ڈاکٹر علی محمد خاں

لاہور کا دبستانِ شاعری

نشریات

لاہور کا دبستان شاعری

ڈاکٹر علی محمد خاں

نشریات

۴۰۔ اردو بازار لاہور۔ فون: ۰۳۲۱۔۴۵۸۹۴۱۹

۸۹۱،۴۳۹۱۰۰۹۲۰ علی محمد خاں، ڈاکٹر

ع ل ی۔ ل لاہور کا دبستان شاعری

لاہور: نشریات

۲۰۰۸ء۔ ص: ۵۷۶

تاریخ ادب۔ شاعری کی تاریخ

ISBN 978-969-8983-34-8

نام کتاب : لاہور کا دبستان شاعری

مصنف : ڈاکٹر علی محمد خاں

اہتمام : نشریات، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز

قیمت :

ڈسٹری بیوٹرز

انتساب

والدہ مرحومہ کے نام

جن کی یادوں سے میرا دل آباد ہے

اور

پیاری بیٹی فرح علی کے نام

جو میری آنکھوں کی روشنی ہے!

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم

جاں دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

(ملکہ نور جہاں)

ترتیب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب
دیگر شعراء (بلحاظ ترتیب زمانی)

٥٥

پیش لفظ

کسی علاقے کا ادب جو زندگی کے کسی خاص ڈھب' معاشرت کے امتیازی خصائص' زبان و بیان کی کسی خاص روش اور اسلوب سے پہچانا جائے تو وہ ایک دبستان سے موسوم ہوگا۔ دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کی تخصیص تو بہت پہلے ہو چکی' اب دبستان لاہور کی پہچان ڈاکٹر علی محمد خاں نے کی ہے۔ زیر نظر کتاب ان کا وہ مقالہ ہے' جس پر انھیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے۔

شہر لاہور کو دلی اور لکھنؤ کی طرح سیاسی' معاشرتی اور ادبی مرکزیت حاصل ہے۔ علاقہ پنجاب میں آپ کو جو سیاسی' معاشرتی اور ادبی رجحانات نظر آئیں گے ان کی جڑیں لاہور ہی میں ملیں گی۔ لہٰذا علی محمد خاں نے لاہور کی اسی مرکزیت کے پیش نظر پورے علاقے کی نمائندگی کا سہرا لاہور کے سر باندھا ہے اور اس علاقے کے ادبی و ذوقی خصائص کو دبستان لاہور کے نام سے موسوم کیا ہے۔

جس طرح دلی کے دبستان شعر کی اہم اور بنیادی خصوصیت فطرت' سادگی اور متانت ہے' لکھنؤ کے دبستان کی معاشرتی احساس' نزاکت اور لطافت ہے' اسی طرح لاہور کے دبستان کی بنیادی خصوصیت خیال و اسلوب کی توانائی' جدت اور ہر جدت کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ بات محض ادب میں نہیں زندگی میں بھی جاری و ساری ہے۔ دلی اور لکھنؤ میں ادب اور معاشرت دونوں ہی ہندی مسلم تہذیب و روایت سے پھوٹے لیکن لاہور کی ادبی روایت میں نئے حکمرانوں یعنی انگریزی حکومت کے اشارے اور توجہ کے اثرات بھی شامل ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر علی محمد خاں صاحب نے ۱۸۷۴ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان کی مدت کو' جس میں نئے ادبی رجحانات اور روایت کو فروغ حاصل ہوا' ایک نئے دبستان کی تشکیل کا دور قرار دیتے ہوئے اپنے مقالے کی تکمیل کی۔

آپ پوچھیں گے کہ آخر ادبی تاریخ کے ہوتے ہوئے' جس میں عہد بہ عہد معروف شعراء کا تذکرہ' ان کے کلام کی خوبیاں' زبان و بیان کے خصائص' سب کچھ مل جاتے ہیں' دبستان بندی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بات ٹھیک ہے لیکن ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ادبی تاریخ زمانی جہت میں کام کرتی ہے اور دبستان کا تعلق "لازمانیت" سے ہے۔ دبستان کی یہ "لازمانیت" بعض ادبی خصائص کو' موضوعات اور

اسالیب اظہار کو مرور ایام سے الگ کر کے روایت کی صورت میں یکجا کر دیتی ہے۔ دبستانوں کی مختص کردہ یہ روایت عہد بہ عہد چلتی رہتی ہے اور کسی تاریخی دور سے مختص نہیں ہوتی۔

آپ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تاریخ میں شاعروں کا ذکر ہوتا ہے اور دبستانوں میں شاعروں کے حوالے سے ذوق کے قوانین کا۔ ذوق کے یہ قوانین کسی دور میں بھی نمایاں ہو سکتے ہیں جنھیں مخصوص دبستانوں کے حوالے سے پہچانا جا سکتا ہے۔ بعض ادبی خصوصیات کو مکانی بنا کر دبستانوں نے "زمان و مکاں" دونوں ابعاد کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یوں دیکھیے تو دبستان وہ مختلف سوتے ہیں جو مختلف سمتوں سے پھوٹتے ہیں اور آپس میں مل کر شعر و ادب کی روایت کے بہاؤ کا تعین کرتے ہیں۔ اردو ادب کے حوالے سے دیکھیے تو دکن، دہلی، لکھنؤ اور لاہور سے اردو ادب کی روایت کے مختلف دھارے پھوٹتے ہیں اور آپس میں مل کر اردو کی ادبی روایت کے دریا کی تشکیل کرتے ہیں۔

دبستان لاہور کی ایک بڑی اور بنیادی خصوصیت، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، جدّت اور جدّت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ چونکہ اس دبستان سے متعلقہ علاقہ خطہ پنجاب ہے اس لیے یہ خصوصیت علاقہ کی زندگی میں بھی رچی بسی ہے۔ آپ ایک نظر اس خطہ کی تاریخ پر ڈالیے تو یہاں آپ کو مذہبی، نیم مذہبی، اصلاحی، سیاسی اور ادبی تحریکیں اپنی پوری قوت و توانائی اور جدت پسندی کے ساتھ پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں۔ ان مختلف تحریکوں سے زندگی کا تحرک بھی ظاہر ہوتا ہے اور جدت پسندی بھی۔

ڈاکٹر علی محمد خاں نے اسی تحرک اور جدت پسندی کے رجحان کے تحت پنپنے والی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اسے ایک مخصوص مزاج اور اسلوب بیان سے متعلق کر کے اردو شاعری کے ایک دبستان، کو اس کے مرکز لاہور سے منسلک کر دیا ہے تاہم مصنف نے تو محض ایک اشارہ کیا ہے۔ اس علاقے کی پوری معاشرت اور ادب کی دیگر اصناف کا مطالعہ بھی انھیں خطوط پر ہو سکتا ہے۔

(ڈاکٹر) سجاد باقر رضوی

سابق پروفیسر شعبہ اردو

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

یکم دسمبر ۱۹۹۱ء

دیباچہ

(طبع چہارم)

''لاہور کا دبستانِ شاعری ۔۱۸۴۷ تا ۱۹۴۷ء'' پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔اس مقالے پر مجھے ۱۹۸۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈگری ایوارڈ ہوئی تھی۔۱۹۹۲ء میں جب یہ مقالہ پہلی بار کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوا تو کتاب کی ضخامت اور فارسی زبان وادب سے نابلد یا کم آشنا قارئین کی عدم دل چسپی کے خیال سے اصل مقالے کا دوسرا باب' جو خطۂ پنجاب کے فارسی گو شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے' نکال دیا گیا تھا۔مزید برآں مقالے کا ساتواں باب بھی حذف کر دیا گیا تھا' جو اُن شعراء کے بارے میں ہے جنھوں نے ہر چند اپنی شاعری کا آغاز تو ۱۹۴۷ء سے قبل ہی کر دیا تھا تاہم وہ ۱۹۴۷ء تک پوری طرف معروف نہ ہوئے تھے مگر بعد میں بہت معروف ہوئے اور کچھ ایک نے بلند مرتبہ پایا مگر جب دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو میرے کچھ بزرگوں اور مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ مقالہ اصل صورت میں چھپنا چاہیے تاکہ شعروادب سے دل چسپی رکھنے والوں کو سرزمین پنجاب سے متعلق علامہ اقبال کے اس قول کی بخوبی تصدیق ہو جائے کہ:

> ''افسوس آج خانخاناں نہ ہوئے کہ ان کو معلوم ہوتا کہ خاک پنجاب شیراز و نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں۔''

اوران کو اس خطے کے ان شعراء کے بارے میں بھی آگاہی حاصل ہو جائے جو ۱۹۴۷ء میں شعروادب کے افق پر آہستہ آہستہ طلوع ہو رہے تھے مگر بعد میں جن کی ضوفشانی میں بہت اضافہ ہوا۔

میں نے موجودہ ایڈیشن کے لیے تمام مقالے پر نظرِ ثانی کی ہے۔اس دوران میں جو نئے ماخذ دستیاب ہوئے' ان سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان شاعروں کے احوال وآثار اور ان کے کلام کا از سرِ نو

جائزہ لیا ہے جو اس مقالے کی اشاعت اول کے وقت حیات تھے اور ان کا تمام کام ہمارے سامنے نہ آیا تھا' اب وہ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ اس موقع پر میں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کی تحسین سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور اپنے ان دوستوں کا بھی ممنون ہوں جن کی تنقیص نے مجھے اس کتاب پر نظر ثانی کا موقع دیا۔ چند ایک جگہوں پر اصلاح ضروری تھی' وہ کر دی گئی ہے' جہاں نیک نیتی سے مجھے اپنی رائے پر اب بھی اصرار ہے' وہاں میں نے اسے قائم رکھا ہے۔ البتہ قارئین کے بھرپور استفادے کے لیے کتاب کے آخر میں کتابیات کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس مشورے کے لیے میں اپنے ہمدم دیرینہ پروفیسر عبدالجبار شاکر اور اس محنت کے لیے اپنے رفیق کار ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن کتابت ہوا تھا اور مجھے تسلیم ہے کہ کتابت معیاری ضرور تھی مگر بے شائبہ دل آویز نہ تھی۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں صرف اضافہ شدہ ابواب اور فہرست مندرجات ہی کو کمپیوٹر پر کمپوز کرایا گیا تھا مگر موجودہ کتاب کو اول تا آخر از سر نو کمپوز کرایا گیا ہے۔ جس کے لیے کمپوزر جناب امجد عبدالستار نے بڑی محنت کی ہے۔ ان کی محنت ایک ایک صفحے سے مترشح ہے۔ اس کام کے لیے انھیں بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس موقع پر مجھے اپنے فاضل دوست پروفیسر عبدالجبار شاکر اور ان کے صاحب زادوں اور "کتاب سرائے" کے منتظمین عزیزم جمال الدین افغانی اور عزیزم محمد رفیع الدین حجازی کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے' جن کی کوششوں سے اس کتاب کا خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ چوتھا ایڈیشن آراستہ ہوا۔ خدا تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے! اور کتاب سرائے' کے عظیم ادارے پر جس نے دنوں میں پبلشنگ کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا ہے' اپنی بیکراں رحمتوں کے پھول برسائے!

اس موقع پر مجھے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی' پروفیسر شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج یاد آ رہے ہیں' وہ میرے استاد اور اس مقالے کے نگران تھے اور جب میں اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں جب یہ مقالہ

لکھ رہا تھا تو احساس ہوتا ہے کہ اس فیض کا سرچشمہ وہی ہیں۔ وہ دھوپ کی تمازت میں میرے لیے ایک شجر سایہ دار تھے۔ وہ آج بھی میرے دل میں بستے ہیں۔ خدا تعالیٰ انھیں اپنی لاانتہا نوازشوں سے سرفراز کرے!

ڈاکٹر علی محمد خاں
پروفیسر آف اردو
ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

۱۴ راگست ۲۰۰۸ء

دیباچہ

(طبع اول)

لاہور ہمیشہ سے ادب کا مرکز رہا ہے۔ دلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کی طرح یہاں بھی فارسی اور قدیم اردو ادب کے ایسے مشاہیر گزرے ہیں، جنھوں نے ادب کو اپنے خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا اور ان کے کارہائے نمایاں سے ایک دنیا واقف ہے۔ مگر انگریز کے آنے کے بعد برصغیر کی وہ تاریخ جو پرانے وقتوں سے چلی آ رہی تھی، بدلنے لگی۔ فکر و احساس کی نئی راہیں پیدا ہوئیں اور نئے تقاضوں کے پیش نظر ادب کے موضوعات اور اسالیب میں تبدیلیاں آنے لگیں جس کی بلند آہنگ بازگشت ہمیں "انجمن پنجاب" کی شکل میں سنائی دی۔ یہ انجمن مشرق و مغرب کے تہذیبی رابطے کی علامت ہے۔ ان تمام ادبی رویوں کو، جو مغربی ادب سے مستعار ہیں اور جنھوں نے اردو شعر و ادب میں تازہ لہو دوڑایا، سب سے پہلے خوش آمدید کہنے والی تحریک "انجمن پنجاب" ہے۔ جس کی روح رواں آزاد اور حالی تھے۔ انجمن پنجاب کے بعد ادب کی بڑی بڑی تحریکیں چلیں، جن میں پنجاب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علامہ اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جو برعظیم کے مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی دور زوال ہے۔ لیکن مسلمانوں نے باوجود اپنے زوال کے اردو زبان و ادب کو خوب چمکایا۔ ملک میں جابجا علمی و ادبی انجمنیں پھیل گئیں، جن کو توانائی پنجاب نے بہم پہنچائی۔ اس ضمن میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے نام خاص ہیں۔ اس طرح اردو ادب کے ان رجحانات و میلانات نے، جو پنجاب کے مخصوص مزاج اور اس کے طرز فکر و احساس کے آئینہ دار تھے، ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی۔

واضح رہے کہ جب کسی شہر کے ساتھ دبستان کا لفظ منسلک کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دبستانی روایات اس شہر تک محدود ہیں۔ اپنی بھرپور ادبی روایات کے ساتھ شہر اپنے پورے خطے کی نمائندگی کرتا ہے نیز اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ادبی روایات کے سلسلے میں پورے خطے کے لیے سند بن جاتا ہے۔ اس لیے جب لاہور کے دبستان کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد پنجاب کا

دبستان شاعری ہے اور پنجاب بھی آج کا پنجاب نہیں بلکہ قیام پاکستان سے قبل کا پنجاب ہے۔ لاہور چونکہ پنجاب کا نمائندہ اور مرکز ہے' اس لیے پورے علاقے کے شعری رجحانات اور شعری خصائص کو یکجا کر کے اسے دبستانِ لاہور کا نام دیا گیا ہے۔

اس موضوع کا خیال مجھے میرے فاضل دوست پروفیسر عمر فیضی نے دیا تھا اور مقالے کی تکمیل تک انھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ اس ضمن میں' میں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں سے بھی استفادہ کیا جو لاہور کے دبستان کے حق میں تھے۔ ان میں ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر شہرت بخاری کے نام زیادہ اہم ہیں اور میں خوش نصیب ہوں کہ اس موضوع پر ان لوگوں کے علاوہ مجھے مولانا حامد علی خاں' جناب عبداللہ قریشی' ڈاکٹر عبادت بریلوی' جناب احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر آغا سہیل' ڈاکٹر سہیل احمد خاں' پروفیسر جیلانی کامران' پروفیسر حسن عسکری کاظمی' پروفیسر افسر حسین رضوی' پروفیسر احسان الٰہی سالک' پروفیسر افتخار احمد باجوہ اور جناب کلیم اختر جیسے شعر و ادب کے نباضوں کی بھی تائید نصیب ہوئی۔ میں اس ضمن میں اپنے کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم خاں لودھی' اورینٹل کالج کے لائبریرین چودھری نذیر احمد' پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ڈپٹی چیف لائبریرین سید جمیل احمد رضوی اور میاں سہیل افتخار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ارباب اختیار کا بھی ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے اس کٹھن کام کی تکمیل میں مجھے سہولتیں بہم پہنچائیں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹریٹ کے اس مقالے کی تیاری کے لیے پروفیسر سجاد باقر رضوی کو میرا نگران مقرر کیا۔ اس دوران میں بعض اوقات کسی ایک بات کی تصدیق یا تحقیق میں مہینوں صرف ہو جاتے۔ کئی بار ایسے دشوار گزار مقام آئے کہ ہمت جواب دے جاتی لیکن استاد محترم جناب سجاد باقر رضوی کی مشفق و مہربان شخصیت قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہی یہاں تک کہ منزل مقصود تک میری رسائی ممکن ہو گئی۔

اس وقت جب کہ کتاب طباعت کے آخری مراحل میں ہے' میں سب سے پہلے خدا کا شکر اور اپنی بیوی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے اس کام کو کرنے کی طاقت دی اور بیوی نے فرصت۔ اس کے بعد اپنے کرم فرما ملک مقبول احمد کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے جن کی کوششوں سے یہ کتاب زیور

طباعت سے آراستہ ہوئی۔ خدا انہیں جزائے خیر دے!

آخر میں، میں یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کہ میں نے کتاب کی ضخامت اور قارئین کی عدم دلچسپی کے خیال سے اصل مقالے کا دوسرا باب' جو اس خطے کے فارسی گو شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے' نکال دیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے شعراء کا ذکر بھی حذف کر دیا ہے۔ جنھوں نے اگرچہ اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ء سے قبل ہی کر دیا تھا تاہم اس وقت تک وہ پوری طرح معروف نہ ہوئے تھے۔

ڈاکٹر علی محمد خاں

شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور

۵ر دسمبر ۱۹۹۱ء

پہلا باب

سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حالات

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین اقوام عالم کی نظروں میں ہمیشہ پُرکشش رہی ہے۔ اسے جغرافیائی حالات کی ستم ظریفی کہہ لیجیے یا کچھ اور لیکن تاریخی حقیقت یہی ہے کہ جتنے بھی حملہ آوروں نے برصغیر کا رُخ کیا، سوائے محمد بن قاسم کے، بیشتر شمال مغرب کی سمت سے آئے اور سرزمین پنجاب سے ہو کر گزرے۔ جغرافیائی لحاظ سے پنجاب ایک مخصوص اور متعین ملک کبھی نہ تھا اور مختلف زمانوں میں اس کے حدود کم و بیش ہوتے رہے ہیں اور نہ ہی یہ خطہ کبھی کسی ایک مخصوص قوم کے وطن کی حیثیت سے معروف رہا بلکہ جغرافیائی حالات نے اسے ایک وسیع و عریض زرخیز خطۂ ارضی بنا دیا ہے، جس میں کئی دریا بہتے اور اسے سیراب کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے پنجاب قوموں اور لشکروں کی گزرگاہ رہا ہے اور برصغیر میں یہی وہ واحد خطہ ہے جو مختلف اقوام اور حملہ آوروں کا ابتدائی مسکن بنا۔ آریہ، سکندر اعظم، محمود غزنوی، محمد غوری، منگول، ظہیر الدین بابر، نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی برصغیر میں سب سے پہلے خطہ پنجاب ہی میں پہنچے اور لاہور یا اس کے گرد و نواح سے ہی ان کا گزر ہوا۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر مسلمانوں کا واسطہ بھی پہلے پہل یہاں کے باشندوں سے پڑا، جن میں مختلف قوموں اور مذہبوں کے لوگ شامل تھے۔ اگرچہ مسلمان پہلی صدی ہجری میں سندھ آ گئے تھے [1] بلکہ اس سے بھی

---

[1] کتاب الہند ابوریحان البیرونی، مترجم سید اصغر علی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۸ کے مطابق محمد بن قاسم ۹۲ھ/۷۱۲ء میں نواح سجستان سے سندھ میں داخل ہوا اس نے شہر بمنھوا کو فتح کر کے اس کا نام منصورہ اور شہر ملتان کو فتح کر کے اس کا نام معمورہ رکھا اور ہندوستان کے شہروں کو تاراج کرتا ہوا قنوج تک چلا گیا۔

قبل کچھ عرب مسلمان خاندان ساحل گجرات' مالابار' کارومنڈل'[1] مالدیپ اور سراندیپ[2] میں مستقل طور پر آباد ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کی آمد کا' جس کے اثرات برصغیر کی آئندہ تاریخ پر گہرے مرتب ہوئے' اصل راستہ یہی تھا۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب ہی وہ خطہ ہے جو ہمیشہ سے برصغیر کی خوش قسمتی اور بدقسمتی کی کنجی بنا رہا ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں مختلف تہذیبیں اور مختلف تمدن سب سے پہلے آپس میں گلے ملے اور جن کے اثرات پورے برصغیر پاک و ہند میں پھیلتے رہے۔

لاہور' جو پنجاب کا مرکز ہے اور بیشتر وقت پنجاب کا دارالحکومت رہا ہے' کا معین طور پر ذکر نویں صدی عیسوی میں ملتا ہے لیکن جہاں تک اس کی آبادی اور شہرت کا تعلق ہے' مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کی وہ اہمیت نہ تھی جو سلاطین اسلامیہ کے زیر اقتدار اسے حاصل ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۰ھ/۹۹۹ء اور پھر ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء میں حملہ کر کے پنجاب کو فتح کر لیا اور اور ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو یہ شہر اپنی خصوصیات کی بنا پر ایک معروف مرکزی شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ فتح کے بعد سلطان محمود غزنوی نے ازسرنو لاہور کو آباد کیا اور یہیں سے اس نے فتح کے کچھ عرصہ بعد اپنا سکہ بھی جاری کیا جس کے ایک طرف سنسکرت عبارت تھی اور دوسری طرف عربی۔ سلطان محمود نے اس کا نام لہاور' لہاور' لوہور یا لہانور سے تبدیل کر کے "محمود پور"[3] رکھ دیا۔ سلطان محمود کے زمانے کے بہت سے سکے آج بھی عجائب گھر لاہور کی زینت ہیں جن میں سے کئی ایک پر محمود پور مع ۴۱۹ھ بھی ایک طرف کندہ ہے۔[4] ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء تک آل غزنہ یہاں حکومت کرتے رہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے تہذیبی اور سیاسی سطح پر مقامی معاشرہ ایک منجمد معاشرہ تھا۔ اس

---

[1] کارومنڈل کا علاقہ راس کماری کے شمال مشرق کی طرف واقع ہے جسے عرب معبر کہتے تھے۔ اس علاقے میں عربوں کی قدیم آبادیاں ہیں۔ سب سے اہم اور پرانی بستی ضلع نئے ولی صوبہ مدراس کا شہر کیالاپٹم ہے جہاں اب بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ (بحوالہ آب کوثر' شیخ محمد اکرام مطبوعہ فیروز سنز ۱۹۵۲ء ص ۵۶)

[2] موجودہ سری لنکا کا قدیم نام ہے۔

[3] قلعہ لاہور کی مختصر تاریخ' ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مطبوعہ کتاب خانہ نورس لاہور ۱۹۷۳ء ص ۶۔

[4] ایضاً۔

معاشرے کی عکاسی علامہ ابوریحان البیرونی [1] (متوفی ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) جو سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آئے' نے ''کتاب الہند'' میں بڑے وقیع انداز میں کی ہے، لکھتے ہیں:

''ہندو اپنے طبقوں کو برن یعنی الوان یا رنگ کہتے ہیں اور نسب کی حیثیت سے جاتک یعنی موالید یا پیدائش نام رکھتے ہیں۔ یہ طبقے ابتدائی منزل میں چار ہیں۔ سب سے اونچا طبقہ برہمنوں کا ہے۔ جن کے متعلق ہندوؤں کی کتابوں میں مذکور ہے کہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ لفظ اس قوت سے کنایہ ہے جس کو طبیعت کہتے ہیں۔ سر حیوان کا سب سے بلند حصہ ہے اس لیے برہمن اس جنس کے خلاصہ و منتخب ہیں اور اسی وجہ سے ہندوؤں کے نزدیک سب سے بہتر انسان ہیں۔ ان کے بعد کھشتریوں کی ذات کا درجہ ہے جو ہندوؤں کے نزدیک برہما کے کندھوں اور ان کے دونوں ہاتھوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا مرتبہ برہمنوں کے مرتبہ سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ تیسرا درجہ ویشوں کو حاصل ہے جو برہما کی رانوں سے پیدا ہوئے ہیں اور چوتھے شودر ہیں جن کی تخلیق برہما کے دونوں پیروں سے ہوئی ہے''۔ [2]

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:

''ان سب سے نیچے ادنیٰ درجے کے ذلیل لوگ ہیں جن کا شمار کسی طبقے میں

---

[1] ابوریحان البیرونی مضافات خوارزم (خیوا) ''بیرون'' میں ۳۶۲ھ/۹۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۷۷ سال ۷ ماہ کی عمر میں ۱۱۳ سے زیادہ علمی کتابیں لکھنے کے بعد ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔ علامہ موصوف ایک مدت تک ہندوستان میں مقیم رہے۔ انھوں نے بڑی جانکاہی سے سنسکرت اور علوم ہند سیکھے کیونکہ برہمن اپنے علوم مسلمان تو درکنار کسی غیر برہمن کو بھی پڑھانے کے روادار نہ تھے۔ بلکہ ہندو قوم کی اکثریت کے لیے لکھنا پڑھنا ایک مہا پاپ تھا۔ کسی اچھوت یا شودر کے کان میں سنسکرت کا کوئی لفظ پڑ جاتا تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ لیکن البیرونی کا علمی ذوق ملاحظہ ہو کہ انھوں نے جان پر کھیل کر ہندوستان کے علوم پر عبور حاصل کیا اور ایسی سیر حاصل کتاب تالیف کی جو نہ صرف غیر جانبدارانہ تحقیق کا شاہکار ہے بلکہ جسے آج بھی محققانہ کتب میں خاص وقعت حاصل ہے۔

(ملاحظہ ہو دیباچہ کتاب الہند) از مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء)

[2] کتاب الہند' ابوریحان البیرونی' مترجم سید اصغر علی' باب ۹' ص ۱۲۶ تا ۱۲۸

نہیں ہے اور صرف اپنے پیشے کے اعتبار سے منسوب ہیں۔ یہ لوگ انتز کہلاتے ہیں۔ ان کے آٹھ فرقے ہیں:

(۱) دھوبی (۲) چمار (۳) بازی گر (۴) ٹوکریاں اور ڈھال بنانے والے (۵) ملاح (۶) مچھیرے (۷) چڑی مار (۸) جلاہے۔

ان سب کو چاروں ذاتوں والے اپنی آبادی میں سکونت پذیر نہیں ہونے دیتے بلکہ گاؤں کے قریب لیکن گاؤں سے باہر آباد کرتے ہیں۔ یہ لوگ گندے کاموں مثلاً گاؤں کو صاف کرنے اور اس کی دوسری خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی جنس میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان میں باہمی امتیاز ان کاموں کی نسبت سے ہوتا ہے جن میں وہ مصروف رہتے ہیں۔ ان کی حالت اولاد زنا کی طرح ہے کہ وہ سب ایک ہی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا باپ شودر اور ماں برہمنی تھی، دونوں کی حرام کاری سے یہ لوگ پیدا ہوئے، اسی وجہ سے نکالے ہوئے ہیں"۔ [1]

البیرونی نے جو کچھ دیکھا ہے بلا کم و کاست اور بے لاگ ہو کر لکھا ہے جس کی تائید دیگر مؤرخین نے بھی کی ہے۔ انھوں نے ہندو معاشرے کے جو خدوخال بیان کیے ہیں اس کا ملخص یہ ہے کہ ذات پات کی غیر فطری تقسیم کی وجہ سے لوگ کئی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے اور معمولی معمولی ضروریات زندگی سے بھی انھیں محروم رکھا جاتا تھا۔ مقدموں کا فیصلہ نہایت دقیانوسی اور بھدے طریقے سے کیا جاتا تھا۔ قانون برہمنوں کو مورد الزام ٹھہرانے کا روادار نہ تھا اور برہمنوں کو ہر طرح کے ٹیکسوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔ لوگ بت پرست اور حد درجہ توہم پرست تھے۔ ستی کی وحشیانہ رسم کا عام رواج تھا اور عام لوگوں کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ لوگ پرلے درجے کے احمق تھے لیکن اپنے آپ کو نہایت دانا اور زیرک سمجھتے تھے۔ بقول علامہ البیرونی:

"..........اور حماقت ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ان

---

[1] کتاب الہند، ابو ریحان البیرونی، مترجم سید اصغر علی، باب ۹، ص ۱۲۶ تا ۱۲۸

لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک ہے' انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ' بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ' دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے۔ اس لیے یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر جاہل رہ جاتے ہیں۔ یہ جو کچھ جانتے ہیں اس کو بتلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے در کنار خود اپنی قوم کے نا اہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دُنیا میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے۔ یہ حالت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر ان سے خراسان اور فارس کے علوم اور اہل علم کا ذکر کیا جائے تو مخبر کو جاہل سمجھیں گے اور مذکورہ بالا عیب کی وجہ سے ہرگز اس کو سچا نہیں مانیں گے۔ حالانکہ اگر یہ لوگ سفر کریں اور دوسرے لوگوں سے ملیں تو اپنی رائے سے باز آجائیں"۔ ❶

یہ تھا وہ مذہبی اور معاشرتی کوائف کا ایک اجمالی سا خاکہ جس میں آگے چل کر برصغیر میں مسلم ثقافت نے اپنا رنگ بھرا۔ مسلمان فاتحین کے مقابلے میں برصغیر کے لوگ ایک طرف تو ذہنی' اخلاقی اور جسمانی طور پر کم تر تھے اور دوسری طرف وہ ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہے تھے۔ چنانچہ جب فاتحین اسلام کے ہمراہ آئے ہوئے باعمل' باکردار اور نیکوکار مبلغین اسلام نے ان کو اسلام کی ترغیب اور دعوت دی تو وہ لوگ اسلام کی حقانیت سے بہت متاثر ہوئے اور دیسی باشندوں کی ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی اور یوں انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔ انھیں مبلغین کے سرخیل حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخش' (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) ہیں جو سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت (۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء) میں لاہور تشریف لائے۔ مسلمان فاتحین میں سے ایک کثیر تعداد

---

❶ کتاب الہند' ابوریحان البیرونی' مترجم سید اصغر علی' ص ۱۹' ۲۰

میں تُرک، افغان، ایرانی، اور دیگر مسلم اقوام بھی اس علاقے میں مستقلاً آباد ہونا شروع ہو گئیں جس سے آہستہ آہستہ ایک نئے تمدن نے اُبھرنا شروع کیا۔ اس نئے تمدن کا ابتدائی مرکز [1] لاہور تھا۔

بقول حافظ محمود شیرانی:

> "مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو تجارت، فوجی و سرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی پنجاب ہی کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نگاہ میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا بلکہ وہ اس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے [2]"۔

غزنوی خاندان کا دارالسلطنت اگرچہ غزنی تھا تاہم غزنوی سلطنت کا دوسرا بڑا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ بلکہ اِس خانوادے کے آخری تین بادشاہوں [3] نے تو لاہور کو اپنی سلطنت کا صدر مقام قرار دے کر یہیں مستقلاً اقامت اختیار کی۔ غزنوی خاندان کا یہ دور علماء و فضلاء کا دور ہے۔ ایک طرف تو غزنی ان کا مسکن و ماوئی تھا اور دوسری طرف لاہور۔ غزنوی سلاطین کی علم دوستی اور داد و دہش کے باعث یہاں غزنی کی سی علمی و ادبی فضا قائم ہو گئی تھی، چنانچہ لاہور اسی بنا پر غزنی خورد [4] کے نام سے مشہور ہوا۔ ابوعبداللہ روزبہ نکتی، ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان اسی دور کے شاعر ہیں [5]۔

غزنوی خاندان کے کمزور ہونے کے بعد ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں سلطان معزالدین محمد غوری نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ لاہور کا انتظام و انصرام کرنے اور اسے اپنے مقبوضات میں شامل کرنے کے بعد محمد

---

[1] کیفیہ، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مطبوعہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء ص ۲۲۔

[2] پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی، مطبوعہ آئینہ ادب لاہور، طبع چہارم ۱۹۷۲ء ص ۵۷۔

[3] سلطان بہرام شاہ (۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تا ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) خسرو شاہ (۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) تا ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء اور خسرو ملک ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء)

[4] فارسی گو شعراء، خواجہ عبدالحمید یزدانی، نقوش لاہور نمبر، مطبوعہ فروری ۱۹۶۲ء ص ۵۹

[5] غزنوی دور کے ان فارسی گو شعراء کا ذکر اگلے باب میں تفصیل سے آئے گا۔

غوری مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھا اور ۵۸۸ھ/۱۱۹۳ء میں ترائن (تراوڑی) کے میدان میں اس نے رائے پتھورا کو شکست فاش دی جس کے ہمراہ ایک سو پچاس [1] راجے مہاراجے تھے۔ اس کے بعد دہلی، اجمیر، قنوج اور بنارس پر تسلط قائم کیا۔ سلطان نے اپنے وفا کیش غلام قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ جس نے ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تک بطور نائب السلطنت اور پھر محمد غوری کی وفات کے بعد ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تک بطور مطلق العنان سلطان، ہندوستان پر حکمرانی کی۔ سلطان قطب الدین ایبک ایک بیدار مغز حکمران تھا جو شجاعت میں فرد تھا اور سخی اتنا کہ لوگ اسے سلطان قطب الدین لکھ بخش [2] کہتے تھے۔ اگرچہ سلطان قطب الدین ایبک کا پایہ تخت دہلی تھا لیکن وہ زیادہ تر لاہور میں مقیم رہا یہاں تک کہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں لاہور ہی میں وفات پائی اور یہیں پر دفن کیا گیا۔ جہاں سلطان التمش نے اس کے مدفن پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر [3] کرایا۔ مقبرہ پر نہایت عمدہ سنگ مرمر کا دو منزلہ گنبد تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں مع دیگر متعلقہ عمارات کے مسمار کرا دیا گیا [4]۔ سلطان قطب الدین ایبک کے عہد حکومت میں لاہور علماء و فضلاء کا مرکز تھا اور بقول پروفیسر محمد شجاع الدین:

> ''یہاں کی نوے فیصدی آبادی زیور علم سے آراستہ تھی۔ اس جگہ فخر مدبر مبارک شاہ اور تاج الدین حسن نظامی جیسے محققین اور مورخین، شیخ عبدالعزیز مکی (متوفی ۶۱۲ھ) سید احمد توختہ ترمذی (متوفی ۶۰۲ھ) اور شیخ یعقوب زنجانی (متوفی ۶۰۴ھ) جیسے علماء اور اصفیا مقیم تھے۔ علاوہ ازیں بے شمار ادیب، شاعر اور فاضل یہاں موجود تھے جن میں سے چند ایک کے حالات لباب الالباب عوفی کے اوراق میں محفوظ ہیں'' [5]۔

اس وقت تمام شمالی ہندوستان مسلمانوں کے زیر نگین تھا اور لاہور ہندوستان میں تمام اسلامی مقبوضات کا مرکز و محور تھا۔ جس میں جا بجا مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تھیں اور سلطان کی رعایا پروری

---

1. آب کوثر، شیخ محمد اکرام، مطبوعہ فیروز سنز ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۰
2. تاریخ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم ڈاکٹر آفتاب اصغر، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۸۷۔
3. ایضاً
4. تحقیقات چشتی، مولوی نور احمد چشتی، مطبوعہ پنجابی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۳۰۔
5. سیاسی اور ثقافتی تاریخ، پروفیسر محمد شجاع الدین، نقوش لاہور نمبر، ص ۳۰۔

اور معدلت گستری کی بدولت امن وامان کا دور دورہ تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک کے جانشینوں کے عہد حکومت میں بھی یہ علمی وتمدنی روایات قائم رہیں لیکن جب ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں منگولوں نے ہندوستان پر حملے شروع کیے تو لاہور کی وہ رونق اور عظمت جو ہندوستان بھر میں اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی خاک میں مل گئی۔ پنجاب کا دارالحکومت ملتان اور پھر دیپالپور منتقل ہو چکا تھا۔ کیونکہ منگول پنجاب پر درۂ بولان' سندھ اور ملتان کی راہ سے تاخت کیا کرتے تھے اور ان جگہوں سے ان کا راستہ روکنے میں آسانی تھی۔

سلطان التتمش نے اپنی مملکت کو منگولوں کے سیلاب سے بچانے کی ہر ممکن تدبیر اور کوشش کی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ تاہم سلطان التتمش کے بعد اور سلطان غیاث الدین بلبن کے پیشرو سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں منگول کئی بار ہندوستان آئے اور لاہور کو انھوں نے کئی بار لوٹا اور یہاں کے قلعہ کو تباہ وبرباد کر دیا [1] لیکن بلبن کے زمانے میں اس کے فوجی اور ملکی استحکام کی وجہ سے منگول پھر ادھر کا رُخ نہ کر سکے۔ التتمش سے بلبن تک کم وبیش پچاس سال کا زمانہ بنتا ہے۔ ان پچاس سالوں میں منگولوں نے ترکستان' ایران اور افغانستان میں طوفان بپا کیے رکھا جس کے مقابلہ میں خطۂ پاک وہند اسلامی دنیا کا نسبتاً سب سے بڑا ملجا وماویٰ تھا۔ چنانچہ کثرت سے علماء وامراء اس سرزمین میں تشریف لائے۔ [2] یہ عمل سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں اور قوی ہو گیا۔ جو عالی نسب لوگ منگولوں کے حملوں سے بچ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے ان کی یہاں پر بڑی قدر ومنزلت ہوئی اور ان سے استحکام حکومت میں بھی بڑی مدد ملی۔ [3]

خاندان غلاماں کے بعد حکومت کی باگ ڈور خاندان خلجی کے ہاتھ آ گئی۔ ان کے بعد خاندان تغلق' خاندان سادات اور پھر خاندان لودھی برسر اقتدار رہا لیکن اس عرصہ میں لاہور کی قدر وقیمت اور اہمیت وہ

---

[1] آب کوثر' ص ۱۱۹

[2] تاج الدین سنگریزہ' امیر روحانی' ناصری' استاد الشعراء شہاب مہمرہ اسی دور میں ہندوستان آئے اور طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج سراج بھی اسی زمانے میں آئے جو ابتدا میں کچھ عرصہ لاہور میں مقیم رہے۔ (آب کوثر' ص ۱۳۷تا۱۴۲' ۱۴۴).

[3] آب کوثر' ص ۱۳۵

نہ رہی جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔ البتہ یہاں مختلف النوع اقوام آپس میں رچ بس گئی تھیں جن کے آپس میں برتاؤ' لین دین اور گفت وشنید سے اُردو کا مغلوبہ گاڑھا ہوتا جارہا تھا اور جغرافیائی طور پر شمال مغرب میں واقع ہونے کی وجہ سے یہ منگولوں کے خلاف ایک اہم عسکری مرکز تھا۔

فیروز شاہ تغلق کی وفات (۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) کے بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی تو پنجاب میں کھوکھروں نے خوب تباہی مچائی۔ ان کا سرکردہ شیخا کھوکھر تھا جسے اپنے بھائی جسرت کھوکھر کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سلطان ناصر الدین محمود کا سالار سارنگ خان اس کی سرکوبی کے لیے پنجاب میں آیا تو شیخا کھوکھر لاہور چھوڑ کر جموں کی طرف بھاگ گیا[1] لیکن جب امیر تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو شیخا کھوکھر نے اس کا استقبال کیا' اس کی مدد کی اور اطاعت قبول کر لی۔ لیکن موقع ملتے ہی بدعہدی کی جس پر امیر تیمور نے اس کو بدعہدی کی سزا دی۔ امیر تیمور واپس چلا گیا اور سید خضر خان کو ہندوستان کی حکومت سپرد کر دی۔ اس خاندان کے ایک تاجدار سید مبارک شاہ نے پنجاب میں امن وامان قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اگرچہ کھوکھروں نے لاہور کو تاراج کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ان کی پیش نہ گئی اور ان کو ہر بار ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ سید مبارک شاہ نے لاہور میں ایک ماہ قیام کیا۔ اس نے شہر کو ازسرِ نو آباد کیا۔ قلعہ اور شہر پناہ کو تعمیر کرایا اور ملک الشرق محمود حسین کو حاکم پنجاب مقرر کیا۔ اس دن سے لاہور کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ سادات کے بعد لودھیوں کی حکومت ہوئی تو ترقی کا وہ سلسلہ جس کا آغاز سید مبارک شاہ کے زمانہ میں ہوا تھا کسی حد تک جاری رہا یہاں تک کہ ہندوستان میں عظیم مغلوں کا عہد شروع ہوا جس کا بانی ظہیر الدین بابر تھا۔

یہ عجیب صورت حال ہے' لیکن واقعہ یہی ہے کہ سلاطین دہلی کے زمانے میں مغلوں سے زیادہ ہیبت ناک اور قابلِ نفرت کوئی ہستی نظر نہیں آتی لیکن جب ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو حقیقتاً اسلامی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار اور پُرامن دور کا آغاز ہوا اور نہ صرف ملکی نظم ونسق اور خلقت کی فلاح و بہبود کا اعلیٰ درجے پر انتظام ہوا بلکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور قومی اور ملکی علم وادب کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ ہوا۔ بابر نے پانچ بار برصغیر پر یلغار کی۔ اگرچہ پنجاب پر اس کا قبضہ تو

---

[1] تاریخ مبارک شاہی' یحییٰ بن احمد سرہندی' مترجم ڈاکٹر آفتاب اصغر' ص ۲۶۳۔

پہلے چار حملوں میں ہی مکمل ہو چکا تھا مگر جب اس نے ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں سلطان ابراہیم لودھی کو پانی پت کے تاریخی میدان میں اور ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۹ء میں رانا سانگا کو سیکری کے نزدیک کنواہہ کے مقام پر شکست دی تو تمام شمالی ہندوستان اس کے زیر اقتدار آ گیا۔ ظہیر الدین بابر نہ صرف ایک اولوالعزم حکمران تھا بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا شاعر [1] اور بلند پایہ مصنف تھا۔ تزک بابری [2] اس کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو یگانہ روزگار تصنیف ہے۔ وہ ہندوستان کی ثقافت کے متعلق اپنی کتاب میں جا بجا بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ جیسے لکھتا ہے:

"جتنے شہر اور میدانی علاقے ہندوستان میں ہیں کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔ ہندوستانی شہروں کی وضع قطع میں عموماً مشابہت پائی جاتی ہے۔ عموماً شہر غلیظ ہیں۔.... یہاں کے شہر اور آبادیاں جلد آباد ہو جاتی ہیں اور جلد ہی ویرانوں کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ خطرے کے وقت یہاں کی آبادیوں کے باشندے اس طرح بھاگ جاتے ہیں کہ اپنا نشان تک پیچھے نہیں چھوڑتے۔ اگر یہاں کے لوگ کہیں بسنا چاہتے ہیں تو یا تو کنویں کھود لیتے ہیں یا تالاب بنا لیتے ہیں اور پھر پھونس اور بانس کی لکڑی کی مدد سے جھونپڑیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ نہ دیواریں اُٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ اینٹیں اور پتھر تراشنے کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں آباد ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے کھیت عموماً دریاؤں سے سیراب ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں دریاؤں سے نہریں نکال کر شہروں تک پہنچائی گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے بعض باغات خوب سرسبز و شاداب ہیں۔ لاہور، دیپال پور اور سرہند کے

---

[1] بابر صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کا تذکرہ نہ صرف مورخین بلکہ بابر نے خود اپنی سوانح "تزک" میں بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "ذی الحجہ کی دوسری تاریخ سے ایک وظیفہ شروع کیا ہے اکتالیس دن تک برابر پڑھا جائے گا۔ اس مہینے میں اپنے دیوان کی ترتیب کی ہے۔ میں نے اس وقت تک چار مختلف اوزان میں پانچ سو اشعار کہے ہیں"۔

(تزک بابری، ترجمہ رشید اختر ندوی، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۱)

[2] بابر نے "تزک" ترکی زبان میں لکھی تھی جسے بعد ازاں اس کے پوتے جلال الدین اکبر کے ایک رفیق عبدالرحیم خان خاناں نے جو بیرم خان کا بیٹا تھا فارسی میں منتقل کیا جس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

علاقوں میں کھیتوں کو پانی زیادہ تر راہٹوں کی مدد سے پہنچایا جاتا ہے، ہندوستان میں مجھے لطافت کی کمی کا بہت احساس ہوا۔ یہاں لوگ بہت خوبصورت بھی نہیں ہیں۔ نہ ملنے جلنے کے آداب ہی سے آشنا ہیں۔ ذہن بھی پست ہیں۔ مروّت اور خلق اور وضعداری میں بھی ہیٹے ہیں۔ یہاں کا گھوڑا اچھا نہیں ہوتا۔ گوشت بھی مزیدار نہیں ہے۔ نہ انگور یہاں کے اچھے ہوتے ہیں نہ خربوزے اور نہ دوسرا پھل ہی لذیذ ہوتا ہے۔ بازاروں میں بکنے والی روٹی بھی خراب ہوتی ہے اور سالن بھی مزے کا نہیں ہوتا۔ یہاں کی عمارتیں نہ ہوادار ہوتی ہیں اور نہ خوش وضع ہی کہی جاسکتی ہیں۔ عوام عموماً ننگے پاؤں رہتے ہیں۔ مرد کمر کے گرد حصۂ اسفل میں لنگوٹی عموماً باندھ لیتے ہیں، البتہ عورتیں ساڑھیاں استعمال کرتی ہیں جس کا ایک حصہ جسم سے لپٹا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ سر کو چھپاتا ہے۔

ہندوستان کی بس ایک ہی خوبی ہے کہ بہت وسیع ملک ہے۔ اس میں سونے چاندی کی بہتات ہے۔ برسات کے موسم میں جو ہوا چلتی ہے وہ بہت لطف دیتی ہے۔ یہاں کی برسات میں کبھی کبھی تو ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس بار آسمان سے مینھ برستا ہے، برسات میں ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔ جہاں پانی کی بوند نہیں وہاں ندی نالے بہنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں پیشوں کی تقسیم خوب ہے۔ ایک ہی پیشہ کے لوگ بکثرت ہوتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ہزاروں آدمی ایک ہی کام کرنے والے دستیاب ہو جاتے ہیں"۔ [1]

بابر فطری طور پر ذہین آدمی تھا۔ وہ فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ جامع صفات کا دلچسپ مرقع تھا۔ اس کو ہندوستان میں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا اور فتح ہندوستان کے صرف چار سال بعد ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں انتقال کر گیا۔ [2] تاہم ان چار سالوں میں اس نے نہ صرف انتظام سلطنت کو مستحکم کیا بلکہ عوام الناس کی حالت سدھارنے کی طرف بھی بھرپور توجہ دی۔ بابر کی

---

[1] تزک بابری، ترجمہ رشید اختر ندوی، ص ۱۹۸ تا ۲۰۷۔

[2] لفظ "ششِ محرم" سے مادۂ تاریخ ولادت اور لفظ "ششِ شوال" سے مادۂ تاریخ وفات برآمد ہوتا ہے۔ (منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی، مترجم محمود احمد فاروقی، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۱)

رحلت کے بعد اس کا بڑا بیٹا نصیر الدین ہمایوں سریر آرائے سلطنت ہُوا تو باپ کی نصیحت کے مطابق بھائیوں کو شریک سلطنت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران میں کامران نے جو کابل اور قندھار کا گورنر تھا پنجاب کا رُخ کیا اور بڑی حکمت عملی سے لاہور پر قبضہ کر لیا جو صوبہ پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ ہمایوں فطرتاً نرم مزاج اور رحمدل تھا، دوسرے بابر کی وصیت تھی کہ بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی اور نیکی کا سلوک کرنا، اس نے کابل اور قندھار کے صوبوں کے علاوہ پنجاب پر بھی کامران کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ کامران نے لاہور میں وسط ایشیا کے باغات کے نمونہ پر ایک عالیشان باغ لگوایا۔ اس سے قبل اسی طرز کا ایک باغ بابر نے آگرہ میں لگوایا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں آگرہ کے بعد یہ دوسرا مغلیہ باغ تھا جو نزہت و طراوت اور رعنائی و دلکشی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ لاہور کا یہ پہلا باغ شاہجہان کے دور تک مقبول رہا۔ اِس عظیم باغ کی بارہ دری کے کھنڈر آج بھی دریائے راوی کے وسط میں ایک جزیرہ میں موجود ہیں جن کو دیکھ کر ایک سیاح بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس باغ کی بارہ دری کے کھنڈرات کا یہ عالم ہے اس کی اصل شان و شوکت کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔

ہمایوں ابھی تیس سال کا نوجوان تھا کہ شیر شاہ سوری نے اسے ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں شکست دے دی اور ہندوستان میں سوری خاندان کی بنیاد ڈالی۔ ہمایوں لاہور میں آ پناہ گزین ہوا مگر شیر شاہ کی آمد کی خبر سن کر دریائے راوی عبور کر کے جان بچاتا سندھ اور راجستھان کے جنگلوں، ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا ایران کو بھاگا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ کا ارادہ تھا کہ لاہور کو نقشے سے بالکل مٹا دے کیونکہ اتنا بڑا شہر سرحدی حملہ آوروں کی راہ میں نہیں ہونا چاہیے جو یہاں آ کر سامان فراہم کر کے مزید فتوحات کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر وہ مرگ مفاجات (متوفی ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) [1] کی وجہ سے اپنا یہ ارادہ پورا نہ کر سکا۔ [2] شیر شاہ نے اپنے پنجسالہ دورِ حکومت میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن سے اس کا نام برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مگر چونکہ لاہور مغلوں کا مرکز تھا اور مغلوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتا تھا اس لیے اسے لاہور سے خاص عداوت تھی۔ اس نے لاہور کو تباہ کر کے اس کی بجائے سیالکوٹ کو پنجاب کا دارالحکومت مقرر کرنا چاہا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس

---

[1] مادۂ تاریخ وفات ''آتش مرد'' سے برآمد ہوتا ہے۔ (منتخب التواریخ' عبدالقادر بدایونی' ص ۲۲۵)

[2] تاریخ جلیلہ' غلام دستگیر نامی' مطبوعہ صابر الیکٹرک پریس لاہور ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء' ص ۱۵۶

نے اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔ [1] اپنی جلاوطنی کے پندرہ اور شیر شاہ کی وفات کے دس سال بعد ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں ہمایوں کو پھر لاہور پر قابض ہونے کا موقع ملا۔ جب ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے لاہور میں داخل ہوا تو اہل لاہور نے اس کے واپس آنے پر مسرت کا اظہار کیا اور اس شہر میں، جسے شیر شاہ اور اس کا بیٹا خاک میں ملانا چاہتے تھے، عظیم پیمانہ پر چراغاں کیا گیا۔ [2]
لاہور پر قابض ہونے کے بعد ہمایوں نے دہلی اور پھر آگرے پر بھی دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مگر قضائے الٰہی سے ایک ہی سال بعد حادثے کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ [3] اس وقت اکبر کی عمر فقط ۱۳ سال اور ۴ ماہ کی تھی اور وہ اپنے اتالیق اور اپنے خاندان کے جاں نثار جرنیل بیرم خان کی معیت میں افغان باغیوں کے استیصال کے لیے کلانور [4] میں مقیم تھا۔ ہمایوں کی وفات کی خبر ملتے ہی وہیں اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ اکبر نے خواجہ خضر خان [5] کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور خود اپنے اتالیق، درباری امرا اور فوج سمیت دہلی اور آگرے کا رُخ کیا جہاں ہمایوں کے انتقال پر ہیموں بقال نے قبضہ جما لیا تھا۔ دریں اثنا سکندر سوری نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ اکبر ہیموں بقال کو پانی پت کے تاریخی میدان میں ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو شکست دینے اور امور مملکت سے فراغت کے بعد ۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو بیرم خان کے ہمراہ عازم لاہور ہوا جس پر سکندر سوری مغلیہ افواج کے خوف سے لاہور سے بھاگ گیا۔ دہلی اور آگرہ روانہ ہونے سے پہلے اکبر نے چار ماہ اور چودہ دن لاہور میں قیام کیا اور لاہور کے انتظام و انصرام کو درست کیا۔ اسی قیام کے دوران میں بیرم خان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس نے بعد ازاں عبدالرحیم خان خاناں کے نام سے اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بڑی ناموری حاصل کی۔

---

[1] لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور) محمد الدین فوق مطبوعہ ظفر برادرس لاہور ۱۹۲۷ء ص ۳۔

[2] لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور) محمد الدین فوق مطبوعہ ظفر برادرس، لاہور ۱۹۲۷ء ص ۳

[3] مادۂ تاریخ وفات ''ہمایوں بادشاہ از بام افتاد'' سے نکلتا ہے۔ (منتخب التواریخ، علامہ عبدالقادر بدایونی، مترجم محمود احمد فاروقی، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء ص ۳۰۹)

[4] کلانور آج کل ضلع گورداسپور (انڈیا) کی تحصیل کا صدر مقام ہے، اس زمانے میں ضلع لاہور کی ایک تحصیل کا صدر مقام تھا۔

[5] خواجہ خضر خا ہمایوں کی ہمشیرہ گلبدن بیگم (مصنفہ ہمایوں نامہ) کا شوہر تھا۔

۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء سے لے کر ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء تک اکبر کئی بار لاہور آیا اور ہر بار لاہور اس کو ایسا بھایا کہ کئی کئی ماہ یہیں متمکن رہا۔ مگر ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں تو اس نے لاہور ہی کو اپنا مستقل دار الحکومت مقرر کر لیا اور لاہور شہر کی آبادی اور رونق کے لیے خود لاہور ہی میں مقیم رہا۔ چنانچہ اکبر کے اس زمانے میں لاہور کو جو رونق اور شہرت نصیب ہوئی اس کی نظیر عہد شاہجہاں کے سوا کسی اور عہد میں نہیں مل سکتی۔ اس دوران میں بے شمار فنی اور علمی کارنامے انجام پائے جو بذات خود ایک الگ مضمون ہے اور جن کی وضاحت کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

اکبر کے عہد کے یورپین اور ہندوستانی سیاحوں اور مورخین نے لاہور کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ در حقیقت اس شہر کی شان و شوکت اور عظمت کا اعتراف ہے۔ مسٹر ٹامسن ہربرٹ نامی ایک سیاح ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا تھا۔ اکبر ان دنوں لاہور میں مقیم تھا، وہ لاہور سے متعلق لکھتا ہے کہ:

"لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے کسی شہر سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا سال کے آٹھ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے۔ بازار اچھے، بارونق اور پختہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے دریائے راوی کے ذریعے جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے' صاف کیے جاتے ہیں۔ یہاں کی قابل دید عمارات میں سے قلعہ' محلات' حمام' تالاب' باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔ قلعہ بہت بڑا ہے۔ جسے اکبر نے اپنے قیام لاہور کے ایام میں پختہ خشتی بنوایا اور اس میں فلک شگاف عمارتیں تعمیر کرائیں"۔ [۵]

جناب فوق نے مسٹر ٹامسن ہربرٹ کا تذکرہ کرنے کے بعد "شباب لاہور میں" گوا کے پرتگیزی پادریوں کی ایک جماعت کا ذکر بھی کیا ہے جو اسی سال (۱۵۹۵ء) لاہور میں اکبر کے پاس آئی تھی۔ ان پادریوں نے اپنے دلچسپ سفرناموں میں لاہور کی بہت تعریف کی اور لکھا ہے کہ:

"یہ شہر ایسا بارونق اور آباد ہے اور اس میں شاہی محلات کے علاوہ امراء و وزراء کے ایسے ایسے عالیشان مکانات ہیں کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادشاہ ان

ایام میں راوی کے ایک جزیرہ میں رہتا تھا جہاں اس کے رہنے کے لیے ایک خوشنما بنگلہ بنایا گیا تھا"۔ ❶

آئین اکبری کے مصنف ابوالفضل' اکبر کے عہد کے چشم دید گواہ ہیں۔ وہ لاہور کے متعلق رقم طراز ہیں:

"لاہور بزرگ شہریست میان دو آبہ باری۔ در بزرگی وانبوہی مردم کم ہمال۔ در باستانی زیجات بہ لہاور تعبیر رود۔ دریں دولت ابد پیوند قطعہ وارک واز خشت پختہ ساختہ اندو چوں چندگاہ پائے تخت شد والا کا نجا برافراختہ آمد ودلکشا یانہا شادابی دیگر بخشید وگونا گوں مردم بر شہر راہ بیگاہ شد وشگرف کار ہابر خاستند ودرانبوہی وبزرگی از اندازہ گذشت۔" ❷

ابوالفضل آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"واز توجہ شاہنشاہی در کشمیر ہنگامہ شالبانی گری پذیرفت ودر لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شد"۔ ❸

اکبر کے زمانے میں دریائے راوی نہایت جوش وخروش سے بہتا تھا اور دریا میں کشتی رانی عام ہوتی تھی۔ امراء کی سیر وتفریح کی سجی سجائی کشتیوں کے علاوہ بار برداری کی کشتیاں بھی چلتی تھیں۔ پانی اس قدر وافر اور گہرا تھا کہ اس میں جہاز بھی چلا کرتے تھے۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ (سندھ) پر یورش کی اور سامان جنگ خشکی کے راستے کے علاوہ راوی کے ذریعے ٹھٹھہ کو بھیجا گیا۔ اس مہم کا سپہ سالار مرزا عبدالرحیم خان خاناں تھا۔ علاوہ دیگر کشتیوں کے کل ۲۵ جنگی کشتیاں لے کر وہ لاہور سے چلا تھا اور ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کے جشنِ نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کر کے لاہور لے آیا تھا۔ ❹ اکبر کے لاہور کو دارالحکومت قرار دینے کی وجہ سے اور یہاں پر طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے نواح میں بھی ایک اور لاہور تیار ہو رہا تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

---

❶ لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور)' محمد الدین فوق' ص ۵۔

❷ آئین اکبری' ابوالفضل' مترجم مولوی فدا علی طالب' جلد اول' حصہ دوم' سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۸ء' ص ۱۵۲۔

❸ آئین اکبری' ابوالفضل' جلد اول' حصہ اول' ص ۱۶۸۔

❹ لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور) محمد الدین فوق' ص ۹۔

اکبر اعظم کی وفات کے بعد ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تخت نشین ہوئے جہانگیر کو ابھی چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اہل لاہور کو ایک عجیب دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو نے جوانی کے خمار اور نالائق مصاحبوں کی فتنہ پردازی اور چکمے میں آ کر باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ ۱۶ اپریل ۱۶۰۶ء کو وہ اکبر کے مقبرے کی زیارت کے بہانے قلعہ آگرہ سے نکل بھاگا اور دس ہزار سواروں کی معیت میں دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آ پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے اپنے ہمراہیوں سے وعدہ کیا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد وہ سات روز کے لیے اسے لوٹنے اور غارت کرنے کی اجازت دے گا۔ خسرو کی فوج ایک دروازے کو جلا کر شہر میں ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آ پہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگا لیکن راستہ میں سودھرا (متصل وزیر آباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے جن میں حسین بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبدالرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے کامران کی بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں نصب کروائیں اور ان سات سو قیدیوں کو یکدم پھانسی دے دی۔ خسرو کو پابہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا اور جس راستے اس کے سات سو ساتھی سخت اذیتوں سے مارے جا رہے تھے اسی راستے سے اسے قلعے میں بھجوایا گیا تا کہ وہ اپنے باغی ساتھیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس نے حسین بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبدالرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرا دیا اور یہ دونوں دم گھٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک قید رہا اور آخر ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی میں مر گیا۔ لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔ [1]

جہانگیر نے برصغیر پر کم و بیش بائیس سال (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷/۱۶۲۷ء) حکومت کی۔ اس مدت میں لاہور کی ترقی کا گراف مزید بلند ہوا اور اس کا شمار برصغیر کے اوّلین شہروں میں ہونے لگا۔ ثقافت، معیشت اور تجارت میں اس کا برصغیر کے شہروں میں کوئی ثانی نہ تھا۔ سید محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

---

[1] لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور) محمد الدین فوق، ص ۱۱۔

"بعہد جہانگیر ۱۶۲۶ء میں دو انگریز رچرڈ سٹل Richard Still اور جان کروڈر John Crowther تجارت کے ارادے سے لاہور آئے، ان کا بیان ہے کہ لاہور ہندوستان کے بہترین شہروں میں سے ایک ہے۔ ہر چیز یہاں بہ افراط میسر ہے۔ حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار شہر اور ایسا آباد قطعہ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے لیے سوداگر جہازوں میں اپنا مال لادتے ہیں اور دریا کے کنارے پر ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال واسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں۔" [1]

مرزا محمد عرف معتمد خان بخشی جہانگیر کے دربار کے ایک اہم اور باحیثیت رُکن تھے۔ "اقبال نامہ جہانگیری" ان کی جہانگیر کے عہد کی اہم تصنیف ہے جسے چشم دید شاہد کی شہادت قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ جہانگیر کے لاہور میں ورود سے متعلق لکھتے ہیں:

"بروز دوشنبہ ۹ ماہ آزر مطابق ۵ محرم الحرام ۱۰۳۰ھ ساعت مسعود میں دارالسلطنت لاہور کے دولت خانہ کو رونق بخشی جس میں معمور خان میر عمارات نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ دولت خانے پر نئی شان اور عجیب چہل پہل نظر آتی تھی' دلکشا عمارتیں' روح پرور مناظر' نہایت لطیف و پاکیزہ' سب منقش و تصویر دار' ہوشیار کاری گروں کے تیار کیے ہوئے سرسبز وشاداب باغ جس میں انواع واقسام کے پھل پھول نظریں لبھا رہے تھے۔ اپنی اپنی جگہ نگاہیں جذب کیے لیتے تھے۔"

[2] زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" [3]

---

[1] تاریخ لاہور' سید محمد لطیف' مطبوعہ لاہور ۷۵-۱۹۵۶ء ص ۸۹ سے ترجمہ۔

[2] سید محمد لطیف نے "تاریخ لاہور" کے صفحہ ۳۸ پر اور ڈاکٹر محمد باقر نے "لاہور: ماضی اور حال" مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ص ۱۴۰ پر اس شعر کو بالفاظ جہانگیر لکھا ہے جبکہ یہ شعر نظیری کا ہے۔
(ادب نامہ "ایران" مرزا مقبول بیگ بدخشانی' مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور س ن' ص ۲۰۷)

[3] اقبال نامہ جہانگیری' مرزا محمد عرف معتمد خان بخشی ترجمہ محمد زکریا مائل' مطبوعہ نفیس اکیڈمی۔ کراچی' ص ۱۵۹

جہانگیر نے قلعۂ لاہور میں بہت سی عمارات کا اضافہ کیا اور اس کے امراء و وزراء نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں اور ان کے گرد وسیع و عریض باغات لگوائے۔ جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال اُنس تھا اور اسی بنا پر ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دارالسلطنت ہی بنالیا اور لاہور میں دفن کیے جانے کی وصیت کی۔ چنانچہ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفر کشمیر کے دوران میں راجوری کے قریب وفات پائی تو وصیت کے بموجب اس کی میت لاہور لائی گئی اور دریائے راوی کے دائیں طرف نور جہاں کے تعمیر کردہ باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ جس پر بعد ازاں شاہجہاں نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا جو آج بھی سالہا سال گزر جانے اور سکھوں کے زمانے کی دستبرد کے بعد بھی برصغیر پاک و ہند کی لاجواب عمارات میں شمار ہوتا ہے۔

نور جہاں' جہانگیر سے بڑھ کر لاہور کی دلدادہ تھی۔ بلکہ جہانگیر کے مرنے کے بعد اپنے آخری وقت (۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء) تک اس نے لاہور سے قدم باہر نکالنا گوارا نہ کیا اور مر کر بھی لاہور میں ہی دفن ہوئی۔ اس کا مقبرہ سکھ گردی کے باوجود آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اس کا ذیل کا شعر اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے جو مرتے دم تک اسے لاہور کے ساتھ تھی:

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم جنت دیگر خریدہ ایم [1]

جہانگیر کے انتقال کے بعد آصف جاہ کی تگ و دو سے بالآخر شاہجہان ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ شاہجہان کا زمانہ سلطنت مغلیہ کا "سنہری زمانہ" کہلاتا ہے۔ یہ تیس سالہ دور ثقافت' زراعت' تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں جنگ و جدل کی مہمات بہت کم وقوع پذیر ہوئیں جبکہ رعایا کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا گیا۔

شاہجہان کو لاہور کے ساتھ اپنی جائے ولادت ہونے کی نسبت سے خاص اُنس تھا۔ تخت نشینی کے بعد پانچ سال تک وہ غیر معمولی مصروفیات کی بنا پر پنجاب جیسے اہم صوبے میں نہ آسکا۔ کیونکہ لاہور کی جانب سے وہ اس لیے بھی مطمئن تھا کہ یہاں اس کا مربی و محسن اور خسر آصف جاہ موجود تھا۔ چنانچہ

---

[1] لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور)' محمد الدین فوق' ص ۳۸۔

فراغت میسر آتے ہی اس نے لاہور کا رُخ کیا۔ یہاں کے انتظام و انصرام کو ملاحظہ کیا اور ان کو بہتر بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ لاہور میں بابر، اکبر اور جہانگیر کے عہد کی قدیم عمارات موجود تھیں جو بد قطع اور بدنما ہو چکی تھیں' ان کو گرا کر جدید' مستحکم اور نفیس عمارات بنانے کی ہدایت کی۔ جن کی نگرانی پر حکیم علیم الدین انصاری معروف بہ نواب وزیر خان (بانی مسجد وزیر خان) کو مامور کیا۔ چنانچہ شاہی قلعہ میں دیوان عام' دیوان خاص' مثمن برج اور شیش محل کے علاوہ خواب گاہیں اور حمام آج بھی کسی نہ کسی حالت میں اپنے عظیم عہد پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔ مغل بادشاہوں میں شاہجہان کو اس لیے بھی منفرد مقام حاصل ہے کہ اسے عظیم الشان باغات اور عمارات تعمیر کرنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے تاریخ میں وہ ''انجینیئر بادشاہ'' کی حیثیت سے شہرت عام اور بقائے دوام کا حقدار قرار پایا۔ اسی کی خواہش سے لاہور میں شاہ نہر کی تکمیل پر نواب علی مردان خان کے اہتمام سے شالا مار باغ تیار ہوا اور اسی کے حکم پر جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ آصف جاہ کی وفات پر شاہجہان نے اس کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا تھا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔ غرض شاہجہان کے عہد میں لاہور نے سلطنت کے اہم ترین صوبے کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے ہر شعبہ میں خوب ترقی کی۔ اسی عہد میں کئی یورپین سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان آئے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری لاہور پہنچا۔ جس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے:

> (ترجمہ) ''آگرہ سے روانہ ہوئے اکیسواں دن تھا کہ پو پھٹتے ہی ہمیں مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا۔ جس میں آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں۔ شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ پیدل چل رہے تھے' کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ غرض کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس لیے ہم واپس آگئے ...... شہر کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے جہاں نانبائی اور مختلف دکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر ہم نے بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ' بکری' گائے وغیرہ کے

گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہے۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں [1] ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے جو میدہ سے بنائی جاتی ہے اور ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا کھانا دو وقتوں میں پانچ آنہ [2] تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی کثرت، ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور سلیقہ مندی سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے بلکہ در و دیوار سے مترشح تھا اور سوداگر نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔ لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے اور وہاں سے دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجے کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغات، محلات اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بڑے بازار کا نام "بازار دلکشا" ہے۔ اس میں اس قدر دولت ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے"۔ [3]

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور نے کی وہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے بھی زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دور دور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے اور باغات، محلات اور پُرشکوہ عمارات نے لاہور کو خیاباں خیاباں ارم بنا رکھا تھا۔ ولی عہد سلطنت دارا شکوہ کے دم سے بھی لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح وہ اسلامی تصوف کا دلدادہ تھا اسی ذوق و شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی مجلس میں ایک طرف مسلمان علماء بیٹھتے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ وہ اکبر کی طرح مسلمان علماء اور ہندو

---

[1] مراد تنور ہے۔

[2] موجودہ اکتیس پیسے۔

[3] تاریخ لاہور، سید محمد لطیف، ص ۹۰، ۹۱۔

پنڈتوں کے مباحثے کراتا اور سنسکرت کتابوں کے فارسی میں تراجم کراتا۔ داراشکوہ اور سکھ پیشوا گورو گوبند میں بہت موانست تھی۔ جب گوروجی امرتسر سے لاہور آتے تو مہینوں داراشکوہ کے مہمان رہتے اور مسائل تصوف کے ذکراذکار سے صحبت گرم رہتی۔

شاہجہان کے بعد اورنگ زیب کا دور حکومت ہے جو نصف صدی پر محیط ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے اس طویل دور حکومت میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور آیا اور اس کے عرصہ حکومت کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گزر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔ تاہم عالمگیر کی یادگار بادشاہی مسجد آج بھی لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ عالمگیر کے عہد میں اگرچہ خطہ لاہور کو تاریخ ہندوستان میں نمایاں مقام حاصل نہیں رہا پھر بھی یہاں کے حالات کم و بیش پُرسکون رہے اور عوام فارغ البال اور خوشحال۔ ایک مشہور فرانسیسی جوہری ٹیونیئر [1] نے ۱۶۴۸ء اور ۱۶۶۸ء کے درمیان اصفہان سے لے کر قندھار، کابل اور لاہور، آگرہ اور دلی تک پاپیادہ سفر کیا۔ وہ عالمگیر کے عہد حکومت کے اختتام پر لاہور آیا جس کے متعلق، وہ اپنے سفرنامہ "ٹریولز" میں لکھتا ہے:

(ترجمہ) "لاہور سلطنت کا دارالحکومت ہے جو پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک کے کنارے واقع ہے۔ دریا پہلے شہر کے متصل بہتا تھا۔ مگر اب پون میل کے فاصلے پر چلا گیا ہے اور اپنی طغیانی سے گردونواح کے علاقوں کو بہت نقصان پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے۔ اس کی لمبائی ایک کوس سے زیادہ ہے، اس کی عالیشان عمارتیں جو آگرہ اور دہلی کی عمارتوں سے بھی زیادہ بلند ہیں عدم توجہی کی وجہ سے گرتی جاتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں بہت سے مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ قلعہ، جس میں تخت گاہ شاہی ہے بہت اچھی حالت میں ہے اور چونکہ دریا اب اس سے بہت فاصلے پر ہے اس لیے وہ بالکل محفوظ ہے"۔ [2]

---

[1] پورا نام John Baptista Tavenier تھا۔

[2] تاریخ لاہور، سید محمد لطیف، ص ۹۱۔

ڈاکٹر برنیئر جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ۱۶۶۴ء میں لاہور سے ہو کر گزرا تھا، لاہور کے متعلق رقم طراز ہے:

(ترجمہ) "یہ ایک نفیس شہر ہے۔ اس کے بازار اور منڈیاں بہت بارونق ہیں۔ مکانات اپنی پختگی، خوبصورتی، بلندی اور شان وشوکت کے لحاظ سے آگرہ اور دہلی کی شاہی عمارات سے کم نہیں"۔ ❶

ہم یہ کہنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی تاریخ لاہور کا وہ درخشاں باب ختم ہو گیا جس کی ابتدا سلطان محمود غزنوی نے کی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال ۱۷۰۷ء سے لے کر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ڈیڑھ سو برس کا زمانہ ہے۔ اس طویل عرصے میں لاہور کو بلحاظ مجموعی وہ حیثیت کبھی حاصل نہ رہی جو ماضی میں اس کے نام کے ساتھ مخصوص تھی۔ اس دوران میں جب تک لاہور مرکز (دہلی) کے زیر اثر رہا، یہاں کا گورنر کلی طور پر نہ سہی لیکن کسی نہ کسی حد تک خود مختاری رہا اور سکھوں کے عہد میں تو مرکز کا اثر بالکل ہی نہ رہا بلکہ سکھ حکمران اپنی ذات میں سیاہ سفید کے مالک بنے رہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ نے بمشکل جنگ اقتدار سے فراغت حاصل کی تھی کہ اسے معلوم ہوا کہ سکھ پیشوا کے پیروکار بندہ بیراگی نے سرزمین پنجاب میں قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے اور سرہند، سہارنپور، جالندھر اور لاہور کے نواح میں تباہی مچادی ہے۔ چنانچہ شاہ عالم بہادر شاہ سکھوں کی تباہ کاریوں کا حال سن کر دارالحکومت جانے کے بجائے سیدھے لاہور آئے۔ انھوں نے حکماً لاہور میں سکھوں کے داخلے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس کے باوجود سکھ وقتاً فوقتاً رات کے وقت راوی کو عبور کر کے آتے رہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں سکھوں کی بیخ کنی کے لیے بادشاہ نے مغلیہ افواج کے دستے مقرر کیے اور امین خان کو ان دستوں کا کمانڈر مقرر کیا۔ اس تمام عرصے کے دوران میں بادشاہ نے لاہور میں ہی قیام کیا۔ حتیٰ کہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں لاہور میں ہی وفات پائی۔ شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد چاروں شہزادے رفیع الشان، جہاندار شاہ، جہان شاہ اور عظیم الشان

---

❶ تاریخ لاہور، سید محمد لطیف، ص ۹۱۔

لاہور پہنچ گئے۔ اگرچہ چاروں شہزادے پہلے تو اس بات پر رضامند تھے کہ آپس میں جنگ نہ کریں اور باہم تصفیہ سے مملکت کو تقسیم کر لیں۔ لیکن مسلسل بدگمانیوں کی وجہ سے جب گفت وشنید لاحاصل رہی تو ان میں باہم جنگ ہوئی جو دریائے راوی اور شاہی قلعہ کی فصیل کے مابین لڑی گئی۔ اس جنگ میں شہزادہ عظیم الشان ایک فریق تھا اور دوسرا فریق باقی تینوں شہزادے تھے۔ حصول اقتدار کی اس جنگ میں لاہور کے مضافات میں آباد مکینوں پر قیامت ٹوٹ پڑی جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس سے اہل لاہور میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بالآخر اس جنگ میں شہزادہ عظیم الشان کو ہزیمت اٹھانا پڑی اور وہ مارا گیا۔ (بعض مورخین کے نزدیک میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے دریائے راوی کی تند وتیز لہروں کا شکار ہو گیا۔) نتیجتاً جہاندار شاہ برسر اقتدار آیا۔ جس کے کچھ ہی دنوں بعد آپس کی بدگمانیوں میں مزید اضافہ ہوا اور بقیہ تینوں شہزادے آپس میں پھر لڑ پڑے۔ جس میں جہان شاہ اور رفیع الدرجات قتل ہوئے۔ اب جہاندار شاہ کے مقابلے میں تخت تیموری کا اور کوئی دعویدار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بادشاہت کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے قلعہ لاہور میں اپنا جشن تاجپوشی منعقد کیا۔ لاہور میں موجود تمام امراء نے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور نذرانے پیش کیے۔ اس کے نام کا خطبہ مساجد میں پڑھا گیا اور ملک میں سکہ رائج ہوا۔ بعدازاں جہاندار شاہ لاہور سے دہلی چلا گیا۔

جہاندار شاہ کا عرصہ حکومت کم وبیش دس ماہ بنتا ہے۔ اس عرصہ میں ملک بھر میں فسق وفجور پھیلا اور عوام نے بے یقینی کی کیفیت میں زندگی بسر کی تا آنکہ بنگال سے مقتول شہزادے عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے اپنے باپ اور بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اس پر فوج کشی کی۔ آگرے کے قریب جنگ (یکم جنوری ۱۷۱۳ء) میں جہاندار شاہ کو شکست ہوئی اور وہ اپنے انجام کو پہنچا اور فرخ سیر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں سکھوں نے پنجاب میں مسلسل تباہی مچائے رکھی تھی۔ چنانچہ فرخ سیر نے ۱۷۱۴ء میں کشمیر کے صوبیدار عبدالصمد خاں کو پنجاب میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی غارت گرانہ سرگرمیوں کے سدباب کے لیے پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ عبدالصمد خان کشمیر سے اپنے لشکر سمیت لاہور کی جانب آ رہا تھا کہ گورداسپور کے قریب سکھوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ عبدالصمد خاں نے اگرچہ

بھاری نقصان اُٹھایا تاہم عزم واستقلال کے ساتھ پیش قدمی کی اور سکھوں کو محاصرے میں لے لیا۔ یہ محاصرہ چھے ماہ تک جاری رہا۔ آخر فریقین میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ ہزاروں سکھ کھیت رہے اور تقریباً ایک ہزار سکھوں کے ساتھ سکھ سردار بندہ بیراگی کو گرفتار کرلیا گیا۔ جسے لاہور لایا گیا اور بعدازاں فرخ سیر کے پاس دارالحکومت دہلی کو روانہ کردیا گیا۔ جہاں تمام سکھ قیدیوں کے ساتھ اسے بھی قتل کردیا گیا۔

عبدالصمد خان نے (۱۱۲۵ھ/ ۱۳ ۱۷ء تا ۱۱۵۰ھ/ ۳۷ ۱۷ء) کم وبیش پچیس سال پنجاب پر حکومت کی۔ اس عرصے میں پنجاب میں کامل امن وسکون رہا۔ اس نے سکھوں کی سرکوبی پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اس کے اقدامات کی وجہ سے پنجاب سکھوں سے پاک ہوگیا یہاں تک کہ سکھ ماجھے [1] کے علاقے میں بھی نظر نہیں آتے تھے جو ان کا خاص گڑھ تھا۔ عبدالصمد خان برائے نام تاج دہلی کے ماتحت تھا۔ اس زمانے میں دربار دہلی کی حالت بڑی دگرگوں تھی اور تاج دہلی کی عظمت فقط برائے نام رہ گئی تھی۔ اس پر ۱۱۵۱ھ/ ۳۸ ۱۷ء میں نادرشاہ نے حملہ کرکے مغل دربار کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملادی۔ یہ واقعہ نواب زکریا خان کے دور کے آغاز میں پیش آیا جو عبدالصمد خان کا بیٹا تھا اور اپنے والد کی وفات پر پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ نواب زکریا خان اپنے باپ کی مانند ایک قابل سیاست دان اور باعزم سپہ سالار تھا۔ بہرکیف اس نے محض اپنی لیاقت اور دوراندیشی کے بل بوتے پر نادرشاہی قہر سے کسی نہ کسی حد تک لاہور کو بچائے رکھا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب پنجاب کے عوام پر بیک وقت دو مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک تو افغان، جن کے پے درپے حملوں نے مغربی پنجاب کی معیشت اور ترقی کو نہ صرف تباہ کرکے رکھ دیا تھا بلکہ یہاں زبردست بدامنی اور بے چینی پھیل گئی تھی۔ دوسرے سکھ، جنھوں نے عبدالصمد خان کی سرکوبی کے بعد از سرنو اپنی خون آشام سرگرمیاں شروع کردی تھیں۔ سکھ جو پہلے چھپتے چھپاتے اور بھیس بدل کر امرتسر میں آیا کرتے تھے اب کھلے بندوں ہر طرف دندناتے پھرنے لگے تھے اور آئے دن ان کی جمعیت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ انھیں دنوں لاہور کا گورنر نواب زکریا خان فوت ہوگیا تو سکھوں نے اپنی چیرہ دستیاں مزید تیز کردیں۔

---

[1] دریائے راوی اور دریائے ستلج کا درمیانی علاقہ۔

زکریا خان کے بعد اس کا بیٹا یحیٰی خان لاہور کا حاکم ہوا۔ یحیٰی خان کے دیوان لکھپت رائے نے سکھوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ سکھ جموں کی طرف فرار ہو گئے لیکن اس نے تعاقب کر کے ہزاروں سکھوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور ایک ہزار سکھوں کو گرفتار کر کے لاہور لایا۔ جہاں ان کو ذلیل ورسوا کرنے کے بعد گھوڑا نخاس (بازار اسپاں) میں قتل کیا گیا اور ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں اس جگہ کا نام سکھوں نے ان مقتولین کی یاد میں "شہید گنج" ❶ یعنی سکھ شہیدوں کا مدفن قرار دیا جو آج تک مشہور ہے۔

نواب یحیٰی خان کے چھوٹے بھائی شاہنواز خان' حاکم ملتان نے لاہور کی سلطنت بھی ہتھیانے کے لیے لاہور پر حملہ کر دیا اور فتح یاب ہو کر لاہور کی حاکیت سنبھالنے کے بعد احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا اور ہندوستان پر حملے کی دعوت دی اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ چنانچہ ابدالی بارہ ہزار گھڑ سوار دستے کے ساتھ ۱۱۶۱ھ/ ۴۸ ۱۷ء میں لاہور آ پہنچا۔ شاہنواز خان منحرف ہو کر ابدالی کے خلاف صف آرا ہوا لیکن شکست کھائی۔ ابدالی کے سپاہیوں نے لاہور کی نزدیکی بستی مغل پورہ کو خوب لوٹا اور ہزاروں کی تعداد میں عوام کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لاہور کو فتح کرنے کے بعد ابدالی نے سرہند پر قبضہ کیا اور دہلی کی طرف بڑھا۔ منارہ کے مقام پر اس کی مڈبھیڑ مغلیہ افواج سے ہوئی جس میں نواب قمر الدین خان وزیر اعظم کے بیٹے میر منو اور صفدر جنگ نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ ابدالی کو میدان سے بھاگتے ہی بنی اور اس نے کابل پہنچ کر دم لیا۔ اس سال قضائے الٰہی سے مغل فرمانروا محمد شاہ انتقال کر گیا۔ جس کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ جس نے میر منو کو معین الملک کا خطاب دے کر پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔ جو اپنے انتقال ۱۱۶۶ھ/۵۲ ۱۷ء تک پنجاب کا حکمران رہا۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف پنجاب کے انتظام کو مستحکم کیا بلکہ سکھوں کی بھی سرکوبی کی۔ شاید وہ اپنی فہم وفراست سے حالات پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیتا کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر دوسرا حملہ کر دیا۔ میر منو نے ابدالی سے جنگ کے بجائے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ جسے مرکز میں بنظر تحسین نہ دیکھا گیا اور مرکز نے ابدالی کی واپسی کے بعد میر منو کی سرزنش کے لیے فوج بھیجی جسے شکست ہوئی۔ اس طرح میر منو عملاً مرکز سے علیحدہ ہو گیا

---

❶ تاریخ لاہور' سید محمد لطیف' ص ۷۳۔

لیکن ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ابدالی نے میر منو سے ناراض ہو کر پنجاب پر ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء کے اوائل میں تیسرا حملہ کر دیا۔ چھے ماہ تک فریقین میں جنگ جاری رہی جو بالآخر صلح نامے پر ختم ہوئی لیکن اس عرصے میں سکھوں نے پھر سے تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع کر کے عوام کا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ سکھوں کے خلاف ایک مہم میں میر منو کا حادثاتی طور پر انتقال ہو گیا۔

میر منو کی وفات پر اس کے کمسن بیٹے امین الدین خان کو اس کی والدہ مراد بیگم (مغلانی بیگم) کی سرپرستی میں لاہور کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔ مراد بیگم بہت سمجھدار خاتون تھی لیکن حالات پر قابو نہ پا سکی اور پنجاب مغل بادشاہ اور افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کی سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ابدالی نے چوتھی بار پنجاب کا رُخ کیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ادینہ بیگ جو مراد بیگم کی جگہ زبردستی لاہور کا حکمران بن بیٹھا تھا' فرار ہو گیا۔ ابدالی نے اپنے فرزند تیمور شاہ کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا اور افغان فوج کا ایک دستہ یہاں تعینات کیا۔ ادینہ بیگ نے سکھوں کے ساتھ ساز باز کر لی اور ابدالی کے واپس ہوتے ہی سکھوں کی اعانت سے لاہور پر چڑھ دوڑا۔ افغانوں کو بھاگتے ہی بنی اور لاہور پر ۱۷۵۶ء میں پہلی بار سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے ادینہ بیگ کو بھی لاہور سے نکال دیا اور جسا سنگھ کی سرکردگی میں یہاں پر اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ ادینہ بیگ نے مرہٹوں کی مدد سے ۱۷۵۸ء میں لاہور پر حملہ کیا۔ مرہٹے زبردست کشت و خون کے بعد غالب رہے اور اس طرح ادینہ بیگ مرہٹوں کی مدد سے ایک بار پھر لاہور کا حاکم بن گیا۔ اس نے لاہور کے بجائے بٹالہ کو پنجاب کا صدر مقام بنایا لیکن اسے پنجاب کا انتظام سنبھالے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ سکھوں نے اس پر زبردست یورش کی۔ جس میں اگرچہ سکھوں کو بہت زیادہ جانی نقصان اُٹھانا پڑا لیکن انھوں نے ادینہ بیگ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب پنجاب میں عملاً مرہٹوں کا راج تھا لیکن سکھ ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے۔ مرہٹے پنجاب میں سکھوں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے میں قطعی طور پر ناکام ہو چکے تھے لیکن دہلی میں وہ سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے جس پر ابدالی نے پانچویں بار ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے تاریخی میدان میں ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو جنگ ہوئی جس میں ابدالی نے عظیم الشان فتح پائی اور مرہٹے برصغیر کے سیاسی صفحے سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئے۔ اس جنگ کے بعد ابدالی بوجوہ زیادہ دیر تک ہندوستان میں قیام نہ کر سکا اور واپس افغانستان چلا گیا لیکن اس جنگ کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کی سیاست

کا میدان محض سکھوں اور انگریزوں کے لیے خالی ہوگیا۔ انگریز برصغیر پر کس طرح غالب آئے' یہ تاریخ کا ایک علیحدہ باب ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں البتہ پنجاب میں سکھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ جس پر ابدالی نومبر ۱۷۶۲ء میں چھٹی بار پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ جس کے نتیجے میں ابدالی اور سکھوں کے درمیان ستلج کے کنارے جنگ ہوئی جس میں پچیس یا تیس ہزار [1] سکھ کھیت رہے۔ جس جگہ یہ جنگ ہوئی اسے بعد میں سکھوں نے غالوگڑھ [2] کا نام دیا۔ جس کے معنی ہیں عظیم مقتل۔ غالوگڑھ کی جنگ کے بعد وقتی طور پر سکھوں کی جمعیت پریشان ہونے سے بغاوت کے شعلے سرد پڑ گئے لیکن ابدالی کے واپس جاتے ہی سکھوں نے پھر سے پنجاب کے امن کو تہ و بالا کر دیا اور اپنی وحشت و بربریت اور قتل و غارت سے اس قدر خوف و ہراس پھیلا دیا کہ پنجابی عوام بالخصوص مسلمان ایک عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اس پر جنوری ۱۷۶۴ء میں ابدالی نے پنجاب پر ساتواں حملہ کیا۔ ابدالی کے حملہ آور ہونے کی خبر سنتے ہی سکھ حسب سابق اپنی کمین گاہوں میں روپوش ہو گئے۔ ابدالی دو ماہ تک پنجاب میں رہا۔ لیکن سکھ اس کے ہتھے نہ چڑھے بالآخر ابدالی کو افغانستان کے اندرونی حالات کی وجہ سے واپس جانا پڑا۔ اس پر سکھ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر از سر نو پنجاب پر چھا گئے اور لاہور پر بھی دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یہاں کے باشندوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے اور بھنگی مثل کے تین سرداروں صوبہ سنگھ' گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ نے لاہور کو باہم تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ اسی طرح باقی پنجاب کے بھی سکھ سرداروں نے حصے بخرے کر لیے جہاں پر انھوں نے اپنی چھوٹی بڑی حکومتیں قائم کر لیں۔ جن میں باہمی یگانگت بالکل مفقود تھی۔ اس طرح پورے پنجاب میں وحشت و بربریت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ان کے مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی اس حالت زار کی وجہ سے ابدالی نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے پنجاب پر ۱۷۶۷ء میں آٹھواں اور آخری حملہ کیا لیکن یہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابدالی نے سکھوں کے ساتھ مزید سختی کے بجائے مصالحانہ رویے کو ترجیح دی۔ سردار امر سنگھ کو پٹیالے کا حاکم مقرر کیا۔ سردار لہنا سنگھ کو لاہور اور قرب و جوار کا علاقہ مرحمت فرمایا اور واپس کابل کی راہ لی جہاں اس عظیم جرنیل نے جون ۱۷۷۳ء میں انتقال کیا۔

---

[1] تاریخ لاہور' سید محمد لطیف' ص ۸۷ سے ترجمہ۔

[2] ایضاً۔

۱۷۶۷ء سے لے کر ۱۷۹۷ء تک یعنی تیس سال تک پنجاب پر بھنگی مثل کے سرداروں کا تصرف رہا جبکہ ۱۷۹۷ء اور ۱۷۹۸ء میں تیمور شاہ کے بیٹے اور احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے پنجاب پر دوبارہ حملہ کیا۔ شاہ زمان شیر میسور ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف مدد کرنے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ لیکن اپنے ملک کے ناموافق حالات کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔ اس کے واپس جاتے ہی بھنگی سرداروں نے لاہور کے عوام پر مظالم ڈھانے شروع کیے۔ حالات اس قدر دگرگوں ہوئے کہ اکثر لوگ پنجاب چھوڑ کر نسبتاً پُر امن علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے تو لاہور کے مظلوم عوام نے علاقہ گوجرانوالہ کے حکمران رنجیت سنگھ کو ایک محضر نامہ روانہ کیا اور اسے لاہور پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ کیونکہ بہ نسبت دیگر سرداروں کے اس وقت رنجیت سنگھ کی شہرت بہتر تھی' چنانچہ سردار رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ایک قلیل عرصہ میں اپنے مخالفین کو ختم کرنے کے بعد اپنی حیثیت کو مستحکم کر لیا اور اپریل ۱۸۰۱ء میں اپنے لیے مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چالیس سال تک لاہور کو اپنا دارالحکومت بنا کر پنجاب پر حکومت کی۔ اس نے انتشار اور بدامنی کے ایک طویل دور کے بعد لاہور اور دیگر علاقوں کے انتظام و انصرام کو بہتر کیا۔ جس سے لاہور میں ایک بار پھر قدرے امن و سکون کے دور کا آغاز ہوا۔ شہر کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ شہر میں ان گنت نئے مکانات' حویلیاں' مندر گوردوارے اور سمادھیاں تعمیر ہوئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چونکہ شاہی قلعے کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا تھا اس لیے اس نے اپنے ذوق کے مطابق قلعے کی تعمیرات میں بھی ردوبدل کیا۔ رنجیت سنگھ کے دور میں اگرچہ رعایا کے تمام طبقات امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے مگر دربار میں سب سے زیادہ وقار سکھوں کا تھا اور عموماً سکھوں ہی کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا اور فوج کے بڑے بڑے سکھ افسران کو بیش بہا جاگیروں سے نوازا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہندوؤں کا درجہ تھا جو عام طور پر محکمہ مالیات اور دوسرے دفاتر میں ملازم تھے۔ دفتری زبان فارسی تھی جو تمام طبقوں کے لوگ مسلمان علماء سے مساجد اور مدارس میں پڑھتے تھے۔ معاشرے میں بلا امتیاز مذہب وملت اساتذہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلمان عام طور پر معمولی شاگرد پیشہ یا نجی ملازم تھے اور معاشرتی اعتبار سے اس قدر پس چکے تھے کہ باوجود احساس کے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اہم مساجد کے

ساتھ رنجیت سنگھ کا سلوک بے حد افسوسناک تھا۔ شاہی مسجد کے صحن میں اصطبل قائم تھا جہاں پر فوجی گھوڑے بندھتے تھے اور مسقف حصوں میں سائیس رہتے تھے یا فوجی نوعیت کے گودام تھے۔ پنجاب کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی اور معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ پنجاب میں' جہاں سود کا نام ونشان تک نہ تھا' سودی کاروبار شروع ہو گیا تھا۔ کاشت کار طبقے نے مجبوری کی حالت میں ہندو بنیوں سے قرض حاصل کر کے اپنی مالی حالت کو سہارا دینا چاہا لیکن وہ ایک مصیبت سے نکلنے کی کوشش میں دوسری مصیبت میں گرفتار ہو گئے جو پہلی سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی مستقل طور پر بنیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔ سودی کاروبار کے عام ہونے کی وجہ سے پنجاب کی اقتصادی حالت مکمل طور پر مہاجنوں کے ہاتھ آ گئی اور اس طرح مسلمانوں کی معاشی پسماندگی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

بہر کیف مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور حکومت اس دور انتشار سے بدرجہا بہتر تھا جو پوری اٹھارویں صدی پر محیط ہے۔ خصوصاً اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں مغلوں کی خانہ جنگی' ابدالی کی یورش' مرہٹوں کی یلغار اور سکھوں کی غارت گری کی وجہ سے پنجاب کی سیاسی اور اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ جب رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں عوام کی یہ کیفیت تھی جس کا اجمالی سا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دور انتشار میں عوام کس طرح پس رہے ہوں گے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک وسیع وعریض سلطنت کا مطلق العنان حاکم تھا۔ اس کے زیر اقتدار بلاشبہ دریائے ستلج تک تمام پنجاب بشمول لداخ اور تبت' پشاور' ہزارہ' اور ڈیرہ جات کے علاقے تھے۔ گویا جمرود تا پھلور اسی کی سلطنت تھی جس میں کثرت آبادی مسلمانوں کی تھی جن کی پتلی حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ چنانچہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیٔ نے مسلمانوں کو آزادی دلانے کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو جہاد کی راہ پر اسلاف کی طرح پھر سے گامزن کرنا تھا۔ تاکہ مسلمانوں میں غلامی سے چھٹکارا پانے کے بعد معاشرتی اور مذہبی اصلاح کا سویا ہوا جذبہ پھر سے کارفرما ہو۔ چونکہ پنجاب اور شمال مغربی علاقوں میں مسلمانوں پر زیادہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے اس لیے سید احمد شہید نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ جن کی آواز پر حریت پسند مسلمانوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ مجاہدین کی فوج مشرقی پنجاب' بہاولپور اور شکارپور کے راستے

شمال مغربی سرحدی علاقے میں پہنچ گئی۔ سید صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ کوہ سلیمان، پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ کے علاقوں کے مسلمانوں کو منظم کیا جائے اور رنجیت سنگھ سے جنگ کی جائے اور پنجاب و کشمیر کو آزاد کرانے کے بعد سارے شمالی ہندوستان کو فتح کر کے یہاں شرعی نظام قائم کیا جائے۔ سید صاحب کے رفقاء میں جوش جہاد اور جذبہ شہادت اس قدر ولولہ انگیز تھا کہ مہاراجہ اور ان کے حلیف سکھ سردار بہت پریشان ہو گئے۔ ان کو اپنی سلطنت خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ مہاراجہ نے اپنی پوری قوت سے اس تحریک کا مقابلہ کیا۔ جس کے نتیجے میں اگرچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ تحریک بظاہر تو ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے اثرات بہت بعد تک باقی رہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری دور کے اہم سیاسی واقعات میں سے ایک مہاراجہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ولیم بینٹنگ (William Benting) کی ملاقات ہے۔ جس میں دونوں حکمرانوں نے باہمی دلچسپی کے تمام مسائل پر مذاکرات کیے اور آپس میں دوستی کا ایک معاہدہ بھی کیا۔ اس سے قبل مہاراجہ رنجیت سنگھ اور کمپنی کے درمیان ۱۸۰۹ء میں بھی ایک معاہدہ ہو چکا تھا جس کی رو سے دریائے ستلج کے شمالی علاقوں پر کمپنی نے مہاراجہ کا مکمل اختیار تسلیم کر لیا تھا اور مہاراجہ نے ستلج پار کے علاقوں میں فوجی کارروائی نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ دوسرا معاہدہ دراصل اسی معاہدے کی توثیق تھا۔ ان معاہدات پر رنجیت سنگھ نے اپنے آخری دم تک عمل کیا۔

۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بڑا لڑکا کھڑک سنگھ وارث تاج و تخت ہوا جسے مہاراجہ اپنی زندگی میں ہی جانشین نامزد کر چکا تھا۔ کھڑک سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے متضاد طبیعت کا حامل تھا۔ اس میں انتظامی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ بلکہ اسے کاروبار سلطنت سے ہی کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ ہر وقت شراب اور افیون کے نشے میں دُھت دنیا و مافیہا سے لاتعلق پڑا رہتا۔ اس نے محض ایک سال اور چار ماہ حکومت کی ہو گی کہ اس کا انتقال ہو گیا اور عین اسی دن ایک حادثے میں اس کا بیٹا نونہال سنگھ بھی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا جسے کھڑک سنگھ کا جانشین بننا تھا۔ چنانچہ باپ بیٹے کی وفات کے بعد کھڑک سنگھ کی بیوہ اور نونہال سنگھ کی والدہ رانی چند کور کوئی ساڑھے تین ماہ برسر اقتدار رہی جس کے بعد شیر سنگھ ۱۸ جنوری ۱۸۴۱ء کو مہاراجہ بنا۔ شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا اور ایک بہادر نوجوان تھا۔ مہاراجہ

رنجیت سنگھ کی زندگی ہی میں اس نے یورپین جرنیلوں سے خوب راہ ورسم پیدا کرلی تھی۔ سید احمد شہید کو شکست دینے والی فوجوں کا سالار بھی شیر سنگھ تھا اور اس کامیابی کے بعد تو اس کی دھاک خوب بیٹھ گئی تھی اور یوں وہ فوج اور سکھ عوام دونوں میں ہر دلعزیز تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سیاسی اور فوجی قوت تقریباً برابر تھی اور ملکی گاڑی کسی نہ کسی طور چل رہی تھی۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد سیاسی عنصر رفتہ رفتہ کمزور ہوتا چلا گیا اور فوج طاقت پکڑتی چلی گئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ چونکہ فوج کے بل بوتے پر برسراقتدار آیا تھا اس لیے اسی زعم میں فوج شتر بے مہار ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سرداروں کے احکامات کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور فوجیوں کو یہ بھی ہرگز پسند نہ تھا کہ کوئی ان کی من مانی کرنے میں سدراہ ہو خواہ وہ مہاراجہ ہی کی ذات کیوں نہ ہو۔ چنانچہ شیر سنگھ نے جب لاہور پر قبضہ کیا تو حکام کے منع کرنے کے باوجود سکھ فوج نے شہر کو خوب لوٹا اور غارت گری کی۔ ان تمام واقعات وحالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت کا سیاسی نظام تو پہلے ہی مفلوج ہوگیا تھا اب فوج کا اندرونی نظم وضبط بھی مفقود ہوگیا۔ بے آئینی کی وجہ سے خالصہ سلطنت جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا' زوال کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

شیر سنگھ کے عہد میں کچھ سکھ سردار تو اس کے کھلم کھلا دشمن تھے اور کچھ دل میں مخاصمت رکھتے تھے۔ سندھیانوالہ مثل کے سرداروں کو دربار میں بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل تھا لیکن یہ شیر سنگھ کے ساتھ مخلص نہ تھے، چنانچہ ان سرداروں میں سے ایک نے شیر سنگھ کو موقع ملتے ہی اس وقت قتل کردیا جبکہ وہ اپنی فوج کی قواعد ملاحظہ کر رہا تھا۔ یہ واقعہ ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو پیش آیا۔ باغی سرداروں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس کے کمسن لڑکے پرتاب سنگھ کو بھی گولی مار کر ہلاک کردیا اور یوں قلعے پر قابض ہوگئے۔ شیر سنگھ کے وزیر اعظم دھیان سنگھ کے لڑکے سردار ہیرا سنگھ کو اس شورش کا علم ہوا تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ آکر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اس نے چھوٹی توپیں شاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا کر قلعے کے اندر گولہ باری شروع کردی۔ باغیوں میں مقابلے کی سکت نہ تھی۔ اسی اثنا میں ان کے سرغنہ بھی مارے گئے۔ چنانچہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہیرا سنگھ نے قلعے پر قبضہ کرلیا اور ۱۸ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب

سے چھوٹے لڑکے دلیپ سنگھ کو تخت نشین کر دیا۔ اس وقت دلیپ سنگھ کی عمر فقط چھ سال کی تھی اور خود وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ ان حالات میں رفتہ رفتہ ہیرا سنگھ مملکت کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا جبکہ مہاراجہ کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی۔ ہیرا سنگھ نے کئی ایسے اقدامات کیے جن کی وجہ سے عوام اور دربار میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے اور ایک سال کے اندر ہی اندر نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام نے کھلم کھلا حکومت پر تنقید کرنا شروع کر دی۔ ہیرا سنگھ نے ہوا کا رُخ دیکھ کر دارالحکومت سے غائب ہو جانے میں عافیت سمجھی اور خزانے سمیت فرار ہونے کا منصوبہ بنایا لیکن ابھی وہ لاہور سے چند میل ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا اور وہیں قتل ہوا۔ ہیرا سنگھ کے بعد دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ دلیپ سنگھ چونکہ کم عمر تھا لہٰذا اس کے تمام اختیارات اس کی ماں رانی جنداں استعمال کرتی تھی۔ فوج اس قدر خودسر ہو گئی تھی کہ اس نے ناراض ہو کر جواہر سنگھ کو بھی قتل کر ڈالا۔ چنانچہ رانی جنداں نے اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے اور خودسر فوج کو سزا دینے کے لیے ۱۸۰۹ء کے معاہدہ امرتسر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ادھر در پردہ اپنی فوج کو اُکسایا کہ انگریز ان کے علاقے پر حملہ آور ہونے کے لیے سرحد پر فوج جمع کرنے کے بعد حملہ کیا ہی چاہتے ہیں۔ ان حالات میں سکھ فوج نے مصلحت اسی میں جانی کہ انگریزوں کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی بے خبری میں ان پر حملہ کر دینا چاہیے۔ اگرچہ سکھ فوج فرانسیسی جرنیلوں کی تربیت یافتہ اور بے حد طاقتور تھی اور انگریزی فوج کا بآسانی مقابلہ کر سکتی تھی لیکن نظم و ضبط کے فقدان کی وجہ سے انھوں نے ہر میدان میں انگریزوں سے شکست کھائی اور اس طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جانفشانی سے تیار کردہ فوج تباہ و برباد ہو گئی۔ اس طرح انگریزی فوج نے ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو آگے بڑھ کر بغیر کسی مزید مزاحمت کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۹ مارچ کو عہد نامہ لاہور ہوا جس کی رو سے انتظام سلطنت راجہ دلیپ سنگھ کے بالغ ہونے تک یک کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس کو انگریزوں کی نگرانی میں کام کرنا تھا۔ سکھ فوج اس معاہدے کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی، چنانچہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک بھرپور جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کو چیلیا نوالہ کی لڑائی ہوئی اور اس کے بعد ۲۱ فروری کو گجرات کی جنگ ہوئی جس میں انگریزی فوج نے سکھ فوج کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور لارڈ ڈلہوزی نے اعلان کر دیا کہ سکھ حکومت کا تمام علاقہ انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا گیا ہے۔

دراصل پنجاب کا الحاق انگریزوں کی طویل المیعاد حکمت عملی کا ردعمل تھا۔ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی انگریزوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اس ملک پر بتدریج قبضہ کیا جائے اور مقبوضہ علاقوں میں ایسی اصلاحات کی جائیں جس سے اس علاقے کے باشندوں کی ہمدردیاں انھیں حاصل ہو جائیں تاکہ ان کا قبضہ مستحکم ہو۔ چنانچہ پنجاب میں آتے ہی انھوں نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ خصوصاً دارالحکومت لاہور کے عوام الناس کو حالت سدھارنے پر خاص توجہ دی۔ عوام سکھا شاہی سے تنگ آئے ہوئے تھے انھوں نے ان حالات میں سکھ کا سانس لیا۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے پنجاب میں ایک ایسی حکمت عملی تیار کی جس سے زخم خوردہ سکھ بھی چند سالوں میں ہی دوبارہ ان کے حلیف بن گئے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے بھرپور طریقے سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آگیا تو پنجاب کے چیف کمشنر سر جان لارنس کو پنجاب کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ ان کے بعد سر رابرٹ منٹگمری اس عہدے پر فائز ہوئے۔

جن دنوں لاہور پر انگریزوں کا عمل دخل ہوا تو اس کی کثیر آبادی قدیم شہر تک محدود تھی جس کے بازار اور گلیاں بہت تنگ تھیں اور آبادی بے حد گنجان تھی۔ شہر کے چاروں طرف دوہری فصیل اور خندق تھی اور میلوں تک مغلیہ دور کے محلات، باغات اور حویلیوں کے بے شمار کھنڈرات تھے جن کی اینٹیں جدید تعمیرات میں استعمال ہوتی تھی۔ بقول رائے بہادر کنہیا لال ہندی مصنف تاریخ لاہور:

"............ ہر چند چالیس سال تک بیرونی آبادیوں کی بنیادیں سکھی عہد میں کھودی گئیں اور بیس برس تک انگریزی عہد میں کھدتی رہیں مگر اینٹیں ختم نہ ہوئیں آخر صاحبان انگریز نے بڑے بڑے مغاک بند کرا کر حکم دے دیا کہ کوئی شخص زمین سے

اینٹ نہ نکالے''۔ ❶

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں محلوں اور حویلیوں کی تعمیرات میں جو اینٹیں استعمال ہوئیں وہ انھیں کھنڈرات سے حاصل کی گئی تھیں۔ اینٹ اور پتھر کے لالچ میں بسا اوقات مضبوط اور مستحکم تاریخی اہمیت کی حامل عمارات کو بھی برباد کر دیا جاتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے امراء نے کھنڈرات صاف کر کے جا بجا باغات لگوا لیے تھے اور ایک بار پھر لاہور کے نواح میں اس قدر باغات ہو گئے تھے جن کی نظیر صرف جہانگیر اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ملتی ہے۔ ان باغات سے نہ صرف یہ کہ پھل حاصل ہوتا تھا بلکہ نواحِ شہر کی فضا بھی شاداب ہو گئی تھی۔ انگریزی دور کی ابتدا میں جو تعمیرات لاہور میں ہوئیں' ان میں بھی ان کھنڈرات کی اینٹیں ہی استعمال ہوئیں بعد ازاں جدید طرز کے پڑاوے قائم ہو گئے اور ڈبل اینٹیں بننے لگیں۔ ان باتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اصل عمارات کس قدر عظیم اور شاندار ہوں گی جن کے فقط کھنڈرات سے ساٹھ برس تک اینٹیں حاصل کر کے عمارات بنتی رہیں۔

یہاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا تذکرہ ضروری ہے جس نے پورے برصغیر کو دیکھتے ہی دیکھتے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جس کے برصغیر پاک و ہند کی علمی' ادبی اور تہذیبی تاریخ پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ یہ تحریک بلاشبہ ایک ملک گیر تحریک تھی جس میں ملک کے عوام نے بلا تخصیص مذہب و ملت حصہ لیا اور حریت پسندوں کی مالی' اخلاقی اور سیاسی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہ آگ ملک کے طول و عرض میں ایسی بھڑکی کہ اس کے شعلے لاہور تک پہنچے اور پھر یہاں بھی چاروں طرف آگ لگ گئی۔ عین ممکن تھا کہ یہ آگ انگریزوں کو جلا کر بھسم کر دیتی کہ انھوں نے اپنی کمال روایتی مکاری سے اس کو ٹھنڈا کر دیا۔ مصنف تاریخ پنجاب لکھتے ہیں:

''.......... بریگیڈیر کاربٹ نے جو کہ یہاں میاں میر چھاؤنی کا کمانڈر تھا' فیصلہ کیا کہ اگلی صبح پریڈ کے موقع پر دیسی سپاہیوں کو غیر مسلح کر دیا جائے گا۔ میاں میر چھاؤنی میں مقیم قریباً تین سو انگریز سپاہیوں کو اپنے اعتماد میں لے کر انھیں مسلح رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ اگلی صبح پریڈ کے موقع پر پردیسی سپاہیوں کو فوجی حکم کے تحت فوری طور پر ہاتھ اُٹھانے کے لیے کہا گیا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس طرح تین سو برطانوی سپاہیوں نے ترکیب بازی سے

❶ تاریخ لاہور' رائے بہادر کنہیا لال ہندی' مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۴ء' ص ۳۶۔

تقریباً ساڑھے تین ہزار دیسی سپاہیوں پر قابو پالیا۔ یہ سپاہی معمولی سپاہی نہیں تھے۔ ان میں وہ بہادر بھی شامل تھے، جنھوں نے سرنگاپٹم' میسور' فیروز پور اور گجرات کے معرکوں میں اپنی جرأت' شجاعت اور بہادری کا لوہا منوایا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خاص اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ اس لیے انھیں اس بات کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور بیرکوں میں بند کر دیے گئے۔

یہاں میاں میر چھاؤنی کے دیسی سپاہیوں کو غیر مسلح کر دینے والا واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ اسے انگریزوں کی تاریخ کا ایک اہم 'موڑ قرار دیا جاتا ہے۔ انگریز نے جو قدم میاں میر چھاؤنی میں اُٹھایا اس نے ان کی تاریخ بدل ڈالی.......... اگر ایسا نہ کیا جاتا تو چند گھنٹوں کے بعد یہی سپاہی انگریز کو لاہور میں غیر مسلح کر دیتے' کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر جنگ آزادی میں شریک ہونے والے تھے اور اس کے فوراً بعد ان کا پہلا قدم اسلحہ خانہ پر قبضہ کرنا تھا' لیکن حکومت نے اس سے قبل ہی فیصلہ کر کے تاریخ کو نئے رُخ پر ڈال دیا۔" [1]

جنگ آزادی کے دوران میں بے شمار جانی اور مالی نقصان ہوا۔ انگریزوں کے سات ہزار مقتولین کے بدلے میں کم و بیش پانچ لاکھ ہندوستانی ہلاک کیے گئے' جن میں کثیر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ دہلی پر تو ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک عرصہ تک لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ لیکن انگریزوں کو اس بات کا ضرور احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کے عوام کے جذبات کو مجروح کر کے ان پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ جنگ کے شعلے سرد پڑ جانے کے بعد عوام کے احساسات خصوصاً مذہبی جذبات کا خیال رکھا جانے لگا۔ جس سے مقامی باشندے بھی کسی قدر مطمئن ہو گئے۔

دہلی کی تباہی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو زبان و ادب کی نشوونما کا مرکز اب لاہور بن گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لاہور ایک نئے سماجی' سیاسی اور تہذیبی شعور کا بھی مرکز بن گیا۔ بہت سی مذہبی' سیاسی' سماجی اور ادبی تحریکیں اس خطے سے پیدا ہوئیں' جنھوں نے پورے برصغیر پر بڑے دوررس اثرات مرتسم کیے۔ مگر ہمارا بنیادی تعلق لاہور میں اُردو ادب کے نشوونما سے ہے لہٰذا ہم تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں سے متعلق اگلے ابواب میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

---

[1] تاریخ پنجاب' اقبال صلاح الدین' مطبوعہ عزیز پبلشرز لاہور ۱۹۷۷ء ص ۵۷۹

دوسرا باب

لاہور میں فارسی شاعری کی قدیم روایات

(الف) لاہور میں فارسی شاعری کا آغاز

لاہور کو یہ افتخار حاصل ہے کہ یہ شہر برصغیر پاک و ہند میں فارسی ادبیات کا مرکز اور گہوارہ رہا ہے۔ جس طرح آج کے زمانے میں لوگ حصول علوم وفنون کے لیے کشاں کشاں یورپ اور امریکہ کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اسی طرح کسی زمانے میں عرب وعجم سے ہندوستان میں خصوصاً لاہور چلے آتے تھے۔ پاک و ہند کے تمام شہروں میں سے یہ شرف بھی فقط لاہور ہی کو حاصل ہے کہ اس کو ''غزنین خورد'' اور ''اصفہان ثانی'' کہتے تھے۔ تمام مورخین اس بات پر بیک قلم متفق ہیں کہ جس قدر اس شہر نے فارسی زبان وادب کی خدمت کی، برصغیر کے کسی اور شہر نے نہیں کی۔

غزنوی عہد سے پہلے لاہور کی سیاسی اور عسکری حیثیت بہت کم تھی لیکن جب امیر ناصر الدین سبکتگین اور بعد ازاں سلطان محمود غزنوی نے پے در پے برصغیر پر لشکر کشی کی تو لاہور ایک تو دریا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اور دوسرے اگلی منزلوں پر جانے سے پہلے ستانے اور تر وتازہ ہونے کے لیے اچھی جگہ شمار ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اس خطے کی طرف خاص توجہ دی۔ پہلے پہل تو یہاں پر سلطان غزنی کی طرف سے نائب لسلطنت یا سالار متعین کیے جاتے تھے لیکن پھر اس علاقے کی اہمیت کے پیش نظر سلطان نے اسے براہ

راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اولین سالاروں میں ہمیں عبداللہ قراتگین' اریاق' احمد نیالتگین اور تلک حجام کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ لاہور کے غزنی حکمرانوں میں سے سب سے نامور شہزادہ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ہے جو ۴۶۶ھ/۳-۱۰۷۲ء میں لاہور آیا اور جس نے ہندوستان میں مزید فتوحات حاصل کر کے نہ صرف غزنوی سلطنت کو وسعت دی بلکہ مفتوحہ علاقوں کے استحکام کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اس کے عہد میں لاہور کو وہی عظمت حاصل تھی جو دارالحکومت غزنی کو۔ لاہور غزنی کے بعد وسیع و عریض سلطنت کا سب سے اہم شہر اور مرکز شمار ہوتا تھا۔ سیف الدولہ کی مدح میں ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے قصائد آج بھی اس کی شان و شوکت کے گواہ ہیں۔ جب سیاسی الزامات کی بنا پر سیف الدولہ کے بجائے اس کا بھائی علاؤ الدولہ مسعود لاہور آیا تو اس کے عہد میں بھی لاہور کی ترقی او رخوشحالی میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ علاؤ الدولہ مسعود کے بعد سلطان مسعود بن ابراہیم اور بالآخر سلطان ارسلان سے لے کر یمین الدولہ بہرام شاہ اور خانوادہ غزنویہ کے آخری حکمران تاج الدولہ خسرو ملک تک لاہور دوسرا غزنی شمار ہوتا تھا۔

اگر شمالی ہندوستان کے علاقوں میں سندھ اور پنجاب میں فارسی زبان و ادب کے کچھ اثرات مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی موجود تھے مگر غزنوی دور میں فارسی' پنجاب یعنی لاہور اور ملتان کے صوبوں میں ایک اہم تہذیبی زبان کے طور پر سامنے آئی اور اس نے اس نئے ماحول پر اثر ڈالا اور خود اثر قبول کیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ زبانیں زمان و مکان کی تبدیلیوں سے ہمیشہ متاثر ہوتی ہیں۔ جب فاتحین مفتوحہ علاقوں میں کوئی ایسی زبان لے کر آتے ہیں جو ان علاقوں میں نامانوس ہو تو مفتوحین کی زبان اثر قبول کرتی ہے اور فاتحین کی زبان خود بھی اثر پذیر ہوتی ہے اگرچہ اتنا نہیں جتنا مفتوحین کی زبان۔ یہ ایک ایسا فطری عمل ہے جسے نہ تو روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی تسلیم کرنے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

خانوادہ غزنویہ کے اکثر و بیشتر سلاطین علم و ادب کے مربی و محسن تھے۔ اس خانوادے کا سرخیل یمین الدولہ محمود علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ مصنف ''آب کوثر'' لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعراء کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا' ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانروا کو میسر نہیں ہوا۔ ان شعراء کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی

فتوحات کو چار چاند لگا دیے اور نہ صرف سیاسی تاریخ میں بلکہ فارسی ادب کے اوراق میں بھی محمود اور اس کے دربار کو جگہ مل گئی"۔ ❶

محمود جس طرح ایک بہت بڑا فاتح اور عظیم کشور کشا تھا اسی طرح علم پرور، علم دوست اور شعراء بہت بڑا قدر دان تھا۔ فارسی شاعری اگرچہ روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن یہ غزنوی دور میں انتہائے کمال کو پہنچ گئی۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "شعر العجم" میں رقم طراز ہیں کہ:

"شاعری پر اس نے حوصلہ شاہانہ سے توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا"۔ ❷

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ محمود کے خوان کرم سے چار سو شعراء بہرہ یاب تھے۔ اپنی اسی تصنیف میں علامہ موصوف ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

"محمودی شعراء اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندماء میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارہ تھے یہ ہیں: عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غفاری، فرخی، منوچہری"۔ ❸

ان میں سے اکثر شعراء کے کلام میں سلطان کی ہندوستانی فتوحات سے متعلق اشعار ملتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ عسجدی تو سلطان کی سومنات کی مہم میں بھی شریک تھا اور اس نے اس کے متعلق ایک زبردست قصیدہ لکھا تھا۔ ❹

محمود کا ایک فوجی دستہ ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھا جس نے نہ صرف سلطنت کے شمالی علاقوں میں محمود کے لیے فتوحات کے جھنڈے گاڑے تھے بلکہ ہندوستان میں بھی ہر جگہ یہ دستہ اس کے کام آیا تھا۔

محمود غزنوی سے لے کر خسرو ملک تک غزنوی خاندان کی حکومت کا عرصہ کم و بیش ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔

---

❶ آب کوثر، شیخ محمد اکرام، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۲ء ص ۶۱

❷ شعر العجم (جلد اول) علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور ۱۳۲۵ھ، ص ۳۸

❸ شعر العجم جلد اول، ص ۳۹

❹ آب کوثر، ص ۶۱

اس تمام عرصے میں لاہور کا نام غزنی کے مقابل لیا جاتا تھا۔ بلکہ کچھ حالات میں تو لاہور غزنی سے بھی بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ بہت سے خاندان غزنی اور دوسرے علاقوں سے ترک سکونت کر کے بہتر مستقبل کی آس میں یا بسلسلہ ملازمت لاہور میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ جن میں ہنرمند بھی تھے اور دانشور بھی عالم اور فاضل بھی تھے اور شعراء بھی۔ جن کے فیض سے یہ شہر بھی علوم وفنون اور مذہب اسلام کی اشاعت کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ ایسے علاقوں سے بھی تشنگان علم کھنچ کر آنے لگے جن پر صدیوں سے مسلمانوں کی حکومت تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے مقبوضات وسط ایشیا میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی سلطنت میں خوارزم، ماوراء النہر، خراسان، افغانستان اور فارس و ہندوستان کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ لیکن مودود بن مسعود جب برسر حکومت ہوا تو صرف افغانستان اور مقبوضہ ہندوستان ہی آل سبکتگین کے قبضہ میں رہ گئے تھے باقی ملک آل سلجوق نے ان سے بزور شمشیر چھین لیا تھا۔ چنانچہ آل سبکتگین کے اعیان و امراء اور دیگر متوسلین جو وسط ایشیا اور دیگر سلطنت کے کسی حصے میں رہتے تھے، آل سلجوق کی تاخت وتاراج میں بے خانماں و برباد ہو کر لاہور یا اس کے گرد ونواح میں آ کر آباد ہوئے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ظلمت کدہ ہند میں مشعل نور وہدایت روشن کرنے کے لیے آئے۔ چونکہ یہ نو وارد یہاں مستقل طور پر رہنے کے لیے آئے تھے، ان میں سے بہت سوں نے ہندوؤں کے ساتھ بہت جلد میل جول پیدا کر لیا اور یہاں کی زبان بھی سیکھ لی اور اس میں اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ اہل زبان ہو گئے۔ [1] مسلمان فاتحین تھے اور ہندو مفتوحین۔ مفتوحین کے لیے اپنی حالت سدھارنے اور سیاسی اور سماجی کوائف کو بہتر بنانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ مجبوراً یا ذوق وشوق کے ساتھ فاتحین کی زبان میں استعداد حاصل کریں اور حکومت یا معاشرے میں اچھے مراتب پر پہنچیں، چنانچہ انھوں نے بھی فارسی سیکھی۔

جو لوگ اسلام کی تبلیغ کے لیے یہاں تشریف لائے ان میں شیخ اسماعیل زنجانی (متوفی ۴۴۸ھ/ ۱۰۵۶ء) اور شیخ علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) سرفہرست ہیں۔ سلطان ابراہیم غزنوی کا ایک وزیر ابونصر فارسی علم وادب کا بڑا شیدا تھا۔ اس نے لاہور

---

[1] اُردوئے قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۲۱)

میں ایک خانقاہ قائم کی جو اہل علم وفضل اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی اور جہاں کٹھن منازل ـ کرنے کے بعد دور دراز سے لوگ علم کو پھیلانے اور حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ علامہ ابو ریحا البیرونی ❶ جیسے عظیم محقق کا نام علمی تاریخ میں آجانا ناگزیر ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس خطے میں آئے اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ یہیں بسر کیا۔ عظیم شاعر مسعود سعد سلمان کے والد خواجہ سعد سلما برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہے۔ شعراء چونکہ درباروں سے منسلک رہتے تھے اس لیے جب لاہور میں دربار لگنے شروع ہوئے تو شعراء کی ایک کثیر تعداد نے بھی لاہور کا رخ کیا جن میں سے کچھ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

اگرچہ غزنوی عہد کے بعد بھی فارسی شعر وادب نے برصغیر میں خوب ترقی کی لیکن اس دوران میں جتنے خاندان برسر اقتدار آئے ان میں سے اکثر نے لاہور سے ہٹ کر ملتان، دلی، آگرہ وغیرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا، چنانچہ زیادہ تر انھی علاقوں میں فارسی شعر وادب کو یہاں کی نسبت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ البتہ مغلیہ دور میں خصوصاً اکبر اعظم کے زمانے میں لاہور ایک بار پھر شعر وادب کا گہوارہ بن گیا اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب اس مقالے میں ہم فارسی شاعری کی حوالے سے تین طرح کے چیدہ چیدہ شعرا کا مختصر ذکر کریں گے:

---

❶ ابو ریحان البیرونی مضافات خوارزم (خیوا) "بیرون" میں ۳۶۲ھ/۹۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۷۷ ماہ کی عمر میں ۱۱۴ سے زیادہ علمی کتابیں لکھنے کے بعد ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ میں وفات پائی۔ علامہ موصوف ایک مدت تک ہندوستان میں مقیم رہے انھوں نے بڑی جان کاہی سے سنسکرت اور علوم ہند سیکھے کیونکہ برہمن اپنے علوم مسلمان تو درکنار کسی غیر برہمن کو پڑھانے کے روادار نہ تھے بلکہ ہندو قوم کی اکثریت کے لیے پڑھنا لکھنا ایک مہاپاپ تھا۔ کسی اچھوت یا شودر کے کان میں سنسکرت کا کوئی لفظ پڑ جاتا تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ لیکن البیرونی کا علمی ذوق ملاحظہ ہو کہ انھوں نے جان پر کھیل کر ہندوستان کے علوم پر دسترس حاصل کی اور ایسی سیر حاصل کتاب تصنیف کی جو نہ صرف غیر جانبدارانہ تحقیق کا شاہکار ہے بلکہ جسے آج بھی محققانہ کتب میں خاص وقعت حاصل ہے۔ (بحوالہ دیباچہ کتاب الہند از مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء)

الف: وہ شعراء جو لاہور یا گردونواح میں پیدا ہوئے اور یہیں پر ان کی شاعری پروان چڑھی۔

ب: وہ شعراء جو باہر سے یہاں آ کر بس گئے اور جنھوں نے یہاں کی محفلوں کو اپنی شاعری سے گرمایا۔

ج: وہ شعراء جن کا کسی نہ کسی طور پر لاہور سے کچھ نہ کچھ علاقہ رہا۔

(ب) خطہ لاہور کے معروف فارسی گو شعراء

ابو عبداللہ روزبہ نکتی اللہوری:

سدید الدین محمد عوفی نے "لباب الالباب" (جلد دوم) میں ان کا نام ابو عبداللہ لکھا ہے اور انھیں لاہور کے فارسی گو شعراء میں سب سے قدیم گرداتا ہے۔ (1)

روزبہ نکتی سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے مداحوں میں سے تھا۔ "لباب الالباب" میں اس کے ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار، ایک قطعہ اور ایک نظم کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔ سلطان مسعود کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

روی آں ترک نہ رویست و بر او نہ برست
کہ بریں نار بیارست و برآں گل بیرست
ور بجای مہ و خورشید بود یار مرا
اندریں معنی ہمہ جای حدیث و نظرست
ملک عادل مسعود خداوند ملوک
کہ بفضل از ملکاں بیشتر و پیشترست
(2)

---

(1) لباب الالباب (جلد دوم) سدید الدین محمد عوفی مطبوعہ لندن ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء با اہتمام ایڈورڈ۔ جی براؤن و مرزا محمد ابن عبدالوہاب قزوینی، صفحہ ۵۷

(2) لبا الالبا جلد دوم صفحہ ۵۸

مسعود رازی

مسعود رازی، سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کا درباری شاعر تھا۔ ایک موقع پر اس نے سلطان مسعود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس میں سلجوقیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی روک تھام کے لیے سلطان نصیحت کی تھی۔ یہ نصیحت سلطان کو گراں گزری اور اسے سزا کے طور پر ہندوستان بھجوا دیا۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد شاعر کے ایک اور قصیدے سے خوش ہو کر انعام سے نوازا اور جشن نوروز کے موقع پر اس کے دوستوں کی شفاعت سے اس کا قصور بھی معاف کر دیا تاہم حکم دیا کہ ہندوستان ہی میں رہے۔ ❶

عوفی نے لکھا ہے کہ وہ ''نادرہ سپہر'' ❷ تھا۔ عوفی نے مسعود رازی کی ایک رباعی، ایک قطعہ اور سیب دانار کی صفت میں دو دو اشعار بھی درج کیے ہیں۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

آں زلف نگر بر رخ آں در یتیم
چوں بنگاری چنانک از غالیہ جیم
و آں خال بر آں عارض چوں ماہی شیم
ہچوں نقطی زمشک بر تختہ سیم
❸

علی بن عثمان ہجویری

علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخشؒ (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) ❹

---

❶ پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۲ء، صفحہ ۵۸

❷ لباب الالباب جلد دوم، صفحہ ۶۳

❸ لباب الالباب جلد دوم، صفحہ ۶۳

❹ مادۂ تاریخ وفات:

شیخ عالی علی ہجویری — بودم مخدوم ہر صغار و کبار
ہست سردار وزیور لاہور — طرفہ تاریخ وصل آں سردار

لفظ ہست اور سردار اور زیور لاہور تینوں سے علیحدہ علیحدہ ۴۶۵ برآمد ہوتا ہے۔

(بحوالہ تحقیقات چشتی، مولوی نور احمد چشتی مطبوعہ پنجابی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۹۲

آپ کی ولادت ۴۰۱ھ/۱۰۰۹ء کے قریب غزنی میں ہوئی۔ مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے بعد سلطان مسعود ابن محمود غزنوی کے آخر عہد حکومت میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر ہندوستان میں تشریف لائے اور لاہور میں متمکن ہوئے۔ اپنی تصنیف ''کشف الاسرار'' ❶ میں رقم طراز ہیں کہ:

''میں جب ہندوستان آیا تو لاہور کے گردونواح کو بہشت نما پا کر وہیں رہائش کی ٹھانی۔ چنانچہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہیں بود و باش اختیار کی۔'' ❷

آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے ''کشف المحجوب'' آپ کا شاہکار ہے۔ چونکہ فارسی زبان میں تصوف کی یہ پہلی کتاب ہے' اس لیے اس کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ دوسری کئی گراں قدر تصانیف کے ساتھ ساتھ آپ کا دیوان تو اب ناپید ہے البتہ ''کشف الاسرار'' میں آپ کی ایک غزل کے اشعار اور دو ابیات درج ہیں جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

شوق تو در روز و شب دارم ولا
عشق تو دارم بہ پنہاں و ملا
جان بخواہم داد من در کوی تو
گر مرا آزار آید یا بلا
عشق تو دارم میان جان و دل
می دہم از عشق تو ہر سو صلا

---

❶ پاکستان میں فارسی ادب کے مصنف ڈاکٹر ظہور الدین احمد ''کشف الاسرار'' کو داتا گنج بخش کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے۔ اس ضمن میں وہ کچھ دلائل بھی رکھتے ہیں لیکن وہ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہتے)۔ (بحوالہ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد مطبوعہ ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۵۴ تا ۱۶۰)

❷ کشف الاسرار' حضرت داتا گنج بخش ہجویری مترجم نور محمد ایوبی مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۴ء صفحہ ۲۳

یا خداوندا ! رقیباں را بکش
یا مرا در یاد کن مست بلا
جام من دارد شراب یار خود
مہرباں کن بر من و ہم جتلا
اے علی ! تو فرخی در شہر و کوی
دہ ز عشق خویشتن ہر سو صلا
❶

ابیات:

کمن اے علی بیش ازیں گفتگو
کہ مرد خدائی و پاکیزہ خو
ہر آنچہ تو داری ثواب و عذاب
خداوند ! آں را ہمہ بالصواب
❷

ابوالفرج رونی:

(متولد:۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء)

استاد ابوالفرج رونی مسعود رازی کے فرزند ہیں ❸ جو لاہور کی نواحی بستی رونہ (جس کا اب نا ونشان نہیں ہے) میں پیدا ہوئے۔ عوفی نے لباب الالباب (موئلہ ۶۱۷ھ) میں لکھا ہے کہ:
مولد و منشاء او خطہ لاہور بود۔" ❹

---

❶ کشف الاسرار (اُردو ترجمہ)' صفحہ ۳۴
❷ کشف الاسرار (اُردو ترجمہ)' صفحہ ۳۸)
❸ (پنجاب میں اُردو' صفحہ ۵۸)
❹ لباب الالباب' صفحہ ۲۴۱)

رونی کی کم وبیش تمام عمر لاہور میں بسر ہوئی۔ وہ قصیدہ نگاری میں یکتائے روزگار تھے۔ عوفی نے انھیں ''العمید الاجل الکامل'' ❶ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ رونی اور مسعود سعد سلمان کا زمانہ ایک ہی ہے۔ رونی مسعود سعد سلمان سے عمر میں بارہ سال بڑے تھے اور مسعود سعد سلمان ان کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے ❷ چنانچہ کہا ہے:

نازم بداں کہ ہستم شاگرد تو
شادم بداں کہ ہستی استاد من

انوری نے بھی، جن کو اول درجے کا فارسی قصیدہ نگار مانا جاتا ہے، کئی اشعار میں رونی کی استادی کا لوہا مانا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

اندراں مجلس کہ من وامی بشعر بوالفرج
تا شنیدستم و لوعی داشتستم بس تمام

اور ملک الشعراء فیضی نے بھی اپنے اشعار میں تسلیم کیا ہے کہ وہ رونی کے مداح، مقلد اور متبع ہیں۔ جیسے:

فیضی منم آنکہ در معانی کامی بدو صد نیچ گرفتم
ذوق کہ تواں گرفتن از شعر از شعر ابوالفرج گرفتم

سدید الدین محمد عوفی کا خیال ہے کہ اُستاد رونی لاہور کے وہ پہلے بلند پایہ شاعر ہیں جن کا دیوان طبع ہو کر ہم تک پہنچ پایا ہے۔ دیوان مختصر ہے جس میں قصائد و قطعات کے علاوہ ساٹھ رباعیات اور صرف تین غزلیات ہیں۔ یہ دیوان ۱۳۲۵ھ میں طہران میں چھپا تھا۔ ان کی ایک رباعی یہ ہے:

تا چوں گل لعل گونہ بفروختہ ام
چوں نیلوفر جامۂ غم دوختہ ام

---

❶ لباب الالباب، صفحہ ۲۴۱)

❷ مآثر لاہور (جزو دوم) سید ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷۸

بیداری شب ز نرگس آموختہ ام
زیرا کہ چو لالہ بادل سوختہ ام
❶

مسعود سعد سلمان

(۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء۔۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)

مسعود سعد سلمان کا شمار فارسی کے دس اکابر شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کو اتنا بڑا درجہ دینے کی بڑ وجہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا شاعر اور حسین وجمیل نظموں کا خالق ہونے کے علاوہ فارسی کا وہ پہلا شاعر جس نے شعر میں ذاتی تاثرات داخل کیے۔ محمد عوفی نے ان کو ''العمید الاجل سعد الدولۃ والدین'' ❷ کے لقب سے یاد کیا ہے اور ''از نوادر ایام وافاضل انام بود'' ❸ کہا ہے۔ مسعود کے اجداد ہمدان رہنے والے تھے۔ ان کے والد سعد سلمان شہزادہ مجدود ابن مسعود کے ہمراہ دارالحکومت غزنی سے مستو ❹ کی حیثیت سے ۴۲۷ھ/۱۰۳۶ء میں لاہور آئے اور ساٹھ برس تک سلطنت کی خدمات سرانجا دیں۔ ان کو لاہور ایسا بھایا کہ اسی کو اپنا وطن بنالیا اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مسعود کی تا ولادت حتمی طور پر معلوم نہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء کے قریب لاہور ہی میں ہوئے۔ ❺ اگرچہ کچھ ایرانی تذکرہ نویسوں نے ان کا مولد ہمدان بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں کیو مسعود خود اپنی جائے پیدائش لاہور بتاتے ہیں اور ساٹھ گواہوں کا ایک گواہ خود شاعر کی ذات ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

---

❶ لباب الالباب (جلد دوم)' صفحہ ۲۴۵
❷ لباب الالباب (جلد دوم' صفحہ ۲۴۶
❸ لباب الالباب (جلد دوم' صفحہ ۲۴۶
❹ مستوفی' بہ معنی صدر محاسب یا وزیر خزانہ
❺ ماثر لاہور (ضمیمہ) سید ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۶ء' صفحہ ۱۰۴

به هیچ نوع گناهی دگر نمی دانم
مرا جز اینکه دریں شہر مولد و منشاست
❶

اسی طرح ایک اور شعر میں لاہور سے دور رہ کر افسوس کیا ہے:

مولدم لاوہور و از لاوہور دور
دھک اے لاوہور بے تو کے سرور
❷

مسعود نے اپنے فاضل باپ کی نگرانی میں اچھی تعلیم حاصل کی۔ ابتدائے جوانی کا کچھ عرصہ غزنی میں بسر ہوا اور شاعری کا آغاز بھی سلطان ابراہیم غزنوی کے عہد میں وہیں ہوا۔ مگر جب سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ۴۶۹ھ/۱۰۷۸ء میں والئی ہند ہوا تو مسعود اس کے ندیم کی حیثیت سے ہندوستان چلا آیا۔ جہاں ایک تو عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے کی وجہ سے اور دوسرے ایک پرگو شاعر ہونے کی حیثیت سے خاصی شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ لیکن فارغ البالی کا کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ سیف الدولہ کو کسی غلط فہمی کی بنا پر اس کے والد کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔ شہزادے کے ساتھ ساتھ مسعود بھی دھر لیے گئے اور ان کو قلعہ "دھک" میں نظر بند کر دیا گیا جو ہندوستان کی سرحد پر ایک بلند اور دشوار گزار مقام پر واقع تھا۔ وہاں سے مسعود کو قلعہ "سو" میں بھیج دیا گیا۔ "دھک" اور "سو" میں وہ سات سال مقید رہے۔ سو کے بعد ان کو قلعہ "نائے" میں رکھا گیا جو وزیرستان کے بلند پہاڑوں میں واقع تھا' جہاں یہ تین سال نظر بند رہے۔ "سو" اور "نائے" میں ان پر طرح طرح کی سختیاں روا رکھی گئیں۔ اس طرح دس سال محبس میں گزارے جس کا انھوں نے اپنے کلام میں بھی ذکر کیا ہے:

هفت سالم بکوفت سو و دھک
پس ازانم سہ سال قلعۂ نائے

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید مطبوعہ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۸۷

❷ تذکرہ شعرای پنجاب' صفحہ ۱۸۷

آخر کار سلطان کے ایک مقرب خاص عمید الملک ابوالقاسم کی سفارش پر قید سے رہائی پائی جہاں سے ہمارا شاعر سیدھا اپنے محبوب وطن لاہور چلا آیا اور اپنے والد کی جاگیر کے انتظام و انصرام میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ ابو نصر فارسی کی معیت میں جالندھر کا علاقہ فتح ہوا تو ابو نصر نے جالندھر کی حکومت بھی مسعود کے سپرد کر دی۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد جب ابو نصر معتوب ہوا تو اس کے ساتھ مسعود کو بھی معزول کر کے قلعہ ''مرنج'' میں قید کر دیا گیا۔ جہاں سے تین سال کی قید کاٹنے کے بعد ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء میں ایک امیر ثقۃ الملک کی وساطت سے رہائی ملی۔ غرض اس طرح مسعود کل تیرہ برس محبوس رہا۔ ❶

مسعود ایک بلند درجہ اور پر گو شاعر تھے۔ ان کا میلان طبع صرف قصیدہ گوئی تک محدود نہ تھا بلکہ انھوں نے غزلیات' رباعیات اور قطعات بھی کہے ہیں۔ مگر ان کی وجہ شہرت و رفعت زیادہ تر ان کے قصائد اور قصائد سے بھی بڑھ کر حبسیات ہیں' جن میں ان کے رنج والم کی داستان اور آہ و بکا کی کسک شامل ہے اور جو فصاحت و بلاغت' سوز خیزی اور شدت تاثر کے لحاظ سے فارسی شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں۔

اپنے محبوب وطن لاہور کی یاد میں انھوں نے کئی ایک دردناک نظمیں لکھیں۔ ایک نظم کے دو اشعار ہیں:

تو دانی کہ در بند گرانم یا رب

دانی کہ ضعیف و ناتوانم یا رب

شد در غم لوہور روانم یا رب

یا رب کہ در آرزوئے آنم یا رب

❷

---

❶ بعض تذکرہ نویسوں نے مسعود کی قید کی کل مدت اٹھارہ انیس سال لکھی ہے اور وہ قلعہ مرنج میں تین کے بجائے قید کا عرصہ آٹھ سال بتاتے ہیں۔ (بحوالہ ماثر لاہور صفحہ ۱۲۶ اور پاکستان میں فارسی ادب' صفحہ ۶۸)

❷ فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر (مقالہ) خواجہ عبدالحمید یزدانی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر' صفحہ ۸۹۸

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

رسید عید و من از روئے حور دلبر دور
چگونہ باشیم بے روئے آں بہشتی حور
مرا کہ گوئی کاے دوست عید فرخ باد
نگار من بہ لہاوور و من بہ نیشا پور
رہ دراز و غریبی و فرقتِ جاناں
اگر بنالیم دارید مر مرا معذور

❶

اور ذیل کے قصیدے میں لاہور کو کس دلسوزی کے ساتھ مخاطب کیا ہے:

اے آنکہ باغ طبع من آراستہ ترا
بے لالہ و بنفشہ و سوسن چگونہ ای
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار
با من چگونہ بودی و بے من چگونہ ای
از دوستان ناصح مشفق جدا شدی
بادشمنان ناکس ایمن چگونہ ای

❷

ملا شیری لاہوری

(متوفی:۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء)

ملا شیری لاہور کے نزدیک ایک قصبے کوکووال کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا جو اپنے زمانے کے ایک عالم فاضل شخص تھے۔ ملا شیری نے علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد سے کی اور

---

❶ فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر (مقالہ) خواجہ عبدالحمید یزدانی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر' صفحہ ۸۹۸

❷ فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر (مقالہ)' صفحہ ۸۹۹

شعر و شاعری میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ شب بھر میں تیس غزلیں کہہ دیں۔ ❶ ملا عبد القادر بدایونی، مصنف منتخب التواریخ نے ان کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''بلاشبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے گیا ہے۔ دوسروں کی فصاحت اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر مہر لگا دی۔۔۔ خاص طور سے شکوہ شکایات کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا۔'' ❷

شیری کا تعلق اکبر اعظم کے دربار سے تھا۔ انھوں نے اکبر اعظم اور خان کوکلتاش کی مدح میں قصائد کہے تھے۔ اکبر کے حکم سے مہابھارت کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ ان کا دیوان تو اب نایاب ہے البتہ تاریخوں اور تذکروں میں ان کے جو اشعار ملتے ہیں وہ شاعری میں ان کا بلند مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔

آپ نے کوہستان یوسف زئی میں خان کوکلتاش اور راجہ بیر بر کے ہمراہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کے دوران میں وفات پائی۔ ان کے ایک قصیدہ ❸ ''سوال و جواب'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گفتم اے دل زچہ اوضاعِ جہاں گشت بدل
گفت خاموش کہ در مغزِ فلک رفتہ خلل
گفتم آسائش اگر ہست، بگوئید کجاست؟
گفت در خواب نمایند پس از خواب اجل
گفتم آں یار چرا ابروی پرچیں دارد
گفت با صاحب بدخو نتواں کرد جدل
گفتم اہلِ سخن آرائشِ مجلس باشند
گفت لیکن نتواں گفت بارباب دول

❹

---

❶ (منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی مترجم محمود احمد فاروقی (حصہ سوم) مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۰۳)

❷ (منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی مترجم محمود احمد فاروقی (حصہ سوم) مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور، صفحہ ۲۰۳)

❸ سودا کا مشہور قصیدہ لامیہ بھی اسی زمین میں ہے۔ مطلع ہے:

اٹھ گیا بہمن و دی کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

❹ تذکرہ شعرائے پنجاب، خواجہ عبد الرشید صفحہ ۲۱۴، ۲۱۵

محمد جمال الدین عرفی

(۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء۔۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء)

محمد جمال الدین عرفی اکبراعظم کے درباری شاعر تھے۔عرفی نے برصغیر پاک و ہند میں عمرعزیز کے فقط چند سال گزارے تھے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے عین شباب میں آلیا۔ ❶ عرفی کی پیدائش شیراز میں ہوئی تھی اور تربیت وتعلیم کا بیشتر حصہ بھی وہیں بسر ہوا۔ایران کے قیام کے دوران میں کوئی چھے ہزار اشعار کہے تھے جو ضائع ہوگئے۔ورود برصغیر کے بعد اکبری نورتن ملک الشعراء فیضی سے قریبی تعلق رہا' جن کی وساطت سے عبدالرحیم خانخاناں اور اکبراعظم تک رسائی ہوئی۔ملا بدایونی لکھتے ہیں:

"بلند فطرت اور صاحب فہم نوجوان تھا۔۔۔عرفی اور حسین ثنائی (عرفی کا ہم عصر اور دربار اکبری کا دیگر شاعر) نے شاعری میں بڑا نصیبہ پایا ہے۔کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے کھڑے نظر نہ آئیں۔ان کے دیوان عراقی' ہندوستانی سب تبرکاً خریدتے ہیں۔۔۔عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے۔ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی"۔ ❷

عرفی کا دیوان مطبع نولکشور' کانپور میں ۱۹۱۵ء میں پہلی بار طبع ہوا تھا۔اس کے بعد برصغیر اور ایران میں متعدد بار چھپ چکا ہے۔ ❸

چند متفرق اشعار یہ ہیں:

ہر دل کہ پریشاں شود از نالۂ بلبل
در دامنش آویز کہ با وی جزی ہست

---

❶ وفات لاہور ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء بقول ملا عبدالقادر بدایونی "وفات کے کچھ دنوں بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کرلے گیا اور دفن کردیں"۔(بحوالہ منتخب التواریخ: صفحہ ۲۷۲)

❷ منتخب التواریخ' ملا عبدالقادر بدایونی صفحہ ۲۷۲)

❸ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۴۳)

عرفی دل خود را بچه خوش داشته ای
گر ایں دو سہ بیت است کہ بگذاشتہ ای

کلید میکدہ ہا را بمن دہید کہ من
نہ آں کسم کہ باندازہ مست میگردم

بیا ای عشق رسوای جہانم کن کہ یک چندی
نصیحت ہای بیدرداں شنیدن آرزو دارم
❶

شیخ ابوالفیض فیضی ❷

(۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء۔۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء)

اگرچہ فیضی کی ولادت اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی تاہم عمر عزیز کا ایک طویل حصہ لاہور میں بسر ہوا اور لاہور ہی میں انتقال کیا۔ ❸ فیضی شیخ مبارک کا بڑا بیٹا، ابوالفضل کا بڑا بھائی، اکبر اعظم کے دربار میں ملک الشعراء اور اکبر کے نورتنوں میں سے ایک تھا۔ اس کی تصانیف میں سے مثنوی نل و دمن برصغیر کے علاوہ ایران و توران میں بھی بڑی شہرت رکھتی ہے۔ جس کے متعلق مصنف ''منتخب التواریخ'' ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

''چار ہزار کچھ کم دو سو اشعار پر مشتمل واقعتاً ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان تین سو سال میں امیر

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۲۳۳)

❷ ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص فیضی مشہور کر رکھا تھا لیکن اس کے چھوٹے بھائی (ابوالفضل) کو ''علامی'' کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا۔ لیکن یہ تخلص سازگار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی اسے دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ (بحوالہ منتخب التواریخ صفحہ ۲۹۷)

❸ بعد میں اس کی نعش آگرہ لے جا کر دفن کی گئی۔ (بحوالہ منتخب التواریخ صفحہ ۲۹۷)

خسرو کے بعد شاید ہی کسی نے ہندوستان میں ایسی عمدہ مثنوی لکھی ہو۔" ❶ عالم ایسا کہ نصف قرآن مجید کی "سواطع الکلام" کے عنوان بے نقط تفسیر کی ❷ تمام اصناف نظم میں غایت درجے کی مہارت حاصل تھی۔ قصائد' غزلیات اور رباعیات اعلیٰ درجے کی ہیں۔ مصنف "تذکرہ شعرائے پنجاب" ایک حوالے سے لکھتے ہیں:

"چوں نواب خاں جہاں بہادر بامر ایلچی گری پیش شاہ رفت' پادشاہ پرسید کہ سرآمد شعرای ہندوستان کیست؟ گفت۔ ملک الشعرا شیخ ابوالفیض فیضی است' گفت' از اشعار وی بخواں۔ نواب ایں بیت برخواند:

بانگ قلم دریں شب تار
بس معنی خفتہ کرد بیدار

پادشاہ آفرین کرد و بغایت محظوظ شد و تشویش طلبید و باب زرنوشت۔" ❸

فیضی کی یہ ایک رباعی بھی ملاحظہ کیجیے:

فیضی بکشا گوشِ دل و دیدۂ ہوش
ازکار جہاں دور کن ایں دیدہ و گوش
نیرنگ زمانہ بنگر و لب بر بند
فسانہ دہر بشنو و چشم بپوش
❹

شاہ ابوالمعالی غربتی ❺

(۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء۔۱۰۲۵ھ/۱۶۱۵ء)

شاہ ابوالمعالی کا زمانہ اکبر و جہانگیر و شاہجہان کا زمانہ ہے اور حضرت میاں میر اور یہ ہم عصر ہیں۔ اگرچہ

---

❶ منتخب التواریخ صفحہ ۷۲۹

❷ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۸۲

❸ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۸۳

❹ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۸۵

❺ شاہ ابوالمعالی کی تاریخ پیدائش "ابوالمعالی حق پرست" سے نکلتی ہے۔ (بحوالہ منتخب التواریخ صفحہ ۶۱۹)

آپ کی جائے ولادت شیر گڑھ ہے تاہم اخیر عمر کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں بسر ہوا۔ شاہ صاحب کی فقیری، درویشی، پاک بینی اور دیدہ وری کے چرچے ان کی زندگی ہی میں بہت تھے۔ لوگ فیض حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے مرید بنتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملا عبدالقادر بدایونی اور ملک الشعراء فیضی جیسی نابغہ روزگار شخصیات آپ سے گہری عقیدت رکھتی تھیں۔ اگرچہ شاہ ابوالمعالی کی اصل شہرت تو ان کی درویشی اور بزرگی ہے لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ کچھ کم نہیں۔ آپ غربتی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا ایک غیر مطبوعہ مرتب دیوان پنجاب یونیورسٹی لائبریری مجموعہ آذر میں آج بھی موجود ہے جو غزلیات، رباعیات، قطعات، معمہ جات اور قصائد پر مشتمل ہے۔ غزلیات زیادہ تر چھوٹی بحروں میں ہیں جن کا ممتاز وصف سہل ممتنع ہے۔ دیوان میں تصوف و سلوک اور جذب و معرفت کے مضامین بھی جا بجا ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق بدایونی کا کہنا ہے:

''نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا تھا۔'' ❶

آپ کے دیوان میں سے ایک مختصر غزل ملاحظہ کیجیے:

دیدنِ روی او صفا بخشد
شہدِ لعلِ لبش شفا بخشد
ہر شبی عکسِ شمع رخسارت
حرم دیدہ را ضیا بخشد
نیست در ہیچ نازنیں مہری
لولیاں را وفا خدا بخشد
دل غمش رابجاں کجا بدہد
بگدا لقمہ کے گدا بخشد
غربتی ہر کہ مست شد در عشق
نقد دل را بہ دلربا بخشد
❷

❶ منتخب التواریخ، صفحہ ۷۰۲

❷ تذکرہ شعرائے پنجاب، خواجہ عبدالرشید صفحہ ۳۵۰

ابوالبرکات منیر لاہوری

(۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء ـ ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء)

منیر لاہور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے طبیعت شعروسخن کی طرف مائل تھی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور بعمر پینتیس سال عین عالم شباب میں بمقام اکبرآباد وفات پائی۔ نعش وہاں سے لاکر لاہور دفن کی گئی۔ ❶ قدرت نے شعر موزوں کرنے کا ایک ایسا ملکہ ودیعت کیا تھا کہ بیس اکیس سال شاعری کی مدت میں ایک لاکھ کے قریب شعر کہہ ڈالے۔ کلیات مرتب کرتے وقت نظرثانی پر کوئی پندرہ ہزار اشعار کے قریب ضائع کردیے۔ ان کا موجودہ کلیات پچاس ہزار کے قریب اشعار پر مشتمل ہے۔ ❷ آپ نے زیادہ تر غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور قطعہ کی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی مثنویاں بڑے پائے کی ہیں۔ ان میں سے "مثنوی در صفت بنگالہ" زیادہ مشہور ہے۔ ان کو اپنی شاعری پر ناز بھی تھا۔ اس لیے وہ بڑے بڑوں کے عیوب شعر گنوانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ان کو احساس تھا کہ وہ ہندی نژاد ہیں، ایرانی نہیں۔ دولت مند نہیں اور کسی بڑے دربار میں ان کی رسائی بھی نہیں، ورنہ ان کا کلام کسی دوسرے سے کم تر نہیں۔ ان کے ہم عصر محمد صالح کمبوہ (مصنف ومورخ) اور سراج الدین علی خان آرزو (شاعر اور نقاد) نے ان کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ ❸

نمونہ کے طور پر کلام میں سے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ای ز رنگین چہرہ ات گل درکنار آئینہ را
موسم حسنت بود فصل بہار آئینہ را

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید، صفحہ ۳۵۰

❷ فارسی گو شعراء (مقالہ) عبدالحمید یزدانی نقوش لاہور نمبر، صفحہ ۸۷

❸ پاکستان میں فارسی ادب ڈاکٹر ظہور الدین احمد ص ۸۹

چوں شود با آئینہ آں ماہ پیکر روبرو
می کند عکس رُخش آئینہ دار آئینہ را

❶

ملا شاہ

(۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء۔۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء)

آپ کا اصل نام تو شاہ محمد تھا لیکن ملا شاہ کے نام سے معروف ہوئے۔ بدخشاں کے رہنے وا تھے لیکن متداولہ علوم کے حصول کے بعد عنفوان شباب ہی میں وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور پھر پھراتے ۱۰۲۳ھ میں لاہور پہنچے۔ ❷ جہاں حضرت میاں میرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگر چہ جلالی طبیعت پائی تھی مگر فقر و استغنا کے پیکر تھے۔ شاہ جہاں' شہزادہ داراشکوہ اور شہزادی جہاں آرا کو ملا شاہ کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔

ملا شاہ صوفی شاعر تھے۔ اگر چہ ان کے کلام میں اوزان وقوافی کے سقم پائے جاتے ہیں تاہم انھیں اپنے کلام پر ناز تھا۔ وہ خود کہتے تھے کہ میرے شعر میرے دل کی آواز ہیں اور بے اختیار میری زبان آجاتے ہیں۔ جیسے:

شعرِ من آورد چہ مضموں را
دل بدست است طبع موزوں را

❸

اپنے کلام سے متعلق ان کا کہنا ہے کہ میرے کلام میں معانی کو تلاش کیجیے۔ میں الفاظ کی دنیا سے

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۳۵۰

❷ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۱۹۶

❸ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۱۹۶

نا آشنا ہوں۔ الفاظ میرے معانی کا ساتھ نہیں دیتے۔ جیسے ان کا شعر ہے:

مست مستور معنی تخنم
لفظ نامحرم است من چکنم
❶

ملا شاہ نے تقریباً ہر صنف سخن مثلاً: قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔
ان کی مثنویات اور رباعیات کے مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ❷
ان کی ایک رباعی ہے:

از شش جہتم روی نمودی آخر
از ہر طرف دلم ربودی آخر
بیرون و دروں جلوہ گری می دیدم
بر تحقیق آدم تو بودی آخر
❸

چندر بھان برہمن لاہوری

(۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء۔۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) ❹

چندر بھان نام تھا، برہمن تخلص کرتے تھے۔ ضروری متداول علوم کی تکمیل لاہور میں کی۔ عربی فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شعر و انشاء کا شوق ابتدائی عمر سے تھا، چنانچہ جلد ہی اچھے شعر کہنے لگے۔ شاہجہان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تو بادشاہ نے برہمن کو "واقعہ نویسانِ حضور"

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید، صفحہ ۱۹۶

❷ رباعیات و مثنویات ملا شاہ خطی شمارہ نمبر ۱۵۸ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

❸ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید، صفحہ ۱۹۶

❹ برہمن کا سال ولادت اور سن وفات "کیفیہ" از برجوہن دتاتریہ کیفی مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۷ء، صفحہ ۳۴ سے ماخوذ ہے)

میں شامل کر لیا اور خاص طور پر شاہی نسخے کی تحریر پر مامور کیا۔ چنانچہ وہ ہر سفر میں بادشاہ کے ساتھ ہوتے اور سفر کی تمام کیفیات' آب و ہوا اور دوسری خصوصیات کو قلم بند کر کے بادشاہ کے حضور پیش کیا کرتے۔ جشنوں اور تیوہاروں کے موقع پر دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ برہمن کی علمی فضیلت اور طبعی میلانات کو دیکھ کر شہزادہ دارا شکوہ نے بادشاہ سے اس کی خدمات اپنے ہاں منتقل کرا لیں۔ چنانچہ ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲ء میں تسخیر قندھار کی مہم میں وہ دارا شکوہ کے ہمراہ تھے۔

برہمن کا شمار ہندو صوفی شعراء میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگرچہ وہ برہمن زادہ تھے تاہم مسلمان علماء کی ہم نشینی اور فارسی ادباء و شعراء کے مطالعے نے ان کے دل و دماغ سے شرک و بت پرستی کے عقائد کو مٹا دیا تھا اور وہ باطن سے توحید پرست تھے اور حسنِ اعمال کے سوا اپنی نجات کا کوئی وسیلہ نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے اکثر اشعار سے ظاہر ہے۔ مثلاً:

برہمن از عمل نیک زاد رہ باید
بسوی ملکِ عدم بار بستن آساں نیست

ان کا دیوان ۳۰۲ غزلیات' ۵۴ رباعیات' ۳ قصائد' ایک مثنوی' چند متفرق مفردات اور ایک اردو غزل پر مشتمل ہے۔ [1] دیوان میں اکثر غزلیات کی بحر مختصر' زبان سادہ اور تخیل واضح ہے۔ ان کا تمام کلام سبک ہندی کی دقت آفرینی اور پیچیدہ گوئی سے مبرا ہے۔ ان کے اندازِ فکر اور طرز بیان سے آشنائی کے لیے ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حدیثِ عشق ہماں بہ کہ تا بیاں نرسد
بدل ہمیشہ بود ثبت و بر زباں نرسد

تمام مغز بجوش آید از حرارت شوق
اگر خدنگ تو روزی باستخواں نرسد

غلام ہمتِ آزادگانِ بے قیدم
کہ گرد راہ تعلق بگردشاں نرسد

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۱

شوم بخوں جگر شاداں و دم نزنم
کہ اہلِ حوصلہ را کار تا فغاں نرسد
برہمن از ہمہ کس خوشنماست صاف دلی
دلی کسی بصفائی برہمناں نرسد
❶

ملاجامی بیخود لاہوری:

(متوفی:۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء)

ملا جامی، شاہجہان کے وزیر اعظم جعفر خان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ''کلمات الشعراء'' کے مصنف سرخوش جوان کے دوستوں میں سے تھے، لکھتے ہیں:

''دیوانی ضخیم دارد مشتمل بر قصائد و قطعات بسیار۔ تاریخ گوئی بی بدل و بی نظیر بود۔ چنانچہ تاریخ مرزا اسماعیل خلف اسد خان وزیر اعظم محمد اورنگ زیب عالمگیر پادشاہ مرحوم کہ بخطاب ذوالفقار خان بہادر نصرت جنگ میر بخشی پادشاہ مذکور بود چنیں یافتہ: ز برج اسد رو نمود آفتاب'' ❷

محمد صالح کمبوہ نے اس کے اشعار کی مقبولیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''سخناں شیرینش چوں قند خمیر مایہ حلاوت می شناسد۔ دیوان اشعارش را مانند ساغر حریفاں دست بدست می برند و اکثر ابیاتش را با اعتبار جزالت الفاظ مردم در دل جامی دہند۔'' ❸

دیوانِ بیخود کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں شمارہ ۲۸۹۹ اور دوسرا نسخہ بوہر لائبریری کلکتہ میں شمارہ ۳۰۰ پر موجود ہے۔ ❹

---

❶ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۱

❷ کلمات الشعراء' محمد افضل سرخوش مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۴۲ء' صفحہ ۱۲

❸ عمل صالح' محمد صالح کمبوہ مطبوعہ کلکتہ س ن (جلد ۳) 'صفحہ ۴۳۲' ۴۳۳

❹ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد صفحہ ۲۱۱

بیخود کی ایک رباعی اور ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

رباعی:

ہر کس کہ دل از مدار دنیا برداشت
عبرت ز شمار کار دنیا برداشت
گوید زمین بر سر گاؤ است بلی
گاؤ است کسیکہ بار دنیا برداشت

❶

اور شعر:

بلبلِ بیچارہ زاں رو شب نمی خوابیدہ است
درمیانِ غنچۂ گل شبنمی خوابیدہ است

❷

بیخود نے ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں وفات پائی۔ سرخوش نے بیخود کے ایک مصرع ہی سے تاریخ وفات نکالی ہے:

جامی از جام محمد بیخود شد

❸

حضرت سلطان باہوؒ

(۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء۔۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء)

حضرت سلطان باہوؒ کی جائے ولادت شورکوٹ ہے۔ ان کے والد بازید محمد ایک عالم و متقی بزرگ تھے اور والدہ مسماۃ راستی 'نیک' پارسا' اور اسم بامسمّی خاتون تھیں۔ سلطان باہو اپنی والدہ کے متعلق لکھتے

---

❶ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۲۱۱

❷ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۲۱۱

❸ تذکرہ شعرائے پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۸۱

ہیں۔

رحمت و غفران نبود بر راستی
راستی از راستی آراستی
❶

سلطان باہوؒ حضرت علی علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے جد امجد عباسیہ عہد حکومت میں پنجاب میں آ گئے تھے۔ ❷ حضرت سلطان باہوؒ تیس سال تک مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں رہے اور دور دراز کے سفر کیے۔ لاہور اور دلی میں بھی کچھ وقت گزارا اور ملتان میں شیخ بہاؤ الدین ذکریاؒ کے مزار پر بھی حاضر رہے۔

مصنف ''تذکرہ شعرای پنجاب'' سلطان باہوؒ کی شاعری کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

''سلطان باہوؒ بزبانہای اردو و پنجابی و فارسی شعری گفت۔'' ❸

آپ ایک صوفی شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان مختصر ہے جس میں صرف ۵۱ غزلیات ہیں۔ زبان میں وہ پختگی اور استواری نہیں جو اساتذہ کا شیوہ ہے، مصرعوں کے اوزان میں بھی کہیں کہیں جھول ہے۔ شاید اس بات کا انھیں خود بھی احساس تھا اسی لیے وہ کہتے ہیں:

''شعراء کے کلام کی پختگی محض عقل و دانش سے ہوتی ہے اور فقراء کی بات محض نور حضورؐ سے ہوتی ہے۔۔۔ میرے دل میں جو حق کا ولولہ ہے وہ مجھے موزوں کلام کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کسی جگہ زبان کلام کا ساتھ نہیں دیتی۔'' ❹

آپ کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

عاشقی را طور معراج دل است
ہر زمان از حق رسد او را سلام

---

❶ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۱۶۴
❷ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۶۹
❸ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۶۹
❹ پاکستان میں فارسی ادب' ڈاکٹر ظہور الدین احمد' صفحہ ۱۶۷

منور گشت جانم ہچو خورشید
ہویدا گشت بر ما جملہ اسرار
❶

شاہ فقیر اللہ آفرین

(متوفی: ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء)

آپ کا نام شاہ فقیر اللہ تھا اور آفرین تخلص کرتے تھے۔ ''مردم دیدہ'' کے مصنف عبدالحکیم حاکم نے انھیں ''لاہوری الاصل'' لکھا ہے:

''فقیر عبدالحکیم حاکم میگوید کہ مخدومی شاہ آفرین لاہوری الاصل است واز شعرای عہد عالمگیر پادشاہ، عمر دراز یافتہ تا سنہ بیست وسوم جلوس محمد شاہ پادشاہ درعرصہ حیات بود''۔ ❷

آفرین اپنے وقت کے بڑے نامی گرامی بزرگ، جید عالم اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان دنوں لاہور میں نواب حفیظ اللہ خاں خلف الرشید نواب سعد اللہ خاں کے یہاں علمی محافل کی بڑی گہما گہمی تھی۔ جن میں آفرین بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے اور اس طرح ان کی خاصی شہرت ہوگئی تھی۔ حاکم لکھتے ہیں کہ مرزا بیدل غائبانہ طور پر آفرین کی تعریف وتوصیف کیا کرتے تھے اور ان کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے:

حجاب عشقم نداد رخصت، سوال بوس از دہان تنگش
از وٴنمی آید ایں مروت، ز من نمی آید ایں تقاضا
❸

اور ناصر علی کو ان کا یہ شعر بہت پسند تھا:

نسیمی میکند نیلوفری صبح بنا گوشت
فغاں ہای شب ہجراں شنیدنہا۔ چہ میدانی
❹

---

❶ پاکستان میں فارسی ادب، ڈاکٹر ظہورالدین احمد، صفحہ ۱۷
❷ تذکرہ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم مطبوعہ پنجابی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۸
❸ تذکرہ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم، صفحہ ۱۹
❹ تذکرہ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم، صفحہ ۱۹

آفرین کو شعر و شاعری سے تو رغبت تھی ہی اس کے علاوہ وہ ایک منکسر المزاج، خوش مشرب، آزاد اور متوکل شخص تھے۔ اسلاف کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتے اور تمام کو اپنا استاد اور مرشد سمجھتے۔ تمام اصناف سخن میں شعر کہے ہیں۔ فرخ سیر کے دور حکومت میں مثنوی ہیر رانجھا لکھی تھی جو بہت معروف ہوئی۔ مصنف تذکرہ شعرای پنجاب لکھتے ہیں کہ اگر یہ شخص ایران میں پیدا ہوتا تو اپنے زمانے کے سخنور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا۔ ❶

حاکم نے آفرین کی تاریخ وفات (۱۱۵۴ھ) اس مصرع سے نکالی ہے:

رفت نقاد معنی از عالم ❷

میر معصوم وجدان

(متوفی ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء)

میر معصوم وجدان، عالی نسب خان کے نام سے مخاطب، میر محمد زمان خان کے بیٹے اور حضرت سید میر کلال قدس سرہ سادات سرہند کی اولاد میں سے تھے۔ فرخ سیر کے زمانے میں میر جملہ کے ہمراہ لاہور آئے مگر کچھ دن، کر تلاش معاش میں دلی چلے گئے۔ جب وہاں کوئی سلسلہ میسر نہ آیا تو تنگ دستی کے ہاتھوں تنگ آ کر لاہور لوٹ آئے اور سیف الدولہ عبد الصمد کے یہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب مذکور جو شعر فہم اور شاعر نواز تھے وجدان کی شاعری سے بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کی نہ صرف خاصی مالی اعانت کی بلکہ اپنا رفیق بنا لیا۔ نواب صاحب کے یہاں یہ معمول تھا کہ ہر روز عصر سے پہلے ایک مشاعرہ ❸ منعقد ہوتا جس میں یہ سرخیل شعراء ہوتے۔ کچھ سال یہی شب و روز رہے کہ ناگاہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ نواب صاحب کے مرنے کے بعد یہ ان کے بیٹے نواب زکریا خان کی ملازمت

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبد الرشید صفحہ ۴۱

❷ تذکرہ مردم دیدہ، عبد الحکیم حاکم، صفحہ ۲۲

❸ تذکرہ مردم دیدہ، عبد الحکیم حاکم، صفحہ ۱۰۷

میں آ گئے اور بہر حال شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ حاکم لکھتے ہیں:

''بسیار صاحب قدرت و صاحب تلاش بود۔ تخلص خلیلے شوخی و رنگینی و مضامین تازہ داشت و زمین ہائے سنگلاخ طرح میکرد''۔ ❶

انھی کے حالات میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''دیوانے ضخیم قریب بہ بست ہزار بیت و قصائد و مثنوی علیحدہ دارد و اکثر بغریب خانہ تشریف می آورد و صحبتہائے می داشت' استاد مسلم الثبوت عصر خود بود۔'' ❷

آپ نے بعارضہ فالج بمقام لاہور کچھ اوپر ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انتخاب میں سے دو ایک اشعار ملاحظہ کیجیے:

دلی بیار و بہ میخانۂ عاشقانہ در آ
بگو کہ شیشہ فروشم بایں بہانہ در آ
❸

زمن شہرت تمنا دارم و نی نام میخواہم
فلک گر واگزارد یک نفس آرام میخواہم
فروغ طبع بخشیدی' الٰہی اوج ہمت دہ
بہ سر عالم مہتاب پشت بام میخواہم
❹

---

❶ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم' صفحہ ۱۰۷

❷ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم' صفحہ ۱۰۷

❸ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم' صفحہ ۱۰۸

❹ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۳۹۵

ابوالحسن قابل خان میرزا

(متوفی ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء)

ابوالحسن نام' قابل خان خطاب اور میرزا تخلص کرتے تھے۔ آباء واجداد کا وطن شیراز تھا۔ لیکن آپ برصغیر میں پیدا ہوئے اور بہادر شاہ اوّل کے دور حکومت میں وارد لاہور ہوئے۔ آپ وضع دار اکابرین اور شاہی منصب داران میں سے تھے۔ حاکم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''فقیر در عہد محمد شاہ در صحبت شاہ آفرین اورا دیدہ بودم۔'' ❶

آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ قصائد کے علاوہ ایک مثنوی بھی لکھی۔ حاکم کا بیان ہے:

''دیوانے وقصائد ومثنوی دارد۔ پختہ گواست و مشقش رسیدہ''۔ ❷

محمد شاہ کے عہد حکومت میں فوت ہوئے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

در گریہ فغاں کردنم از بسکہ ہوس بود
ہر اشک کہ از چشم من افتاد جرس بود

❸

در نمازم جنبش مژگان یار آمد بیاد
ازطپیدن صد جماعت را بیک دیگر زدم
آتش عنان بتان فرنگ اند چوں شرر
شوخند' ہمچو شعلہ و شنگ اند چوں شرر
بگلشنے کہ درخت آستین نجنگ شکست
زبرگ برگ چمن فوج فوج رنگ شکست

❹

---

❶ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۸۳

❷ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۸۳

❸ خواجہ عبدالرشید نے تذکرہ شعرای پنجاب میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے: ہر قطرہ کہ از اشک ترم ریخت جرس بود (تذکرہ شعرای پنجاب صفحہ ۳۵۶

❹ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۸۳

عبدالحکیم حاکم

(۱۱۲۰ھ/۱۷۰۹ء۔۱۱۸۲ھ/۱۷۶۹ء)

اصل نام حکیم بیگ خان ❶ اور حاکم تخلص تھا۔ اپنی گراں قدر تصنیف ''تذکرہ مردم دیدہ'' میں اپنے خانگی حالات پر خود بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''والد فقیر شادمان خان مرحوم از بلخ در عہد عالمگیر بادشاہ بدکن وارد شدہ و در منصب عالی قدر حال خود سرافراز گردید۔ بعد فوت پادشاہ بمراد آباد سکونت ورزید و ایں فقیر در آنجا در سنہ یک ہزار و یک صد و بیست ہجری (۱۱۲۰ھ) متولد شد و در سنہ احد محمد فرخ سیر بلاہور بسبب کمال ارتباط و اخلاص دلیر جنگ ہمراہش آمد طرح اقامت در آں شہر جنت نشاں نمود۔'' ❷

جب آپ کا خاندان لاہور میں اقامت گزیں ہوا تو اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ آپ کو فارسی کتب کے مطالعے اور قدیم اساتذہ کے اشعار یاد کرنے کا بے حد شوق تھا اور کبھی کبھی کوئی ایک آدھ مصرع بھی موزوں کر لیا کرتے تھے۔ یہی شوق انھیں اس وقت کے مشہور شاعر شاہ آفرین کے پاس لے گیا جن سے یہ باقاعدہ اصلاح لیتے رہے اور شعر و شاعری میں خاصی مہارت بہم پہنچائی۔ خود کہتے ہیں:

حاکم نداشتم سر و سامان فکر شعر
از فیض آفرین بہ سخن آشنا شدم
❸

---

❶ حج پر جانے سے قبل تک یہی نام تھا بعد ازاں عبدالحکیم اختیار کر لیا تھا جیسا کہ مصنف تذکرہ شعرائے پنجاب لکھتے ہیں:
''حکیم بیگ پیش از فتن حرمین شریف ترک دنیا کردہ بلباس فقر درآمد و بشاہ عبدالحکیم ملقب گشت''۔ (بحوالہ تذکرہ شعرائے پنجاب صفحہ ۱۱۶

❷ تذکرہ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۹۲

❸ تذکرہ شعرائے پنجاب صفحہ ۱۱۶

ایک دیوان کے علاوہ اپنے سفر حج کے متعلق ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں ایک واقعاتی مثنوی لکھی۔ یہ مثنوی اگرچہ مختصر ہے مگر جذبات محبت و عقیدت نے اسے روح پرور بنا دیا ہے۔ ❶

تذکرہ مردم دیدہ میں منتخب اشعار میں سے بطور نمونہ کلام چند اشعار:

در گلشنی کہ مدعی آنجا چو گل شگفت
ہرگز مرا چو نخلِ خزاں دیدہ بار نیست
از چہ دل تنگ نشیم دریں فصلِ بہار
پنجہ ئی ہست و گریبانی و صحرای ہست
نیست معلوم کہ جان داد ز ما دل شدگان
ایں قدر ہست کہ در کوی تو غوغای ہست
❷

نورالعین واقف

(متوفی ۱۱۹۰ھ/۱۷۸۱ء)

نورالعین واقف بٹالہ ضلع گورداسپور (بھارت) میں پیدا ہوئے جہاں کا عہدہ قضا ایک دراز عرصہ تک آپ کے خاندان میں رہا۔ علوم رسمی کی تکمیل کے بعد شعر گوئی شروع کی۔ میر محمد معصوم وجدان اور فقیر اللہ آفرین سے بھی آپ نے اصلاح لی۔ عبدالحکیم حاکم سے بھی گہرا دوستانہ تھا۔ حاکم نے اپنے تذکرہ میں ان کے اوصاف حمیدہ اور شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''فقیر مولف ایں تالیف از سی سال بایں عزیز بزرگ آشنا است۔ اول صحبت بخانہ مخدومی شاہ آفرین مرحوم دیدہ بود۔ پس ازاں گاہ گاہے بغریب خانہ تشریف می فرمود و روز بروز اخلاص و اتحاد در تیزاید و اکثر مشق سخن یکجا کردہ می شد از اوصاف حمیدہ و اخلاص او چہ بیان نماید کہ زبان قاصر است۔ حاصل کلام علم و فضل ارث خاندان او ست۔ طالب علمے

---

❶ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد پنجم) مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور صفحہ ۴۷
❷ تذکرہ مردم دیدہ، عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۹۵

چند قریب بفراغ تحصیل دارد۔ افکار آبدارش خیلے موثر بہ درد است' معانی بلند و پاکیزہ و الفاظ شستہ و روانی کلامش رواں را تازگی می بخشد' بالفعل باییں طور شعر گفتن خاصہ اوست۔ حد دیگرے نیست............ دیوانے قریب بہ شش ہفت ہزار بیت ترتیب دادہ و قصائد ہم دارد۔ ترجیع بندے در کمال فصاحت و بدرد گفتہ' ظاہرا چنیں ترجیع بند از قدماء ہم کس ہم گفتہ باشد۔ عاشق غزل است و رباعی ہم خوب میگوید............ پختگی و استادی از سخنش معلوم است۔ خودش می فرماید:

نالۂ چند کردہ ام موزوں
نہ غزل نے قصیدہ دارم" ❶

نمونہ کے طور پر ایک آدھ مزید شعر ملاحظہ کیجیے:

سیہ کرد از تغافل بسکہ چشمش روزگار ما
چو گرد سرمہ خیزد تیرہ در محشر غبار ما
سخت مشتاقم بخوش چشمانِ گلشن اے صبا
دیدہ بوس از من رسانی نرگس و بادام را
قدت دیدم قیامت را شنیدم
شنیدہ کے بود مانند دیدہ ❷

آپ کا متذکرہ دیوان پنجابی اکیڈمی لاہور نے ۱۹۶۲ء میں طبع کرایا ہے۔

---

❶ تذکرہ مردم دیدہ' عبدالحکیم حاکم صفحہ ۱۱۴' 115

❷ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۳۸۳

طالب آملی

(۱۰۰۸ھ ❶ / ۱۵۹۹ء ـ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء)

طالب آملی کی جائے ولادت ماژندران کا ایک قصبہ آمل ہے جہاں آپ نے درسی علوم وفنون کی تعلیم بھی پائی ۔ بقول شبلی نعمانی:

''پندرہ سولہ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا'' ـ ❷

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے بعہد جہانگیر ہندوستان آئے ۔ جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے لاہور، دلی اور آگرہ کے کئی چکر لگائے، بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یہاں تک کہ جہانگیر نے تخت نشینی کی چودھویں سالگرہ منائی تو طالب کو ملک الشعراء کا منصب عطا کیا۔ شبلی لکھتے ہیں:

''اس وقت طالب کا سن بیس برس سے زیادہ نہ تھا، اس عمر میں یہ اعزاز خاص اسی شاعر کا کارنامہ اقبال ہے۔'' ❸

طالب کو ہندوستان کے تمام شہروں میں لاہور زیادہ پسند تھا۔ چنانچہ اس نے ایک پوری نظم لاہور کی توصیف میں لکھی ۔ اس کے خیال میں ہفت کشور میں کوئی بھی شہر لاہور کی سی آب و تاب کا حامل نہیں ہے۔ یہاں کا میٹھا پانی خالص شہد کی طرح ہے اور آب حیات کا حکم رکھتا ہے وغیرہ۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خوشا لاہور و فیضِ آب لاہور
بطاعت میل شیخ و شاب لاہور

---

❶ طالب کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے تاہم تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند میں صفحہ ۳۳۱ (جلد چہارم) پر جدید تحقیق کی بنیاد پر یہی تاریخ مندرج ہے۔

❷ شعر العجم (جلد سوم) مولانا شبلی نعمانی مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۴۸)

❸ شعر العجم (جلد سوم) مولانا شبلی نعمانی مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۴۸)

نیابی ز اہل ہندوستاں گروہی
بہ دل نزدیکی ارباب لاہور

گمانم نیست کاندر ہفت کشور
بود شہری بآب و تاب لاہور

بہ زخم سکہ پیشانی خراشد
زر خورشید را ضراب لاہور

ز طاق ابروی زناریاں پرس
نشان مسجد و محراب لاہور

سکندر گو کہ عمر خضر یابد
ز آب ہمچو شہد ناب لاہور

کہ گر یک خضر آب زندگی داشت
ہزاراں خضر دارد آب لاہور

بود لاہور شہری جملہ آرام
نیابی مضطرب سیماب لاہور

میان بکشاد خوش داکش کہ در ہند
فراغت نیست جز در خواب لاہور

بریشم کاسباں از صبح تا شام
کتاں بافی کند مہتاب لاہور

بچنگ زہرہ مشکیں تار بندد
سر زلف بریشم تاب لاہور

کنم ز آں رو مرید آسا شب و روز
کرامت ہا بیاں در باب لاہور

خدایا زندۂ جاوید دارش
بآب خضر یعنی آب لاہور

❶

قندھار کے دوران قیام میں پنجاب کی یاد نے ستایا تو کہا:

دلا! مزاج ترا قندھار درخور نیست
بیا کہ دیدہ ام از اشک ملک پنجاب است

❷

اور پھر ایک سال کے بعد لاہور آیا تو کہا:

چہ خوش حالم کہ بعد از مدت یک سالہ مہجوری
خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

❸

طالب آملی کا درجہ برصغیر کے فارسی گوشعراء میں بہت ممتاز ہے۔ تذکرہ شعرای پنجاب میں خواجہ عبدالرشید طالب آملی کی شاعری کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

دیوان طالب آملی دارای بیست ہزار بیت است وہنوز چاپ نگردیدہ است۔ راجع بہ اشعار خود چنیں گوید:

بہ قطعہ و غزلم انوری و سعدی واں
بہ مثنوی و رباعی سنائی و خیام
پیمبر منم معجزات سخن را
سنائی و خاقانی و حافظم ہمن

---

❶ فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر (مقالہ) خواجہ عبدالحمید یزدانی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۹۰
❷ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۲۳
❸ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۲۳

مجموعہ خیال من آمد بروی کار
منسوخ گشت نسخہ دیوانِ انوری
آتش فشاند عنصر طبعم بریں بساط
با خاک گشت یکساں ابیات عنصری"
❶

مصنف کلمات الشعراء لکھتے ہیں:

"صاحب طبع وذوکمال وخوش فکروخوش خیال بودہ واشعار عالمگیر وارد۔ مرزا صائب وغیرہ سخنوراں اورا باستادی قبول دارند۔" ❷

مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم میں طالب کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ فطری شاعر تھا۔ بزاز دوگو تھا۔ قلم برداشتہ لکھنے پر قادر تھا۔ تشبیہ، استعارے اور کنائے کا خاص خیال رکھتا تھا وغیرہ اور اس ضمن میں انھوں نے طالب کے وہ چار شعر بھی درج کیے ہیں جو جہانگیر نے "تزک جہانگیری" میں ملک الشعرائی کا خطاب دیتے وقت انتخاباً درج کیے تھے۔ ان میں سے دو شعر ہم بھی اس مقالے کی زینت بناتے ہیں:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
دو لب خواہم یکے در مے پرستی
یکے در عذر خواہی ہائے مستی
❸

---

❶ تذکرہ شعرائے پنجاب' خواجہ عبدالرشید صفحہ ۲۲۳

❷ کلمات الشعراء' محمد افضل سرخوش' صفحہ ۶۹

❸ شعر العجم (جلد سوم) مولانا شبلی نعمانی' صفحہ ۱۶۷

قلندر شاہ لاہوری

(۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء۔۱۲۴۷ھ/۱۸۳۲ء)

آپ لاہور میں پیدا ہوئے۔ اس وقت پنجاب پر سکھوں کی بالا دستی تھی اور غارت گری اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا خدا بخش سے حاصل کی۔ ابھی آپ کی عمر گیارہ سال کی تھی کہ والد کے ہمراہ لاہور کی سکونت ترک کر کے عازم لکھنؤ ہوئے جہاں آپ پندرہ سال تک مقیم رہے۔ اس عرصے میں آپ کو ہندوستان کے مختلف اضلاع میں گھومنے پھرنے کا خاصا موقع ملا۔ بالآخر ۱۷۹۷ء میں لاہور واپس آگئے اور پھر کبھی اس شہر سے قدم باہر نہ نکالا۔ ۱۸۳۲ء میں بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ لاہور میں وفات پائی اور اپنی زمین موضع رتہ (نزد لاہور) میں سپرد خاک ہوئے۔ یہ موضع انھیں کی وجہ سے آج تک رتہ پیراں کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت قلندر شاہ فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعری کا عموماً رنگ صوفیانہ ہے۔ ان کا فارسی دیوان ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی خصوصیات کا بھی حامل ہے۔ جسے غلام دستگیر نامی مصنف ''تاریخ جلیلہ'' نے شائع کرایا ہے۔ جس کے اب تک کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

دل سودا زدہ با زلف سرے پیدا کرد
بود دیوانہ و لیکن ہنرے پیدا کرد

حالیا سیر چمن خواہد و پروازے چند
در قفس بلبلِ من بال و پرے پیدا کرد

تاب دیدار تو بے پردہ تمنا دارد
عاشق دل شدہ جان و جگرے پیدا کرد

از لب بام سحر جلوہ چو خورشید نمود
گریہ و زاریٔ شبہا اثرے پیدا کرد

❶

---

❶ تذکرہ شعرائے پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۳۰۲

ونیز:

مایم و کوئے عشق و ہزاراں ملامتے
یا رب دریں مقام دہی استقامتے
❶

دیوان امرناتھ اکبری

(۱۸۲۲ء۔۱۸۶۸ء)

اکبری لاہور میں پیدا ہوئے اور عمر بھر اسی خطے میں رہے۔ آپ کے آباء و اجداد کشمیری الاصل تھے جو شاہجہان کے عہد میں مختلف مناصب پر مامور رہے۔ محمد شاہ کے عہد میں ان کے بزرگ لاہور چلے آئے تھے۔ جہاں آپ کے والد پنڈت دینا ناتھ ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ بقول سیتارام کوہلی مرتب ''ظفر نامہ رنجیت سنگھ'' اکبری نے مولوی احمد بخش چشتی سے تعلیم حاصل کی ❷ اور بعد ازاں قلندر شاہ لاہوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جیسا کہ مصنف تذکرہ شعرای پنجاب کا بیان ہے:

''رابطہ ارادت قلبی خود را با قلندر شاہ استوار کرد و مریدش شد۔'' ❸

اکبری مہاراجہ رنجیت سنگھ کے منظور نظر تھے۔ خود ان کے قول کے مطابق: ''۱۸۳۲ء میں بعمر گیارہ سال مہاراجہ کے حکم پر ظفر نامہ لکھنا شروع کیا۔'' ❹ ظفر نامہ کے آخر میں ایک مثنوی درج کی ہے جس کے آخری حصے میں مہاراجہ کی مدح کی گئی ہے۔ متذکرہ مثنوی کے علاوہ آپ کی فارسی شاعری کا دیوان بھی ہے جو طبع ہو چکا ہے مصنف تذکرہ شعرای پنجاب آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''شاعری نازک فکر و سخنوری شیریں مقال و خوش گو۔۔۔۔ دیوانش بر قصائد و غزلہا مشتمل

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۳۰۲

❷ ظفر نامہ رنجیت سنگھ' دیوان امرناتھ اکبری مرتبہ سیتارام کوہلی مطبوعہ دانش گاہ پنجاب لاہور' ۱۹۲۸ء' صفحہ ۸

❸ تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۵۰

❹ ظفر نامہ رنجیت سنگھ' دیوان امرناتھ اکبری' صفحہ ۱۱

است۔"[1]

بطور نمونہ کلام ایک آدھ شعر ملاحظہ کیجیے:

شد خلق محو ہستی در ذوق خود پرستی
اسرار عشق و مستی سازد کہ آشکارا
کن نظر بر دل صد چاک من ای صبح بہ مہر
بر لب بام عبث خندۂ بیجا مفروش

[2]

مولانا فیض الحسن سہارنپوری

(۱۸۱۶ء۔۱۸۸۷ء)

آپ سہارنپور کے رہنے والے' نہایت فاضل' ادیب' مصنف اور بلند پایہ شاعر تھے۔ کبھی فیض اور کبھی خیال تخلص فرماتے تھے۔ عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ آپ نے مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے علماء سے اکتساب فیض کیا اور شعر میں مولانا صہبائی سے اصلاح لی اور پھر عمر بھر دوسروں کو اصلاح دی۔ دلی کے علاوہ رام پور' لکھنؤ اور علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ بسر کیا' آخر ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ جہاں آپ نے سولہ سال تک چشمہ فیض کو جاری رکھا۔ مولانا شبلی نعمانی' مولانا حالی' مولانا وحیدالدین سلیم' مولوی عبداللہ ٹونکی اور محمد اسماعیل میرٹھی وغیرہ جیسے فاضل اور یگانہ روزگار بزرگ مختلف اوقات میں آپ کے شاگرد رہے ہیں۔[3]

آپ کا فارسی کلام چھپ چکا ہے جو ایک دیوان "نسیم فیض" اور دو مثنویوں "روضہ فیض" اور "چشمہ

---

[1] تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۵۱

[2] تذکرہ شعرای پنجاب' خواجہ عبدالرشید' صفحہ ۵۱

[3] فارسی گو شعراء (مقالہ) خواجہ عبدالحمید یزدانی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر' صفحہ ۸۸۸

فیض" پر مشتمل ہے۔ آپ کے کلام میں بندش کی چستی' تراکیب کا تنوع' خیالات کی رنگینی اور الفاظ کا ترنم پوری طرح موجود ہے۔ انھوں نے صرف ان خیالات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے جو ان کے دل میں موجزن ہوتے تھے۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

در عنفوانِ عیش دریں خانہ سوختیم
گاہے چو شمع و گاہ چو پروانہ سوختیم
ما خانۂ یگانہ و بیگانہ سوختیم
یعنی کہ خانقاہ و صنم خانہ سوختیم
سیماب پارہ ایست کہ قائم نمی شود
از اضطراب ایں دل دیوانہ سوختیم
چوں گل دریں بہار شگفتیم چند روز
آخر بسانِ سبزۂ بیگانہ سوختیم
ای فیض ضبطِ آہ شرر بار تا بہ کی
آہی کشیدہ ایم کہ ویرانہ سوختیم
❶

مولانا غلام قادر گرامی

(۱۸۵۶ء۔۱۹۲۷ء)

علامہ اقبال نے سالک مرحوم (مولانا عبدالمجید سالک) کے قول کے مطابق انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر عرفی و نظیری کے بعد کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے"۔ ❷

---

❶ فارسی گو شعراء (مقالہ) خواجہ عبدالحمید یزدانی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۸۸۸

❷ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۱۰۶۲

فارسی کا یہ یگانہ روزگار شاعر جالندھر کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر ہی میں حاصل کرنے کے بعد چودہ برس کی عمر میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر وکالت کا امتحان بھی پاس کیا۔ امرتسر، کپورتھلہ، لدھیانہ، لاہور، پٹیالہ، رام پور، مالیر کوٹلہ اور دوسرے شہروں کے چکر بغرض ذریعہ روزگار کاٹے مگر طبیعت کے موافق کوئی ملازمت میسر نہ آسکی۔ آخر حیدر آباد (دکن) چلے گئے جہاں ایک قصیدہ پیش کرنے پر محبوب علی خاں، نظام حیدر آباد نے گرامی کو "شاعر خاص" مقرر کیا۔ پھر "ملک الشعراء" کا خطاب ملا۔ ایک دراز عرصہ تک حیدر آباد میں قیام کے بعد مستقل طور پر ہوشیار پور میں بس گئے جہاں شعر و شاعری کی مجالس بکثرت منعقد ہوتی تھیں، کبھی کبھی لاہور میں اپنے عزیز دوست علامہ اقبال کے یہاں چلے آتے تھے اور مہینوں قیام رکھتے تھے۔ مصنف تذکرہ شعرای پنجاب گرامی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"گرامی داری ذوقی بسیار عالی بود و معمولاً می گفت کہ اشعار شعر گفتن را از فیض روحانی نظامی گنجوی بدست آوردہ است۔ بہ ہمی جہت در شاعری تمیذ ہیچ کس نشد۔" ❶

مولانا گرامی کا جو کلام بصورت دیوان گرامی اور رباعیات گرامی طبع ہو کر ہم تک پہنچا ہے وہ بہت مختصر ہے اور اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو انھوں نے کہا ہے۔ ان کا معتدبہ حصہ ان کی لاپروائی سے ضائع ہو گیا۔ سید عابد علی عابد، گرامی کی شاعری کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> "یوں کہنا چاہیے کہ برصغیر پاک و ہند میں فارسی کلاسیکی شاعری کا آخری ترجمان گرامی تھا۔ اس کے بعد تو چراغ ہی گل ہو گیا۔" ❷

ان کی یہ غزل، جس کے ذیل میں چند اشعار دیے گئے ہیں علامہ اقبال کی نظر میں ان کا کارنامہ تھی۔" ❸

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید، صفحہ ۳۰۹

❷ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابد نقوش لاہور نمبر، صفحہ ۱۰۶۶

❸ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابد نقوش لاہور نمبر، صفحہ ۱۰۶۶

شبہائے وصل و گوشۂ چشم عنایتے
مائیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتے
عصیانِ ما و رحمتِ پروردگار ما
ایں را نہایتے ست نہ آں را نہایتے
❶

از صبر و شکر نے سخنے نے ترانہ
الا چکد ز حضرت انساں شکایتے
از چشمِ فتنہ مست کہ خونریزِ عالم است
مضمونِ دار و گیر قیامت روایتے
عقل بہانہ جو سپر افگند و رم گرفت
در عرصہ کہ عشق علم کرد رایتے
تا چند امتحانِ تغافل تمیسے
دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے
❷

حکیم الامت علامہ اقبال

(۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

بلاشبہ حضرت علامہ اقبال کے متعلق اب تک سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی جب تک ان کی فارسی شاعری کا ذکر نہ کیا جائے گا یہ مقالہ تشنہ رہے گا۔

---

❶ سید عابد علی عابد نے علامہ اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ فارسی شاعری میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔" (بحوالہ چند بڑے ادیب 'نقوش' لاہور نمبر صفحہ ۱۰۶۵)

❷ دیوان گرامی شیخ غلام قادر گرامی مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور س۔ن' صفحہ ۸۷' ۸۸

علامہ شیخ محمد اقبال کے قلم سے فارسی میں سات کتابیں ❶ منصۂ شہود پر آئی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اقبالؒ فارسی شعراء میں اپنے ایک منفرد اور خاص انداز کے موجد ہیں۔ انھوں نے فکر ونظر' لفظ ومعنی' بیان واقتباس' تضمین وتنقید غرض کہ ہر معاملے میں جدت کا ثبوت دیا ہے۔ ماسوائے مستثنیات کے ماضی وحال کے اکثر وبیشتر ایرانی شعراء اور نقادان ادب نے برصغیر پاک وہند کے فارسی ادب اور شاعری کو "سبک ہندی" کہہ کر شاید اس کی حیثیت کو سبک کرنے کی کوشش کی ہے تاہم علامہ اقبالؒ کی فارسی شاعری پر کسی نے حرف زنی نہیں کی بلکہ تسلیم کیا ہے کہ اقبالؒ کی فارسی کسی بھی ایرانی نژاد عظیم المرتبت شاعر سے کم نہیں۔ سید عبدالواحد علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"جناب احمد احمدی بیر جندی نے ایک گراں قدر کتاب "دانائے راز" لکھی ہے جو ۱۹۷۰ء میں مشہد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ ان کو اقبال کے کلام میں سعدی اور حافظ کی حلاوت اور رومی کے عمق کا احساس ہوتا ہے۔" ❷

علامہ اقبالؒ نے زیادہ تر مثنوی' غزل' قصیدہ اور رباعی وقطعہ کی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ویسے تو فارسی کے قدیم وجدید بیشتر شعراء کا کلام اقبال کے پیش نظر رہا ہے اور اقبالؒ کسی حد تک رومی' حافظ' افغانی اور نظیری سے متاثر بھی ہیں مگر حقیقت میں اقبالؒ کا مکتب فکر سب سے علیحدہ ہے جسے "سبک اقبال" کا نام دینا زیادہ موزوں ہے کیونکہ یہ انداز انھیں سے شروع ہوا اور انھیں پر ختم ہوگیا۔ سب ایرانی نقادانِ فن تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے بعد اقبالؒ کے پائے کا شاعر فارسی ادبیات نے پیدا نہیں کیا۔ سید عابد علی عابد نے علامہ اقبالؒ کی شاعری کا تجزیہ بڑے مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"علامہ اقبالؒ مرحوم نے اُردو اور فارسی غزل کو ایک نیا لہجہ بخشا اور اظہار معانی کی ایک نئی قدرت عطا کی۔ انھوں نے اس وقت تہذیب مغرب کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا جب اغیار کی حکومت نے زبانوں پہ تالے ڈال رکھے تھے اور ذہنوں پہ اپنے تفوق کی

---

❶ اسرار خودی' رموز بے خودی' پیام مشرق' زبور عجم' جاوید نامہ' مثنوی پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز

❷ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ (مقالہ) مطبوعہ تاریخ ادبیات پاکستان وہند (جلد دوم) صفحہ ۲۸۱

مہریں لگا دی تھیں۔ اس احتجاج کی صورت انھوں نے یہ اختیار کی کہ غزل کے جو کلاسیکی علائم و رموز تھے ان کو نئے معانی بخشے۔ علاوہ ازیں کچھ نئی علامتیں اور اشارے بھی مقرر کیے اور غزل کے پیرائے میں وہ باتیں کہنے لگے جو کوئی معمولی نظم یا نثر میں کہتا تو حکومت کے عتاب کا ہدف بنتا۔ ان علائم و رموز میں قلندر، لالہ، شاہین، پروانہ، جگنو، جوئے کہسار زیادہ اہم ہیں۔ لالہ امت محمدی سے عبارت ہے کہ شہادت اسلام میں بہت بڑی اخلاقی قدر ہے اور لالے کی سرخی خونِ شہیداں کی یاد دلاتی ہے۔ سویدائے دل لالہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کا دل سوز حیات سے لبریز ہے اور نور عشق و ایمان سے روشن۔ شاہین کے متعلق خود انھوں نے اپنے مکاتیب میں بہ تفصیل بحث کی ہے۔

پہلے علامہ مرحوم نے علامتوں، استعاروں اور کنایوں میں بات کی لیکن جوں جوں مسلمانوں کا سیاسی شعور پختہ ہوتا چلا گیا اور جرأت ایمانی کی حرارت سے دل زندہ ہو گئے تو انھوں نے واشگاف الفاظ میں تہذیب مغرب کے خنجر خوں ریز و دو رخ یعنی فلسفے سے مسلح ہو کر اس تہذیب پر مہلک وار کیے اور مسلمانوں کو اس بات کا شعور دلایا کہ مغربی تہذیب ہر طرح عربی تہذیب (مسلمانوں کی تہذیب) سے فروتر ہے۔ ہمیں مذہب اور فقہ میں علم اور عمل میں اسی تہذیب کی طرف لوٹنا ہے۔ اپنے زور بازو سے پرواز کرنا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا:

در چمن بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں
اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگاہ
ہجر تو خوشترم آید ز وصالِ دگراں

——— کیا شعر میں اور کیا علم و دانش میں ——— اقبال کا فیضان نئی نسل کی تخلیقات پر بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں کلاسیک ہو چکا تھا اور یہ ادب کی تاریخ کی بہت بڑی بات ہے"۔ [1]

---

[1] چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابد مطبوعہ نقوش لاہور نمبر، صفحہ ۱۰۷۲ تا ۱۰۷۳

تیسرا باب

اُردو شاعری کی ترویج میں لاہور کا حصہ

(الف) اُردو شاعری کی روایت

اُردو کے مولد و منشا اور اس کی ابتدائی نشوونما کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ بالعموم ہم اس کے آغاز کو اکبر یا شاہجہاں کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ اردو کی ولادت اسی زمانے میں ہو چکی تھی جب مسلمان ہندوستان میں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ سرزمین دکن و گجرات میں اس زبان میں شعر و ادب کا سلسلہ دسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی بابر کی آمد سے قبل جاری ہو جاتا ہے اور بقول فاضل محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی فارسی لغات کی شہادت سے' جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں' صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان ان ایام میں تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہی لغات نگار اس کو ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہندی یا ہندوی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے کہ جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔ اس جگہ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ اردو سب سے پہلے کہاں پیدا ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پنجاب میں بھی قدیم زمانے ہی سے اُردو کی نشوونما کی ایک مضبوط روایت ملتی ہے جس کا اختصار کے ساتھ یہاں پر اظہار کرنا ضروری ہے کیونکہ اس نشوونما کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو کی شعری روایت بھی یہاں پنپتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہم زبان کی ترقی کے پس منظر میں اردو شاعری کے بتدریج ارتقا کا جائزہ لیں گے۔ شیر علی خان سرخوش نے ۱۹۲۳ء میں "تذکرہ اعجاز سخن" لکھا اور فاضلانہ بحث و تمحیص کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ "اُردوئے قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے"۔ ❶

---

❶ تذکرہ اعجاز سخن' حصہ اول' شیر علی خان سرخوش' مطبوعہ حتم ظریف بک ڈپو لاہور' ۱۹۲۳ء ص خ

حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے ''اُردوئے قدیم'' میں اُردو کی ابتدا سے متعلق مورخین سلف اور مستشرقین یورپ کی تصریحات کو متضاد اور ناقص قرار دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''تاریخ زبان اُردو کا یہ تاریک حصہ جو کئی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے اگر روشنی میں لایا جائے اور اس کی بنیاد پر اُردو زبان کی عہد بہ عہد ترقیاں مطالعہ کی جائیں اور اس کے بعد اس کی تاریخ کو سلسلہ وار ترتیب دیا جائے تو ایسی صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ آل سبکتگین کے زمانہ میں اُردو زبان کی ابتدا ہوتی ہے۔ ❶

آگے چل کر یہی فاضل مصنف تاریخی حقائق اور شواہد بیان کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ:

''ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آل سبکتگین کے زمانہ میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ میل جول اور تبادلۂ خیالات کی وجہ سے ہندی زبان میں تغیر شروع ہو گیا تھا اور اسی زمانہ سے ایک جدید زبان کی بنیاد قائم ہوئی تھی اور عہد بہ عہد ترقی کرتے ہوئے ساتویں صدی تک اس نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء۔ ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) کے زمانہ میں یہ جدید زبان عام طور پر بولی جاتی تھی اور وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے یا جنھوں نے عرصہ دراز سے یہاں کی بود و باش اختیار کر لی تھی اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے تھے''۔ ❷

پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی نے ۱۹۲۸ء میں اس بحث کو اور آگے بڑھایا اور زیادہ تفصیل میں جا کر یہ لکھا کہ:

''پنجابی اور اُردو زبان میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ ان کی صرف و نحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابقت ہے اور ساٹھ فی صدی

---

❶ اُردوئے قدیم' حکیم سید شمس اللہ قادری' مطبوعہ مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۲۰

❷ اُردوئے قدیم' حکیم سید شمس اللہ قادری' ص ۲۱ ' ۲۲

سے زیادہ الفاظ ان میں مشترک ہیں"۔ (1)

پنڈت کیفی بھی طویل بحث کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے اور کہا کہ "اُردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی تھی"۔ (2) پہلے پہل تو دانشور اور محققین اُس دعوے (3) کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے تھے لیکن جب اُردو کے وہ مخطوطات (4) جو اس صدی کے ربع اوّل میں تحقیق و جستجو کے بعد شائع ہوئے اور ان کے سامنے آئے تو انھیں ماننا پڑا کہ اُردو کا اوّلین گہوارہ پنجاب رہا ہے اور اسی علاقے سے یہ زبان برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی۔ کیونکہ ظاہر ہے مسلمان پنجاب سے ہندوستان جاتے وقت ضرور کوئی زبان اپنے ساتھ لے جاتے ہوں گے۔ اس صورت حال میں یہ قیاس بہت کچھ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم ایک صدی کے گزر جانے کے بعد بھی اس زبان کے آثار امیر خسروؒ اور ضیاء برنی کے ہاں موجود پاتے ہیں۔ پھر مختلف لسانی اور تہذیبی عوامل نے صدیوں کے اثرات کے بعد اسے وہ شکل دے دی جو ہمیں آج نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے اُردو ادب کی تاریخ مرتب کی ہے۔ جس

---

(1) پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی مرتب ڈاکٹر وحید قریشی' کتاب نما لاہور' مطبع چہارم ۱۹۷۲ء ص ۲۳۶' ۲۴۷

(2) کیفیہ' پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' مکتبہ معین الادب' لاہور ۱۹۵۰ء ص ۵۹

(3) اس صدی کے اوائل میں اہل پنجاب نے دعویٰ کیا کہ "اُردو زبان دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے۔ اس کے افعال عموماً پنجابی ہیں مگر تھوڑی سی تغیر تبدیلی کے ساتھ استعمال میں لائے گئے ہیں"۔ تو مختلف رسالوں اور اخباروں میں یہ بحث چھڑ گئی۔ "مخزن" لاہور میں یہ بحث ۱۹۰۳ء سے شروع ہو کر مختلف اوقات میں ۱۹۱۹ء تک جاری رہی۔ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" ۱۵ جنوری ۱۹۰۵ء اور "اُردوئے معلّٰی" نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ "پیسہ اخبار" لاہور میں یہ بحث برسوں چھڑی رہی (بحوالہ "پنجاب میں اُردو" محمد اکرام چغتائی' سالنامہ "فنون" لاہور ۱۹۶۹ء' ص ۳۷۰

(4) حیدر آباد دکن میں دکنی مخطوطات کی اشاعت کا سلسلہ کم و بیش ۱۹۲۰ء کے بعد سے شروع ہوا۔ ان مخطوطات کے حوالے سے پنجابی اور دکنی اُردو کی مماثلت واضح نظر آتی ہے کہ دونوں ایک ہی زبان کی دو صورتیں ہیں۔ (بحوالہ "تاریخ ادب لاہور" ڈاکٹر جمیل جالبی' (جلد اوّل' ص ۵۹۸)

میں انھوں نے تاریخی حقائق کی روشنی میں بڑے وقیع انداز سے استدلال کیا ہے اور واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ:

''یہ سارے حالات وعوامل' تاریخی شواہد' تہذیبی اور لسانی دھارے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اُردو کا مولد پنجاب ہے''۔ ❶

یہ ایک لازمی امر ہے کہ زبانیں ایک دوسری کا اثر قبول کرتی ہیں۔ فارسی میں غزنوی دور سے ہی ہندی الفاظ استعمال میں چلے آ رہے ہیں۔ فردوسی' عنصری' فرخی' منوچہری' اسدی' بیہقی' سنائی اور ابوالفرج رونی کے ہاں ''بت، دشمن' ❷ کت' چندن' کوتوال' پیلک' لگھن' شل' کتار' پانی' دند' جوہر ❸ جت'' ❹ کے الفاظ بلاتکلف استعمال ہوتے ہیں۔ جب فارسی کے یہ عظیم شعراء ہندی کے یہ الفاظ اپنے کلام میں بغیر کسی مجبوری کے لاتے ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پنجاب کی زبان سے کس قدر متاثر ہیں۔

زبان کے ارتقا کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں شاعری جنم لیتی ہے۔ چنانچہ علاقہ پنجاب میں بالخصوص شہر لاہور میں جسے ابتدا سے پنجاب کا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے' قدیم الایام سے کچھ ایسے شعراء ملتے ہیں' جنھوں نے ہندی' ہندوی' قدیم ریختہ یا قدیم پنجابی میں شعری اظہار کیا ہے۔ اگرچہ

---

❶ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی جلد اوّل' ص ۶۰۲

❷ لفظ: ''دشمن'' فارسی ہے نہ معلوم شیرانی صاحب جیسے فاضل مصنف نے کیسے ہندی کا لفظ شمار کر لیا۔ شاید یہاں لفظ ''برہمن'' تھا جسے کاتب نے غلطی سے ''دشمن'' لکھ دیا۔

❸ ہندی میں ''جوہر'' سے مراد راجپوتوں کی وہ رسم ہے جس میں غالب دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال واسباب کو جلا کر اور اہل وعیال کو قتل کر کے مقابلہ میں آ ڈٹتے تھے اور جب تک ایک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جاتے جنگ سے منہ نہ موڑتے تھے۔ بحوالہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اُردو زبان کے وجود کا ثبوت''۔ از حافظ محمود شیرانی' اورینٹل کالج میگزین' نومبر ۱۹۲۹ء ص ۵

❹ ماخوذ از حوالہ مندرجہ بالا۔

وقت کے دبیز پردوں کے باعث ہمیں ان کا تمام تر کلام میسر نہیں۔ تاہم زمانے کی دستبرد سے جو کچھ بچا ہے اور ہم تک پہنچا ہے وہ پنجاب میں اُردو کی شعری روایت کی نمائندگی کرنے کے لیے کافی ہے۔

اِس زبان کے اوّلین قابلِ ذکر شعراء کے ساتھ ہمیں کچھ صوفیاء کرام ومشائخ عظام کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو تبلیغ اسلام اور حق وصداقت کا درس دینے کے لیے بہ ہزار دقت ہندوستان آئے اور جنھوں نے ظلمت کدہ ہند کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ یہ لوگ اس وقت کے لسانی میل جول کا سب سے بڑا سبب تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک طرف تو اپنے کلام سے تاریک دلوں کو روشن کیا اور دوسری طرف زبان و ادب میں اضافہ ہوتا گیا اور نئے نئے خیالات کے ساتھ نئے نئے اسالیب جگہ پاتے گئے۔ اس طرح ہماری زبان وقت کے ساتھ ساتھ مالا مال ہوتی گئی۔ جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان درویش ہندوستان میں پُر خطر اور دشوار گزار رستوں' سر بفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمان کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبیعت کے مخالف تھی۔ جہاں کی آب وہوا' رسم ورواج' شکل وصورت' آداب واطوار' لباس' بات چیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہلِ ملک سے اور اہلِ ملک کو ان سے وحشت ہو............ لیکن دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم وملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام وخاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سے سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تا کہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمینِ ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم وفاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انھیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم وتلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا گر تھا اور صوفیاء اسے خوب سمجھتے

تھے"۔ ❶

اس طرح ان صوفیاء و مشائخ نے تبلیغی کوششوں کے ساتھ ساتھ واردات قلبی کو شعر کے سانچے میں ڈھالا اور عوام کی زبان میں ان کا اظہار کر کے اپنے پیچھے شاعری کے ایسے نمونے چھوڑ گئے جن سے ایک طرف تو عوام کی تربیت کا کام ہوا اور دوسری طرف زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔

ب۔ خطۂ لاہور کے قدیم اُردو شعراء

مسعود سعد سلمان:

(۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء۔۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آل غزنہ کے عہد میں خطہ لاہور میں فارسی اور یہاں کی مقامی بولی کے میل میلاپ سے زبان کا ایک نیا مرکب تیار ہو چکا تھا جسے ہم ہندی' ہندوی یا قدیم ریختہ کا نام دیتے ہیں۔ پنجاب میں اس زبان کے پہلے قابلِ ذکر شاعر ہمیں مسعود سعد سلمان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے تین دیوان تیار کیے تھے۔ ایک فارسی میں' ایک عربی میں اور ایک ہندی میں۔ جیسا کہ محمد عوفی نے لباب الالباب میں لکھا ہے کہ:

"واو را سہ دیوانست یکی بتازی و یکی بپارسی و یکی بہندوئی"۔ ❷

اس کی تصدیق امیر خسروؒ (م۔۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) نے بھی کی ہے۔ وہ اپنی تصنیف غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"پیش ازیں شاہان سخن کے راسہ دیوان نبودہ مگر مرا کہ خسرو ممالک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندی است و در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام و عادلم"۔ ❸

---

❶ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' مولوی عبدالحق' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء ص ۶۵

❷ لباب الالباب' محمد عوفی' جلد دوم' باب دہم' مطبوعہ لندن/۱۹۰۶ء' ص ۲۴۶

❸ دیباچہ دیوان غرۃ الکمال' امیر خسروؒ' کتب خانہ نظامیہ' دہلی (س۔ن) ص ۶۶

اس لیے متقدمین اور متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ آج ہمیں بدقسمتی سے ان کا ہندی کلام میسر نہیں جو شاید دستبرد زمانہ سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا ہے۔ لیکن مسعود یہیں لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ لاہور اور اس کے نواحی شہر جالندھر میں ہی بسر ہوا تھا' اور ان کو لاہور کے ساتھ بے پناہ محبت تھی جیسا کہ ان کے فارسی اشعار سے ظاہر ہے تو تعجب نہیں کہ انھوں نے اپنے محبوب وطن کی زبان میں بھی شاعری کی ہو جبکہ ان کے فارسی دیوان میں بھی کہیں کہیں ہندی الفاظ اور محاورات کی جھلک پائی جاتی ہے جیسے:

چو رعد زا بر بغرید کوس محمودی
بر آمد از پس دیوار حصن مارامار
❶

چو فغفور بر تخم و درکت ❷

برشکال ❸ اے بہار ہندوستاں
اے نجات از بلائے تابستاں

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ:

(۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء۔۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء)

قدیم اُردو اور قدیم پنجابی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم نے آج کے زمانے میں اپنی آسانی کے لیے ایک ہی زبان کے دو نام رکھ لیے ہیں۔ مسعود سعد سلمان کے بعد تاریخ کے صفحات پر ہمیں اس زبان کی دوسرے بڑے شاعر شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر" نظر

---

❶ "مارامار" پنجابی اور اُردو میں عام ہے۔ جس سے مقصد آپس کی مار پیٹ اور حملہ وغیرہ ہے۔

❷ "کت" کی تشریح میں فرہنگ نامہ تو اس میں لکھا ہے: "تخت ہندواں باشد میاں بافتہ" ہمارے ہاں کت یا کھت کی موجودہ شکل کھاٹ ہے لیکن ضیاء برنی اور صاحب سیر الاولیاء کے ہاں پنجابی شکل میں کھت ہی ملتا ہے۔

❸ "برشکال": ۔ برش + کال یعنی بارش کا موسم

بحوالہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت' از حافظ محمود شیرانی اور نیٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء ص ۵

آتے ہیں جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م۔۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) کے مرید اور خلیفہ ہیں۔ شیخ فرید کے جد امجد کابل کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ منگولوں کے حملوں کے دوران میں ان کو ترک وطن کرنا پڑا اور ہندوستان میں ہجرت کر آئے۔ کچھ عرصہ قصور میں قیام کیا بعد ازاں کوٹھوال (نواح ملتان) کے قاضی بنا دیے گئے۔ شیخ فرید الدین اسی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں تعلیم پائی۔ ایک عرصہ تک بلاد اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی۔ ہندوستان واپس آنے پر شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ کچھ عرصہ ہانسی میں قیام کیا اور پھر قصبہ اجودھن (پاک پٹن) میں آ کر مستقلاً قیام پذیر ہوئے اور یہیں انتقال فرمایا۔

آپ پیغام حق کو پھیلانے کے لیے عوام کے ساتھ عوام کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔ آپ کے ساتھ متفرق دوہرے اور نظمیں بزبان ہندی و پنجابی منسوب ہیں اور کچھ کلام گرو گرنتھ صاحب ❶ میں محفوظ ہے۔ ذیل کے اشعار گرنتھ صاحب میں درج ہیں:

فریدا جے توں عقل لطیف، کالے لکھ نہ لیکھ
آن پڑے گریواں میں، سر نیواں کر دیکھ
❷

---

❶ سکھوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں جو کلام شیخ فرید جی کے نام پر درج ہے وہ شیخ فرید گنج شکر کا نہیں ہے بلکہ شیخ ابراہیم (م۔۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء) کا ہے جو انھیں کی اولاد اور سجادہ نشینوں میں سے تھے اور بابا گورو نانک کے ہمعصر تھے۔ انھیں فرید ثانی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بزرگ بھی فرید تخلص کرتے تھے جب کہ دوسرا طبقہ اسے آپ ہی کا کلام تسلیم کرتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ "ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بالفعل دشوار ہے کہ یہ کلام فرید اول سے تعلق رکھتا ہے یا فرید ثانی سے"۔ (بحوالہ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۰ء: ص) لیکن مصنف تاریخ ادب اردو نے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور پروفیسر فضل حق کے حوالے سے لکھا ہے کہ "گرنتھ صاحب میں جو کلام فرید کے نام پر درج ہے اس کے اکثر و بیشتر حصے کے مصنف خواجہ فرید الدین گنج شکر ہی ہیں"۔ (بحوالہ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی، جلد اول، ص ۶۱۷)

❷ آکھیا بابا فرید نے، محمد آصف خان (مرتب) مطبوعہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور ۱۹۷۸ء ص ۱۳۹

فریدا روٹی میری کاٹھ کی، لاون میری بکھ
جیہناں کھادی چوپڑی، گھنے سہن گے دکھ ❶

رکھی سکھی کھاء کے، ٹھنڈا پانی پیء
فریدا دیکھ پرائی چوپڑی، نہ ترسائیں جیء ❷

فریدا رتی رت نہ نکلے، جے تن چیرے کوء
جو تن رتے رب سوں، تن تن رت نہ ہوء ❸

فریدا کالے میںڈے کپڑے، کالا میںڈا ویس
گناہیں بھریا میں پھراں، لوک کہیں درویش ❹

اُٹھ فریدا وضو ساج، صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نویں، سو سر کپ اُتار ❺

فریدا بُرے دا بھلا کر، غصہ من نہ ہنڈھاء
دیہی روگ نہ لگ ای، پلے سب کچھ پاء ❻

فریدا میں جانیا دکھ مجھ کوں، دکھ سبھا ایہہ جگ
اُچے چڑھ کے دیکھیا، تاں گھر گھر ایہا اگ ❼

---

❶ ایضاً، ص ۱۷۱

❷ ایضاً، ص ۱۷۲

❸ ایضاً، ص ۱۹۳

❹ ایضاً ص ۲۰۶

❺ ایضاً ص ۲۱۶

❻ ایضاً، ص ۲۲۳

❼ ایضاً۔ ص ۲۲۶

لمی لمی ندی وہے، کندھی کیرے کھیت

بیڑے نوں کپر کیا کرے، جے پاتن رہے نچیت ❶

کاگا کرنگ ڈھنڈولیا' سگلا کھایا ماس'

ایہہ دوء نیناں مت چھوہیؤ پر دیکھن کی آس ❷

فریدا دریا دے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے

کیل کریندے ہنجھ نوں' اچنتے باز پئے ❸

مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں مختلف ہیئتوں میں آپ کا معلوم کلام درج کیا ہے۔ جو بقول مصنف "تاریخ ادب اُردو:

"اتنا صاف ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کلام الحاقی یا ترمیم شدہ ہے" ❹

ایسے کلام میں سے ایک نظم ❺ ذیل میں دی جاتی ہے:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک

پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک ❻

ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے

بوکڑ واں ❼ سے نہ کوئی بڑے ہوتے

---

❶ ایضاً' ص ۴۳۱

❷ ایضاً' ص ۴۳۶

❸ ایضاً' ص ۴۳۵

❹ تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر جمیل جالبی' (جلد اوّل)' ص ۶۱۶

❺ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' مولوی عبدالحق' ص ۱۲'۱۱

❻ غوک: مینڈک

❼ بوکڑواں: بکرے

خاک لانے❶ سے گر خدا پائیں
گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
گوش گری میں گر خدا ملتا
گوش چویاں کوئی نہ واصل تھا
عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

ذیل کی نظم بھی آپ کے نام کے ساتھ منسوب ہے جو قدیم اُردو کی متاثر کن مثال ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے ❷
نفس مبادا کہ بگوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے ❸
با دم خود ہمرہ احرار باش
صحبت اشرار بُری بات ہے ❹
باتن تنہا چہ روی زیں جہاں
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے ❺
این سفر دور و دراز ست لیک
بہر خداوند چہ سوغات ہے ❻

---

❶ لانے: لگانے
❷ پنجاب میں اُردو' محمود شیرانی' ص ۲۵۴
❸ ایضاً
❹ ایضاً' ص ۲۵۴
❺ ایضاً
❻ پنجاب میں اُردو (مقالہ)' قاضی فضل حق' اورینٹل کالج میگزین' فروری ۱۹۳۲ء' ص ۳۸

چند شکر گنج بدل جان شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے ⓿

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (بابا فرید) نے عام بول چال کی زبان میں جو شاعری کی ہے اس سے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی زبان کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زبان تھی کہ جو کم وبیش سارے برصغیر میں رائج تھی۔ اس زبان میں نہ صرف عوام الناس ہی بات کرتے تھے بلکہ مسلمان صوفیاء و علماء اور مشائخ کے وعظ و تذکیر بھی اسی زبان میں ہوا کرتے تھے اور ہندو جوگی بھی مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان اپنے خیالات کی اشاعت ایسی ہی زبان میں کیا کرتے تھے۔

بابا گورونانک جی:

(۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء۔۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء)

سکھ حضرات گورونانک جی کو اپنے مذہب کا بانی اور اپنا پہلا گورو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کی جائے پیدائش کے بارے میں سکھ مورخین میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک آپ رائے بھوئے کی تلونڈی (ننکانہ صاحب کا قدیم نام) میں پیدا ہوئے تھے مگر بعض کا خیال ہے کہ آپ اپنی ننھیال' تلونڈی موسیٰ خان (نزد گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے تھے اور اسی نسبت سے آپ کا نام نانک تجویز کیا گیا جس کے معنی ہیں نانکے (ننھیال) میں پیدا ہونے والا۔

گورونانک جی کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں بسر ہوا۔ آپ نے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا۔ مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت بھی کی۔ بچپن میں آپ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی بعد ازاں قرآن شریف اور دوسری مروجہ اسلامی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ ایک بت پرست اور مشرک قوم میں پیدا ہونے کے باوجود آپ توحید کے پرستار تھے۔ آپ کی وفات دریائے راوی کے کنارے موضع کرتار پور (پنجاب' پاکستان) میں ہوئی۔

آپ نے اپنا پیغام پھیلانے کے لیے شعر ہی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ آپ پنجابی کے شاعر تھے لیکن

⓿ پنجاب میں اُردو' محمود شیرانی' ص ۲۵۴

آپ کے دوہے اسی زبان اور کم و بیش اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں جو بابا فرید گنج شکرؒ کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں یہی زبان مرغوب خاص و عام تھی کیونکہ ان بزرگوں کے پیغامات خاص و عام دونوں کے لیے یکساں تھے۔ بابا صاحب کا یہ دوہا آج بھی مقبول ہے:

ساس ماس سب جیو تمھارا تو ہے کھرا پیارا
نانک ساعر ایہو کہت ہے سچے پروردگارا ❶

اب ہم گرنتھ صاحب سے آپ کے چند دوہے ❷ درج کرتے ہیں۔

لمی لمی ندی وہے کندھیں کیرے ہیت
بیڑے نوں کپر کیا کرے جے پاتن رہے سچیت ❸
کاگا چونڈ نہ پنجرا بسے تان اُڈر جاہیں
جت پنجرے میرا سہہ دسے ماس نہ تد کھاہیں ❹
کیا ہنس کیا بگلا جان کوں نذر کرے
جوتس بھاوے نانکا کاگوں ہنس کرے
آپے پٹی قلم آپ اوپر لیکھ بھی توں
ایکو کہیے نانکا دوجا کاہے کوں!
نانک کہے سہیلیو سہہ کھرا پیارا
ہم سہہ کیریاں داسیاں سچا خصم ہمارا

قدیم اُردو کی یہ بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں

---

❶ آب حیات' محمد حسین آزاد' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور ۱۹۸۵ء' ص ۱۷

❷ تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی' (جلد اوّل) ص ۲۳۱

❸ یہ دونوں دوہے بابا فرید کے ہیں۔ (بحوالہ آکھیا بابا فرید نے' محمد آصف خان (مرتب) ص ۲۳۱

❹ ایضاً' ص ۲۳۷

استعمال ہوتے ہیں اور جب صدیوں کا سفر طے کر لیتے ہیں اور یہ الفاظ زبان کا جزو بن جاتے ہیں تب کہیں جا کر یہ اپنا شین قاف دوبارہ درست کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں رہنے والے دیہاتی آج بھی عربی فارسی کے ان گنت الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں ہی بولتے ہیں مثلاً کاگد (کاغذ) وکھت (وقت) سیت (مسجد) حک (حق) کران (قرآن) درواجا (دروازہ) گری وان (گریبان) پر سلات (پل صراط) کھاک (خاک) درویس (درویش) ساعر (شاعر) اجرائیل (عزرائیل) باجار (بازار) باجی گر (بازی گر) باگ (باغ) بکھس (بخش) بدبکھت (بد بخت) وربھ (برف) بگرید (بقرعید) تحکیک (تحقیق) تکھت (تخت) ہجور (حضور) کھسم (خصم) کھار (خوار) جات (ذات) مجوری (مزدوری) وغیرہ۔

ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ الفاظ کی یہ بگڑی ہوئی شکل ہمیں یکساں طور پر کم و بیش سارے صوفیائے کرام کے ہاں نظر آتی ہے اور یہی شکل ہمیں گرنتھ صاحب میں بھی نظر آتی ہے۔ یہی شکل اس وقت کی گجراتی اور دکنی اُردو میں بھی نظر آتی ہے۔ اس قسم کا کلام اُردو زبان کے وجود میں آنے سے قبل بولی یا لکھی جانے والی زبان کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ اس قسم کے کلام کو ہم ہندی اور اُردو کی درمیانی کڑی کا درجہ دے سکتے ہیں یا ایک مشترکہ زبان کی ابتدائی شکل تصور کر سکتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال گورو گرنتھ صاحب کے ان شبدوں اور اشلوکوں کا ہے جن میں ہندی کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت اور بلا جھجک استعمال کیے گئے ہیں۔ عباد اللہ گیانی نے "گورو گرنتھ اور اُردو" میں بابا گورو نانک جی کے بہت سے ایسے شبد درج کیے ہیں۔ ان میں سے ایک شبد [1] درج ذیل ہے:

"یک ارج (عرض) گُفتم (گفتم) پس تو (پیش تو) درگوس (گوش) کن کرتار
ہکا (حقا) کبیر کریم تے بے ایب (بے عیب) پرودگار (پروردگار)
دنیا مکام پھانی (مقام فانی) تحکیک (تحقیق) دل دانی!
مم سر موئے اجرائیل (عزرائیل) گرپھتہ (گرفتہ) دل ہیچ نہ دانی
جن (زن) پسر پدر براوران کس نیس دستگیر (دستگیر)
آخر بیپھتم (بیفتم) کس نہ دارد چوں سود (شود) تکبیر

[1] گورو گرنتھ اور اُردو' عباداللہ گیانی' مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۶ء ص ۶۵

سب روج (شب روز) گستم (گشتم) در ہوا کردیم۔ بدی کھیال (خیال)
گاہے نہ نیکی کار کردم مم ایں چتی (چنیں) احوال (احوال)
بدبھت (بدبخت) ہم چوں بکھیل گاپھل (بخیل غافل) بے نجر (بے نظر) بے باک
نانک بگوید من ترا تیرے چاکداں پاکھاک (خاک)!

شاہ حسینؒ:

(۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء۔۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء)

پنجاب کی سرزمین پر پیدا ہونے والے اولیائے کرام میں سے ایک شاہ حسین ہیں جو مقام لاہور ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء میں پیدا ہوئے' یہیں پلے بڑھے' تعلیم و تربیت پائی اور لاہور ہی میں ۶۱ برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور قدیم لاہور کی نواحی بستی باغبانپورہ متصل شالامار باغ میں دفن ہوئے۔ آپ کی یاد میں شالا ۱. باغ کے باہر آج بھی میلہ چراغاں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

شاہ حسین کے کلام میں اثر انگیزی' بے ساختگی' روانی اور گہری موسیقی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر موضوعات بے ثباتی زمانہ سے متعلق ہیں۔ وہ انکسار اور بے نیازی کا درس دیتے ہیں۔ ان کے مخاطب عوام ہیں۔ وہ عام لوگوں کو زندگی کی تاریکی سے نکال کر ارفع اقدار سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا کلام آج بھی روشنی کا مینار ہے۔ شاہ حسین سیدھی سادی بات کرتے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اور اس کا اثر عوام کے دلوں پر فوری ہوتا ہے۔ وہ عوام کی زبان میں ان ہی کے دکھ درد اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی ان کے کلام کی مقبولیت کا راز ہے۔

شاہ حسین نے اپنی شاعری کے لیے عوام کی زندگی اور رہن سہن سے استعارے وضع کیے ہیں۔

مثلاً:

کنت:	باری تعالیٰ	میکا:	دنیا
سراں:	آخرت	چندن پیڑ:	یادالٰہی
آنگن:	دل	چوراسی گھر:	آواگون کا چکر
پانچ ندیاں:	حواس خمسہ	چرخا:	انسانی جسم پنجر
کاتنا:	نیک عمل	راج:	توشۂ آخرت

ترنجن:	دُنیا	پنج پونیاں:	نماز پنجگانہ
کوا کالا ہرن:	شیطان' نفس امارہ	لیکھا:	یوم حساب
ڈولی:	جنازہ	مکنا ہاتھی:	نفس امارہ
مکلاوہ:	موت کا دن	لڈی:	وجد' حال
پربھات:	ساعت	سکھیاں:	ارمان
سالو:	جسم' جیون	ماہنجھی:	تقدیر
رات:	عمر' زندگی	چولا:	کفن

علاوہ ازیں کپاس کاتنا' ڈھول' شادی بیاہ کی مختلف رسومات' مٹیار' جھومر ڈالنا۔ پینگ۔ پیپل کا درخت' کنواں' رانجھن' کھیڑا وغیرہ۔ اور عوام ان استعارات سے بخوبی واقف ہیں:

کافی (1) کی ایجاد کا سہرا بھی شاہ حسین کے سر ہے۔ انھیں کی پیروی میں ''کافی'' کا رواج نہ صرف پنجاب میں ہوا بلکہ ملتان اور سندھ میں بھی ''کافی'' مقبول ترین صنفِ سخن قرار پائی۔

شاہ حسین کی شاعری کی زبان اس وقت کی سادہ پنجابی زبان ہے جو قدیم ریختہ کے بہت قریب ہے۔ اس زمانے کے عام رجحان کے مطابق ان کے کلام میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں مگر ان کے یہاں یہ الفاظ بابا فریدؒ اور بابا گورو نانک جی کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ کلام عوام الناس کی ذہنی سطح کے بہت قریب ہے اور بقول مصنف ''تاریخ ادب اُردو'':

> ''زبان و بیان کے اعتبار سے ایسا کلام ہے کہ اُردو دان بھی بغیر پنجابی زبان سے واقفیت حاصل کیے اسے سمجھ سکتا ہے۔ اس زبان کا بنیادی ڈھانچہ وہی ہے جو اُردو زبان کا ہے۔ اسی لیے شاہ حسین کا کلام قدیم اُردو کے ذیل میں آتا ہے''۔ (2)

(ان کی یہ کافیاں (3) دیکھیے:

---

(1) ''کافی'' پنجابی صنف شاعری میں صوفیاء کا وہ کلام ہے جو ترنم سے ادا کیا جائے۔

(2) تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل)' ص ۶۲۳

(3) ایضاً

کدی سمجھ نداناں گھر کتھے ای سمجھ ندانا؟
آپ کمینہ تیری عقل کمینی کون کہے توں داتا!
ایتھیں راہیں جاندے ڈٹھڑے میر ملک سلطاناں
اپے مارے اپے جیوائے عزرائیل بہانا
کہے حسین فقیر سائیں دا ہن مصلحت اُٹھ جانا

جگ میں جیون تھوڑا کون کرے جنجال
کیندے گھوڑے ہستی مندر کیندا ہے دھن مال
کہاں گئے مُلاں کہاں گئے قاضی کہاں گئے لکھ ہزاراں
ایہہ دُنیا دن دوئے پیارے ہر دم نام سمال
کہے حسین فقیر سائیں دا جھوٹا سب بیوپار

جہاں دیکھو تہاں کپٹ ہے کہوں نہ پیو چین
دغا باز سنسار تے گوشہ پکڑ حسین
من چاہے محبوب کو تن چاہے سکھ چین
دوئے راجے کی سیدھ کیسے بنے حسین

اسی طرح شاہ حسین کی اور بھی ایسی کئی کافیاں ہیں جو قدیم اُردو کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خالص پنجابی کلام میں بھی کئی جگہ مصرعے کے مصرعے اُردو کے آجاتے ہیں۔ شاہ حسین اُردو کے یہ مصرعے عمداً نہیں لاتے بلکہ یہ زبان [1] بھی ان کی زبان پر ایسی چڑھی ہے جیسے پنجابی زبان۔ مثلاً:

توں ہی تاناں توں ہی بانا سبھ کچھ میرا توں
کہے حسین فقیر سائیں دا خلقت گئی ادھوری

---

[1] تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۲۴۳

کوئی میری ، کوئی دوئی شاہ حسین پھسنڈی ❶

رائے چندر بھان برہمن لاہوری:

(۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء۔۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء)

برہمن کی پیدائش ولی دکنی سے تقریباً ایک صدی پہلے ہوئی۔ (ولی ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء اور برہمن ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) میں پیدا ہوئے تھے) ❷ کچھ تذکرہ نگار اُن کا وطن مالوف اکبر آباد' کچھ دلی اور کچھ لاہور بتاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ برہمن کا تعلق کس سرزمین سے تھا یہ طے ہے کہ ان کی عمر کا ایک طویل حصہ لاہور میں بسر ہوا۔ شاہجہان اور داراشکوہ کے درباروں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ دارا شکوہ کے مزاج میں انھیں بہت دخل تھا۔ داراشکوہ بھی انھیں نہایت عزیز رکھتے تھے۔ داراشکوہ کے قتل کے بعد یہ دل برداشتہ ہو کر تارک الدنیا ہو گئے اور بنارس چلے گئے۔ آخر ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں وہیں انتقال کیا۔

برہمن فارسی ❸ کے بہت اچھے شاعر تھے اور اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ پنڈت سری رام لالہ لکھتے ہیں کہ:

> ''طبیعت کی موزونی سے عاشقانہ اور تصوف دونوں رنگوں میں نہایت اچھا شعر کہتے تھے اور اس وقت کے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ زبان اگرچہ قدیم اور مخلوط بہ ہندی ہے مگر مضامین کی نفاست و خوبی صاف جھلک رہی ہے''۔ ❹

آپ کا فارسی دیوان تو ملتا ہے لیکن اردو دیوان کا کہیں پتہ نہیں چلتا' جو یقیناً تھا۔ کیونکہ ہماری اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ پنڈت سری رام لالہ نے اپنے تذکرہ ''خم خانۂ جاوید'' میں پانچ

---

❶ ایضاً

❷ کیفیہ' پنڈت برجوھن دتاتریہ کیفی' ص ۲۳

❸ برہمن کی فارسی شاعری کا ذکر دوسرے باب میں گزر چکا ہے

❹ خم خانۂ جاوید' پنڈت سری رام لالہ (جلد اوّل) مطبوعہ منشی نولکشور واقع لاہور ۱۳۲۵ھ/۱۹۱۱ء ص ۵۷۴

اشعار پر مشتمل ایک غزل درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تبرکا کلام درج تذکرہ کیا گیا۔ ❶ گویا کلام خاصا تھا جس میں سے یہ غزل بطور نمونہ دی گئی ہے۔ پنڈت کیفی اور بعض محقق اسے اُردو کی اوّلین ❷ غزل تسلیم کرتے ہیں۔

غزل ❸ یہ ہے:

خدا ❹ نے کس شہر اندر ہمیں کولائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
خوباں کے باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسی ❺ ہے نہ سمرن ہے نہ گلشھی ہے نہ مالا ہے
ـ قتا ما عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ :ر ہے نہ بھالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا سیں ❼
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

---

❶ خم خانہ جاوید' پنڈت سری رام لالہ' (جلد اوّل)' ص ۵۷۵
❷ کیفیہ' پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' ص ۲۴
❸ خم خانہ جاوید' پنڈت سری رام لالہ' (جلد اوّل)' ص ۵۷۵
❹ پنڈت کیفی نے یہ مصرع اس طرح لکھا ہے:
خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کولا کے ڈالا ہے (بحوالہ کیفیہ' ص ۲۵)
❺ تسی: تسبیح
❻ پنڈت کیفی نے یہ مصرع اس طرح لکھا ہے:
پیا کے ناؤں عاشق کوں قتل با عجب دیکھے ہوں (بحوالہ کیفیہ' ص ۲۵)
❼ بگیا- باغیچہ

حضرت سلطان باہوؒ:

(۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء۔۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء)

حضرت سلطان باہو کا شجرۂ نسب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ملتا ہے۔ سانحۂ کربلا کے بعد جب آپ کے بزرگوں پر عرب کی سرزمین تنگ ہو گئی تو وہ خراسان اور افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں آئے اور شورکوٹ میں مقیم ہو گئے تھے۔ جہاں پر ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ حد درجہ زاہدہ اور عابدہ تھیں۔ انھوں نے آپ کا نام باہو (با + ہو) رکھا۔ کلام میں بھی آپ باہو ہی تخلص کرتے تھے اور آپ کو اس پر بڑا فخر تھا۔

پنجابی صوفی شعراء میں آپ کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ مگر آپ نے اپنے کلام میں رمز و کنایہ استعارہ اور خاص صوفیانہ اصطلاحات سے کام نہیں لیا۔ بلکہ جو کچھ کہا ہے وہ صاف اور سیدھے سادے اسلوب کے باوجود اس قدر جذب و مستی میں ڈوب کر کہا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے۔ آپ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے تصوف کے بارے میں ایک سو چالیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے لیکن جو رچاؤ آپ کے پنجابی کلام میں ہے اس کا جواب نہیں۔ آپ کا یہ کلام دنیا اور دنیا والوں سے اُکتائے اور گھبرائے ہوئے دلوں کی تسکین کا ذریعہ اور سہارا ہے۔

شاہ حسین کی طرح آج تک حضرت سلطان باہو کو بھی قدیم اُردو شعرا کی صف میں جگہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ حضرت سلطان باہوؒ کے کلام میں بھی قدیم اُردو کا وہی مزاج نمایاں ہے جو پنجاب میں ہمیں بابا فرید اور بابا گورو نانک جی کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ قدیم اُردو اور پنجابی ایک ہی زبان کے دو رُوپ ہیں۔ ان میں سے ایک رُوپ نے مختلف لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اثرات سے مل کر ایک ملک گیر زبان کی حیثیت اختیار کر لی جسے آج ہم اُردو کہتے ہیں اور ایک روپ جغرافیائی عوامل کے تحت پرورش پاتا رہا اور اپنی علیحدہ واضح شکل بنانے میں کامیاب ہوا جسے ہم پنجابی کا نام دیتے ہیں۔ حضرت سلطان باہو کا کلام دونوں زبانوں کی قربت کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں دونوں رنگ (اُردو اور پنجابی) اس طرح حل ہو گئے ہیں کہ انھیں علیحدہ کرنا مشکل نظر آتا ہے مثلاً یہ چند ابیات

دیکھیے:

الف اللہ پڑھیا جا حافظ ہو یا گیا حجابوں پردا ہو
پڑھ پڑھ عالم فاضل ہو یا بھی طالب ہو یا زردا ہو
لکھ ہزار کتاباں پڑھیاں ظالم نفس نہ مردا ہو
باجھ فقیراں کسے نہ ماریا باہو ظالم چوراندردا ہو ❶

ج جو دم غافل سو دم کافر سانوں مرشد ایہہ پڑھایا ہو
سنیا سخن گیاں کھل اکھیں اساں چت مولا ول لایا ہو
کیتی جان حوالے رب دے اساں ایسا عشق کمایا ہو
مرن تھیں مرگئے اگے باہوتاں مطلب نوں پایا ہو ❷

ز زاہد زہد کریندے تھکے روزے نفل نمازاں ہو
عاشق غرق ہوئے وچ وحدت نال محبت رازاں ہو
جھوڑی مکھی قید شہد وچ کیہہ اڑسی نال شہبازاں ہو
جنہاں مجلس نال نبیؐ دے باہو اوہ صاحب رازنیازاں ہو ❸

ن نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو
نہ دل میرا دوزخ منگے نہ شوق بہشتیں راضی ہو
نہ میں ترییے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہو
باجھ وصال اللہ دے باہو ہور دُنیا کوڑی بازی ہو ❹

ن نہ میں جوگی ناہیں جنگم نہ میں چلہ کمایا ہو
نہ میں بھج مسیتی وڑیا نہ تسبیح کھڑکایا ہو

---

❶ ابیات سلطان باہو" عبدالمجید بھٹی (مرتب) مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۶

❷ ایضاً ص ۸۷

❸ ایضاً ص ۱۱۴

❹ ایضاً ص ۱۹۴

جو دم غافل، سو دم کافر، ساتوں مرشد ایہہ فرمایا ہُو
مرشد سوہنی کیتی باہو کِک پاؤچ چا بخشوایا ہُو
❶

ناصر علی سرہندی:

(۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء۔۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء)

ناصر علی سرہندی شیخ محمد معصوم خلف الصدق حضرت مجدد الف ثانی کے مرید تھے۔ مرزا سیف خان بدخشی اور بعد ازاں ذوالفقار خان وزیر اعظم کے در دولت سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ ملازمت کے دوران میں بیجاپور (دکن) کرناٹک، ملتان، دلی اور دیگر علاقوں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ آخر کار سرہند واپس آگئے۔ آخری عمر دلّی میں بسر کی۔ ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں انتقال کیا اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے نزدیک مدفون ہوئے۔

ناصر علی سرہندی دراصل فارسی زبان کے شاعر تھے اور اپنی فارسی شاعری پر انھیں بڑا ناز بھی تھا جیسا کہ خود کہتے ہیں:

بدیں شوخی غزل گفتن علی از کس نمی آید
بایراں می فرستم تا کہ بنویسند جوابش را
❷

اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ آپ معاصرین ولی دکنی میں سے ہیں۔ ولی دکنی سے شعر میں چشمک رہتی تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں: ❸

''ولی نے اپنے جوش ریختہ گوئی میں ناصر علی سرہندی کو کہ علی تخلص کرتے تھے یہ شعر لکھا:

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

---

❶ ایضاً۔ص ۲۰۰
❷ تذکرہ شعرائے پنجاب، خواجہ عبدالرشید، مطبوعہ اقبال اکادمی، کراچی ۱۹۶۷ء ص ۲۵۴
❸ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۸۰

ناصر علی نے جواب میں لکھا:

باعجاز سخن گر اُڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں"

شیرانی صاحب اپنی معرکۃ الآراء کتاب "پنجاب میں اُردو" میں لکھتے ہیں کہ:

"پنجاب میں علی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی پرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔ یہاں علی کے اُردو کلام کا نمونہ ایسی بیاضوں سے دیا جاتا ہے جو محمد شاہ کے عہد میں یا اس سے چند سال بعد نقل کی گئی ہیں"۔ [1]

قدیم تذکروں میں آپ کا فارسی کلام تو خاصی تعداد میں مل جاتا ہے لیکن اُردو کلام بہتات سے میسر نہیں۔ شیرانی صاحب نے مختلف بیاضوں سے آپ کے کلام کا جو نمونہ دیا ہے ان میں سے چند اشعار [2] یہ ہیں:

نین کے ساغر تمن کے بھتیرا جھوں لبالب سوں مل پڑے گا
ہووے گی نرگس خجل چمن سوں گلوں کی انکھیاں میں گل پڑے گا

دو نین کاری تمیں کی جانی حیران کرتی لوگن کے تائیں
خراب ہوگا تمام عالم جب ان نین سوں کجل پڑے گا

تمن کے ابرو کمان دستی پلک ہے حاضر جو تیر ناوک
نظر غضب کی نہ دیکھ ساجن کوئی بیچارا اوتھل پڑے گا

علی ملاحت تیرے بچن کی اگر زلیخا سنیں گی کبھوں
مصر میں سوداگر ہووے گا درم نہ یوسف کوں مل پڑے گا

بگرد روی ساجن کے ہو یا پیدا خط مشکیں
لیا ملک سلیمانی مگر موراں مکر کر کرا!

---

[1] پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۲۶۴

[2] پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۲۶۵

جرس تجھ کارواں کا سن علی آن شوخ بے پروا
کیا ہے بار ہستی کا و لے عزم سفر کر کرا!
چندر سے مکھ پر یہ خال مشکیں نپٹ بشوخی لٹک رہا ہے
عجب ہے یاراں کہ ایک زنگی بملک رومی اٹک رہا ہے
بت فرنگی بقتل ہمنا رکھے جو پرچیں جبیں دما دم
علی تفقر! مقام جس کوں ہوا ہے حاصل ز وصل جاناں
چو چشم نرگس ہوا ہے حیران بوصل دلدار چھک رہا ہے

شیرانی صاحب نمونہ کلام درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ:

"علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بنا پر محمد شاہی عہد کے شعراء کے کلام سے ممتیز ہے بگر دروی ساجن' آن شوخ بے پروا' بت فرنگی بقتل ہمنا' چو چشم نرگس' چو تیر ناوک ایسی بندشیں ہیں جو قدیم شعرائے دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں"۔ ❶

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی:

(۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء۔۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء)

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین حسنی سید ہیں۔ آپ کے جدّ اعلیٰ شیخ ابوالحسن علی بغدادی معروف بہ بدیع الدین شہید جیلانی بغرض سیاحت عراق سے ہندوستان تشریف لائے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ کے والد سید محمد عنایت اللہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مختلف اوقات میں متفرق مقامات سیالکوٹ' کشمیر اور کابل وغیرہ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے تھے اور خان بہادر ❷ کے خطاب سے سرفراز تھے۔ محمد فاضل الدین' شیخ محمد افضل قادری کے مرید تھے۔ عربی' فارسی اور متداولہ علوم کی تحصیل ابوالحسن شیخ محمد عزت لاہوری سے کی۔ حافظ محمود شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ "بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تلاشِ معاش کی غرض سے شاہی لشکر کی شمولیت کی اُمید میں وطن سے نکلے۔

❶ پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۲۶۵

❷ ایضاً

جب بٹالہ ❶ پہنچے، کچھ موانعات پیش آئے کہ شراکت لشکر کے ارادہ کو ترک کر کے یہیں رہ پڑے اور تصوف میں ذوق لینے لگے“۔ ❷

ایک روایت ❸ کے مطابق آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ آپ نے ۷ ذی الحج ۱۱۵۱ھ میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ”غم عام“ ❹ مادۂ تاریخ وفات ہے۔

ولی دکنی ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ کے قریب دلی آئے تھے۔ بقول مصنف تاریخ ادب اُردو:

”ولی کی یہی اہمیت ہے کہ اس نے اپنے نئے رنگِ سخن کو مقبول بنا کر دوسروں کو اس پر چلنے کا راستہ دکھایا۔ ولی کے ساتھ ہی اُردو زبان و شاعری کے خدوخال اور انفرادیت متعین ہو جاتی ہے جسے سارے برعظیم کے صاحب سخن معیار کے طور پر قبول کر لیتے ہیں“۔ ❺

محمد فاضل الدین بھی ولی سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا کلام بھی اسی نئے رنگِ سخن کا آئینہ دار ہے جو ولی کے ہاں ہے۔ ان کا کلام ❻ دیکھیے:

کہیو اے قاصد جائے کر سینہ میرا ہے جل پڑا
بوجھا تھا میں نے سہل یہ عشق آتش گل پڑا!!
اس عشق سوں جل بل گیا یہ صبر اور سبھ عقل جب
جا کر کہو پیو سوں لو کو جان و تن جل تھل پڑا
یہ بھوکھ اور سونا گیا سبھ سوکھ لکھ دُکھ لگا
آکر دکھا یو مکھ پیا میں جان سوں تل جل پڑا

---

❶ بٹالہ ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) کی تحصیل کا صدر مقام ہے۔ سرزمین پنجاب کا مردم خیز شہر ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر مرزا نورالعین واقف کا مولد و منشا بھی یہی شہر ہے۔

❷ پنجاب میں اردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۲۶۴

❸ ایضاً

❹ ایضاً' ص ۲۶۵

❺ تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی' جلد اول' ص ۶۴۷

❻ پنجاب میں اُردو' قاضی فضل حق' ص ۶۵' ۶۶

اُڈری پریوا جا نگر نامہ پڑھا محبوب کوں
یہ دردو غم سبھ دیکھ لے اس راز کی گل گل سنا
مرتا ہوں غم سیں اے پیادا رو مرالب سیں کہو
جب خاک سیں مل کر پروں تب بھی کہوں جل مل گیا
جب خاک ہو یہ تن مرا اُڑے گا قطرہ قطرہ ہو
لگ کر تمھارے پاؤں سے آکھوں پیا بل بل گیا
عشرت گئی فرقت بھئی اس جان کو کیسی بنی
پیو کو ملا تو کب دھنی یہ جیوڑا دل مل پڑا
مجھ کوں نہیں ہے جیوناں تم سیں سوا دیکھا پیا
اس نام اپنے سے شہا وہ آ مجھے پل پل دکھا
تم محی الدین ہو پاک خو تم نیں جلایا دین کوں
فاضل تمھارے نام سیں دائم کہے بل بل گیا

محمد فاضل الدین نے ایک طرف سرزمینِ پنجاب میں ولی دکنی کے رنگِ سخن کو پھیلایا اور دوسری طرف پنجاب میں اُردو کی متصوفانہ شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے بعد ان کے جانشین بھی انھیں روایات کے علمبردار رہے۔

سید بلّھے شاہ:

(۱۱۰۴ھ/۱۶۹۲ء۔۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء)

سید بلّھے شاہ قصور کے رہنے والے تھے۔ آپ بھی شاہ حسین کی طرح ظاہر کو چھوڑ کر باطن پر زور دینے والے اور وحدت الوجود کے قائل صوفیاء میں سے ہیں۔ عربی فارسی اور ہندی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد پھرتے پھراتے لاہور میں آکر شاہ عنایت قادری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کو اپنے مرشد سے والہانہ عقیدت تھی۔ اس عقیدت کا رنگ آپ کے اکثر اشعار سے جھلکتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ساری عمر شادی نہ کی بلکہ ساری زندگی جذب و مستی کے عالم میں گزار دی۔ آپ کا کلام سادہ

اور بڑا اثر ہے جس کا ہر شعر روح کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں کافیوں اور دوہوں سے گاؤں قصبے اور شہر آج تک گونج رہے ہیں۔ اشعار میں حد درجہ موسیقیت پائی جاتی ہے۔ مزار قصور میں ہے۔ جہاں ہر سال تزک و احتشام کے ساتھ آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

بلھے شاہ کو بھی ابھی تک قدیم شعرائے اُردو کے زُمرے میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن اُن کے کلیات ❶ کے مطالعے سے واضح طور پر مترشح ہے کہ ان کے کلام کا لب ولہجہ انداز بیان اور ذخیرہ الفاظ قدیم اُردو کے رنگِ سخن سے کمال مشابہت رکھتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بلھے شاہ کے کلام کو ہم دو حصوں میں بخوبی تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: خالص پنجابی کلام

ب: اُردو کلام جس میں دوہے بھی شامل ہیں۔

بلھے شاہ کے ہاں خالص پنجابی کلام میں بھی ایسے الفاظ و تراکیب کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اُردو اور پنجابی دونوں میں مشترک ہے اور بعض اوقات تو پنجابی کلام میں بھی اُردو مصرعے بلکہ بند اس طرح آ گئے ہیں گویا ان کے ہاں اُردو اور پنجابی کا کینڈا ایک ہے مثلاً اُن کا یہ کلام (۲) دیکھیے:

عیسیٰ نوں بن باپ جمایا
نوحؑ پہ طوفان منگایا!
نال پیو دے پتر لڑایا
ڈوب اوہناں ماریا ای
موسیٰ نوں کوہ طور چڑھایو
اسمٰعیل نوں ذبح کرایو
یونسؑ مچھی نوں نگلایو

---

❶ کلیات بلھے شاہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (مرتب) مطبوعہ پنجابی ادبی اکادمی لاہور ۱۹۶۳ء

❷ تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۶۵۱

پھر تخت پر جا چاڑیا ای!
بُلّھا شاہ فقیر بیچارا
روشن جگ وچ نام تمھارا!
چلیا دے کے کوچ نقارا
جھوٹھوں سچ نتاریا ای
رہ رہ دے عشقا ماریا ای
کہہ کس نوں پار اُتاریا ای

یا مثلاً ایک کافی کا یہ شعر ❶ دیکھیے:

بُلّھے شاہ تے شاہاں مکھڑا گھنگھٹ کھول دکھائیں
اپنے سنگ رلائیں پیارے اپنے سنگ رلائیں

ایسی متعدد مثالیں بُلّھے شاہ کے کلام سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن کے مصرعے کے مصرعے صاف اُردو کے ہیں یا پھر ایک آدھ لفظ کے تغیر سے وہ مصرعے اُردو کے بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بُلّھے شاہ کا کلام شاہ حسین اور سلطان باہو کے کلام کی طرح اُردو دان طبقے کو بھی اسی طرح متاثر کرتا ہے جس طرح پنجابی دان طبقے کو۔

آپ کے کلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جو مکمل طور پر اُردو ہے مثلاً ان کی یہ کافی جس کا پہلا شعر ہے ❷

پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہوئے اب پیا کس نوں کہیے
ہجر وصل ہم دونوں چھوڑے اب کس کے ہو رہیے

یا ان کی ایک اور کافی جو اس شعر ❸ سے شروع ہوتی ہے:

---

❶ ایضاً ص ۶۵۲

❷ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اول) ص ۶۵۲

❸ کلام حضرت بُلّھے شاہ، مرتبہ راجہ رسالو، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور (س۔ن) ص ۹

اب تو جاگ مسافر پیارے
رین گئی . لٹکے سب تارے

یا پھر ان کی ذیل کی کافی ❶ جو غزل کے انداز میں لکھی گئی ہے:

سنو تم عشق کی بازی ملائک ہوں کہاں راضی
یہاں بر ہوں پر ہے گا جی دیکھاں پھر کون ہارے گا
ساجن کی بھال ہن ہوئی میں لہو نیں بھر روئی
مجھے ہم لاہ کر لوئی حیرت کے پتھر مارے گا
مہورت پوچھ کر جاؤں ساجن کا دیکھنے پاؤں
اسے میں لے گلے لاؤں نہیں پھر خود گزارے گا
عشق کی تیغ سے موئی نہیں وہ ذات کی دُوئی
اور پیا پیا کر موئی مویاں پھر رُوح چتارے گا
ساجن کی بھال سرد یا لہو مدھ اپنا پیا
کفن باہوں سے سی لیا لحد میں پا اُتارے گا
بلّھا شاہ عشق ہے تیرا اسی نے جی لیا میرا
میرے گھر بار کر پھیرا دیکھاں سر کون وارے گا

علاوہ ازیں بلّھے شاہ نے "ہوری" کے عنوان سے، جس کا پہلا مصرع ہے:
ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ، ایک کافی لکھی ہے جو سرتا سر اُردو میں ہے۔ اس کافی میں وحدت و معرفت اور تصوف و طریقت کے مضامین بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔

زبان و بیان کا یہی رنگ ڈھنگ ان کے دوہوں میں بھی ملتا ہے۔ ان کے اس رنگ کے دوہوں میں سے یہ دوہے دیکھیے:

---

❶ تاریخ ادب اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل)، ص ۶۵۳

اس کا مکھ ایک جوت ہے گھونگھٹ ہے سنسار
گھونگھٹ میں وہ چھپ گیا مکھ پر آنچل ڈار ❶
ان کو مکھ دکھلائے ہے جن سے ان کی پیت
ان کو ہی ملتا ہے وہ جو اس کے ہیں میت ❷
جیسی صورت ع دی ویسی صورت غ
اک نقطے کا فرق ہے بھلی پھر کو نیں ❸

بلھے شاہ کے کلام کا نمایاں رنگ توحید ہے۔ ان کا لہجہ ہر جگہ درویشانہ ہے۔ کلام کی بنیادی خصوصیت سادگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھائی سو سال گزرنے کو آئے لیکن ان کا کلام خاص وعام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

غلام قادر شاہ:

(متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)

غلام قادر شاہ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ آپ علم و عمل اور زہد و تقویٰ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا لقب ''اہل اللہ'' تھا اور ''غلام'' تخلص'' کرتے تھے۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ ''قوت مخدوم'' سے آپ کی تاریخ وفات بمطابق سن ہجری نکلتی ہے۔

آپ تصوف کے دلدادہ تھے۔ شیرانی صاحب ان کے حال میں بیان کرتے ہیں کہ:

''ف میں متعدد تصانیف آپ کے قلم سے نکلی ہیں۔ جن میں سے ''صفاالمرات'' کا ہم تک نام پہنچا ہے''۔ ❹

آپ کی شاعری میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایک اُردو مثنوی ''رمز العاشقین'' آپ کے والد

---

❶ کلام حضرت بلھے شاہ، ص ۳۱
❷ ایضاً
❸ کلام حضرت بلھے شاہ، ص ۸
❹ پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۲۷۴

بزرگوار کی زندگی میں ہی تصنیف ہو چکی تھی۔ شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"یہ مثنوی میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" سے جو ۱۱۵۹ء کی تصنیف ہے' اقدم ہے۔ اس مثنوی کے دو نسخے میرے پاس ہیں۔

خاتمہ میں یہ عبارت درج ہے" نسخہ متبرکہ رمز العاشقین تصنیف حضرت غلام قادر شاہ قدس سرہ ساکن بٹالہ تمام گردید ۱۲۰۴ھ" دونوں نسخے خط نسخ میں ہیں"۔ ❶

مثنوی "رمز العاشقین" کی بحر مقبول عام چھوٹی بحر ہے اور اس کا وزن عروضی خالص ہندی ہے اور بقول شیرانی صاحب" پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ ❷

مثنوی میں آیات قرآنی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تصوف کی کم وبیش تمام اصطلاحات عربی میں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی ایک عالمانہ شان رکھتی ہے۔ مثنوی کے علاوہ غلام قادر شاہ کا جو کلام بھی ہمیں میسر آیا ہے اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلوں میں محبوب کے حسن و جمال اور ہجر و وصال کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ رموز و علائم مجازی نوعیت کی ہیں لیکن جا بجا حقیقت و معرفت کے اشارے ملتے ہیں اور ان کی غزلیں بالعموم حمد و نعت اور مناجات و منقبت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ذیل کی غزل کو آپ کی نمائندہ غزل کہا جا سکتا ہے جس کے متعلق مصنف تاریخ ادب اُردو کا خیال ہے کہ" غزل کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اُردو زبان ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ لفظوں اور لہجوں کے پرانے پتے جھڑ رہے ہیں اور نئے پھوٹ رہے ہیں" ❸

غزل ❹ یہ ہے:

پیا جن مکھ تیرا دیکھا اسے پھر کیا دکھاتا ہے
چکھا جن رس تیرے لب کا اسے پھر کیا چکھاتا ہے

---

❶ ایضاً

❷ پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۲۷۵

❸ تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۶۵۰

❹ ایضاً

ہوا ہے دل مرا کولا برہ کی آگ کے بھیتر!
اسی جرتی انگاری کوں کہو اب کیا جراتا ہے
نہ عاقل ہوں نہ دیوانہ نہ محرم ہوں نہ بیگانہ
ایسے بے ہوش بے خود کوں کہو پھر کیا جتاتا ہے
جدائی سے جرے عالمؔ جروں میں روبرو ہردم
ایسے مجنوں دیوانہ کوں کہو پھر کیا ستاتا ہے
گرا کر شیشۂ دل کوں لگے جور و جفا کرنے
خدا سے ٹک ڈرو ظالم گرے کوں کیا گراتا ہے
پیا کا درس جن پایا ہویا ناداں نہ جانے کچھ
لیا جن سبق وحدت کا اسے کیا پھر پڑھاتا ہے
قضا کے بحر قلزم موں پڑا یہ دل گیا گزرا
نہ جاگے روز محشر کے اسے پھر کیا جگاتا ہے
پیا جن جام وحدت کا نہ راکھے خوف سولی کا
انا الحق جب ہویا الحق اسے پھر کیا ڈراتا ہے
سنوں ہر جا سخن تیرا دیکھوں سب موں رخن تیرا
ترا ہوں میں سجن تیرا مجھے پھر کیا لبھاتا ہے
غلام شاہ فاضل کا کہے دل سوں سنو یارو
دیکھا میں شاہ محی الدین مجھے پھر کیا دکھاتا ہے

فدوی لاہوری:

(۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء۔۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء)

فدوی ایک ہندو بنیے کے بیٹے تھے۔ اصل نام مکندلال ❶ تھا۔ مگر اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر

---

❶ دیکھیے حاشیہ اگلے صفحہ پر

ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور محمد حسین نام رکھا۔ اصل وطن لاہور تھا لیکن چونکہ ذریعہ معاش تجارت تھا اس لیے کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ قیام کیا۔ اسی سلسلہ میں ایران میں بھی ایک عرصہ تک رہے۔

شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

> ''......علم کم مگر طبیعت مناسب تھی۔ شعر اُردو کہتے تھے۔ صابر علی شاہ کے شاگرد تھے اور فقیرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشاعرہ میں جاتے تو کبھی بیٹھتے۔ کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے اور چلے جاتے تھے۔ جب انھوں نے احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپے نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔ ان کا بھی دماغ بلند ہوا اور دعوئ ملک الشعرائی کا کرنے لگے.................'' ❷

احمد نگر (فرخ آباد) میں ایک عطار کی دکان کے اوپر مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ فارغ اوقات میں عطار کی دکان پر آ بیٹھتے اور وہیں شعر و شاعری کا چرچا رہتا۔ اسی جگہ فدوی نے سودا کے بعض اشعار پر اعتراض کیے۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک مقام پر سودا نے شیخ و برہمن دونوں کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فدوی نے اعتراض کیا کہ دین شیخ کے لیے اور دھرم برہمن کے لیے مخصوص ہے۔ سودا نے جواب میں

---

❶ پروفیسر قاضی فضل حق نے ''پنجاب میں اُردو'' اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء کے صفحہ ۵۶ پر سرور نامی شاعر معاصر فدوی کے حوالے سے فدوی لاہوری کا نام مرزا فدائی بیگ لاہوری اور اسے صحیح النسل مغل لکھا ہے۔ عبارت کا پورا متن یہ ہے: ''فدوی' مرزا فدائی بیگ نام لاہوری شاگرد صابر علی صابر تخلص کا' سپاہی وضع' خانہ جنگ تھا۔ اور بیچ سرکار ضابطہ خان کے علاقہ روزگار رکھتا تھا۔ چنانچہ بموجب فرمائش نواب موصوف کے قصہ یوسف زلیخا کا اس نے زبان ہندی میں بخوبی نظم کیا۔ مگر ناتمام رہ گیا۔ میاں مصحفی نے اپنے تذکرہ میں بقال پسر اور غلام مغل لکھا ہے محض غلط ہے۔ مرزا سودا مرحوم جو اپنی عادت سے لاچار تھے اسی کی ہجو اور ہجو میں مذکور بقال اور بوم کا لکھا۔ میاں مصحفی نے بھی یہی دلیل پکڑ کے اس کو بقال پسر قرار دیا ہے۔ تو م اس کی مغل برلچ تھی اور حسب نسب میں اس کے کچھ خلل اور فرق نہ تھا..........''

❷ آب حیات' مولانا محمد حسین آزاد' ص ۱۵۵

آیۂ کریم لکم دینکم ولی دین نقل کی۔ اسی طرح سودا کا ایک شعر کسی اور بحر میں حسب ذیل تھا:

تم نے جہاں وا کیے بند قبا اپنے جان
جا کے صبا نے بباغ کھول دیے گُل کے کان

فدوی نے اصلاح دے کر اس طرح لکھا:

کھول دیے ناز سے تم نے دو چشم اپنے جان
کھولے صبا نے یہ سن غنچۂ نرگس کے کان [1]

چنانچہ سودا اور فدوی میں ٹھن گئی۔ سودا نے جس طرح اپنے اور ہمعصروں کی ہجویں لکھیں، ان کی بھی پانچ [2] ہجویں لکھیں جو مرزا کے کلیات میں موجود ہیں۔ مرزا نے ان پانچ ہجوؤں میں سے ایک ہجو پنجابی زبان میں لکھی ہے۔ جس کا مطلع ہے:

پئی جو سودا کے کن یہ گل کہ فدوی جس کول جاوندا ہے
بھلے بُرے نوں دے یارا اکھ اکھ ہجو تینڈی سناوندا ہے [3]

فدوی کی طرف سے "جواب آں غزل" کے طور پر سودا کی جو ہجویں لکھی گئیں وہ اگرچہ اب میسر نہیں تاہم ان میں سے ایک شعر اور ایک مصرع مولانا آزاد نے "آب حیات" میں دیا ہے جو یہ ہے۔ [4]

کچھ کٹ گئی ہے چٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دُم داب سامنے سے وہ اُڑ چلا لٹورا

---

[1] پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۳۲۵

[2] ہمعصروں میں سودا نے فدوی لاہوری کے علاوہ میر ضاحک، فاخر مکیں، بقاءاللہ خاں بقا اکبرآبادی وغیرہم کی ہجویں لکھی ہیں (بحوالہ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۱۵۴)

[3] پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۳۲۶

[4] آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۱۵۵

بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے!

فدوی طبعاً حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ حسینوں سے عشق بازی کے سلسلہ میں لوگوں سے ان کے کئی بار جھگڑے بھی ہوئے۔ چنانچہ ان کے ہمعصر 'تذکرہ ہندی گویاں کے مصنف' مصحفی لکھتے ہیں کہ" اکثر اعضائیش دیدم کہ مجروح بودند"۔ ❶

شعر وسخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور اپنی شاعری پر فخر کیا کرتے تھے۔ مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کی شاعری کو سراہا ہے جیسا کہ لکھتے ہیں:

''در گفتن قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازش شاعری او اکثر بر ہمیں بود۔ کلامش برزبان بازاریاں بسیار دائر و سائر است''۔ ❷

ذیل میں فدوی کے کچھ اشعار بطور نمونہ کے درج کیے جاتے ہیں:

نکلے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زبان چلے
ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے
یہ یہ ہی ہے تیر ایک کہ سدا بے کماں چلے

سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار
ہر اِک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں
بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں رہے
وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے ❸

❶ تذکرہ ہندی غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۷

❷ ایضاً

❸ ایضاً

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے
موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے

ابرو ترے کی تیغ سے سورج ڈرے ہوئے
پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کون دھرے ہوئے

خالی کر ان کو دل کے نشانہ پہ ایک بار
ترکش تری مژہ کے ہیں چاروں بھرے ہوئے

کہنے لگا کہ میری گلی کی طرف نہ آئے
جا اے دوا نے یاں سے ادھر کون پرے ہوئے

جرأت کہاں کہ آ سکوں قرآن کی قسم
لاتا ہے دل مرا مجھے آگے دھرے ہوئے

مت ان جفا شعاروں سے کچھ بات کیجیو
غصے میں پھر رہے ہیں یہ ظالم بھرے ہوئے

فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ و دشت کے، یکسر ہرے ہوئے [1]

مولانا محمد ابراہیم خوشدل:

(متوفی ۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ء)

آپ لاہور کے مشہور اہل علم خاندان چشتیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد قاضی ضیاء الحق مع اپنے خاندان کے ایران سے ہندوستان آئے اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت پذیر ہوئے۔ نواب خان بہادر نے آپ کو اپنے فرزند یحییٰ خان کا اتالیق مقرر کردیا۔ مولانا ابراہیم اپنے والد کی طرح علم وفضل اور حکمت ودانش میں یگانۂ زمانہ تھے۔ مولوی نور احمد چشتی، مصنف تحقیقات چشتی، یادگار چشتی، تحفہ

---

[1] فدوی لاہوری، کلب علی خان فائق، صحیفہ لاہور بابت ماہ جنوری فروری ۱۹۷۶ء ص ۵۲

چشتی اور عجائبات چشتی آپ کے پڑپوتے ہیں۔ مولانا محمد ابراہیم اپنے زمانے کے سیاسی اور معاشرتی ماحول سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اس خاندان میں دستور تھا کہ تخلص اکثر اوقات ہم قافیہ اختیار کیے ہیں جو دل پر ختم ہوتے ہیں مثلاً پردل' خوشدل' بیدل' یکدل"۔ ❶ مولانا کا عہد حیات لاہور میں نواب زکریا خان کے دور نظامت سے لے کر لاہور پر بھنگی سرداروں کے قبضے تک ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ قدر و منزلت کے اعلیٰ مرتب پر فائز رہے اور ہر کہیں ان کی شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ گوہر نوشاہی اپنے مقالے میں احمد بخش یکدل کی تحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"مولوی یکدل کا کہنا ہے کہ جب نادر شاہ لاہور میں فروکش تھا تو نواب زکریا خان کی طرف سے مولوی محمد ابراہیم چشتی کو مجرائے نادری اور سلام شہنشاہی ادا کرنے کا حکم ہوا۔ اس موقع پر مولوی صاحب نے شہنشاہ ایران نادر شاہ کی خدمت میں ایک قطعہ پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر خلعت فاخرہ' اسپ ایرانی بازین طلائی اور "حسان عجم" کا خطاب دیا"۔ ❷

حافظ محمود شیرانی صاحب نے مولانا کی ایک نظم "چرخہ" بطور نمونہ کلام دی ہے۔ اس نظم میں دُنیا کو بڑھیا اور انسانی جسم کو چرخہ تصور کیا گیا ہے۔ حافظ صاحب کا کہنا ہے کہ "چرخہ کی یہ نظم پنجاب میں بہت مقبول رہی ہے"۔ ❸

اس نظم سے چند منتخب بند یہ ہیں۔ ❹

غم کے سوں ہو محزوں

آہ دنیا سب مکر و فنوں

---

❶ پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۳۲۰

❷ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات' گوہر نوشاہی' مقالہ پی ایچ۔ ڈی' غیر مطبوعہ' مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری' ص ۱۳۲

❸ پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۳۲۱

❹ ایضاً' ص ۳۲۱ تا ۳۲۴

جو توں چاہے قادر کوں
اس عالم سوں ہو بیروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

بلبل گلزار خدا کا ہو
قمری شمشاد فنا کا ہو!
اب تارک حرص و ہوا کا ہو
آہ خوب نصیحت ہے تجکوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے مہتر یعقوب
کدھر گئے یوسف محبوب
کدھر گئے طالب مطلوب
کدھر گئے لیلے مجنوں!
کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

کہاں سکندر سے سلطاں
دارا کہاں رفیع الشاں
سب جگ کوں فانی جہاں
چھوڑ نہ کر مکر و فنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں

ایہہ دُنیا ہے سفر سرائے

غافل ہو مت آنکھ لگائے

پونجی کھوئی چلے پچھتائے

پھر نہیں آوے ہاتھ کہوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

جو زاہد زہد نما ہوں گے

دل پتھر اہل ریا ہوں گے

شرمندہ روز جزا ہوں گے

رو راست ریا سے ہو بیروں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

خوشدل قسمت پہ قانع ہو

ہنکار سوں دل کوں مانع ہو

بیننده قدرت صانع ہو

کس سوں کیا مطلب تجکوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

سیّد وارث شاہؒ

(۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء۔۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء)

پنجابی زبان کے کلاسیکی شعراء میں وارث شاہ کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کی تصنیف "ہیر" کو پہلے اور بعد کی تمام تصنیف شدہ "ہیروں" پر فوقیت حاصل ہے۔ وارث شاہ نے "ہیر" ۱۱۸۰ھ بمطابق

۱۷۶۶ء لکھی تھی۔

نبی سن یاراں سوا سیانی ہجری لے دیس وچ ایہہ تیار ہوئی۔ ❶

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا اور انگریزوں کے قدم مضبوطی سے جمتے جا رہے تھے۔ پنجاب میں گزشتہ پون صدی سے انتشار، افراتفری اور آپادھاپی کا دور دورہ تھا۔ ایسے زمانے میں سید وارث شاہ نے ایسے انداز میں ہیر تصنیف کی جس نے نہ صرف دُکھی دلوں کو سکون بہم پہنچایا بلکہ انسانیت و اخلاق کا درس بھی دیا۔

یہ عظیم شاعر لاہور کے نواح (جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے اور وہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ وارث شاہ کی ''ہیر'' پنجابی زبان کی شاہکار مثنوی ہے۔ لیکن جہاں تک اس مثنوی کے ذخیرہ الفاظ کا تعلق ہے اس میں کثرت سے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو نہ صرف قدیم اُردو کے ڈول کے ہیں بلکہ آج بھی اُردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔ پنڈت کیفی لکھتے ہیں کہ:

''اگر ڑاور ڑے کے لاحقوں کو اور چند مقامی خصوصیات کو نکال دیں تو وارث شاہ کی زبان اور ہماری انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی زبان میں کم فرق پایا جائے گا''۔ ❷

پنڈت کیفی نے وارث شاہ کے ہاں ایسے مستعمل الفاظ کی ایک نا تمام فہرست ❸ بھی دی ہے جو پنجابی اور اُردو میں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

''جگ (دنیا) مول (ابتدا) انگی، سبھے (سب) گنی (خوبیوں والا) دھندڑے (دھندے) ڈھلک (دمک۔شعاع) سنج (سانجھ۔شام) سویر، ہتھو ہتھ (ہاتھوں ہاتھ) کاہندا (کندھا) گبھرو، سندر، ٹھاٹھ، بجر، جھنجھٹ، آرسی، بھائی، دیور، نہال (خورسند) کھیاں کلنگ (کلنک) نہ بنے گی (گزارہ نہ ہوگا) اٹھکیلیاں، ٹھٹھولیاں، سوکن، جوبن جتیاں (جوتیاں) سدھارنا، ٹھگی، ڈھکیا (ڈھیکا) سورکھ، سگھڑ، متوالی، رسیلی، چھلانگ، سوہنی، مشٹنڈا،

---

❶ ہیر سید وارث شاہ، مرتب محمد باقر، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء ص ۳۶۶

❷ کیفیہ، پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، ص ۵۷

❸ کیفیہ، پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی، ص ۵۸

ڈوم وغیرہ۔

اور اسی ضمن میں کیفی مزید لکھتے ہیں کہ ''یہ سارے الفاظ اُردو میں بولے جاتے ہیں۔ زیادہ تر فرق لہجے کا ہے۔ لسانی اور صرفی تخالف بہت ہی تھوڑا ہے''۔ ❶

''ہیر'' میں صرف ایسے الفاظ ہی نہیں ملتے جو اُردو اور پنجابی میں مشترک طور پر مستعمل ہیں بلکہ بہت سے ایسے مصرعے کے مصرعے بھی ملتے ہیں جو کم وبیش اُردو اور پنجابی میں یکساں طور پر مشترک ہیں۔ مثلاً یہ چند مصرعے ❷ دیکھیے:

☆ مُلّاں آکھیا ''اونا معقول جٹا'' فرض کج کے رات گزار جائیں

☆ فجر ہوندی نوں اگوں ای اُٹھ ایتھوں سر کج مسجدوں نکل جائیں

☆ اِک گھڑی نہ چین ہے اوس نڈھی کیہا ٹھو کیو پریم دا بان میاں

☆ دل فکر گھیریا بند ہو یارانجھا جیو غوطے کھائے لگ بیٹھا

☆ آواز آئی بچہ رانجھیا او تیرا مجھ مقابلہ ہو رہیا

اور بقول مصنف تاریخ ادب اُردو:

''ان مصرعوں میں اُردو کی آوازیں اس کا لہجہ اس کے الفاظ پنجابی کے ساتھ گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ ''ہیر'' جیسی ٹھیٹھ پنجابی تصنیف میں بھی اُردو ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہے''۔ ❸

حضرت وارث شاہ پنجابی زبان کے بہترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی ''ہیر'' اس قدر مقبول ہے کہ اس کے سامنے ان کا دوسرا کلام غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا اُردو کلام بھی ہے تو جبھی کی بنا پر دستبرد زمانہ سے نہ بچ سکا۔ حالانکہ پنجابی کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے فارسی اور اُردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ حافظ

---

❶ ایضاً

❷ تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۶۵۷/۶۵۸

❸ تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل)' ص ۶۵۷'۶۵۸

محمود شیرانی نے ان کی دس اشعار پر مشتمل ایک اُردو غزل مولوی محبوب عالمؒ ایڈیٹر پیسہ اخبار کی ایک بیاض سے پنجاب میں اُردو میں نقل کی ہے۔ جس میں سے چند اشعار یہ ہیں [1]:

جس دن کے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا
اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار بھی بیزار ہویا

دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں
وہ ساقی صاحب جام نہیں اب پینا ے دشوار ہویا

بن جانی جان خراب بھی با آتش شوق کباب بھی
جوں ماہی بحر آب بھی نت رروں ساتھ بے پار ہویا

مجھے پی اپنے کو لیاؤ رے یا مجھ سوں پی پہنچاؤ رے
ایہہ اگن فراق بجھاؤ رے سب تن من جل انگار ہویا

تب مجنوں کامل ہویا تھا جب لیلیٰ کہہ کر رویا تھا
وہ یک دم کج سویا تھا اب لگ نیک شمار ہویا

سو میں اب مجنوں وار بھی پردیس بدیس خوار بھی!
اوس پی اپنے کی یار بھی اب میرا بھی اعتبار ہویا

جب وارث شاہ کہلایا نے تب روح سوں روح ملایا نے
تب کج سہاگ سولایا نے جیو جان مخزن اسرار ہویا

اشرف نوشاہیؒ:

(۱۱۵۵ھ/۳۲-۱۷۴۲ء۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)

اشرف نوشاہی کا نام پنجاب میں اُردو کی خدمات کے سلسلہ میں بڑا اہم ہے۔ آپ کے سوانحی حالات بہت کم دستیاب ہو سکے ہیں۔ مختلف حوالوں سے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ آپ کا پورا نام محمد

---

[1] پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۳۱۸، ۳۱۹

اشرف تھا اور اشرف ❶ ہی تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام مولانا عزیز الدین بن مولانا محمد معصوم فاروقی تھا۔ آپ گوجرانوالہ کے نواحی موضع پانڈوکی میں پیدا ہوئے جو آپ کے آباء و اجداد کا مسکن تھا۔ آپ "قاضی" اور "مفتی" جیسے جلیل القدر مناصب پر فائز رہے تھے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ آپ پانڈوکی سے ترک سکونت کر کے موضع کالیکی ❷ تحصیل وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں آپ نے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں بعمر ستر سال انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار بھی اسی موضع میں واقع ہے۔

بحیثیت شاعر آپ کی حیثیت مسلّم ہے۔ مصنف تذکرہ شعرای پنجاب لکھتے ہیں کہ:

"بزبان ہائی پنجابی و اُردو و پارسی شعری سرود۔" ❸

اور تذکرہ میں بطور نمونہ کلام کچھ فارسی اشعار بھی دیئے ہیں۔ پروفیسر قاضی فضل حق لکھتے ہیں کہ:

"ان کی پنجابی کافیاں فرقہ نوشاہیہ کی مجالس وجد و حال میں بہت مقبول ہیں۔ فارسی، اُردو اور پنجابی کے پرگو شاعر تھے"۔ ❹

آپ نے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں ایک کتاب "کنز الرحمۃ" کے نام سے فارسی میں لکھی جس میں اپنے سلسلہ کے پیر و مرشد حاجی محمد نوشہ (م۔ ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء) کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد اور ان کے خلفاء کے حالات و کرامات فارسی زبان میں نظم کیے ہیں۔

اشرف نوشاہی اس دور کے شاعر ہیں جو شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ سرزمین لکھنؤ، دہلی اور ان کے ساتھ ساتھ پنجاب میں قدیم رنگ بیان کو ترک کرنے اور جدید رنگ کو اپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اشرف نوشاہی نے قدیم اور جدید دونوں رنگوں کو آتے جاتے دیکھا ہے

---

❶ پروفیسر قاضی فضل حق نے "پنجاب میں اُردو" مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۳۳ء ص ۸۸ پر آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ "ان کا اصلی نام عزیز الدین تھا مگر بچپن سے ہی لوگ اشرف کے نام سے پکارتے تھے آخر میں یہی نام مشہور ہو گیا۔"

❷ قاضی فضل حق صاحب نے ان کے احوال میں موضع کالیکی ضلع گوجرانوالہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ بلکہ بحوالہ بالا لکھا ہے کہ "آپ بعد میں موضع منجر (چھنہ) ضلع گوجرانوالہ میں چلے گئے تھے"۔

❸ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید، ص ۳۳

❹ قاضی فضل حق، پنجاب میں اُردو، ص ۸۸

اور خود کو بھی اس کے مطابق بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں قدیم معیار کی تقلید بھی ہے لیکن اس نئے معیارِ سخن کا پرتو بھی بخوبی نظر آتا ہے جو شمالی ہندوستان میں مرزا محمد رفیع سودا (۱۱۱۸ھ/ ۷-۱۷۰۶ء-۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) اور میر تقی میر (۱۱۳۵ھ/ ۲۳-۱۷۲۲ء-۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) سے شروع ہوتا ہے۔ مصنف تاریخ ادب اُردو لکھتے ہیں کہ:

> ''اس دور تک آتے آتے زبان و بیان کے سب دھارے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ قدیم انداز جدید طرز و اسلوب میں جذب ہو کر ایک نیا رُوپ دھار لیتا ہے۔ اشرف نوشاہی کے ہاں قدیم اور جدید دونوں رنگ الگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور مل کر ایک ہوتے ہوئے بھی'' [1]

دونوں رنگ ملاحظہ کیجیے:

جن نے رُخ اُوپر وہ زُلف پیچا ڈالی ہے
کہو کیا چاند چودس پر گویا یہ رات کالی ہے
مجھے اُمید تھی اس ماہ رُو سیں کام پاؤں گا
نجانا تھا یقیں کر کے کہ آخر چاند خالی ہے
تیرے بن باغ میں لگتا نہیں دل آشناواں کا
نظر میں چشم نرگس کے یکا یک دام خالی ہے
مویاں میں نام دلبر کا نہیں ہوتا جدا دل سیں
کہ دل کی نخل تاب عشق کے پانی سیں پالی ہے
کہوں ظالم کوں کس مظلوم کا پیتا ہے خوں امروز
کہ آگے سے زیادہ اُن لباں پر خون لالی ہے
تیری اس خوش ادائی سیں رقیبوں کو نہیں پروا
کہ اشرف عشق تیرے میں دیوانہ لا اُبالی ہے [2]

---

[1] تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) صفحہ ۲۶۸

[2] پنجاب میں اُردو (ضمیمہ نمبر ۲) قاضی فضل حق، ص ۳۰۴

بہار آئی ہے اے بلبل چمن میں آشیاں کیجے
گلوں کے آونے کی تہنیت ورد زباں کیجے
چمن میں جام ہے مے ہے بجن ہے اور ساقی ہے
چلو یارو شتابی سیں چمن میں جا مکاں کیجے
نہ کچھ بے وفائی سوں غرور حسن کی ہرگز
وفاداری میں ہر لحظہ بہار بے خزاں کیجے
تلی پر لے کھڑا ہوں جان تیرے کے تصدق پر
اگر نہیں مانتا مجھ کو تو آ کر امتحان کیجے
ملامت کا نشانہ ہو رہا اشرف تیرے در پر
نگہ سوں تیر آرش اور ابرو کی کماں کیجے ❶

پیر مُراد شاہ لاہوری:

(۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء۔۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء)

غلام رُکن الدین مراد شاہ، پیر کرم شاہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ❷ تھے۔
آپ ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ آپ کے والد سکھوں کی چیرہ دستیوں اور لوٹ مار سے عاجز آ کر ترک وطن ❸ کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ چار سال قیام کے بعد اپنے والد کے ہمراہ واپس لاہور آ رہے تھے کہ دوران سفر میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ جس

---

❶ پنجاب میں اُردو (ضمیمہ نمبر ۲)، قاضی فضل حق، ص ۳۰۲

❷ پیر مراد شاہ پانچ بہن بھائی تھے جن میں مراد شاہ سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی پیر قلندر شاہ، ان سے چھوٹے پیر سکندر شاہ اور سب سے چھوٹے پیر فرخ بخش تھے۔ پانچویں بہن تھیں جن کا نام مبارک سلطان تھا۔ (بحوالہ تاریخ جلیلہ، غلام دستگیر نامی، مطبوعہ صابر الیکٹرک پریس، لاہور ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء، ص ۱۹۹

❸ نامی صاحب نے لکھا ہے کہ پیر کرم شاہ اپنے خسر امارت مرتبت شیخ نور الحسین خان عقیل الہاشمی کی ملاقات کے لیے ۱۱۹۶ھ میں مع اہل وعیال لکھنؤ گئے تھے۔ (بحوالہ مندرجہ بالا)

میں آپ کے والد کام آئے۔ والد کے انتقال کے بعد وطن کی واپسی معرض التوا میں پڑ گئی تاہم ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء کے اوائل میں وطن واپس آ گئے اور پھر تا حیات لاہور میں ہی رہے۔ ۵ محرم الحرام ۱۲۱۵ھ ❶ کو بعمر اکتیس سال آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار نواح لاہور تحصیل شاہدرہ کے موضع ملک مردانہ کھوکھر میں آج بھی مرجع خلائق عام ہے۔

پیر مراد شاہ خطہ لاہور کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زبان لکھنؤ کا بیج سرزمین پنجاب میں لگایا۔ وہ ایک ذہین اور طباع انسان تھے۔ شاعری کا ملکہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، اس پر لکھنؤ کے سات سالہ قیام نے' جہاں شب و روز شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا' سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر میں یعنی لکھنؤ سے واپسی سے کچھ ہی ایام پہلے ایک منظوم خط اپنے عزیزانِ وطن کو لکھا جو نامۂ مراد ❷ کے نام سے ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ نامۂ مراد کے علاوہ مثنوی'' مراد المحبین'' مثنوی'' مراد العاشقین''، ''گمس نامہ''، ''موش نامہ'' دیوان مراد اور فارسی میں ایک ترجیع بند ''نامریداں'' (بروزن ما مقیماں) ان کی تصانیف ہیں۔

نامۂ مراد میں انھوں نے اپنی ذاتی اور گھریلو باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے عام خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شاہان اودھ کی داد و دہش اور علم دوستی سے لکھنؤ جگمگا رہا ہے۔ شعر و شاعری کی طرف عام و خاص کا رجحان ہے چنانچہ لکھنوی رنگ شاعری کا اثر مراد شاہ پر بھی پڑا۔ یہ خط بہت کم وقت میں لکھا گیا ہے جیسا کہ اس کے متن میں اس امر کا ذکر بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود مراد شاہ کی زبان صاف' سلیس' رواں اور بامحاورہ ہے اور کلام میں پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ نامۂ مراد میں ذکرِ قبولیت اُردو کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ ❸

وہ اُردو کیا ملے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

---

❶ تاریخ جلیلہ' غلام دستگیری نامی' ص ۲۰۰

❷ نامہ مراد' شائع کردہ پیر غلام دستگیر نامی متولی اوقاف اشرف پیر عبدالجلیل چوہڑ بندگی لاہور' طبع ثانی ۱۳۷۰ھ جس میں گمس نامہ اور موش نامہ بھی شامل ہے۔

❸ تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اول) ' ص ۶۶۰

کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں
کروں ، شہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں
سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں!
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں
کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہوجائے سب تک
یہاں سے تابایاں تل عرب تک
پسندِ طبع وزراء و شہاں ہے
غرض جو کچھ ہے اب اُردو زباں ہے

یہ بات اُردو کی لسانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ''نوطرز مرصع'' کے مصنف عطا حسین خاں تحسین نے نثر میں اور مراد شاہ نے نظم میں اُردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے استعمال کیا۔ شیرانی صاحب مراد شاہ کے احوال میں لکھتے ہیں کہ:

''لفظ اُردو کا استعمال ان کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لائے ہیں''۔ ❶

مراد شاہ کی مختصر مثنویاں ''مگس نامہ'' اور ''موش نامہ'' اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مگس (مکھی) اور موش (چوہے) کو علامت بنا کر اشاراتی زبان سے اس دور کے حالات اور ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ ذیل میں ہم مثنوی ''مگس نامہ'' سے چند اشعار ❷ دیتے ہیں جن سے مثنوی کے انداز بیاں لطافت اور اشاراتی زبان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

---

❶ پنجاب میں اُردو: حافظ محمود شیرانی' ص ۳۲۹
❷ تاریخ ادب اُردو: ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۶۶۱' ۶۶۲

شہر لاہور قبۂ اسلام
روشن آفاق میں ہے جس کا نام
تھا بہشت بریں بر روئے زمیں
عجب انساں تھے اس مکاں کے مکیں
اولیاء و مشائخ و سادات
علماء اِک سے اِک ستودہ صفات
شہر تھا یا کہ کانِ علم و ادب
کان کیا بلکہ جانِ علم و ادب
رشکِ آبادیٔ جہاں تھا یہ
الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
کوئی اس میں پڑا جو بوم قدم
ہے اب اس کا وجود رشکِ عدم
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے
سکھیوں کی غرض دہائی ہے
زر تو شاہ زماں سدھارے لے
سکھیوں کو گئے اجارہ دے
اسی صورت سے آگے احمد شاہ
تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ
اب ہیں پر سکھیوں سے سب لاچار
ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار

مراد شاہ نے "قصہ چہار درویش" کو "مراد العجیبین" کے نام سے اُردو میں نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر پہلے درویش کی سیر کے حال کے ساتھ ہی اسے ختم کر دیا۔ یہاں تک کل اشعار کی

تعداد تقریباً پندرہ سو ❶ ہے۔

اس مثنوی کے انداز بیان و زبان کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''زبان سلیس اور با محاورہ ہے اور مراد شاہ اس پر ایسی قدرت کا اظہار کرتے ہیں اور قصے کو ایسی خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ با محاورہ زبان کا استعمال ساری مثنوی میں قدم قدم پر نظر آتا ہے''۔ ❷

اگرچہ مراد شاہ غزل بھی کہتے تھے لیکن مثنوی کے باب میں وہ غزل سے کہیں زیادہ آگے نظر آتے ہیں جیسا کہ شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ اس میدان میں وہ کسی سے کم نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں۔ متواتر سات سال ہندوستان میں رہنے کی بنا پر زبان بالکل صاف ہوگئی ہے۔ سلاست اور روانی کے علاوہ کلام میں پختگی موجود ہے''۔ ❸

سکندر شاہ امداد لاہوری:

(۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء۔۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء) ❹

آپ حضرت کرم شاہ کے فرزند ارجمند اور پیر مراد شاہ لاہوری' مشہور شاعر و صوفی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ سلسلہ سہروردیہ کے جلیل القدر بزرگ حضرت شیخ قطب العالم عبدالجلیل چوہڑ بندگی کی اولاد میں سے ہیں۔ جیسا کہ پیر مراد شاہ کے احوال میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ کے والد سکھوں کی چیرہ دستیوں اور مار دھاڑ سے تنگ آ کر ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ سکندر شاہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ جہاں آپ سات سال رہنے کے بعد اپنے بھائی پیر مراد شاہ کے ہمراہ ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں لاہور آ گئے مگر وطن میں کچھ ہی عرصہ بعد ہی عین عنفوان شباب میں بعمر بیس سال ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں انتقال

---

❶ تاریخ ادب اُردو' ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) ص ۶۶۲

❷ ایضاً' ص ۶۶۳

❸ پنجاب میں اُردو' حافظ محمود شیرانی' ص ۳۲۸

❹ تاریخ جلیلہ' غلام دستگیر نامی' ص ۲۰۵

ہو گیا۔ آپ کا مزار احاطہ خانقاہ حضرت عبدالجلیل چوہڑ بندگی میں واقع ہے۔ مصنف تذکرہ شعرای پنجاب لکھتے ہیں کہ:

''در شجاعت و جود و سخا و زہد و تقویٰ عدیل در روزگار نداشت و صاحب عرفان بود۔ ❶

نامی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''آپ احوال عجیب رکھتے تھے۔ رقیق القلب اور صاحب درد تھے۔ آپ کی طبع خوب موزوں تھی''۔ ❷

پیر مراد شاہ نے اپنے جواں مرگ بھائی کو اس طرح یاد کیا ہے:

جو پیروں نے برسوں میں حاصل کیا
خدا نے سو تھا اس جوان کو دیا
جو کچھ طبع زاد اس کا یاد آئے ہے
تو جان سُن سُنا کر نکل جائے ہے
کسے یاد ہے جو اسے یاد تھا
ہر اِک فن میں گویا وہ اُستاد تھا
فقیری میں رکھتا تھا کسبِ کمال
جہاں کو سمجھتا تھا خواب و خیال
تجرد کے عالم میں اِک فرد تھا
جواں مرد تھا صاحب درد تھا
بہ عصر دلم ہچو یوسف عزیز
سکندر خصائل ارسطو تمیز ❸

---

❶ تذکرہ شعرائے پنجاب' خواجہ عبدالرشید' ص ۶۰

❷ تاریخ جلیلہ' غلام دستگیر نامی' ص ۲۰۵

❸ ایضاً' ص ۲۰۶

مراد شاہ کی طرح سکندر شاہ بھی بڑے خوش گو شاعر تھے اور امداد تخلص کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی مراد شاہ سے ہی اصلاح لیتے تھے جیسا کہ خود ان کا کہنا ہے:

فیض شاہ مراد سے امداد
ہم نے باندھے ہیں ریختوں کے پل ❶

شیرانی صاحب نے آپ کی ایک غزل "پنجاب میں اُردو" کی زینت بنائی ہے جسے ہم بھی بطور نمونہ کلام ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ❷:

بادہ و جام ساقی و گل و مُل
ہے نہیں ہائے اِک وہ غیرت گل

شب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا
شیشہ ہر چند کہہ رہا قُل قُل

زلفِ مشکیں کو دیکھ کر اس کی
کٹ گیا آج طرۂ سنبل

جس گل اندام کے لیے میں نے
کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گل

سو اشارہ میں اس کے خوں میرا
لے گیا اس کا زنگئے کاکل

دیکھ کر اس پری کو ہوش و حواس
آہ پرواز کر گئے بالکل!

فیض شاہ مراد سے امداد
ہم نے باندھے ہیں ریختوں کے پل

---

❶ پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، ص ۳۳۳

❷ ایضاً

آپ نے اگرچہ بہت کم عمر پائی تھی لیکن کلام سے استادانہ رنگ صاف جھلک رہا ہے اور زبان و بیان کا وہی انداز ہے جو اس وقت کے شمالی ہندوستان کے شعراء کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

فقیر سید نور الدین منور:

(۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء۔۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء)

لاہور کے فقیر خاندان ❶ کو سکھی عہد میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس خاندان کے بزرگان اُچ شریف سیداں (نزد بہاول پور) میں سکونت پذیر تھے اور وہاں کی خلافت سادات ان کے سپرد تھی۔ ان میں سے فقیر سید غلام محی الدین فن طبابت و جراحی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے جو نواب خان بہادر کے اصرار پر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ فقیر سید غلام محی الدین کے تین بیٹے تھے۔ فقیر سید عزیز الدین' فقیر سید امام الدین اور فقیر سید نور الدین۔ یہ تینوں بھائی عربی اور فارسی کے یکتائے روزگار عالم تھے۔ فقیر سید عزیز الدین' مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے' آزاد تخلص تھا۔ ان کا قلمی دیوان فقیر خانہ اندرون بھاٹی دروازہ لاہور میں محفوظ ہے۔ فقیر سید نور الدین مہاراجہ کے سرکاری دواخانہ کے نگرانِ اعلیٰ تھے۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے اور منور تخلص کرتے تھے۔ ان کے فارسی کلام کو تو ڈاکٹر محمد لطیف نے مرتب کر کے پیکجز لاہور کے زیر اہتمام شائع کر دیا ہے تاہم اُردو کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

فقیر سید نور الدین منور کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۵۲ء بمطابق ۵ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ بروز ہفتہ لاہور میں ہوا۔ مولوی احمد بخش یکدل نے تاریخ وفات کہی:

''از جہاں موجد سیادت رفت'' (۱۲۶۸ھ)

---

❶ مولوی نور احمد چشتی نے اس خاندان کے حالات اپنی تصنیف ''تحقیقات چشتی'' میں صفحہ ۱۶۷ تا ۱۷۰ پر درج کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ: ''یہ فقیر صاحبان اوّل مہاراجہ کے معالج اور پھر شدہ شدہ وزیر باتوقیر اور مدار المہام مقرر ہوئے مگر سبحان اللہ بے دولتِ فقر باوجود رکن رکین سلطنت مہاراجہ تھے مگر درویشی کو نہ چھوڑا ہمیشہ رنگ گیرو مطبوع طبع رہا' (ہمیشہ دستار برنگ گیرو رکھتے تھے) اور عجز و انکساری یہاں تک تھا کہ مشہوری خاندان بیاسم فقیر صاحبان ہوئی۔۔۔۔ تمام لوگ ملک پنجاب کے ان کی لیاقت دیکھ کر اس محلہ کو قطعہ یونان کہتے ہیں اور بے شائبہ یہ امر حق ہے''

گوہر نوشاہی اپنے مقالے ''لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات'' میں مولوی احمد بخش یکدل کے احوال میں ضمناً منور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مولوی یکدل کی اطلاع کے مطابق نورالدین منور صرف حمد' نعت' منقبت اور مدح کہتے تھے۔ ان کے فارسی اور اُردو کلام میں بہت کم اشعار ان موضوعات سے ہٹ کر ملتے ہیں [1]

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:

''ان کا فارسی اور اُردو غزلیات پر مشتمل دیوان ضخیم ہے۔ جس میں ہر چند فارسی غزلیات کی تعداد زیادہ ہے لیکن اُردو کلام بھی خاصی مقدار میں ہے۔ [2]

آپ کے کلام کا نمونہ:

قرص نان مہ و مہر کر کے گدائی تیری
تب بھی چرخ نے کی زلّہ ربائی تیری

جب وہ عاشق ہے ترا جس پہ خدا ہے عاشق
واہ تیرا شان ہے اور واہ بڑائی تیری

بلکہ وہ آپ ہو یا شیفتہ حسن رُخت
جس نے ہاتھ اپنے سیں تصویر بنائی تیری

شب کے پردے میں چھپاتا ہے رُخ اپنا خورشید
جبکہ سنتا ہے شہا چہرہ کشائی تیری

یا حسین ابن علی کثرت افکار سیں اب
ہو کے لاچار میں دیتا ہوں دہائی تیری

خاک پاک در زہرا کروں اب سرمۂ چشم
بخت گر ہووے مجھے راہنمائی تیری

---

[1] لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات' گوہر نوشاہی' ص ۸۶

[2] ایضاً

کہہ قبول ام شہ آگے منور کا سلام
اے صبا کیجیو عرض گر ہو رسائی تیری ❶

☆☆☆

حضرت خیر الوریٰ مالکِ قدر و قضا
سیّد ہر دوسرا ڈھونڈے تری یہ رضا
جز سے لے تا بہ کل، خار سے لے تا بہ گل
عام سے لے تا رسل، خلق سے لے تا خدا
اور یہ سب ہیں تیرے واسطے پیدا ہوئے
اے مہ عالی لقب، صاحب جدّ و علا
ذرّے سے لے تا بہ خور، صدف سے لے تا بہ دُر
بندہ سے لے تا بہ حُر، بوم سے لے تا ہما
بج سے لے تا ثمر، سمک سے لے تا قمر
زیر سے لے تا زبر، فرق سے لے تا بہ پا
عرض کرے نور دیں، سجدے میں رکھ کر جبیں
اے شہ دُنیا و دیں، سیّد حاجت روا ❷

مولوی احمد بخش یکدل:

(۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء۔۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء)

مولوی احمد بخش یکدل، مولوی نور احمد چشتی مؤلف تحقیقات چشتی اور مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر ''رفیق ہند'' کے والد تھے۔ لاہور میں معلّمی کرتے تھے۔ جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔ ❸ لاہور کے بڑے

---

❶ لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات، گوہر نوشاہی، ص ۸۶۔۸۷

❷ اُردو شاعری میں لاہور کا حصہ، گوہر نوشاہی، مقالہ ایم۔اے اُردو غیر مطبوعہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ص ۳۳

❸ تحقیقات چشتی، مولوی نور احمد چشتی، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۲۳

بڑے معزز سکھ، ہندو اور مسلمان آپ سے اکتساب علم کرتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دیوان راجہ دینا ناتھ کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ راجہ دینا ناتھ کے بھائی دیوان کدار ناتھ کی شادی میں لاہور سے دلی گئے تو بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے پر وہاں سے "فخر الشعراء" کا خطاب ملا اور انعام واکرام سے نوازے گئے۔ اس واقعے سے متعلق نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ:

"............حتی کہ جب بتقریب شادی صاحب زادہ دیوان کدار ناتھ صاحب برادر راجہ دینا ناتھ صاحب کے گئے تو اس بہادر شاہ سے............ان کو خطاب فخر الشعراء ملا اور ایک مہر بدر الدین مہر کن کی دستخطی حضرت بہادر شاہ نے والدم کو بایں عبارت کندہ کرا کر عطا فرمائی: فضیلت پناہ، یکدل آگاہ، فخر الشعراء مولوی احمد بخش یکدل، فدوی محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی۔ اور ماسوا اس کے تیرہ پارچہ کا خلعت مع دو رقم جواہر آپ کو اور سات پارچہ کا فدوی مؤلف کتاب ہذا کو عطا ہوا اور ہر طرح سے بمراحم شاہانہ وتلطفات خسروانہ سرفرازی بخشی"۔ [1]

مولوی صاحب کو شعر و شاعری سے خصوصی شغف تھا اور فن تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے ۱۸۲۱ء سے لے کر ۱۸۶۱ء تک کی مسلسل روزانہ واقعات کی مفصل ڈائری بیس جلدوں میں مرتب کی تھی [2] جو ابھی تک ان کے وارثوں کے پاس غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔

علم و ادب، دانش و حکمت اور تاریخ نویسی کا یہ آفتاب ۲ نومبر ۱۸۶۷ء کو غروب ہوا۔

نمونہ کلام یکدل [3]:

جان میری اگر تیری گلی جائے
پہنچے نہ کوئی اگر چلی جائے

---

[1] تحقیقات چشتی، مولوی نور احمد چشتی، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۲۴، ۲۵

[2] لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، گوہر نوشاہی، ص ۱۶۷

[3] لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، گوہر نوشاہی، ص ۱۶۷

واقف نہیں کوئی میرے منہ پر
گر جائے بدی و گر بھلی جائے

اشکوں کے بہائے میں نے دریا
تس پر بھی یہ جاں مری جلی جائے

گرو ترے منہ کی کیا کہوں بات
شرمندہ ہوئی جہاں کلی جائے

یکبارگی آگ لگ اُٹھے گی
دوبارہ اگر حنا ملی جائے

چوکھٹ ہی تیری پہ سر رکھے ہے
گر آئے ہے قطب یا ولی جائے

اب دہلی سے تابہ حیدر آباد
لاہور سے دھوم یکدلی جائے

○○

عارض پہ نور ہے کیا خال دلبر کے تلے
چاند کے اوپر ہے اخترؔ چاند اختر کے تلے

سچ تو ہے ظالم کے سائے سے بھی بچنا چاہیے
چین سے کوئی نہیں چرخِ ستمگر کے تلے

اے تمنائے شہادتؔ دم مجھے لینے تو دے
حسرتِ دیدار قاتل بھی ہے خنجر کے تلے

یا تو وہ دن تھے کبھی تکیے تھے پھولوں میں پڑے
اب فلک کے جور سے ہیں خاک بستر کے تلے

حال دل کا ہے یہی تیرے ستم سے اے صنم
شیشہ نازک کو رکھ کر دیکھ پتھر کے تلے
یا الٰہی آرزو یکدل کی ہے تجھ سے یہی
حشر کو ہوں دامنِ آل پیمبرؐ کے تلے

○○

وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا تھام اب تلک
ورنہ تو کر چکی تھی قضا کام اب تلک
یک جلوہ تیرے حسن کا مہتاب پر ہوا
جھانکا کرے ہے آکے لب بام اب تلک
ساقی یہ چرخ دور ہلالی تو بھر چکا
خالی رہا ہے کیوں یہ مرا جام اب تلک
شورجنوں میں عیش میں تھا روز و شب غریق
میں نے نہیں سنا تھا ترا نام اب تلک
چیں چیں کرے ہے مرغ دل اس دام زُلف میں
آہوئے چیں سنبھل تو کہ ہے دام اب تلک
اسپند ہو جلوں ترے ہندوئے خال پر
پر توسنِ فلک نہ ہوا رام اب تلک
گر اس کے دل کو میری طرف سے پھرا دیا
پاوے نہیں ہے چرخ بھی آرام اب تلک
قطع نظر ہے خاص سے میں عام میں ملا
عامی نہیں سمجھتا مجھے عام اب تلک
یکدل جو بول چال ہے اُردو زبان کی
کرتا ہوں شاہ دہلی سے میں وام اب تلک

دیوان امرناتھ اکبری:

(۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء۔۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء)

دیوان پنڈت امرناتھ صاحب مدن اکبری' مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دیوان راجہ دیناناتھ کے بڑے بیٹے تھے۔آپ کے بزرگوں کا اصل وطن دہلی تھا مگر آپ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے یہیں نشوونما پائی اور اپنے زمانے کے فاضل روزگار شخص مولوی احمد بخش یکدل سے تعلیم حاصل کی۔ اکبری حضرت قلندر شاہ سے ارادت قلبی رکھتے تھے اور ان کے مرید ہو گئے تھے۔ ❶

آپ مہاراجہ رنجیت سنگھ' مہاراجہ دلیپ سنگھ اور الحاق پنجاب کے بعد انگریزی سرکار میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔اکبری جہاں خود اچھی قابلیت اور علمیت کے حامل تھے وہیں بڑے علم دوست اور علم پرور بھی تھے۔آپ کے پاس ہمیشہ اصحاب علم و دانش کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔پنڈت سری رام خمخانۂ جاوید میں رقم طراز ہیں کہ:

> "دیوان صاحب مغفور نہایت باخبر' مطالعہ پسند' لائق' فقیر دوست امیر تھے۔سیاحی کا بڑا شوق تھا۔چنانچہ اکثر بلاد ہندوستان مثل بنارس' گیا' لکھنؤ دہلی کی سیر کی تھی۔علم ہندسہ و حساب میں وحید زمانہ تھے"۔ ❷

انجام کار ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں بعمر پینتالیس سال سرگباش ہوئے۔

اکبری اعلیٰ درجے کے مورخ اور فارسی کے بڑے اچھے ادیب تھے۔مہاراجہ کی فرمائش پر اس کی زندگی کے حالات لکھے جو نہایت مفصل اور مکمل ہیں۔۱۹۲۸ء میں اس کتاب کو پروفیسر سیتارام کوہلی نے اپنی شرح کے ساتھ "ظفرنامہ رنجیت سنگھ" کے نام سے پہلی مرتبہ شائع کیا۔

اکبری فارسی اور اُردو کے شاعر تھے۔شعر کہنے کا ملکہ فطری تھا اور صغیرسنی سے ہی شعر کہتے تھے اس پر استاذ مولوی احمد بخش یکدل کی صحبت نے اور جلا بخشی چنانچہ استادانہ رنگ میں شعر کہنے لگے مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی۔آپ کا دیوان فارسی قصائد اور اردو غزلیات پر مشتمل ہے جسے آپ کے صاحبزادے

---

❶ تذکرہ شعرائے پنجاب' خواجہ عبدالرشید' ص ۵۰

❷ خمخانہ جاوید' پنڈت سری رام لالہ (جلد اوّل) ص ۳۹۰

پنڈت رام ناتھ مرحوم سابق ڈسٹرکٹ جج نے مطبع کوہِ نور لاہور سے ۱۸۷۳ء میں شائع کرا دیا تھا۔

انتخاب کلام یہ ہے ❶

مردانِ خدا خواہشِ دُنیا نہیں کرتے
آزاد رہ و رسم کی پروا نہیں کرتے

کیوں ہم کو دکھاتے نہیں تم دستِ حنائی
ہم خون کا کچھ آپ پہ دعویٰ نہیں کرتے

کب مانگتے ہیں کاکلِ شب رنگ سے ہم دل
عشاق یہ دن کو تقاضا نہیں کرتے

فردوس میں جانے کی نہیں ہم کو تمنا
سولی کی قسم خواہشِ عقبےٰ نہیں کرتے

عاشق کا ستانا نہیں معشوق کو منظور!
جو ہم کو ستاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے

ہم عشق میں سردار ہیں منصور کے اس دم
سرمایۂ کونین پہ سودا نہیں کرتے

غیروں سے کرم کرتے ہیں اور ہم سے مدارا
در پردہ وہ عشاق پہ کیا کیا نہیں کرتے

محفل میں غریبوں کے شرافت کہو ہم کو
اس طور کبھی دوست کو رسوا نہیں کرتے

ہر وقت تصور ہے مجھے آپ کا دل میں
کس بزم میں ہم آپ کا چرچا نہیں کرتے

---

❶ دیوانِ اکبری، امر ناتھ اکبری، مطبوعہ مطبع کوہِ نور لاہور، ۱۸۷۳ء مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص ۱۲۳، صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲ بالترتیب

اے اکبرِ زار یہ مصرع ہے ظفر کا
"وہ کون سی مے ہے کہ گوارا نہیں کرتے"!

⚬⚬

انساں کو حق نے نور کا مظہر بنا دیا
اِک مشتِ خاک تھا جسے جوہر بنا دیا
خونِ جگر سے ہم نے کیا دل کو لالہ زار
داغِ جنوں سے دل کو مشجر بنا دیا
محرومِ وصلِ یار ہیں عہدِ شباب میں
فرقت نے اون کے ہم کو معمر بنا دیا
تم نے بنایا ذرہ سے کمتر ہمیں تو کیا
ہم نے تمہارے خال کو اختر بنا دیا
نالوں کا میرے پہنچ گیا صور تک اثر
دُنیا کو میں نے عالمِ محشر بنا دیا
کل ہم کو دیکھ کوچہ میں کہنے لگا وہ شوخ
اس رہگذر کو آپ نے کیا گھر بنا دیا
سوزِ جگر سے چشم میں آنسو ٹپک پڑے
سینہ تھا ایک دل اوسے پتھر بنا دیا
گردابِ غم میں غرق کیا مجھ کو یار نے
جو موج اُٹھی اوسے وہیں چکر بنا دیا
جس نے ضعیف جان کے مجھ کو دیا ہے زور
دستِ فلک نے اوس کو سمندر بنا دیا

دل اکبری نے آپ دیا زُلفِ یار کو
مومن کو مار مار کے کافر بنا دیا

✿✿

یارِ وحدت میں تعلق نہ کا جو پردہ اُٹھا
صاف ہستی کا ہمیں آپ ہی دھوکا اُٹھا ❶

✿✿

کون وہ ہے جو ترا طالبِ دیدار نہیں
کون اس چشمِ سیہ مست کا بیمار نہیں ❷

✿✿

چوتھا باب

انجمن پنجاب کا قیام اور پنجاب میں دیگر ادبی تحریکیں

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کہنے کو تو ۱۸۵۷ء تک قائم رہی لیکن دراصل حکومت کی طاقت اٹھارویں صدی کے وسط تک عملاً ختم ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے نہ صرف مسلمانوں کا رہا سہا بھرم کھول دیا بلکہ ان کی سطوت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ دلّی سلطنت کا مرکز تھا' اس لیے انگریزوں کا سب سے بڑا نشانہ بھی دلّی ہی بنا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی' جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا' کے بعد دلّی پر گویا تباہی و بربادی اور مصائب و آلام کا آسمان ٹوٹ پڑا اور ایک عرصہ تک قیامت صغریٰ برپا رہی۔ اب انگریز سیاہ و سفید کے مالک اور مختار کل تھے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف اور اس انقلاب کا ذمہ دار گردانتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے نزدیک مسلمانوں کو سزا دینے کے لیے ان کا یہ جرم ہی کافی تھا کہ وہ برصغیر کے حکمران رہے تھے۔ اب وہ فاتح تھے اور یہ مفتوح۔ مفتوح تو اگرچہ ہندو بھی تھے لیکن انگریزوں نے ایسی حکمت عملی وضع کی کہ ہندو اکثریت کو اپنے ساتھ ملایا جا سکے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوؤں کو یہ تاثر دیا کہ انگریزوں نے ہی ان کو مسلمانوں کی غلامی سے نجات دلائی ہے اور تاریخ کو مسخ کر کے ہندوؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ مسلمان حکمران متعصب تھے اور انگریزوں نے ہی ان کو اس تعصب سے بچایا ہے۔ ہندو آسانی کے ساتھ انگریزوں سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ انگریزی عمل داری میں ان کو بڑے بڑے عہدے دیے گئے اور مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ علاوہ ازیں مسخ شدہ تاریخ اور کامیاب پروپیگنڈے کی وجہ سے ہندوؤں میں بھی تعصب پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی عام کیفیت

ناگفتہ بہ اور قابلِ رحم تھی اور وہ نہ صرف انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے ہوئے تھے بلکہ ہندوؤں کے چرکے بھی سہتے تھے۔ دلّی پر انگریزوں کے ظلم و استبداد اور تشدد و بربریت کی الم انگیز داستان آج بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ جس پر حساس دل شعراء ❶ نے بھی خون کے آنسو بہائے ہیں اور دلی کی تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی عظمتِ پارینہ اور پُرشکوہ تہذیب و تمدن کے مٹنے کا ماتم کیا ہے۔ دلّی کی یہ کیفیت ذیل کے قطعے سے مترشح ہے۔ غالب کے اس قطعے ❷ کو ہم دلّی کی بزمِ آخر کا نوحہ کہہ سکتے ہیں:

بس کہ فعّال ما یُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا!
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا!
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

---

❶ اس سلسلے میں اپنے وقت کے اکثر شعراء نے مرثیے، نوحے، شہر آشوب، غزل یا قطعات کے ذریعے اظہارِ غم کیا ہے، جن میں غالب کے علاوہ مفتی صدرالدین آزردہ، قاضی فضل حسین افسردہ، منیر شکوہ آبادی، محمد علی تشنہ، نواب مرزا داغ، مرزا قربان علی بیگ سالک، حکیم محمد تقی سوزاں، سید ظہیرالدین ظہیر، حکیم آغا جان عیش، مرزا باقر علی کامل، حافظ غلام دستگیر مبین، حکیم محمد محسن اور خواجہ الطاف حسین حالی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

❷ اس قطعے کے علاوہ غالب کی غزلیات کے بہت سے اشعار کا پس منظر بھی ۱۸۵۷ء کا سانحہ ہے، علاوہ ازیں غالب کے نجی خطوط میں بھی اکثر و بیشتر جگہوں پر اس سانحہ عظیم اور اس کے اثرات کا ذکر ملتا ہے۔

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا ❶

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد جب دلّی کی سیاسی اور معاشرتی حیثیت ملیامیٹ ہوگئی، لکھنو بھی اُجڑ گیا تو فن وحکمت اور شعروادب نے دلّی کو چھوڑ کر مختلف علاقوں کا رُخ کیا۔ کچھ لوگ رام پور چلے گئے، کچھ حیدر آباد (دکن) پہنچے اور کچھ پنجاب کے گلزاروں کی رونق بنے۔ علاقہ پنجاب چونکہ تحریک آزادی کے دوران میں اس لحاظ سے تقریباً غیر جانبدار ہی رہا تھا کہ یہاں سے آزادی کے متوالوں کی بوجوہ ❷ صحیح انداز سے امداد نہ ہوسکی تھی۔ لہٰذا یہاں امن تھا۔ ویسے بھی پنجاب پر انگریزوں کا مکمل تسلط تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں یہاں کے سکھ باشندوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور سکھوں نے سقوط دہلی میں بھی انگریزوں کی مقدور بھر حمایت ❸ کی تھی۔ لہٰذا پنجاب کی ترقی میں انگریزوں نے بھرپور دلچسپی لی۔ پنجاب میں یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو چیف کمشنر کا عہدہ ختم کر دیا گیا، اس کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر کا تقرر عمل میں آیا اور دہلی کو پنجاب کے ماتحت کر دیا گیا۔ جس سے لاہور کی سیاسی اہمیت مزید اُجاگر ہوئی۔ چنانچہ شعروادب اور تعلیم وتعلّم سے منسلک لوگ کشاں کشاں لاہور کی جانب آئے۔ جن کے

---

❶ خط بنام مرزا علاؤالدین احمد خاں صاحب بہادر، محررہ مئی ۱۸۶۱ء اردوئے معلّیٰ، جلد دوم حصہ اوّل، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۵۷۔۵۸

❷ ان وجوہ کا تفصیلی ذکر پہلے باب کے آخری حصے میں آچکا ہے۔

❸ اسی حمایت کی بنا پر جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے صوبہ پنجاب کو وسعت دی اور ضلع حصار کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر سرجان لارنس نے پنجاب کے لیے ملکہ وکٹوریہ سے خاص مراعات حاصل کیں اور مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ نابھہ اور مہاراجہ کپورتھلہ کو خصوصی انعامات دیے (بحوالہ تاریخ پنجاب، اقبال صلاح الدین، مطبوعہ عزیز پبلشرز لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۵۸۲

سرخیل مولوی محمد حسین آزاد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دہلی کے مشاہیر جن میں ماسٹر پیارے لال آشوب [1] پنڈت من پھول' منشی درگا پرشاد نادر' مرزا اشرف بیگ خاں اشرف' مولوی امو جان ولی' خواجہ الطاف حسین حالی' مولوی کریم الدین' مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ اور مرزا ارشد گورگانی کے نام شامل ہیں' یکے بعد دیگرے یہاں تشریف لائے۔ مولوی محمد حسین کو' جو بلا شبہ دبستان لاہور [2] کے بانی کہلائے جانے کے مستحق ہیں' لاہور ایسا بھایا کہ انھوں نے یہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی اور تا دم آخر علمی و ادبی مشاغل میں معروف رہے۔

آزاد اور دوسرے مشاہیر کے آنے سے لاہور میں اُردو ادب کی متنوع' متعدد اور مختلف و متضاد تحریکیں اُبھرتی' پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی ہیں۔ جن کا ایک اجمالی سا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

انجمن پنجاب

مسلمانوں کے طویل دور اقتدار میں برصغیر کی سرکاری زبان فارسی رہی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کے عہد تک سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ لیکن کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۷ء میں اپنے مقبوضہ علاقوں میں فارسی کے بجائے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا [3] ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق ہوا تو یہاں بھی فارسی کی

---

[1] ماسٹر پیارے لال آشوب ۱۸۶۲ء میں پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر مقرر ہوئے تھے بعد ازاں وہ انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور دوسرے مشاہیر ماسٹر صاحب کی ترغیب سے ہی لاہور آئے تھے۔ لاہور میں اکٹھے ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت بڑی سرگرمی اور تندہی سے کی اور اسی وقت سے پنجاب میں اُردو کا چرچا اور ذوق عام ہوا۔ (بحوالہ مرحوم دہلی کالج' مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند)' دہلی ۱۹۴۵ء ص ۱۶۷' ۱۶۸)

[2] پروفیسر شہرت بخاری نے اپنے مقالے "ادبی تحریکیں" مطبوعہ نقوش لاہور نمبر ۱۹۶۲ء میں دبستان پنجاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لاہور چونکہ پنجاب کا مرکز' محور اور نمائندہ شہر ہے اس لیے ہم نے اسے "دبستان لاہور" ہی کہا ہے۔

[3] قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات (جلد اوّل' حصہ اوّل) مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' ۱۹۸۵ء ص ۳۵

جگہ اُردو کو دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر نافذ ❶ کر دیا گیا۔

چونکہ شعری اور ادبی زبان کے طور پر اُردو یہاں خاص و عام میں پہلے ہی مقبول تھی لہٰذا اس فیصلے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ الحاق پنجاب سے قبل سالہا سال تک پنجاب بدنظمی کا شکار رہا تھا۔ قدرے سکون میسر آیا تو نظم و نسق میں بہتری کے ساتھ ساتھ برصغیر کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی تعلیم کی اشاعت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پنجاب کے دیہات اور قصبات میں بول چال کی زبان کے طور پر پنجابی مقامی لہجوں میں رائج تھی' لیکن رو بہ انحطاط تھی چنانچہ حکومت نے طے کیا کہ:

"اُردو فارسی رسم الخط کے ساتھ حکومت کے زیر انتظام سکولوں میں پڑھائی جائے .... نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ پنجابیوں کو انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرنے کی بجائے دیسی زبان (اُردو) میں تعلیم دینے سے عملی طور پر بہتر نتائج نکل سکتے ہیں"۔ ❷

پنجاب میں محکمہ تعلیم کا قیام جنوری ۱۸۵۶ء میں عمل میں آیا۔ ❸ جس نے مختصر عرصے میں پنجاب بھر میں سکولوں کا جال بچھا دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۶۴ء میں لاہور اور دہلی میں گورنمنٹ کالج قائم ہو گئے۔ ❹ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹز کو گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ❺

ڈاکٹر لائٹز ایک دور اندیش' صاحب بصیرت اور اولوالعزم مفکر تھے۔ اس سے قبل وہ کنگز کالج لندن میں عربی اور فقہ اسلامی کے پروفیسر ❻ تھے اور ان کا شمار ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا۔ ایک بلند پایہ مستشرق ہونے کے ناطے انھیں مشرقی علوم سے مکمل آگاہی حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے خطۂ پنجاب

---

❶ ایضاً

❷ ایضاً

❸ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' مطبوعہ جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۲ء' ص ۳

❹ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' ص ۴

❺ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' ص ۴

❻ قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات' ص ۵۴

کی تعلیمی و معاشرتی ترویج اور احیاء کے لیے' جس سے انھیں حد درجہ دلچسپی تھی' اپنی آمد کے چند ماہ بعد ہی' کرنل ہالرائیڈ ❶ کے صائب مشورہ اور مقامی ہندو' مسلم اور سکھ علماء و فضلاء کے تعاون سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب ❷ قائم کی تاکہ انھیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک پلیٹ فارم میسر آ سکے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ بیان کیے گئے:

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء

۲۔ باشندگانِ ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت

۳۔ صنعت و تجارت کا فروغ

۴۔ علمی' ادبی' معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث و نظر

۵۔ صوبے کے با اثر اور اہلِ علم طبقے اور سرکاری افسران کے درمیان رابطے کی صورت پیدا کرنا

۶۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری ❸

انجمن پنجاب نے اپنے قیام کے ساتھ ہی پنجاب میں اشاعت تعلیم کے لیے بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ عوام کے استفادے کے لیے لائبریری قائم کی گئی۔ اخبار و رسائل جاری کیے گئے اور سماجی' تہذیبی' اخلاقی' انتظامی' علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلہ خیالات کے لیے جلسوں کا بندوبست کیا گیا۔ ❹

---

❶ کرنل ہالرائیڈ اس وقت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے۔

❷ انجمن کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا تھا جو بعد میں صرف "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور ہوئی۔ انگریزی میں اس کا نام :

"SOCIETY FOR DIFFARSION OF USEFUL KNOWLEDGE IN THE PUNJAB".

رکھا گیا تھا۔ (بحوالہ انجمن پنجاب --- تاریخ و خدمات' ڈاکٹر صفیہ بانو' مطبوعہ کفایت اکیڈمی' کراچی ۱۹۷۸ء ص ۱۰۵)

❸ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان' کراچی ۱۹۸۵ء ص ۳۶۹

❹ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان' کراچی ۱۹۸۵ء ص ۳۶۹

انجمن پنجاب کا دائرہ عمل لاہور تک ہی محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کی شاخیں [1] امرتسر، گورداسپور، قصور، راولپنڈی اور دوسرے شہروں میں بھی قائم ہوئیں اور انجمن کے مقاصد کی پیشرفت کے لیے سرگرم کار ہوئیں۔

قطع نظر اس کے کہ انجمن پنجاب اپنے جملہ اغراض و مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہم ذیل میں انجمن کے فقط اس پہلو کو زیر بحث لائیں گے جس کا تعلق شعر و شاعری کے اس رویے سے ہے جس کی بدولت آگے چل کر اُردو شاعری پر گہرے اور دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں مولانا آزاد کا اسم گرامی ہمیں اس حد تک تابناک نظر آتا ہے جیسے انجمن پنجاب اور آزاد ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔

آزاد فطرت کی طرف سے ایک مجتہد کا دماغ لے کر آئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے سے قبل دہلی میں قیام کے دوران میں ہی وہ غزل کی شاعری سے دل برداشتہ تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہماری شاعری رات کو تارے گننا چھوڑ کر دن میں سورج سے آنکھ ملانا سیکھے۔ ہمارے اس خیال کی تائید مولانا حالی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

"لاہور ہی میں کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں..............." [2]

آزاد کو اپنی روایات اور اپنی سرزمین سے جنون کی حد تک شیفتگی تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اُردو شاعری وہ جہت اختیار کرے جہاں اس پر "شاعری جزویست از پیغمبری" کا اطلاق ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا:

"اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں امراء القیس اور لبید نہیں تو کوئی کالی داس ہی نکال۔

---

[1] صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۹

[2] مجموعہ نظم حالی ابتدائیہ (حالی کی کہانی حالی کی زبانی) مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۲ء ص ۷

اے ہندوستان کے صحراؤ! فردوسی اور سعدی نہیں تو والمیک ہی پیدا کردو۔" ❶

چنانچہ لاہور میں قیام اختیار کر لینے کے بعد جب انھیں قدرے اطمینان وسکون ملا اور انجمن پنجاب کی صورت میں مناسب ماحول بھی میسر آیا تو اسے غنیمت سمجھا اور اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن کے زیر انتظام منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں انھوں نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کے زیر عنوان ایک معرکۃ الآرا اور پر تاثیر مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے اُردو شاعری اُدبی معیار میں انقلاب اور شعراء کے نصب العین میں تبدیلی کی ضرورت پر بہت زور دیا اور اپنے مقالے کا اختتام ان الفاظ میں کیا:

"... اُمید ہے کہ جہاں اور محاسن وقبائح کی ترویج واصلاح پر نظر ہوگی۔ فن شعری اس قباحت پر بھی نظر رہے' گو آج نہیں؛ مگر قوی اُمید ہے کہ ان شاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔

تمھاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا"

❷

حتیٰ کہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کی شام کو انجمن کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان تاریخی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ان کے ہم قافلہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب' مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ' مولوی کریم الدین' منشی درگا پرشاد نادر' پنڈت من پھول کے علاوہ' کرنل ہالرائیڈ' مسٹر تھارنٹن سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ' کرنل میکلاگن' مسٹر ینگ کمشنر' مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور' نواب عبدالمجید خان اور فقیر سید قمرالدین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس جلسے کی صدارت مسٹر جسٹس بولنو نے کی۔ مولانا آزاد نے جلسے کی ابتدا میں وہ تاریخی تقریر کی جس سے کچھ ہی عرصہ بعد اُردو شاعری میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ آزاد کی اس تقریر کو ہم بجا طور پر انجمن پنجاب کی ادبی تحریک کا منشور قرار دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں وہ

---

❶ نظم آزاد' مولانا محمد حسین آزاد' مرتبہ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد' مطبوعہ شیخ مبارک علی' لاہور ۱۹۳۶ء ص ۲۱

❷ نظم آزاد (دیباچہ) مولانا محمد حسین آزاد ص ۲۰

تمام بنیادی مقاصد واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں جو آزاد کے پیش نظر تھے اور جس کے لیے وہ ایک عرصے سے کوشاں تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں اُردو شاعری میں اندھادُھند تقلیدی رویے پر سخت تنقید کی اور اپنے ہم وطن شعراء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"..........اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اُڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم' کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت۔ کسی شے سے خوف یا خطر' یا کسی پر قہر یا غضب' غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو' اس کے بیان سے وہی اثر' وہی جذبہ' وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا.......... تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے' ہار' طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے.................. اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور' مضمون کا جوش و خروش اور لطائف وصنائع کے سامان' تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف' بہت سے حسرت و ارمان' اس سے زیادہ ہجر کا رونا' شراب ساقی' بہار' خزاں' فلک کی شکایت اور اقبال مندی کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں

ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطالب یا اخلاقی مضامین نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا (کہ) ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں..........

جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہوں گے۔ کئی پرانی مورتیں ہیں، وہ چراغ سحری ہیں، انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو جائے گی اور اُردو میں نظم کا چراغ گُل ہو جائے گا'' [1]

اس طویل اچھوتی تقریر کے بعد بارش کے پہلے قطرے کے طور پر خود آزاد نے اپنی پہلی نظم ''شب قدر'' کے عنوان سے پیش کی۔ جس سے سامعین کو یہ جتانا مقصود تھا کہ اُردو نظم روایتی مضامین کے علاوہ اور مطالب کے بیان کرنے کی بھی پوری طرح اہل ہے اور یہ کہ جو شعراء وہاں موجود ہیں یا جنھیں آئندہ مجوزہ مشاعرے میں نظم پڑھنا تھی' ان کے سامنے کوئی نمونہ ہو۔ [2]

یہ نظم ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ پنڈت کیفی نے اسے نئی شاعری کی سب سے پہلی

---

[1] نظم آزاد (لیکچر آزاد) مولانا محمد حسین آزاد' ص ۳۱

[2] اگرچہ اُردو شاعری میں نظم کی روایت اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ اُردو شاعری۔ قدماء میں دکنی دور میں تو موضوعاتی نظمیں ملتی ہی ہیں مگر میر و سودا اور میر حسن' انیس' دبیر' نسیم' مرزا شوق اور دیگر شعراء سے لے کر آزاد اور حالی سے پہلے تک اکثر و بیشتر شعراء کے یہاں موضوعاتی نظمیں نہ سہی' مثنویوں اور مرثیوں سے موضوعاتی نظمیں اقتباس کی جا سکتی ہیں۔ البتہ زمانہ موجود کی فطری شاعری کے' جس کی ابتدا آزاد اور حالی سے ہوئی' پیش رو نظیر اکبر آبادی کہے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ نظیر ایک ایسے شاعر ہیں' جن کی شاعری میں جدید اُردو شاعری کے تخم موجود ہیں۔ لیکن اُردو شاعری کی اصلاحی تحریک سے انھیں اس لیے واسطہ نہیں کہ طرز جدید کے سرپرست روایت کے بجائے اُردو شاعری کا رابطہ انگریزی شاعری کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے۔

نظم ❶ قرار دیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں:

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی

دُنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی نے تو رُخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہاں پر ❷

''اس نظم کی تعریف میں'' ہر شخص کی زبان سے کلمات تحسین واحسنت صادر ہوئے۔'' ❸

مولانا آزاد کی دلپذیر تقریر کے بعد دیگر زعماء نے انجمن کے مقاصد کی وضاحت میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر کرنل ہالرائیڈ نے انگریزی زبان میں جو تقریر کی وہ'' تاریخ ادبیات اُردو میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے''۔ ❹ اس تقریر کا ترجمہ ضمیمہ'' کوہ نور'' مطبوعہ ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء میں چھپا تھا۔ ذیل میں اس ترجمے کی نقل پیش کی جاتی ہے:

''..........یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اُردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے' اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔ اِسی واسطے جملہ

---

❶ منشورات' برجموہن دتاتریہ کیفی' مکتبہ معین الادب' لاہور ۱۹۵۰ء ص ۲۶۲

❷ نظم آزاد' مولانا محمد حسین آزاد' ص ۳۳

❸ آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین' ڈاکٹر محمد صادق' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء' ص ۶۰

❹ ایضاً

رؤساء اور اہل علم اور ان لوگوں سے جو شعر و سخن اور تصانیف سے لذت اٹھاتے ہیں' درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف توجہ کریں۔

اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر شعر سنائے' وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔......... "❶

تقاریر کے بعد اتفاق رائے سے طے ہوا کہ انجمن کے زیر انتظام ہر ماہ ایک مشاعرہ ہوا کرے گا اور اس سلسلے میں ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو ایک موضوعی مناظمہ منعقد کیا جائے۔ جس کا موضوع "برسات" ہو۔ چنانچہ تاریخ متعینہ پر یہ مناظمہ ہوا۔ اسے ہم موضوعاتی شاعری کا پہلا باقاعدہ مشاعرہ ❷ تسلیم کرتے ہیں۔ اس مشاعرے میں آزاد اور دیگر شعراء کے ساتھ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی شرکت فرمائی اور مجوزہ موضوع پر اپنی طویل نظم "برکھا رت" پڑھی جسے عوام و خواص نے بے حد سراہا۔

اس سلسلے میں دوسرا مشاعرہ ❸ ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا۔ موضوع "زمستان" تھا۔ اس مشاعرے میں نو شعرائے کرام نے اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں جس میں مولانا حالی شریک نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے "مثنوی زمستان" پڑھی جسے سامعین نے بے حد سراہا مگر اخبارات میں بڑی لے دے ہوئی۔ اگرچہ کسی قدر حمایت بھی ہوئی لیکن مخالفت میں سخت تنقید ہوئی اور خوب کیچڑ اچھالا گیا۔ اس سلسلے میں "پنجابی اخبار" پیش پیش تھا جس نے مولانا آزاد کی ذات پر رکیک حملے کیے۔ تاہم مخالفت اور موافقت کی اسی فضا میں نئی نظم کا بیج آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا گیا اور مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔

---

❶ آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، ڈاکٹر محمد صادق، ص ۹۶

❷ جناب عبداللہ قریشی نے جامعہ پنجاب کے مجلہ تحقیق شمارہ نمبر ۱۳ بابت ۱۹۸۱ء ص ۹۷ پر اور ڈاکٹر صفیہ بانو نے "انجمن پنجاب۔ تاریخ و خدمات" مطبوعہ کفایت اکیڈمی ۱۹۷۸ء ص ۲۳۴ پر ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو ہونے والے مناظمہ کو پہلا باقاعدہ مشاعرہ تسلیم کیا ہے اور ہے بھی یہ بجا کیونکہ اس سے قبل ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو ہونے والا جلسہ محض ایک جلسہ ہی تھا مشاعرہ نہیں۔ اس میں فقط تقاریر ہوئیں اور صرف مولانا آزاد نے اپنی نظم "شب قدر" بطور نمونہ سنائی تھی۔

❸ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اپنی تصنیف "منشورات" میں ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو ہونے والے مشاعرہ کو کسی سہو کی بنا پر "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ باقاعدہ ہونے والا دوسرا مشاعرہ تھا۔

تیسرا مشاعرہ ۳ راگست ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ اس کا عنوان ''اُمید'' تھا۔ اس میں بھی نو شعرائے کرام شریک ہوئے جس میں مولانا آزاد کے ساتھ مولانا حالی بھی تھے۔ مولانا حالی کی نظم ''نشاطِ اُمید'' بہت دلکش اور جاندار تھی جسے ہر کہ و مہ نے بہت پسند کیا۔

چوتھے مشاعرے کا انعقاد یکم ستمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ اس مشاعرے میں مولانا آزاد کے علاوہ بارہ شعرائے کرام نے حصہ لیا' جن میں مولانا حالی بھی تھے۔ موضوع ''حب وطن'' تھا۔ مولانا آزاد کے بعد اور سب سے آخر میں مولانا حالی نے اپنی مشہور نظم ''حب وطن'' پڑھ کر سنائی جسے سامعین نے بہت ہی پسند کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان موضوعاتی مشاعروں میں حالی نے شریک ہو کر نہ صرف یہ کہ مولانا آزاد کے ارادوں کو مضبوط کیا بلکہ قدیم اُردو شعری روایات کو ترک کر کے نئی شعری روایات کی تعمیر میں جو حصہ لیا وہ بہت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔

اسی طرح مشاعروں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اس سلسلے کا پانچواں مشاعرہ ۹ راکتوبر ۱۸۷۴ء کی شام کو ہوا۔ مشاعرے کے لیے موضوع ''امن'' دیا گیا تھا۔ شرکاء کی تعداد گیارہ تھی لیکن ان میں مولانا حالی شامل نہیں تھے۔

چھٹا مشاعرہ پروگرام کے مطابق ۱۴ نومبر ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس کا عنوان ''انصاف'' تھا۔ اس مشاعرے میں تیرہ شعرائے کرام نے شرکت کی۔ مولانا حالی بھی شعراء کی فہرست میں شامل تھے۔ لاہور میں مولانا حالی کا یہ آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد وہ خرابیِ طبیعت اور دیگر ذاتی وجوہ کی بنا پر تادیر یہاں قیام پذیر نہ رہ سکے اور دہلی چلے گئے۔ بہر کیف مولانا حالی نے اپنی طویل مثنوی ''مناظرۂ رحم و انصاف'' پڑھی۔ جو ایک سو انیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کی سامعین نے دل کھول کر تعریف کی۔ اس مشاعرے میں مولانا حالی کے بعد اور آخر میں پنڈت کرشن لال طالب نے مجوزہ موضوع پر ایک مختصر مگر خوبصورت مثنوی پڑھی۔ جس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نظم کی یہ نئی روایت کس قدر تیزی سے پھیل رہی تھی۔

ساتواں مشاعرہ ۱۱ دسمبر ۱۸۷۴ء کو انجمن کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس کا موضوع ''مروت'' تھا۔ شعراء میں بشمول مولانا آزاد پندرہ شعراء تھے۔

آٹھواں مشاعرہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس کا موضوع "قناعت" تھا اور شرکاء میں دو طلبہ ❶ بھی تھے۔ جس سے یہ حقیقت واضح طور پر مترشح ہے کہ مطلوبہ شعری روایت نئی نسل میں بھی مقبول ہوتی جا رہی تھی۔

نواں مشاعرہ ❷ "ہمدردی" کے موضوع پر ۲۲ مئی ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اس میں مولانا آزاد کی شرکت کا ثبوت نہیں ملتا البتہ دسواں مشاعرہ ❸ ۳ جولائی ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوا۔ اس میں آزاد شریک تھے۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام یہ آخری مشاعرہ تھا جو "شرافت انسانی" کے موضوع پر انجمن پنجاب ہال میں منعقد ہوا۔ آزاد نے "شرافت حقیقی" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ یہ آخری مشاعرہ بے رونق تھا کیونکہ اس میں آزاد کے علاوہ کوئی بھی بڑا شاعر شریک نہ تھا۔

بہر کیف انجمن پنجاب کے زیر انتظام یہی دس مشاعرے ہوئے اور اسی پر ان مناظموں کا اختتام ہوگیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ عرصے میں صرف موضوعاتی مناظمے ہی نہ ہوئے تھے بلکہ ان کے متوازی روایتی طرحی مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے اور وہ لوگ جو مناظموں کو ناپسند کرتے تھے ان طرحی مشاعروں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں کی روداد

---

❶ ایک طالب علم کا نام لالہ دین دیال تھا جو عاجز تخلص کرتے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے جبکہ دوسرے کا نام جوالا سہائے اور تخلص خرم تھا' یہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ (بحوالہ انجمن پنجاب۔ تاریخ و خدمات' ڈاکٹر صفیہ بانو' ص ۳۳۲'۳۳۶)

❷ ڈاکٹر صفیہ بانو نے "انجمن پنجاب.......... تاریخ و خدمات" کے ص ۳۵۲ پر نویں مشاعرے کے انعقاد کی تاریخ ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء لکھی ہے اور موضوع "تہذیب" بتایا ہے جبکہ جناب عبداللہ قریشی نے رسالہ انجمن پنجاب کے ضمیمے "گلدستۂ سخن" جس میں ان مشاعروں کی روداد چھپا کرتی تھی' کے حوالے سے جو کہ مجلس ترقی ادب لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے' تاریخ ۲۲ مئی ۱۸۷۵ء قرار دی ہے اور موضوع "تہذیب" کے بجائے "ہمدردی" لکھا ہے جو زیادہ مستند ہے۔

❸ دسویں اور آخری مشاعرے کے سلسلے میں مصنفہ مذکورہ ڈاکٹر صفیہ بانو نے اپنی تصنیف "انجمن پنجاب.......... تاریخ و خدمات" کے صفحہ ۳۶۰ پر لکھا ہے کہ "دسویں مشاعرے کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا" اور موضوع "اخلاق" لکھا ہے جبکہ جناب محمد عبداللہ قریشی نے اسے بھی غلط قرار دیا ہے اور رسالہ انجمن پنجاب کے ضمیمے کے حوالے سے ہی اس مشاعرے کی تاریخ انعقاد ۳ جولائی ۱۸۷۵ء اور موضوع "شرافت انسانی" لکھا ہے۔ جس پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

بھی رسالہ انجمن پنجاب کے ضمیمے کے طور پر چھپا کرتی تھی لیکن چونکہ موضوعاتی مشاعرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو مشاعروں کی روایت سے ہٹ کر مختلف انداز کے حامل تھے اس لیے ان کی بازگشت ملک بھر میں سنی گئی اور پورے ملک میں ان کے حق یا مخالفت میں اتنا کچھ کہا گیا اور لکھا گیا کہ اگر جمع کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔ موافقین نے جی کھول کر داد دی اور مخالفین نے مولانا آزاد کو ذاتیات کی حد تک رگیدنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس زمانے کے تقریباً تمام تر اخبارات ورسائل نے جدید شاعری کی اس تحریک کی موافقت یا مخالفت میں اپنی اپنی آراء کا اظہار ضرور کیا۔ جس کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ البتہ "سررشتہ تعلیم" لکھنو اور "لارنس گزٹ" میرٹھ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ "سررشتہ تعلیم" لکھنو انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اُٹھنے والی جدید شاعری کی اس روایت اور مولانا آزاد کا بدترین مخالف اخبار تھا جبکہ ہفتہ وار "لارنس گزٹ" میرٹھ نے بے لوث حمایت کی مثال قائم کی۔ "لارنس گزٹ" کی ۶ ر اکتوبر ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں ایک مفصل افتتاحیہ درج ہے۔ اس افتتاحیے کے لکھنے والے اُردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے تذکرے کے بعد اس وقت کی اُردو شاعری کی قابلِ رحم حالت کا خاکہ اتارتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "......اُردو شاعری اَب مُردوں میں گنی جاتی تھی مگر آفرین ہے مولوی محمد حسین 'آزادؔ تخلص' پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انھوں نے اُردو شاعری کی بے قدری کو نظر کر کے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر واقعی حالات کو شرح اور بسط کے ساتھ پورا پورا نظم میں موزوں کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں۔ جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہے۔ اوّل لوگ اس پر ہنسا کرتے ہیں پھر اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی ادھر ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو حضرت آزاد نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا۔ جس سے یہ ادا مُردہ زندہ ہو گیا......" ❶

---

❶ ادبی تحریکیں، پروفیسر شہرت بخاری، نقوش لاہور نمبر، شمارہ نمبر ۹۲، ۱۹۶۲ء، ص ۱۱۰۶

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آزاد نے انھیں دنوں میں جو میرٹھ کا سفر [1] اختیار کیا تھا اور وہاں یک جلسے میں اپنی مثنوی ''صبحِ اُمید'' پڑھ کر سنائی تھی تو شاید آزاد ''نظم'' کو شاعری میں ایک ملک گیر تحریک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر چونکہ انجمن پنجاب خود دس سے زیادہ مشاعرے نہ کرا سکی تھی اس لیے اس تحریک نے دور رس اثرات تو چھوڑے مگر فعّال تحریک نہ بن سکی۔ جس کی کئی وجوہ ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ وہ ہے جو ڈاکٹر محمد صادق نے انجمن پنجاب کی بزمِ مشاعرہ کی ناکامی کی وجوہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھی ہے۔ آپ رقم طراز ہیں کہ:

> ''میری رائے میں بزمِ مشاعرہ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ بہت حد تک پیش از وقت تھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر دور کا ادب اِن عصری احتیاجات کا جنھیں ''روحِ عصر'' کہا جاتا ہے' آئینہ ہوتا ہے لیکن جس وقت بزمِ مشاعرہ کی بنیاد رکھی گئی اس وقت تک روحِ عصر کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان قدروں کا جن سے نئے عہد کی تعمیر ہونی تھی' ایک دھندلا سا عکس اُفق پر نمودار ہو چکا تھا' لیکن ابھی اس کے خدوخال نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ بزمِ مشاعرہ انھی ادھورے نقوش کی عکاسی ہے اور اگر آپ اس روحِ عصر کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد میں نظر آئے گی جس کی مظہر ''مسدسِ حالی'' ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بزمِ مشاعرہ عام طور پر اس لیے ناکام رہی کہ اس کے عقب میں کوئی مضبوط حرکی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ بزمِ مشاعرہ میں ہمیں نئی قدروں کی جستجو کا پتہ ملتا ہے لیکن وہ ابھی تک عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی''۔ [2]

انجمن پنجاب کی بزمِ مشاعرہ کا بیان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ہم مولانا حالی کا ذکر نہ کریں کہ انھوں نے انجمن سے کیا اثرات قبول کیے۔ مولانا حالی نے انجمن کی بزمِ مشاعرہ میں چار بار

---

[1] ایضاً

[2] آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین' ڈاکٹر محمد صادق' ص ۱۰۸' ۱۰۹

شرکت کی اور پھر" بہ سبب ناموافقت آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہو کر دتی چلے گئے۔" ❶ لاہور میں چار سال تک قیام کے دوران میں انھیں بہت سی مغربی تصانیف سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور جیسا کہ صالحہ عابد حسین نے "یادگار حالی" میں لکھا ہے:

"ان کو اس میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور ان کے مذاق شعر و ادب پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ حالی نے دیکھا کہ شعر و ادب کا میدان کتنا وسیع ہے اور اس کا کام محض واردات قلب کا بیان اور داستان عشق کا سنانا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ترجمانی' کائنات کا مطالعہ' انسانوں کے اخلاق اور معاشرتی معیاروں کا بلند کرنا بھی ہے اور لوگوں کے دلوں میں قوم کی محبت اور خدمت کے جذبات کو اُبھارنا بھی! حالی مغربی ادب کا یہ اثر قبول کرتے رہے اور مذاق شعر نئے سانچے میں ڈھلتا رہا.................. "حب وطن" کو پڑھ کر یہ بات محسوس ہونے لگتی ہے کہ حالی کے دل میں درد ملت اور اصلاح قوم کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے اور ان کا دل اس کی اصلاح کے لیے بے قرار ہے۔ شاعر کا ذہن نئی شاعری' بھی قبول کر چکا ہے اور شعر و ادب کو زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ہے مگر ابھی تک مصالحانہ جوش' اپنے مشن کا احساس اور اپنی شاعری سے کام لینے کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہیں ہے اور ہوتا بھی کیسے؟ قوم کے ابتر اور مایوس کن حالات وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور رات کی تاریکی دور ہونے کی کوئی علامات ابھی تک اُفق پر نظر نہ آتی تھیں۔ چند نظمیں کہنے سے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ لاہور سے دلی آ گئے لیکن افسردہ اور بے دل، پراناسرمایہ نکما نظر آتا تھا اور نئی اُمنگ ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوئی تھی جس نے حالی کو حالی بنایا"۔ ❷

چنانچہ حالی چہ کنم و چہ نکنم کی کیفیت میں مبتلا تھے کہ ان کی ملاقات قوم کے اس ناخدا (سرسید احمد خاں) سے ہو گئی جس نے قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں جان کی بازی لگا رکھی تھی اور جو بیس سال سے

---

❶ مجموعہ نظم حالی' ابتدائیہ (حالی کی کہانی حالی کی زبانی)' ص ۱۲

❷ یادگار حالی' صالحہ عابد حسین' مطبوعہ آئینہ ادب' لاہور ۱۹۶۶ء' ص ۱۸۹۔۱۹۳

اپنی مایوسی، بے عملی، شکست خوردہ اور خوفزدہ قوم کو قعرِ مذلت سے نکالنے، اُبھارنے اور سیدھی راہ پر ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ "اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی"۔ ❶

سرسید خود شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے لیکن وہ شاعرانہ بصیرت رکھتے تھے اور اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اچھے اشعار کا طبائع پر کیا اثر ہوتا ہے اور انھوں نے حالی کی شاعرانہ خوبیوں کو بھی پرکھ لیا تھا۔ چنانچہ سرسید نے حالی کو راغب کیا کہ وہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے نظمیں لکھیں اور سرسید کے ایما پر حالی نے اپنی وہ پہلی جدید طرز کی مہتم بالشان طویل نظم "مدّ و جزرِ اسلام" لکھی جو ۱۸۷۹ء میں مکمل ہوئی اور جو "مسدسِ حالی" کے نام سے ملک کے طول و عرض میں جلد ہی مشہور ہو گئی۔ مسدس میں حالی کا قومی شعور اور آزاد اور سرسید تحریک کا جذبا اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ حالی مسدس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی......قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے..........قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے.......... اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت و تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جن سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے، ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور موروثی ورثہ ہے قوم کو بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی

---

❶ دیباچہ مسدس حالی، مولانا الطاف حسین حالی، مطبوعہ کشمیر کتاب گھر لاہور ۱۹۸۲ء ص ۱۸

نے نہیں لکھی ....''❶

مسدس کا ایک حصہ قدیم شاعری کی مذمت اور اس کی اصلاح کی تلقین سے بھی متعلق ہے۔ اس حصے کے ابتدائی دو بند اس طرح ہیں:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بد تر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے ❷

اصلاحِ قوم کے علاوہ مسدس میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں وہ اُردو شاعری کو فرسودہ اور قدیم روایات سے ہٹا کر زندگی کی حقیقی راہوں کے قریب لانے اور جدید شاعری کو خاص و عام میں مقبول بنانے کا بڑا موثر ذریعہ ثابت ہوئے۔

اس زمانے میں حالی نے مسدس کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں لکھیں، جن میں ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' شامل ہیں۔ ان نظموں میں بھی ہمیں وہی تحریک اور وہی نیا شعور کارفرما نظر آتا ہے جس

---

❶ دیباچہ مسدس حالی، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۱۸، ۱۹

❷ مسدس حالی، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۷۴، ۷۵

کے محرک مولانا آزاد تھے۔

اب سرسید تحریک کے زیرِ اثر اس نظم کی تحریک نے ایک نئی کروٹ لی اور ایک نئے انداز کی شاعری کا آغاز ہوا اور جدید طرز میں سماجی، تاریخی، قومی، ملی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ حالی اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ سرسید کی ذات کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے اب حالی کے سامنے زندگی کا ایک متعین نقطۂ نظر اور مقصد تھا جو اس سے پہلے واضح نہ ہوا تھا یعنی یہ کہ شاعری کے ذریعے اپنی پژمردہ قوم کے جسم میں ایک نئی روح پھونکنا، اس کے سامنے ایک منزل کا تعین کرنا اور اس منزل کے حصول کے لیے قوم کو صحیح راہ پر گامزن کرنا، جس میں حالی بہت حد تک کامیاب رہے۔

اس طرح گویا مولانا آزاد نے نظم کی جس نئی تحریک کا ڈول ڈالا تھا، حالی نے نہ صرف اس کو منضبط کیا بلکہ اس کی ترویج و اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ آزاد بنیادی طور پر ایک نثر نگار تھے اور شاعری ان کا میدان نہیں تھا جبکہ حالی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے بھی مردِ میدان تھے۔ چنانچہ جدید احساس کے طلوع ہونے کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا اور کہا اس کا بڑا مقصد اس نئی تحریک کو کامیاب کرنا تھا، جس کی داغ بیل آزاد نے ڈالی تھی۔ جامعہ میسور کے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''.........قدیم اصناف خیالی کی شکست و ریخت اور نئے تصورِ شعری کی تعمیر میں حالی کی تحریروں نے جو کام کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ وہ دھن کے ایسے پکے تھے کہ مخالفتیں سہتے رہے، لوگ ان کا مضحکہ اُڑاتے رہے، لیکن وہ برابر اپنا کام کیے گئے۔ حالی کی ادبی زندگی کا بڑا کارنامہ اردو شاعری کی اصلاح ہے اور ان کی اصلاحی مساعی کا سب سے بڑا مجموعہ ان کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ جس کی اشاعت درحقیقت جدید شعری تخیل کو نشوونما دینے میں بہت مفید ثابت ہوئی''۔ [1]

''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالی نے رسمی اور تقلیدی عناصر کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے اور اس تصنیف میں یہ اہتمام کیا ہے کہ اُردو شاعری کے نقائص دکھائے جائیں اور ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں اور اصلاح کا قدم اس احتیاط کے ساتھ اٹھایا ہے کہ قدیم روایات زندگی کے نئے

---

[1] جدید اُردو شاعری، عبدالقادر سروری، مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۷ء ص ۶۹

تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہو جائیں اور ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیات بھی برقرار رہیں۔ غزل جو کہ اُردو شاعری میں سب سے زیادہ اہم ہے اور جو ہمارے مزاج میں رچ بس گئی ہے اس کے لیے یہ التزام کیا ہے کہ یہ صنف بدستور قائم رہے لیکن زبان و بیان وتخیل اور موضوعات میں آہستہ آہستہ اضافے کیے جائیں۔ اس کے پیش نظر انھوں نے خود بھی نئے انداز کی غزلیں لکھیں اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے نئی راہوں کا تعین کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری جدید غزل حالی کی مساعی کی رہین منت ہے۔

اصلاح کے اس دور میں آزاد اور حالی کے ساتھ اگر ہم مولانا شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ اور ان کے بعض ہم عصروں کا تذکرہ نہ کریں تو غلط ہوگا کیونکہ ان شعرائے کرام نے بھی اپنی اپنی جگہ لاہور سے اُٹھنے والی اس نئی تحریک کو اپنایا اور حتی المقدور اس کی عملی طور پر پیروی کی۔

غرضیکہ انجمن پنجاب کی شعری تحریک نے اُردو شعری روایت کو ایک نئی راہ سے روشناس کیا۔ اقتضائے زمانہ کے مطابق شاعری اب تخیل، جذبے اور فن تک اظہار کے محدود رہنے کے بجائے ایک نئی جہت سے آشنا ہوئی۔ بے شک آزاد اور حالی نے موضوع پر زیادہ زور دیتے ہوئے فنی تقاضوں کو کسی حد تک پس پشت ڈال دیا تھا تاہم جلد ہی اُردو شاعری کو ایک عظیم شاعر نصیب ہو گیا جس نے قدیم شاعری سے فن کاری اور جدید شاعری سے موضوعاتی رجحانات لے کر ایسی اعلیٰ سطح کی شاعری کی جس نے حال کے علاوہ مستقبل کو بھی متاثر کیا اور شاعری میں اعلیٰ روایات قائم کیں اور خود ماضی کے عظیم اساتذہ میر و غالب کا ہم پلہ بن گیا۔ یہ عظیم شاعر اقبال تھا۔

اقبال......ایک شاعر، ایک تحریک

حضرت علامہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک تحریک تھے۔ ایسی تحریک جو ان سے شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہو گئی۔ قدیم و جدید شعراء میں ان کا موازنہ کسی شاعر سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ موازنہ کے لیے اشتراک موضوع اور اشتراک خیال ضروری ہیں اور ایجاد و اختراع کی قوت نے اقبال کو قدیم و جدید شعراء سے الگ کر دیا ہے۔ ہاں یہ مسلمہ امر ہے کہ ان کے افکار سے شاعری پر بڑے دور رس اثرات مترتب ہوئے۔ اقبال، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔

یہاں صرف ان کی اُردو شاعری کا ذکر مقصود ہے۔

اُردو کی فکری شاعری کی تاریخ میں اقبال کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ نہ صرف اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں بلکہ ایک عصر نو کے معمار بھی ہیں۔ انھوں نے ایک طرف آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ اور اسمٰعیلؔ کے اصلاحِ شاعری کے کام کو تکمیل کی حد تک پہنچایا اور دوسری طرف اپنی قومی شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ کے سامنے مستقبل کی منزل کا صحیح نقشہ پیش کیا اور اپنی رفعتِ تخیل و بلند آہنگی سے اُردو شاعری کو ایک قابلِ رشک معیار تک پہنچادیا۔ انھوں نے اردو شعر و ادب میں وہ حقائق و معارف بیان کیے جو ایک شاعر کو تلمیذ الرحمٰن کے رُتبے پر فائز کردیتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں دعوت فکر بھی ہے اور درس عمل بھی اور ان کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا سارا حسن و لطف اور طرز ادا کی تمام تر دلکشی اور رعنائی بھی۔

اصناف شاعری کے لحاظ سے اقبال کا کلام غزل، مرثیہ، مثنوی، مناظر فطرت، رباعیات یا قطعات، ظریفانہ و طنزیہ، قومی اور وطنی نظموں پر محیط ہے۔ ہمیں ان میں سے ہر صنف پر الگ الگ ریویو کرنا چاہیے لیکن یہ مقالہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا لہٰذا ہم ذیل میں ڈاکٹر صاحب کے اُردو کلام پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں گے۔

فطری طور پر انسان کے خیالات اور میلانات میں وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ تبدیلی رونما ہوتی ہے اور ان میں بتدریج پختگی آتی ہے۔ چنانچہ ہم اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کو اپنی آسانی کی خاطر چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کا پہلا عمومی دور وہ ہے جو اُن کے زمانہ طالب علمی سے شروع ہوکر ۱۹۰۵ء تک محیط ہے۔ آپ نے اگرچہ اپنی شاعری کا آغاز اپنے وطن سیالکوٹ سے ہی کردیا تھا لیکن حقیقی معنوں میں اس کا آغاز ان کے ورود لاہور سے ہی ہوا جہاں اُن دنوں پنجاب بھر میں سب سے زیادہ اُردو زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ دلی اور لکھنؤ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد کچھ شعراء جن میں مرزا ارشد گورگانی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہاں جمع ہوگئے تھے اور لاہور کے بازار حکیماں

میں ایک بارونق مشاعرے کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اقبال لاہور آئے تو ان کی شاعری کی نشوونما کے لیے قدرتی طور پر اعلیٰ تر امکانات کی حامل تخلیقی فضا میسر آ گئی۔ اقبال نے ان مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کی تو لوگوں میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی لیکن آپ کی شاعری کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی نظم ''ہمالہ'' مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا' شائع ہوئی۔ یہ سلسلہ آپ کے یورپ جانے یعنی ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس دوران میں آپ مخزن کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے اور بازار حکیماں کے مشاعرے میں شرکت کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھنے کے لیے بھی بڑی فکر اور اہتمام کے ساتھ کوئی نہ کوئی نظم ضرور کہہ لیا کرتے تھے۔ اس عرصہ میں آپ نے جو نظمیں کہیں ان میں سے ''ہمالہ'' کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ علاوہ ازیں بچوں کے لیے چند نظمیں ہیں اور خفتگانِ خاک سے استفسار' عقل و دل' شمع' ایک آرزو' آفتاب صبح' انسان اور بزم قدرت' پیام صبح' رخصت اے بزم جہاں!' تصویر درد' چاند' سرگزشت آدم' جگنو' صبح کا ستارہ' نیا شوالہ' کنار راوی اور التجائے مسافر ان میں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں مغربی شعراء جیسے ٹینی سن' ایمرسن' ولیم کوپر اور لانگ فیلو کے کلام سے ماخوذ ہیں۔

اس دور میں اقبال کے خیالات میں وطن پرستی کا جذبہ غالب ہے۔ یہ جذبہ ان کی نظم ''تصویر درد'' میں بخوبی نظر آتا ہے جسے ہمارے خیال میں اس دور کی نمائندہ نظم کہا جا سکتا ہے۔ ''تصویر درد'' کا ایک ایک شعر وطن کے عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر نے ہندوستان کی زبوں حالی پر جی کھول کر نوحہ خوانی کی ہے اور اہل وطن کو آپس میں متحد رہنے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی تلقین کی ہے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے' ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!

تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں [1]

وطن پرستی کے اسی جذبے کا بڑا بھرپور اظہار ان کی نظم "نیا شوالہ" میں بھی نظر آتا ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا

واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے [2]

فطرت کے ساتھ والہانہ اُلفت اور شیفتگی کے ساتھ ان کے دل میں ایک سچا اسلامی جذبہ بھی موجزن ہے۔ انھیں عقل پر عشق کی برتری کا احساس ہے اور انھوں نے آگے چل کر بندۂ مومن اور حقیقت انسان کا جو تصور پیش کیا اس کی ہلکی جھلک بھی ہمیں اس دور کی نظموں میں نظر آجاتی ہے۔ ان کے علاوہ خوبصورت تشبیہات، دلآویز استعارات اور حسین و جمیل تراکیب اور کسی حد تک فکر و خیال کی ندرت بھی موجود ہے۔

اس دور کی نظموں میں ہمیں یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ہمارے شاعر کے دل میں ایک خلش اور ایک کسک ہے وہ دُنیا والوں کو کچھ راہیں سمجھانا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی صحیح اور واضح راہ متعین نہیں کر پائے جیسا کہ پروفیسر سید وقار عظیم نے اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"............اقبال کی آواز میں ابھی "بانگِ درا" کی گونج نہیں۔ ابھی وہ کسی بھولے بھٹکے

---

[1] بانگِ درا، اقبال، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع دوم ۱۹۷۵ء ص ۷۰

[2] بانگِ درا، ص ۸۸

قافلے کے راہنما نہیں بن سکے۔ اس لیے کہ شاید ابھی ان کے فکر کو عشق کی پوری ہم نوائی حاصل نہیں اور اسی لیے ان کے بیان میں تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور تازگی' ترکیبوں کی جدت اور تخیل کی شوخی اور رنگینی اور بلندی کے امتزاج کے باوجود جا بجا پختہ کاری کی شدید کمی ہے اور شاعر کے خیال اور بیان دونوں پر جا بجا فرسودہ روایتوں کا گہرا سایہ نظر آتا ہے۔ یہ بات نسبتاً نظموں میں کم اور غزلوں میں زیادہ ہے"۔ ❶

ہر چند اقبال کی شاعری کا یہ دور بہ لحاظ مجموعی ان کے فکر و تخیل کی کوئی نمائندگی نہیں کرتا اور اس میں ان کی وہ انفرادیت نمایاں نہیں ہوتی جس نے اقبال کو اقبال بنایا۔ البتہ ہمیں کہیں کہیں ان چیزوں کی جھلک بخوبی نظر آ جاتی ہے جو آگے چل کر ان کے فکر و تدبر اور فلسفۂ حیات کا لازمی جزو ہیں۔

۱۹۰۵ء سے' جب وہ بغرض حصول تعلیم ولایت گئے' ان کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا اور ۱۹۰۸ء تک' جب وہ ولایت سے واپس تشریف لائے قائم رہا۔ اس دوران میں ان کی فطری شاعری کا رنگ اور بھی زیادہ نکھر آیا ہے۔ یورپ کے حسین مناظر نے شاعر کے دل پر بہت اثر کیا۔ اس دور کی اکثر نظمیں انھی تاثرات کا نتیجہ ہیں مثلاً حقیقت حسن' حسن و عشق' کلی' چاند اور تارے' انسان' ایک شام اور تنہائی وغیرہ فنی اعتبار سے لاجواب نظمیں ہیں۔ اس دور میں خودی' بے خودی اور تصوف کی ہلکی سی چھاپ بھی اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ فطرت انسانی اور خارجی فطرت میں ایک عجیب ہم آہنگی اور ربط محسوس کرتے ہیں۔ وہ قلب انسانی کی کسک' غنچے کی چٹک اور مظاہر فطرت کو' ایک ہی اصل کے مختلف روپ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دریا کی روانی اور سبزے کی شادابی میں ان کے مضطرب دل کو سکون میسر آتا ہے۔

اس دور میں اقبال نے بہت کم نظمیں لکھیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بقول سر عبدالقادر' شاعری سے ہی دل برداشتہ ہو گئے تھے ❷ کیونکہ وہ ایشیا کی شاعری کو یورپ کی شاعری کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے۔ اگرچہ ترک شاعری کے ارادے کو تو انھوں نے سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے قائل کرنے پر ترک کر دیا ❸ لیکن ایک تو ان کی طبیعت میں یہ تغیر پیدا ہو گیا کہ شاعری کی زبان بدل گئی یعنی اُردو کے

---

❶ اقبال......شاعر اور فلسفی' سید وقار عظیم' مطبوعہ تصنیفات لاہور ۱۹۶۸ء ص ۱۳

❷ دیباچہ بانگ درا' سر عبدالقادر' ص ۱۵

❸ دیباچہ بانگ درا' سر عبدالقادر' ص ۱۵

بجائے زیادہ تر فارسی میں طبع آزمائی شروع کردی اور دوسرے ان کا زاویہ نگاہ بھی بدل گیا اور انھوں نے شاعر کے بجائے پیامبر کی حیثیت اختیار کرلی۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام انھوں نے ولایت سے ایک پیغام بھیجا جو گویا ایک متن ہے اور ہندوستان واپس آنے کے بعد جو شاعری کی وہ اس متن کی شرح ہے:

اوروں کا ہے پیام اور' میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں' ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور' گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی' شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی [1]

ان کے پیغام کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد' مسلسل جنبش و حرکت اور مسلسل تگ و تاز کا نام ہے۔ پہلے مورِ ناتواں نے انھیں رازِ حیات سے آگاہ کیا تھا اب چاند اور تارے انھیں زندگی کی حقیقت سے آشنا کرتے ہیں:

---

[1] بانگِ درا ص ۱۱۴' ۱۱۵

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں!
جو ٹھہرے ذرا' کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق' انتہا حسن ○

اسی مسلسل جدوجہد' حرکت' تگ وتاز اور عمل کا نام کوشش ناتمام ہے' کیونکہ جس مسافر کی کوئی منزل نہیں' اس کا سفر نامکمل ہے اور اقبال کے نزدیک اسی کا نام زندگی ہے۔ آپ نے اپنی مختصر نظم "کوشش ناتمام" میں اس نکتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے:

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے
رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٰ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تاب دوام کے لیے
کہتا تھا قطب آسماں قافلۂ نجوم سے
ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے
سوتوں کو ندیوں کا شوق' بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لیے

○ بانگِ درا' ص ۱۱۹

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے
رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے ❶

وطن کی فطری اور مذہبی محبت اگرچہ اس دور کی شاعری سے بھی آشکار ہے تاہم اس دور میں انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ وطنیت پر اسلامی قومیت کی بنیاد استوار نہیں ہو سکتی:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ❷

اور اسی فلسفے پر پختہ یقین نے ان کو اسلامی خدمت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ان کی نظم "عبدالقادر کے نام" سے مترشح ہے کہ وہ اب اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانانِ عالم بالخصوص مسلمانانِ ہند کی بیداری چاہتے ہیں:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
بادۂ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

---

❶ بانگِ درا، ص ۱۲۴

❷ بانگِ درا، ص ۱۳۵

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں' دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں ❶

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ ایک نئی اُمنگ کے ساتھ ہندوستان آئے اور اپنی شاعری کو مسلمانوں کی بیداری کے لیے وقف کر دیا۔ اگرچہ اس دور میں انھوں نے غیر مسلم مذہبی پیشواؤں رام اور نانک کی مدح میں بھی نظمیں لکھیں تاہم زیادہ تر نظموں کا رُخ مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس لیے اگر ہم اس دور کی شاعری کو اسلامی شاعری کہہ لیں تو بھی بجا ہے۔

اقبال کی شاعری کا یہ دور گزشتہ ادوار سے اس لیے بھی ممتاز ہے کہ فکر و خیال میں تغیر کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تغیر آیا ہے۔ اس دور میں چونکہ انھوں نے بیشتر فارسی میں لکھا۔ اس لیے اُردو کی نظموں میں بھی فارسیت کا اثر نمایاں ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر بانگ درا کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"...........فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اُردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اُردو میں دورِ سوم میں لکھی گئی ہیں ان میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلقِ قلم جو فارسی کے میدان میں گامزن ہے' اس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اُردو کی طرف موڑی جاری ہے"۔ ❷

یہ اثر صرف فارسی ترکیبوں' بندشوں اور تضمینوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کئی نظموں میں بند کا آخری شعر فارسی میں ہی لکھا ہے۔ مثلاً شمع و شاعر کا پہلا بند اور اس دور کی آخری نظم "طلوعِ اسلام" کا آخری بند تو اوّل سے آخر تک فارسی میں ہے۔

اس دور میں ان کی شاعری کا موضوع فلسفۂ خودی اور فلسفۂ بیخودی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب وہ علانیہ اس کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں:

---

❶ بانگِ درا ص ۱۳۲

❷ بانگِ درا (دیباچہ) ص ۱۷

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا ❶

اس دور میں اقبال کی عقیدت جنابِ رسالتمآبؐ اور خاکِ پاک حجاز سے بے انتہا بڑھ گئی تھی۔ جس کا اظہار آپ نے گاہ گاہ نہایت پُر درد اور پُر اثر طریقوں سے اپنی نظموں میں کیا ہے۔ ''میں اور تو'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری شعر میں جنابِ رسولؐ سے خودوارانہ شان کے ساتھ کمالِ حد ادب اور انتہائی سوز و گداز سے لطف و کرم کی درخواست کی ہے:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری ❷

اسی دور میں ایک مختصر نظم ''شفاخانۂ حجاز'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ''دیوانۂ حجاز'' کہا ہے اور اسی نظم میں سرزمینِ حجاز پر کس قدر موثر اور شاعرانہ انداز میں موت کی خواہش کا اظہار کیا ہے:

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا!
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں ❸

---

❶ بانگِ درا، ص ۲۷۳
❷ بانگِ درا، ص ۲۵۳
❸ بانگِ درا، ص ۱۹۸

اقبال کی شاعری کا یہ اسلامی رنگ فرقہ پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ دراصل اس کے پس پردہ وہ محرکات ہیں جو آپ نے قیامِ یورپ کے دوران میں بچشم خود ملاحظہ کیے تھے کہ اقوامِ یورپ کس طرح شاطرانہ نداز سے وطنیت اور قومیت کے پردے میں دوسری اقوام بالخصوص ملتِ اسلامیہ کے انحطاط کے در پے ہیں۔ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے وقوع پذیر ہونے پر یہ صورتِ حال اور کھل کر سامنے آ گئی کہ وطن اور وطن پرستی کا جذبہ جس کا پرچار اقوامِ یورپ کر رہی ہیں' وہ ایک زبردست سراب ہے اور ان کا ملجا ئے مقصود اقوامِ مشرق کو بے دست و پا بنانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان حالات میں بجا طور پر مسلمانانِ عالم کے جذبات مشتعل ہوئے۔ چنانچہ شکوہ' جوابِ شکوہ' خطاب بہ جوانانِ اسلام' مسلم' حضور رسالتمآبؐ میں' نویدِ صبح' فاطمہ بنت عبداللہ' ارتقا اور شمع و شاعر میں آپ نے مسلمانوں کے انھی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے نتیجہ میں جب قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا' خلافت برائے نام رہ گئی' اسلامی ممالک بیروزگاری' افلاس اور فاقہ مستی کی دلدل میں پھنس گئے اور اسلامی دنیا کا مستقبل بظاہر کوئی نہ رہا تو اقبال نے ''خضرِ راہ'' کے عنوان سے نظم لکھی جس میں ان تمام واقعات کا تجزیہ کیا ہے اور جب کمال اتاترک نے ترکوں کو یورپ کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی تو دُنیائے اسلام میں دھوم مچ گئی چنانچہ ان امید افزا حالات میں آپ نے ''طلوعِ اسلام'' کے عنوان سے ایک پُر جوش نظم لکھی جس میں نہایت بلند آہنگی سے مسلمانوں کو درخشاں مستقبل کی نوید سنائی اور اس کے حصول کے لیے انھیں راغب کیا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی' ذہنِ ہندی' نطقِ اعرابی ❶

اسی نظم میں آپ آگے چل کر فرماتے ہیں:

مکاں فانی' مکیں آنی' ازل تیرا' ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو' جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
نہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا ❶

''طلوع اسلام'' بانگِ درا کی آخری نظم ہے، اسی پر اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ختم ہوا۔ اس کے بعد آپ کی زیادہ تر توجہ فارسی شاعری کی طرف مبذول رہی اور احباب کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اُردو حضرت علامہ کے فیض سے بالکل ہی محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ اسی خدشہ کے پیشِ نظر سر عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچہ کے اختتام پر علامہ اقبال سے التماس کی کہ وہ:

''اپنے دل و دماغ سے اُردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق اور محتاج ہے..........اب وہ پھر کچھ عرصہ کے لیے گیسوئے اُردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اسی مجموعہ اُردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے ایک دوسرے کلیاتِ اُردو کا پیش خیمہ سمجھیں''۔ ❷

بانگِ درا کی طباعت اوّل ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اس کی اشاعت کے بعد جو کچھ انھوں نے اُردو میں لکھا، وہ ان کی اُردو شاعری کا چوتھا دور ہے۔ گزشتہ ادوار میں ان کی شاعری کے بعض خاص محرکات تھے لیکن اس دور میں کوئی پُر جوش خارجی محرک ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اب ان کے پاس ایک مکمل فکری نظام تھا جس کے تحت خارجی دنیا کے مقابلے میں روحانی اور باطنی دنیا زیادہ اہم بن گئی تھی۔ لہٰذا اب خودی اور بے خودی کے تصورات ان کی شاعری کے محرک بنے۔ چنانچہ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں خودی اور اس سے متعلق افکار کی گونج سنائی دیتی ہے:

---

❶ بانگِ درا، ص ۲۶۹، ۲۷۰

❷ بانگِ درا (دیباچہ) سر عبدالقادر، ص ۱۸

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں [1]

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں [2]

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں! [3]

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی [4]

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی [5]

اسی دور میں سیاسی موضوعات پر بھی علامہ صاحب کی کئی نظمیں ہیں جن میں سے دو نظمیں اشتراکیت کی تائید میں بڑے پرزور لہجے میں کہی گئی ہیں۔ ایک نظم کا عنوان "لینن .... خدا کے حضور میں" ہے اور دوسری نظم کا عنوان "فرمان خدا .... فرشتوں سے" ہے۔ اول الذکر نظم میں اقبال نے کمال بصیرت سے خود لینن کی زبان سے یورپی تہذیب و تمدن کی تمام خرابیاں بیان کی ہیں اور موخر الذکر نظم، جسے ہم اول الذکر نظم کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں، خدا کی زبان سے فرمان کی صورت میں تہذیب نو ن خ ی کا تم ہے۔ اس دور کی سب سے زیادہ پر جوش نظم "ساقی نامہ" ہے۔ جو مثنوی میر حسن کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کو اقبال کی اردو شاعری کا ماحصل کہنا بھی بجا ہوگا۔ اس نظم میں اقبال کا جوش بیان،

---

[1] بال جبریل، اقبال، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع بستم ۱۹۷۵، ص ۳۸

[2] بال جبریل، ص ۴۴

[3] ایضاً

[4] ایضاً ص ۴۵

[5] ایضاً

اپنی فنی خوبیوں کے ساتھ انتہائے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرجوش الفاظ اور خیالات کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا چلا آتا ہے۔ ہم صرف ایک بند کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے، کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر

یہ عالم، یہ بتخانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خُو نہیں
کہ تُو میں نہیں اور مَیں تُو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں!

چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے

اسی کے بیاباں، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہیں جرّہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور ❶

حیات بعد الموت کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کا زمانہ ڈاکٹر صاحب کی طویل علالت کا زمانہ ہے لیکن اس میں بھی وہ فارسی اور اُردو زبانوں میں شعر کہتے رہے۔ اُردو زبان میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ ضرب کلیم کے نام سے بال جبریل کی طبع اوّل ۱۹۳۵ء کے بعد ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اور ضرب کلیم کے بعد ۱۹۳۸ء میں ارمغانِ حجاز شائع ہوئی۔ اس دور کی اُردو نظموں میں یہ خصوصیت ہے کہ روانی' جوش اور بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ سوز اور گداز بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کشمیر میں سیاسی شورش پیدا ہوئی اور مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا گیا۔ ایک مسلمان اور دوسرے کشمیری النسل ہونے کے ناطے ڈاکٹر صاحب کے جذبات میں تلاطم پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ چنانچہ کشمیر کے مسلمانوں کے مصائب سے متاثر ہو کر انھوں نے کشمیر اور مسلمانانِ کشمیر سے متعلق کئی نظمیں لکھیں جن میں ان کو نہایت پر جوش انداز سے حصول آزادی کی ترغیب دی ہے۔ مثلاً:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر!
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر

کہہ رہا ہے داستان بیدردی ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

---

❶ بال جبریل ص ۱۲۵، ۱۲۶

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟ ❶
سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند!
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند ❷

اس کے علاوہ اس دور کی نظموں میں وہ نظمیں یا وہ اشعار زیادہ دلآویز ہیں جس سے کوہستانی زندگی کے لوازم و خصوصیات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور ہمارے شاعر نے غیرت و حمیت، آزادی و حریت اور اخلاصِ عمل کا درس دیا ہے۔ جیسے "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" میں اقبال فرماتے ہیں:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

---

❶ ارمغانِ حجاز، اقبال، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور طبع چہارم ۱۹۴۸ء ص ۲۵۸، ۲۵۹

❷ ارمغانِ حجاز، ص ۲۶۳

اخلاص عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را" ❶

اس دور کی تمام تر نظمیں بلند آہنگ، پر جوش، ولولہ خیز اور شاعرانہ ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اقبال کے دورِ آخر کی شاعری کا مزاج صرف واعظانہ ہے تو کم از کم ارمغانِ حجاز کی نظموں پر تو یہ کلیہ صادق نہیں آتا۔ صوفیاء کے ایک نظریہ کے مطابق جسم جب ضعیف ہوتا ہے تو روح قوی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان نظموں کی کچھ یہی کیفیت ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے افکار میں اس قدر تنوع اور عظمت ہے کہ اس کی صراحت کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کی پوری روایت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ نئے خیالات بھی لیے اور دونوں کی ترکیب سے ایک نئے انداز کی شاعری تخلیق کی۔ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں حتی الوسع ان کے تفکر و تاثر کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ جس سے واضح طور پر مترشح ہے کہ اقبال بجائے خود اقبال ہیں اور ایجاد و اختراع اور فکر و نظر کی قوت نے اقبال کو اُردو شعراء میں سب سے ممتاز کر دیا ہے۔

اُردو شاعری میں رومانوی تحریک

رومانویت انسان کی لاشعوری کیفیت کے ایک خاص اظہار کا نام ہے۔ یہ پامال راستوں کو ترک کر کے ایک تخلیقی جذبہ کے تحت نئی قدروں کی تلاش میں منہمک ہونے کا عمل ہے، جس کے متعدد زاویے ہیں اور مختلف جہتیں ہو سکتی ہیں۔ شعر و ادب میں رومانویت لامحدود احساسات اور ماورائیت ❷ کے اظہار کا رویہ ہے۔

فرانسیسی مفکر روسو کی اس عظیم آواز کو رومانویت کا مطلع کہا جاتا ہے:

---

❶ ارمغانِ حجاز، ص ۲۳۰، ۲۳۱

❷ ماورائیت کی اصطلاح کے ایک سے زیادہ مفاہیم ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ ہمارے تجربات سے ماوراء ایک ایسی حقیقت موجود ہے جو ہمارے دائرہ فہم و ادراک میں نہیں سما سکتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذہن تجربات کی حدود سے ماوراء ہو کر ان تجربوں کو منظم کرتا ہے اور اس کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ گرد و پیش کے مادی حقائق سے ماوراء ایک اعلیٰ حقیقت کا وجود ہے۔
(ماخوذ از "مغرب کے تنقیدی اصول" سجاد باقر رضوی، مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۰ء ص ۱۸۹)

۱۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے''۔ ❶

روسو کے بقول:

''فطرت کو تمدن پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ ایک چیز خدا کی تخلیق ہے اور دوسری انسان کی ....اگر انسانی احساسات فطری طور پر نیکیوں اور خوبیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں تو متمدن زندگی کے تمام پہلو' سیاسی اور معاشرتی حالات' احساسات کے فطری اظہار میں رکاوٹ بن کر انسان کے فطری ارتقا کی راہیں بند کرتے ہیں۔'' ❷

یورپ میں اٹھارویں صدی کے اوائل تک انسان کے بارے میں عام تصور یہ تھا کہ ''انسان کی امتیازی خصوصیت اس کی عقل ہے''۔ ❸ لیکن اس صدی کے آخر میں اس تصور نے جنم لیا کہ ''انسان کی فطری خصوصیت اس کے احساسات ہیں''۔ ❹

اسی تصور نے جذبات کی بے ساختگی اور ذہنی امیج کے تصورات کو بھی پیدا کیا ❺ جس پر ورڈز ورتھ کا یہ قول مستزاد ہوا کہ ''شاعری احساسات کی تاریخ یا سائنس ہے'' ❻

انگریزی ادب میں کلاسیکیت کی واضح اور مستقل روایات موجود تھیں جن کے ردعمل کے طور پر نئے رجحانات کی حامل رومانویت کی تحریک متشکل ہوئی۔ اس طرح یورپی خصوصاً انگریزی ادب میں کلاسیکی نظریات میں ہمیں مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آتا ہے:

۱۔ کلاسیکیت اشیاء کو حدود میں رکھتی ہے جبکہ رومانویت لامحدود کی متلاشی ہے۔

۲۔ کلاسیکیت عقل و دانش اور فہم و ادراک کی قائل ہے جب کہ رومانویت جذبہ و لگن کی سرمستی کا نام ہے۔

---

❶ ''اردو ادب میں رومانوی تحریک'' ڈاکٹر محمد حسن' مطبوعہ کارواں ادب ملتان صدر ۱۹۸۶ء ص ۱۶

❷ مغرب کے تنقیدی اصول' سجاد باقر رضوی' ص ۱۸۳

❸ مغرب کے تنقیدی اصول' سجاد باقر رضوی' ص ۱۸۳

❹ ایضاً۔ ص ۱۸۲

❺ ایضاً

❻ ایضاً

۳۔ کلاسیکیت اصول پرستی' توازن' تناسب' تنظیم اور ترتیب سکھاتی ہے جبکہ رومانویت ان سب کے خلاف صاعقہ بردوش بغاوت پر اُکساتی ہے۔

۴۔ کلاسیکیت زمانہ حال اور روایات کی پابند ہے جبکہ رومانویت زمانہ ماضی و مستقبل کی شائق لیکن زمانہ حال اور مروج روایات سے متنفر ہے۔

۵۔ کلاسیکیت کا زور معاشرتی اقدار پر ہے جبکہ رومانویت کا جہاں فرد کا جہاں ہے۔

۶۔ کلاسیکی نظریات میں آفاقی معروضوں اور تصورات کو اہم گردانا گیا ہے جبکہ رومانوی نظریات میں گردوپیش کی ٹھوس حقیقت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

۷۔ کلاسیکی شاعری میں کل کی ہیئت اجزاء کی حیثیت پر غالب ہوتی ہے جبکہ رومانوی شاعری میں مختلف اجزاء کی تفاصیل کو اہمیت دی گئی ہے۔

کلاسیکیت نے یورپ میں گزشتہ کئی صدیوں سے کچھ ایسے اصول وضع کر لیے تھے جن میں حرکت تھی نہ حسن' جمال و رعنائی تھی نہ زندگی کی گہما گہمی۔ چنانچہ اس بیزار کن یکسانیت سے عاجز آ کر کچھ اذہان میں یہ بات آئی کہ انسانی جذبات' عقل کے تابع فرمان و کلاسیکی مطلق اصولوں کے زیر نگیں نہیں رہ سکتے اور ایک قوت ایسی ہے جو انھیں ان سے سرتابی پر مجبور کرتی ہے اور کبھی کبھی انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ پاسبانِ عقل کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ چنانچہ ان اصولوں سے بغاوت کر کے لامحدود جذبات و احساسات کی شدت نے انسان کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ اسی نئی جہت کا نام رومانویت ہے۔ اس طرح رومانویت ایک طاقتور انا اور ایک زبردست خودی کی مظہر ہے جو تہذیبِ نفس سے آشنا نہیں۔ فکری یہ تبدیلی یورپ میں طریقۂ راسخ قدماء سے تجاوز کرتے ہوئے شروع ہوئی اور وہیں پر اپنے ارتقائی مدارج طے کیے۔

جہاں تک اُردو شعر و ادب کا تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو میں ویسا کلاسیکی جامد ماحول تو موجود نہیں تھا جیسا رومانویت کے احیا کے موقع پر یورپی بالخصوص انگریزی ادب میں تھا۔ پھر بھی اردو شعر و ادب میں کچھ فارسی ادب سے آمدہ اور کچھ بتدریج ساختہ ایسے اصول موجود تھے جن کی بنا پر صرف ہیئت کی طرف غیر معمولی توجہ دی جا رہی تھی اور اس اعلیٰ تخلیقی اصول سے اغماض برتا جا رہا تھا جس کے

مطابق موضوع اور ہیئت کی متوازن وحدت ہی فنی کامیابی کی ضمانت تھی۔ اصناف سخن میں سے غزل، قصیدہ اور مثنوی قدیم کلاسیکی مطلق اصولوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ جس کے بعد ردعمل کا ہونا ایک فطری عمل تھا چنانچہ یہی ہوا۔ حالی کا "مقدمہ شعروشاعری" اسی کلاسیکی جمود کے خلاف ردعمل کے طور پر ایک انقلاب انگیز قدم ہے۔ لیکن یہ ردِعمل، عمل سے قوی تر نہیں تھا جیسا کہ فطرتاً ہونا چاہیے تھا۔ کسی قسم کا انتقامی ردعمل حالی اور ان کے اصلاح پسند معاصرین کے مزاج اور مذاق کے خلاف تھا۔ یہ لوگ طبعاً انقلاب کے بجائے شعر کی اصلاح' شاعری کے سماجی مقاصد کے حصول اور توازن و اعتدال پر زور دیتے تھے اور یہ بات رومانویت کی روح کے منافی نہ سہی تاہم اس کے مطابق نہیں ہے۔ اصلاح شاعری کی تحریک کے دوران میں حالی اور ان کے معاصرین نے بار بار نیچرل شاعری کے تصور کے ساتھ ساتھ اخلاقی مضامین کے ادا کرنے اور قومی مقاصد کو پیش کرنے پر زور دیا ہے۔ یہ لوگ اسلوب میں بھی بغاوت نہیں بلکہ اصلاح چاہتے ہیں اور ایسی اصلاح جو ان کے اصلاحی اور اخلاقی مقاصد کو بروئے کار لا سکے۔ اسی سلسلے میں حالی کے "مقدمہ شعروشاعری" سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے۔ اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔ لیکن ازروئے انصاف اس کو علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"۔ [1]

انجمن پنجاب سے نیچرل شاعری کی جو تحریک اٹھی اسے ہم اس معنی میں تو رومانوی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مضامین فطرت کو نظم میں پیش کرنے پر زور دیا نیز پرتصنع صنائع بدائع کے خلاف خلوص اظہار پر زور دے کر بالواسطہ طور پر جذبہ و احساس کے اظہار کو وقعت دی تاہم انھوں نے اخلاقی و اصلاحی مقاصد کی اتنی ترویج کی کہ رومانویت کا جمالیاتی پہلو یکسر دب گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حالی نے اس بات پر بھی اصرار کیا کہ شاعر کو اپنے مافی الضمیر کا اظہار آزادی سے کرنا چاہیے اور قدیم اسلوبوں اور

---

[1] "مقدمہ شعروشاعری" خواجہ الطاف حسین حالی' مرتب ڈاکٹر وحید قریشی' مطبوعہ مکتبہ جدید' لاہور ۱۹۵۳ء ص ۱۱۰

اصولوں سے بھی تجاوز کرنے کی صلاح دی۔ لیکن انھوں نے اور ان کے معاصرین نے پرانے مطلق اصولوں کو مسترد نہیں کیا بلکہ ہر جگہ تطہیر و اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ گویا انھوں نے شاعری پر ایسے نئے اصولوں کا اطلاق کیا جو پرانے اصولوں سے کم جامد اور سخت نہ تھے۔ نئے اصولوں کے منطبق کرنے سے جو شاعری ہمیں ملی اسے ہم مقصدی شاعری کا نام دیتے ہیں۔ اس مقصدی شاعری میں سوائے اس حد تک کہ غزل کی کلاسیکیت اور قدیم شعری روایات سے بغاوت کا عنصر ملتا ہے ہمیں رومانویت کی اصل روح نظر نہیں آتی۔ اس نے ایک طرح قدیم شعری جاذبیت کو بھی ختم کر دیا۔ اصلاحی شاعری کی یہ بے نمکی جنگ عظیم اوّل کے زمانے میں اپنے عروج پر تھی؛ جس کے خلاف ردِ عمل کا ہونا فطری تھا۔ اس ردِّ عمل کی بنیاد اصلاحی شاعری کے دور میں بھی کسی حد تک پڑ چکی تھی۔ جس کے آثار کسی حد تک شرر اور شبلی کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

رومانوی تحریک اسی بے نمکی کے خلاف صدائے احتجاج تھی جسے جنگ عظیم اوّل کے دوران میں اُبھرنے والے متنوع جذبات و احساسات نے مزید بلند آہنگ کیا۔ دراصل بیسویں صدی کے اوائل میں لوگوں میں غیر ملکی ادب پڑھنے کا رجحان فروغ پذیر تھا۔ اس عرصے میں نئی نسل کے کچھ نوجوانوں نے یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی جو وہاں کے افکار و نظریات سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ انگریزی ادبیات، دوسری زبانوں کے ادب کے مطالعے اور دوسرے ممالک کی آزادی کی تحریکوں نے یہاں کے لوگوں میں ہمت اور اُمید پیدا کی اور ان سے اخذ و استفادہ شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نثر میں رومانویت کی ابتدا انگریزی کے بجائے ترکی تراجم سے ہوتی ہے" ❶ کیونکہ ترکی ادب میں اس وقت تک رومانویت کا اچھا خاصا اثاثہ جمع ہو چکا تھا۔

جنگ عظیم اوّل کے دوران میں اور اس کے فوری بعد برصغیر میں اقتصادی اور معاشرتی حالات بہت تلخ تھے۔ سیاسیات میں مختلف تحریکوں کی بنا پر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور استعماریت کے خلاف لوگوں میں نفرت کے جذبات موجود تھے۔ آزاد اور حالی کی مشفقانہ اصلاحی شاعری ان حالات میں اپنا اثر کھو چکی تھی۔ اس کے برعکس باغیانہ رجحانات فروغ پا رہے تھے۔ بغاوت کے یہ رجحانات ایک طرف تو

---

❶ "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب" ڈاکٹر یونس حسنی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۱۱۹

معاشرتی سطح پر رسوم و رواج کے بندھنوں کو توڑنے کے درپے تھے اور دوسری طرف سیاسی سطح پر استعمار کے خلاف برصغیر کی آزادی کے لیے عوام کو جدوجہد پر اکسا رہے تھے۔ آزادی کی یہ لگن رومانوی رجحانات کا محض ایک پہلو تھی۔ اس کا دوسرا پہلو معاشرتی ذمہ داریوں اور حال کی سخت کوشیوں سے فرار اور فطرت کی آغوش میں پناہ لینے کا تھا۔ نفسیاتی طور پر یہ رجعت Regression یعنی آغوش مادر میں سکون کی تلاش کی علامت تھی۔ رومانویت کے اس دوسرے پہلو کے پیچھے انگلستان میں چلنے والی فن برائے فن کی تحریک کی سند بھی تھی۔ یہ تحریک فرانسیسی علامت پسندی کے زیر اثر پروان چڑھی اور شروع شروع میں فن کی دیگر شعبہ ہائے علم سے بالخصوص اخلاقی مقاصد سے آزادی کی علمبردار تھی لیکن جلد ہی آسکر وائلڈ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں تصنع اور زوال پسندی کا شکار ہو گئی۔

اُردو شاعری میں یوں تو رومانویت کی کوئی باقاعدہ روایت کبھی بھی موجود نہیں رہی۔ البتہ قدیم و جدید ادبی سرمائے میں اس کے کچھ عناصر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض اساتذہ کے یہاں مختلف اصناف سخن خصوصاً مثنوی اور غزل میں تخیل کی حسن کاری اس حد تک ہے جس سے رومانوی نقطۂ نظر کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔ کلاسیکی غزل کا سوز و گداز اور حزنیہ رنگ بھی اسی کا غماز ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی روایت شکنی اور غالب کی انفرادیت بھی رومانویت کے زمرے میں شمار کی جا سکتی ہے۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام اصلاح شاعری کی تحریک میں بھی رومانویت کے کچھ کچھ اثرات ملتے ہیں۔ گویا اُردو شاعری میں منتشر ہی سہی لیکن ایسے عناصر ضرور موجود رہے ہیں جو رومانویت کے ضمن میں آتے ہیں اور جو اُردو شاعری میں رومانوی تحریک کے احیا میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

یوں تو بیسویں صدی کے اوائل ہی سے کئی شعراء کے یہاں کسی حد تک رومانویت کے آثار ملتے ہیں لیکن یہ تاثرات پہلے پہل اور واضح طور پر ہمیں اقبال کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں فارسی اور اُردو کی عظیم کلاسیکی روایت کا نچوڑ' فطرت پسندی' آزادی اور تغیر کا شدید رومانوی احساس اور اسلامی فکری عناصر کی ترکیب نے ان کے عظیم تخیل کی گرفت میں آ کر اُردو شاعری میں ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جس کی ابتدا اور انتہا دونوں انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔

اقبال کا کلام ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی غواصی کوئی آسان کام نہیں اور بقول ڈاکٹر یوسف

حسین خاں" اقبال کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس پر مشکل ہی سے آپ کوئی ادبی لیبل لگا سکتے ہیں۔ ❶

اقبال کا بار بار اپنے درخشندہ ماضی کی طرف جھانکنا بھی ان کے رومانوی مزاج کا غماز ہے۔ ان کے نزدیک گزشتہ کل کی یاد آج کی حقیقت سے بھی زیادہ زندہ اور تاثر خیز ہے۔ وہ اپنے تابناک ماضی سے کائنات کی مظہر کسی ایسی تجلی کی جستجو میں ہیں جو آج کے انسان کی ہیئت کو بدل ڈالے۔ ماضی میں ان کی نظر کے سامنے مردِ کامل کا باوقار اور پُر نور چہرہ ہے پھر ایسے مردِ مومن کے خدوخال ہیں جن کے خون نے انسانی اقدار کو دنیا میں عام کرنے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اقبال چاہتے ہیں کہ یہ قوتِ عمل رائیگاں نہ جائے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری کے ہر دھارے میں ایک جذب و مستی کا دریا موجزن ہے بلکہ ان کی شاعری کا منبع جذبہ وتخیل کی شدت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انھیں رومانوی رجحانات کا حامل قرار دے سکتے ہیں۔ اقبال شاعری کی جس روش پر بھی چلتے ہیں تو ان کی چال میں ایک مستانہ وقار ہے، اسی لیے وہ اپنے لیے ایک نہایت مختصر مگر معنی خیز اصطلاحی لفظ "قلندر" پسند کرتے ہیں جس میں رومانوی مزاج کی جھلک ملتی ہے:

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر ❷

"روحِ اقبال" کے مصنف اعتراف کرتے ہیں کہ:

"اقبال کے طرزِ ادا سے آزادی، مستی اور جذب ایسے ملے ہوئے ہیں کہ انسان اس کے کلام کو سن کر وجد کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کا اظہار لفظ "قلندر" سے کرتا ہے جس سے بڑھ کر رومانیت پسندی کے اظہار کے لیے غالباً اور کوئی دوسرا لفظ نہیں۔ رومانیت اور رمزیت کی روح اس ایک لفظ "قلندر" میں آ گئی ہے۔

---

❶ روحِ اقبال، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مطبوعہ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۳ء ص ۶۷

❷ اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء ص ۱۹۱

ز برون درگذشتم ز درون خانہ گفتم
سخن نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم ❶

یہ مصنف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"ایک جگہ اس (اقبال) نے ان چیزوں کو گنایا ہے جو وہ بطور تحفہ بزمِ شوق یعنی زندگی کے لیے لایا ہے۔ یہ سب چیزیں رمزیت اور رومانیت کی جان ہیں:

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خمخانہ مے" ❷

چنانچہ اقبال کی شاعری میں عقل و عشق، خطر پسندی، بے باک اور طوفانی جذبات سے محبت کرنے کا رجحان، تب و تاب آرزو، عمل پیہم، خودی کا وجدان، مردِ مومن کا تصور فطرت اور شعور ماضی یہ تمام باتیں ان کے رومانوی رجحانات پر دلالت کرتی ہیں۔

اُردو شاعری میں رومانویت کا سب سے واضح اور دلآویز رجحان اختر شیرانی کے کلام سے مترشح ہوتا ہے۔ رومانویت کی بنیادی خصوصیات کو جس قدر اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں سمویا ہے اور پھر جس طرح ان خصوصیات کا فنکارانہ انداز میں اظہار کیا ہے وہ اُردو شعراء میں صرف انھیں کا حصہ ہے۔

بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

"اگر اُردو میں رومانوی شاعری کی کوئی نمائندگی کر سکتا ہے تو وہ اختر شیرانی ہیں"۔ ❸

بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"اختر رومانی شاعر ہیں یا کچھ نہیں"۔ ❹

اور اختر کے ایک دوست حکیم نیر واسطی کے خیال کے مطابق:

"مشرق میں رومانی شاعری کے تین پیمبر آئے ہیں۔ ایک امراء القیس، دوسرا حافظ

---

❶ "روحِ اقبال" ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص ۶۸

❷ "روحِ اقبال" ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص ۶۸

❸ اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ص ۱۳۳

❹ "اُردو شاعری میں رومانوی تحریک" ڈاکٹر محمد حسن، مطبوعہ کاروانِ ادب، ملتان صدر ۱۹۸۴ء، ص ۶۱

شیرازی اور تیسرا اختر شیرانی' جس کی زبان حافظ کی تھی اور تخیل امراء القیس کا"۔ ❶

اختر کی شاعری میں مشرقی ادب کی جذب وکیف کی تابندہ روایات کی جھلک بھی ہے اور مغربی ادب کی رومانویت کا پرتو بھی اور اس طرح اس کی شاعری مشرق ومغرب کا خوبصورت امتزاج ہے۔

اختر شیرانی کی تمام تر زندگی ایک شان بے نیازی' بے راہ روی' بے اعتدالی' بے اصولی' جذباتیت اور تصور پرستی کا حسین مرقع ہے اور یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو ایک شاعر کے رومانوی ہونے کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اختر ابتداء ہی سے فطرتاً ایک مخلص جذباتی اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز درویش صفت انسان تھے۔ ان کے یہاں ہر جگہ ایک جذب ومستی اور ذوق کا عالم کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے فکر وخیال کا محور دماغ کے بجائے دل ہے۔ وہ حسن کے شاعر ہیں خواہ وہ حسن انسان میں ہو یا آسمان سے زمین تک کی کسی اور چیز میں۔ دنیا کا کوئی مقام یا منظر ہو اختر کی شاعری میں آکر وہ اور حسین بن جاتا ہے۔ حسن کی پرستش کرنا ان کا شعار ہے اور اسی لیے وہ ہر گام پر جلوہ حسن کے متلاشی ہیں یہاں تک کہ ان کی حسن پرست نگاہیں اپنے حسن آفرین تخیل سے ایسے مناظر میں بھی حسن کا پہلو تلاش کر لیتی ہیں جن میں ایک سطحی آدمی کے لیے کوئی کشش نہیں ہوتی مثلاً انھیں بیمار کلیوں میں بھی صحت مند حسن نظر آجاتا ہے۔

کوئی جانِ ملاحت ہے' کوئی جانِ صباحت ہے
مجھے تو کچھ انھیں بیمار کلیوں سے محبت ہے ❷

دراصل فطرت کے مظاہر میں بھی ایک رومانوی شاعر کو اپنے شدید باطنی جذبات کا پرتو دکھائی دیتا ہے اور فطرت اس کی اپنی اندرونی زندگی کے نشوونما کے سوا کچھ بھی نہیں مثلاً جب ورڈز ورتھ کہتا ہے کہ "پہاڑی ندی نالوں کی محبت اس کے لیے ایک والہانہ جذبہ تھی تو وہ فطرت کو خراج عقیدت پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے شعور حسن کا اعلان کرتا ہے"۔ ❸

---

❶ "سلمٰی سے دل لگا کر" نیر واسطی مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۰ء ص ۹

❷ "اختر شیرانی اور جدید اردو ادب" ڈاکٹر یونس حسنی ص ۱۶۹

❸ "مغربی شعریات" محمد ہادی حسین مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء ص ۳۰۹

پنے باطنی شعورِ حسن کا پرتو اختر کو بھی مظاہرِ فطرت میں نظر آتا ہے جس کی مرقع کاری الفاظ کی مدد سے وہ اس طرح کرتے ہیں اور اس طرح رنگ بھرتے ہیں کہ انسان اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر نس حسنی کے الفاظ میں:

''وہ ایک مصور ہیں جس کے نگار خانے میں مناظرِ قدرت کے حسین مرقعے آویزاں ہیں۔ وہ ایک ماہر بت تراش ہیں جو اجسام ہی کو نہیں حسیات و کیفیات کو بھی مجسم کر دیتے ہیں۔ اختر کی یہ مرقع نگاری اور بت تراشی ان کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں ہے............
ان کا انداز اس قدر دلآویز اور اتنا فطری ہے کہ مناظر سے لطف اندوزی میں ہم ان کے ہم مشرب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے............ اختر کے اس صنم کدے کی جھلک ملاحظہ ہو:

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے
ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تم کو!
نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے
کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمہیں
شجر نے محوِ گل و شاخسار دیکھا ہے'' ❶

منزلِ حسن کی یہی بے باک تلاش شاعر کو ماورائی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں اس کا لطیف نام ''سلمیٰ'' ہے جو اختر کے نزدیک عورت کے نام کا ایک استعارہ ہے۔ وہ عورت جس کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرا ہے اور جس کا حسن بے پروا اور جس کی محبت اختر کے نزدیک دین و دنیا کا خلاصہ

---

❶ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب'' ڈاکٹر یونس حسنی، ص ۱۶۹

ہے۔ یہی رومانویت کا سب سے گہرا رنگ ہے۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ اور اس طرح کے دوسرے نام اختر کا جمال ذہنی ❶ تھے۔ جو مادی طور پر کبھی متشکل نہیں ہوئے۔ ❷

اختر بلاشبہ بلانوش تھے اور آوارہ منش بھی لیکن طبعاً انتہائی شریف تھے۔ وہ غم کی ذرا سی کسک بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان کی شاعری کے رومانوی ماحول، ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انھیں دنیائے شعر وادب کا رومانوی شہزادہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنی داخلی کیفیات میں اسنے مگن رہتے تھے کہ بیرونی دنیا ان کے لیے کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ گوپال متل، جو ان کے ہم عصر اور ہم مشرب تھے ان کی ان کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اختر شیرانی کے لیے تو بعد میں باہر کی دُنیا بالکل ہی بے حقیقت ہوگئی تھی اور ان کے ذہنی ہیولوں نے ان کے لیے ٹھوس شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ جن سے وہ خواب ہی میں نہیں بلکہ عالم بیداری میں بھی ہم کلام رہتے تھے.......... میں کبھی کبھی ملنے چلا جاتا تو مجھ سے پوچھتے کیا تمھیں کوئی آواز نہیں آ رہی۔ پھر کہتے رات اس نے مجھے پوری غزل لکھوادی۔ وہ بولتی جاری تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔ اسے خلل حواس کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن یہ خارجی ماحول پر داخلیت کی فتح بھی تو ہے''۔ ❸

اُردو شاعری میں اختر شیرانی سے قبل بیشتر طور پر محبوب کی جنس ملفوف ہے۔ کبھی اس سے امرد پرستی کا پہلو نکلتا ہے اور کبھی طوائف پرستی مترشح ہوتی ہے۔ جبکہ اختر شیرانی نے واشگاف الفاظ میں عورت کو جذبہ عشق کا موضوع بنایا ہے جو ان کی نظر میں ایک ماورائی خواب اور ایک نغمہ شیریں ہے۔ انھوں نے تانیث سے ہرگز گریز نہیں کیا بلکہ کھلم کھلا عورت سے مخاطب ہیں۔ عورت ان کی نظر میں ایک دیوی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی محبت میں ہوسناکی، پستی اور ابتذال نہیں بلکہ حسن اور معصومیت ان کے یہاں ہم معنی ہیں۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کی شدت کو منظر عام پر لانے میں کوئی مصلحت یا حجاب روا

---

❶ ''ادب اور نظریہ'' آل احمد سرور، مطبوعہ ادارہ اُردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء ص ۷۹

❷ ''لاہور کا جو ذکر کیا'' گوپال متل، مطبوعہ مکتبہ تحریک نئی دہلی ۱۹۷۶ء ص ۳۹

❸ ایضاً، ص ۴۱

نہیں رکھتے بلکہ اپنے رومان کی تشہیر کرتے ہیں اور بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

> ''رومان سے ان کا اتنا گہرا تعلق تھا کہ ایک ادبی مجلہ نکالا تو اس کا نام بھی ''رومان'' رکھا اور برسوں یہ رسالہ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا''۔ ⓿

اس طرح اختر کی شاعری میں رومان کو گہرا دخل ہے لیکن ان کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس رومان کو واقعیت کے روپ میں پیش کیا۔

اختر شیرانی اوّل و آخر تخیل کے شاعر ہیں اور تخیل ہی میں حسن کے پیکر تراشتے اور حسن کے ایوان و گلزار تعمیر کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا فن رومانویت سے عبارت ہے اور یہی رومانویت ان کو اُردو شعراء میں منفرد اور اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز کرتی ہے انھوں نے اپنے مخصوص رنگ و آہنگ سے نہ صرف اپنے ہم عصر شعراء کو متاثر کیا بلکہ آئندہ کے شعراء بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

رومانویت کی اس تحریک میں ایک اور اہم نام حفیظ جالندھری کا ہے۔ حفیظ کا ''شاہنامہ'' بھی جو ج تک ان کا کارنامہ شمار ہوتا آرہا ہے رومانویت کے رجحان کا آئینہ دار ہے۔ اس سے پہلے حفیظ کے منفرد انداز کے گیتوں اور ان کی ہلکی پھلکی چھوٹی بحر کی نظموں سے بھی خالص رومانویت مترشح ہے۔ ان گیتوں اور نظموں میں حفیظ نے بڑی سادگی سے کہیں حسنِ فطرت کی عکاسی کی ہے' کہیں ارضِ وطن سے لہانہ شیفتگی ہے اور کہیں جذبہ حسن و عشق کی معصومیت کا اظہار کیا ہے اور ہر جگہ ان کا اسلوب دلکش ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''حفیظ کی رومانویت ان معصوم حیرتوں سے عبارت ہے جو اُن کے دل میں گردو پیش کے حسن کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت کا جمال ایک نغمہ سرمدی بن کر اُبھرا ہے۔ وہ فطرت کی آغوش میں سر رکھ کر اِن حیات آفرین لوریوں کو سنتے ہیں اور فطرت کے نغمے سے قلب و روح کو تازگی عطا کرتے ہیں............ ان کی رومانویت کا ایک اور

⓿ ''وے صورتیں الٰہی'' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۴۷

زاویہ ارضِ وطن کی محبت میں ظاہر ہوا"۔ ❶

حفیظ کی شاعری پر ٹیگور اور اقبال کے اثرات ضرور ہیں لیکن وہ کسی کے مقلد نہیں اور رومانوی شعراء میں ان کا سب سے الگ ایک اپنا مقام ہے' جو اختر شیرانی' مجاز' میرا جی' ن۔ م راشد اور جوش سے بہت مختلف ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

"اس کی رومانیت تو اس کی اپنی ہی ہے جو ایک طرف اس کی سرشاری اور جوشِ زندگی میں اور دوسری طرف اس کے ملی و وطنی احساسات میں منعکس ہوتی ہے..................۔

حفیظ جو کچھ بھی ہے اپنے دور کی رومانی ادبی تحریک کا ناقابل فراموش' مقبول ترین اور اثر چھوڑنے والا شاعر ہے۔ جس کی شاعری کے نقوش اتنے مستقل اور دیرپا ہیں کہ زمانے کی ہر کوشش کے باوجود مٹ نہیں سکے"۔ ❷

اُردو شاعری میں رومانوی تحریک کا زمانہ حقیقتاً دونوں عالمگیر جنگوں کا درمیانی زمانہ ❸ ہے۔ اس دور میں ہندوستان کے باشندوں میں جبر و محرومی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر زندگی کو ایک خاص نہج پر ڈالنے اور خواب و خیال کی دُنیا میں رہنے کا احساس بھی شدت پکڑتا رہا جسے رومانوی شعراء نے اپنے شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ لیکن ان شعراء کے سامنے کسی منزل کا واضح نشان نہ تھا۔ چنانچہ رومانویت کی یہ تحریک جس نے فکر و خیال سے بڑی خدمات سرانجام دی تھیں' منتشر ہونا شروع ہوئی اور نتیجتاً ترقی پسند ادبی تحریک میں مدغم ہو گئی۔ کچھ ترقی پسند شعراء نے رومانوی ادبی تحریک کے اثاثے کو قیمتی جان کر ابتدا میں اسے ہی استعمال کیا۔ چنانچہ ان شعراء کے ہاں جو رومانوی ادبی تحریک اور ترقی پسند ادبی تحریک۔ کے سنگم پر ہیں' رومانویت کے واضح آثار ملتے ہیں۔ ان شعراء میں' جن کا اُردو شاعری میں ایک مقام ہے' ڈاکٹر محمد دین تاثیر' میرا جی' ن۔ م راشد' فیض احمد

---

❶ "اُردو ادب کی تحریکیں" ڈاکٹر انور سدید' ص ۳۶۳

❷ "سخن ور" (نئے اور پرانے) ڈاکٹر سید عبداللہ' مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۷۶ء' ص ۱۵۳

❸ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تصنیف "اُردو ادب کی تحریکیں" کے صفحہ ۴۷۹ پر لکھا ہے کہ:

"اُردو ادب میں رومانی تحریک کا دورِ عروج بیسویں صدی کے ربع چہارم تک پھیلا ہوا ہے۔" جو کہ صحیح نہیں۔ اس تحریک کے اثرات قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک تو ملتے ہیں لیکن اس کے بعد نہیں۔

فیض، احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی بطور خاص شامل ہیں۔ ان کے رنگ و اسلوب کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔

ترقی پسند ادبی تحریک

ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات کوئی نئی چیز نہیں ہیں بلکہ ہر دور کا ادب اپنے ماضی کی نسبت ہمیشہ ہی ترقی پسند ہوتا ہے۔ ادبی اور علمی تحریکات اور نظریات یقیناً سماج میں تبدیلی اور وقتی تقاضوں سے پیدا ہوتے ہیں لیکن گزشتہ تہذیبی سرمائے اور روایات کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ گویا فطری طور پر یہ ایک مسلسل اور نامیاتی عمل ہے جو ماضی کی درخشندہ روایات اور نئے دور کے مطالبات کو ہم آہنگ کر کے تخلیقی سوتوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اگر کوئی اس عمل میں سدِّ راہ ہوا تو ہمیشہ ناکام رہا اور کسی نے اس سے عداوت رکھی تو لاحاصل رہی۔

ترقی پسند مصنفین کے نام سے برصغیر میں جو تحریک ۱۹۳۵ء سے شروع ہوئی اس کا مطالعہ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس کی محرک وہ قوتیں ہیں جنھوں نے نہ صرف اُردو اور برصغیر کی دوسری علاقائی زبانوں بلکہ دنیا بھر کی چھوٹی بڑی تمام زبانوں کو کم یا زیادہ متاثر کیا ہے۔ تاریخ کے کسی حصے میں شاید ہی کوئی ایسی تحریک برسرِ کار آئی ہو جس نے انسانی سرگرمی اور کارکردگی کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا کہ اس ترقی پسند تحریک نے جو بحیثیت مجموعی اشتراکی نقطہ نظر کی تائید کرتی ہے۔

اس بات کا کھوج لگانا کچھ آسان کام نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اُردو شعر و ادب پر کیا کیا اثرات مرتب ہوئے اور اس کے آئندہ کیا کیا اثرات ظہور پذیر ہوں گے۔ لیکن یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز (۱۹۳۵ء) سے بہت پہلے اُردو شعر و ادب کے مزاج میں فطری، سماجی اور سیاسی شعور کا داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ آزاد، حالی، شبلی اور اکبر کی شاعری میں ہمیں اس شعور کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اور شعراء کے علاوہ خصوصاً ان شعراء نے شعوری طور پر شاعری کے ساتھ سماج کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ یہی ان کے زمانے کا تقاضا تھا۔ "قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی

حالت بدلتی رہتی ہے"۔ ❶

گویا شعر و ادب کبھی بھی سماج اور زندگی سے الگ نہیں ہوتے بلکہ ان میں وقت کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ فقط متذکرہ شعراء کا کلام ہی اپنے دور کے رجحانات کا حامل ہے بلکہ ان بزرگوں سے پہلے کا ادب بھی سماج اور زندگی سے لاتعلق نہیں ہے۔ اگر شعر و ادب ترقی پذیر نہیں ہوتے تو انحطاط پذیر ہوتے ہیں اور پھر بھی زندگی کے کسی نہ کسی طبقے اور سماج کے کسی نہ کسی پہلو کے ترجمان ضرور رہتے ہیں۔ ادب زندگی سے لاتعلق ہو کر رہ ہی نہیں سکتا اور سیاسی اثرات سے بھی مبّرا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ لوگ جو ادب کو سیاست سے الگ تھلگ رکھنے کے حامی ہیں وہ ادب کی فطری نشو و نما سے ناواقف ہیں اور غلطی پر ہیں۔

جہاں تک ترقی پسند ادبی تحریک کا تعلق ہے تو واضح ہے کہ اس کی گھٹی میں سیاست شامل ہے۔ سرزمین لاہور میں، جہاں سے جدید شاعری کی تحریک کا آغاز ہوا، ہمیں حالی واضح طور پر نئے سماجی اور سیاسی شعور کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنے شعری افکار میں سیاست اور معاشرت کو داخل کیا ہے اور شعری روایات کے دھارے کے رُخ کو "ادب برائے ادب" سے "ادب برائے زندگی" کی طرف موڑا ہے۔ حالی کے تو "مقدمہ شعر و شاعری" لکھنے کی غایت ہی یہ تھی کہ وہ شعراء کو بتانا چاہتے تھے کہ شاعری کا اصل مقصد کیا ہے اور ایک شاعر اپنی شاعری سے کیا کچھ کام لے سکتا ہے اور یہ کہ محض الفاظ کی طلسم سازی اور تخیل کی بلند پروازی شاعری کا کمال نہیں ہے بلکہ کمال ہے تو یہ ہے کہ شاعری دلگداز ہونے کے ساتھ ساتھ بامقصد، اخلاقی اقدار کی حامل اور انقلاب آفرین ہو اور انھیں جذبات کے زیرِ اثر انھوں نے اپنی لافانی نظم "مدوجزر اسلام" لکھی جس میں ان کا قومی شعور اوجِ کمال پر ہے اور جس کے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں کہ:

"حالی کا مسدس اُردو زبان کی پہلی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ یہ حالی کا شاہکار تھا اور اس نے اُردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا .... فنی اعتبار سے مسدس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو آج بھی ترقی پسند شاعری کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ زبان کی سادگی،

---

❶ مقدمہ شعر و شاعری، خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۱۱۲

نرمی، سلاست، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے پرہیز، براہ راست انداز بیان ایسی چیزیں ہیں، جنھوں نے جاگیرداری انداز بیان کے تصنع کو ختم کر دیا"۔ ❶

مسدس کے علاوہ بھی حالی نے ایسی بہت سی نظمیں لکھیں ہیں جن میں ان کا قومی شعور بہت بلند ہے مثلاً انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" کے عنوان سے یہ نظم:

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر، کرامت ہے یہ انگلستاں کی
اس کی سرحد میں غلامی نے جو نہیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلب ماہیت میں انگلستاں ہے گر کیمیا،
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستاں بھی
آن کر آزاد، یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام، اس کی ہوا جن کو لگی ❷

جدید شاعری کی تحریک کا مقصد زندگی کو اصلاح کی راہوں پر گامزن کرنا تھا کیونکہ یہی اصلاح کا راستہ اور وقت کا تقاضا تھا۔ لیکن اس میں وہ انقلابی آہنگ اور وہ سیاسی شعور نہیں ہے جو ہمیں اقبال کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں ماضی کی درخشندہ روایات کے ساتھ ساتھ اصلاح پسندی کے وہ رجحانات بھی بلند سطح پر نظر آتے ہیں جن کے نقوش اس سے قبل آزاد، حالی، شبلی اور اکبر کے یہاں زیادہ واضح نہیں ہیں۔ اقبال کی شاعری عصر نو کی شاعری ہے۔ جو پُر جوش، پُر اُمید، پُر حوصلہ، مترنم اور متحرک ہے۔ اس میں بڑی ہمہ گیری، گیرائی اور وسعت ہے۔ ان کی شاعری کا عرصہ کچھ کم نصف صدی پر محیط ہے۔ اس زمانے کی شاید ہی کوئی سماجی اور سیاسی تحریک ایسی ہو جس کا عکس اس میں نظر نہ آتا ہو۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے یورپ اور ایشیا کے تمام اہل فکر کو متاثر کیا تھا۔ اقبال ایک عظیم مفکر

---

❶ ترقی پسند ادب، سردار جعفری، مطبوعہ مکتبہ پاکستان چوک انارکلی لاہور ۱۹۵۶ء ص ۱۰۹

ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شاعر بھی تھے لہٰذا ان کے یہاں بھی اس انقلاب کے شدید تاثرات نظر آتے ہیں۔ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت' سرمایہ و محنت کی کش مکش' کسانوں کی بدحالی اور انقلاب کو کئی جگہ اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں اس کا نقشِ اوّل ہمیں ان کی نظم "خضر راہ" میں نظر آتا ہے۔ جس میں اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی حیلہ گری کو بے نقاب کرتے ہوئے مزدور طبقے کو بورژوا کے چنگل سے نکل کر متحد و منظم ہونے کا پیغام دیا ہے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا' ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے ❶

اقبال نے اپنے افکار میں مغربی تہذیب کی کبھی تعریف نہیں کی حالانکہ اس میں بھی خیر و شر دونوں پہلو موجود ہیں لیکن اشتراکیت کے ضمن میں تعریف کا پہلو مذمت پر بھاری رہا ہے۔ بالِ جبریل کی ایک نظم "لینن .... خدا کے حضور میں" میں اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی مزید مذمت کی ہے۔ اسی نظم کے آخری دو شعر ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

---

❶ بانگِ درا' اقبال' ص ۲۶۲' ۲۶۳

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات [1]

بال جبریل کی ایک اور نظم "فرمان خدا............فرشتوں سے" ہے۔ یہ نظم سرتاپا اشتراکی نقطہ نظر کی تائید میں ہے:

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو [2]

اس نظم کے متعلق ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے ہے کہ:

"(یہ نظم) ایسی ہیجان انگیز اور ولولہ خیز ہے کہ اس کے جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے اگر روسی زبان میں اس کا موثر ترجمہ ہو سکتا اور وہ لینن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنا دینے پر آمادہ ہو جاتا' سوا اس کے کہ مُلحد لینن کو اس میں یہ خلل نظر آتا کہ اس میں خدا یہ پیغام اپنے فرشتوں کو دے رہا ہے اور اس کے نزدیک وجود نہ خدا کا ہے اور نہ فرشتوں کا .... یہ نظم کیمونسٹ منی فیسٹو (اشتراکی لائحہ عمل) کا لب لباب ہے اور محنت کشوں کے لیے انقلاب بلکہ بغاوت کی تحریک ہے"۔ [3]

---

[1] بال جبریل' اقبال' ص ۱۰۸
[2] بال جبریل' اقبال' ص ۱۰۹' ۱۱۰
[3] فکر اقبال' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' مطبوعہ بزم اقبال' لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۳۱

اقبال کی دیگر نظموں مثلاً ''اشتراکیت'' ❶ اور کارل مارکس کی آواز'' ❷ میں بھی انھیں خیالات کا اظہار ہے۔ ''ساقی نامہ'' اقبال کی اُردو شاعری کا ماحصل ہے۔ اس میں بھی ہمیں اقبال کے افکار کی وہی انقلابی گونج سنائی دیتی ہے جس کا جستہ جستہ وہ پہلے ہی اظہار کرتے رہے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا ❸

اقبال اشتراکیت کے حامی نہیں۔ اس تحریک کے بعض بنیادی اصولوں سے انھیں اختلاف ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایک خالصتاً مادی تحریک ہے جس کی بنیاد خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی پر ہے۔ لیکن چونکہ اس نظام میں اسلامی نظام عدل کی جھلک نظر آتی ہے اس لیے وہ مختلف جہتوں سے اس کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اقبال کے فارسی کلام کی طرف اس وقت ہمارا روئے سخن نہیں ہے تاہم اشتراکی نقطۂ نظر کی تائید اور انقلابی نظریات ہمیں ان کی فارسی نظموں میں زیادہ نظر آتے ہیں اور ان کی نظمیں ''موسیولینن'' ❹ قیصر ولیم'' ❺ قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور'' ❻ اور نوائے مزدور ❼ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

---

❶ ضرب کلیم، اقبال، مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ۱۹۸۱ص ۱۳۶

❷ ضرب کلیم، اقبال، ص ۱۳۷

❸ بال جبریل، اقبال، ص ۱۳۳

❹ پیام مشرق، اقبال، مطبوعہ شیخ غلام علی ۱۹۷۲، ص ۲۰۹

❺ ایضاً، ص ۲۱۰

❻ ایضاً، ص ۲۱۵

❼ پیام مشرق، اقبال، مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور۔ ۱۹۷۲ء

مختصر یہ کہ سماجی تحریکات کے ساتھ وابستگی ہمارا جمہوری ادبی ورثہ ہے۔ اس ورثے میں ۱۹۳۵ء تک ہمہ گیر تبدیلیوں کے ساتھ بڑی وسعت پیدا ہو گئی تھی کیونکہ گزشتہ پون صدی میں سماجی اور سیاسی بیداری کی جدو جہد کے سبب اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور یہ تبدیلیاں باشعور ادبی حلقوں، خصوصاً نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو بغاوت، انقلاب، مساوات اور آزادی کے تصور سے سرشار کر رہی تھیں۔ جس پر اشتراکیت کے فلسفے اور عوامی انقلاب کی لہر نے مہمیز کا کام کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اکثر طلباء اب امریکہ کی آزادی، انقلاب فرانس اور انقلاب روس پر مبنی لٹریچر پڑھ رہے تھے۔ ابراہیم لنکن، روسو، کارل مارکس، اینگلز اور لینن کی سوانح عمریاں اور ان کے افکار کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ ایسے ہی ہم خیال طلبہ کے ایک گروہ نے جو برصغیر سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ میں تھا، ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ جس کی روح رواں سید سجاد ظہیر تھے۔ اسی ادبی حلقے نے ۱۹۳۵ء کے اوائل میں لندن میں "ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن" (۱) کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ شرکاء میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ اسی سال جولائی میں چند بین الاقوامی شہرت یافتہ خیالات کے حامل ادیبوں نے فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر ترقی پسند خیالات کی ترویج واشاعت کی غرض سے پیرس میں ایک کانگرس بلائی (۲) کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ دنیا کے ہر خطے کے ہر ادیب و شاعر کو اپنی ذات سے باہر نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کے لیے

---

(۱) "INDIAN PROGRESSIVE WRITERS'ASSOCIATION" بحوالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمٰن اعظمی، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۴ء، ص ۳۰

(۲) اس کانگریس کا پورا نام "کلچر کے تحفظ کے لیے ادیبوں کی عالمی کانگریس تھا یعنی

"WORLD CONGRESS OF THE WRITERS FOR THE DEFENCE OF CULTURE"

بحوالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۳۱

رجعت پسندوں کے مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

اس موقع پر ادباء اور شعراء کے نام ایک اپیل شائع کی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ:

"رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔ ہمارا قلم' ہمارا فن' ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رُکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں' جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں' جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں" ❶

اس کانفرنس میں برصغیر سے کوئی بڑا ادیب یا شاعر شریک نہ ہو سکا تھا تاہم سید سجاد ظہیر نے ضرور شرکت کی جنھوں نے اس کانگرس کے انعقاد سے صرف چند ماہ قبل لندن میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم کی تھی۔ پیرس میں کانگرس کے اجتماع سے متذکرہ انجمن کو بڑی تقویت ملی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے لندن میں جو منشور تیار کیا تھا اس کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ برصغیر میں ہونے والے سماجی اور سیاسی تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں ممد و معاون ہوں۔ آج ہمارے شعر و ادب میں جذبات کی نمائش عام ہے۔ عقل و فکر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ شعر و ادب اور دیگر فنون کو قدامت پسندوں کی اجارہ داری سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے اور اسے زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ❷

یہ انجمن جو سید سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء نے بنائی تھی اس کی حیثیت محض ایک ادبی حلقے یا لٹریری سوسائٹی کی نہ تھی کہ بلکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ یہ انجمن ایک ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کرے اور ہندوستان میں جو شاعر اور ادیب ترقی پسند خیالات رکھنے والے ہوں وہ سب ایک جماعت میں منسلک ہوں، چنانچہ سید

---

❶ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۳۱

❷ ماخوذ از اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمٰن اعظمی' ص ۳۲

سجاد ظہیر نے انجمن کے منشور کی نقول ہندوستان میں اپنے دوستوں اور مختلف شاعروں اور ادیبوں کو ان کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے بھیجیں۔ اکثر نے انجمن کے مقاصد کی ہمت افزائی کی۔ ہمت افزائی کرنے والے لوگوں میں سے زیادہ کا تعلق الہ آباد سے تھا۔ چنانچہ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا جس میں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ ❶ سجاد ظہیر نے ان عظیم ادیبوں سے ملاقات کی اور ادبی تحریک کے منصوبے کو اُن کے سامنے رکھا۔ ان تینوں حضرات نے تحریک کے مقاصد سے اتفاق کیا اور منشور پر اپنے دستخط کر دیے۔ ❷

الہ آباد میں ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے ساتھ ہی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی ترقی پسند خیالات کے حامل ادیبوں نے اپنے یہاں اسی طرح کی انجمنیں قائم کرلیں۔ علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی جس کا پہلا باقاعدہ جلسہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ ❸ حیدر آباد میں سبط حسن اور قاضی عبدالغفار نے اس تحریک کو منظم کیا۔ ❹ کلکتہ میں ہیرن مکرجی نے اس انجمن کی تشکیل میں سب سے زیادہ کام کیا۔ ❺ صوبہ بہار میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی کی کوششوں سے انجمن قائم ہوئی۔ ❻ الہ آباد میں انجمن کی تشکیل کے کچھ ہی دنوں بعد (جنوری ۱۹۳۶ء) ❼ سید سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کی ترویج کے لیے اور اس سلسلے میں پنجاب کے ادیبوں سے براہِ راست گفتگو اور تبادلہ خیالات کرنے کے لیے امرتسر اور لاہور کا دورہ کیا۔ پہلے

---

❶ ماخوذ از روشنائی 'سید سجاد ظہیر' مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور ۱۹۷۶ء ص ۲۰ '۲۱

❷ ایضاً

❸ اُردو ادب میں ترقی پسند ادبی تحریک 'خلیل الرحمن اعظمی' ص ۳۵

❹ ایضاً

❺ ایضاً

❻ اردو ادب میں ترقی پسند ادبی تحریک 'خلیل الرحمن اعظمی' ص ۳۵

❼ روشنائی 'سید سجاد ظہیر' ص ۲۳

امرتسر آئے اور وہاں سے محمود الظفر' پرنسپل ایم اے او کالج' ان کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں اور فیض احمد فیض کے ہمراہ جو اس وقت ایم۔ اے۔ او کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے لاہور پہنچے۔ لاہور میں اس تحریک کو آگے بڑھانے میں میاں افتخار الدین نے نمایاں حصّہ لیا۔ ❶ صوفی تبسم اور اختر شیرانی نے انجمن کے قواعد و ضوابط سے اتفاق کیا اور انجمن کے منشور پر دستخط کر دیے۔ ❷ فیض کی تجویز پر صوفی تبسم لاہور کی انجمن کے عارضی سیکرٹری چنے گئے۔ ❸ لاہور میں انجمن کے باقاعدہ تشکیل پا جانے کے بعد اس پلیٹ فارم سے انجمن کے منشور کو ہندوستان میں پھیلانے کے لیے سب سے زیادہ کام ہوا اور سید سجاد ظہیر کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ:

> ''ہم میں سے کسی کو بھی یہ وہم و گمان نہیں تھا کہ لاہور کی ادب پرور سر زمین پر یہ دہ پہلا لغزیدہ قدم ہے جو بعد کو اُردو کے کھلیان میں سنہرے خوشوں کا اتنا بڑا انبار لگا دے گا۔ چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر' فیض' بیدی' احمد ندیم قاسمی' میرزا ادیب' ظہیر کاشمیری' ساحر' فکر' عارف' رہبر' اشک وغیرہ جیسے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے دوسرے حصے کے ادیبوں کے لیے قابلِ رشک بن گئیں''۔ ❹

اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہندوستان بھر میں لاہور سب سے بڑا ادبی و اشاعتی مرکز تھا۔

بہرکیف ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے چند ماہ میں ہی اس قدر مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ ملک میں ہر طرف سے ترقی پسند رجحانات کی تائید ہونے لگی۔ نوجوان ادیب اور شاعر اس میں دامے' درمے اور سخنے حصہ لے رہے تھے معمر اور بزرگ ادیب اور شاعر نوجوانوں کی ان کوششوں کو سراہ رہے تھے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جائے جہاں ملک کے تمام ادیب جمع ہو کر

---

❶ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمٰن اعظمی' ص ۳۵

❷ روشنائی' سید سجاد ظہیر' ص ۴۰

❸ ایضاً' ص ۴۲

❹ روشنائی' سید سجاد ظہیر' ص ۴۲

ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کریں اور ادب اور ادیبوں کے مسائل پر غور و خوض کر کے انجمنوں کی سرگرمیوں کے لیے ایک دستور اور لائحہ عمل تیار کریں۔ ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی زیر صدارت منعقد ہوئی ❶ منشی پریم چند نے کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر کانفرنس میں شرکاء کا خیر مقدم کرنے کے بعد ان الفاظ سے شروع کی:

''حضرات! یہ جلسہ ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پیدا ہو۔ ❷

پریم چند نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے آخر میں یہ الفاظ کہے:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا' جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت' ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''۔ ❸

اس کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے جن میں کئی ایک مقالے پڑھے گئے اور تقاریر ہوئیں۔ آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے تقریر کی۔ جس میں انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور اس کے اعلان نامے سے مکمل اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا:

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنا چاہیے۔ اس میں عوام کے دُکھ سکھ' ان کی بہترین

---

❶ ترقی پسند ادب' علی سردار جعفری' مطبوعہ مکتبہ پاکستان' لاہور ۱۹۵۶ء' ص ۱۹۶

❷ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمن اعظمی' ص ۴۱' ۴۲

❸ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمن اعظمی' ص ۴۵

خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور متحد و منظم ہو کر اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں"۔ ❶

لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس نے ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی طرف راغب کیا اور جا بجا اس کے چرچے ہونے لگے۔ اس طرح یہ تحریک ملک گیر حیثیت اختیار کر گئی۔ تحریک کی آواز عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں پنجاب کے تاریخی مقام جلیا نوالہ (امرتسر) کے مقام پر فیض احمد فیض کے اہتمام سے ایک کانفرنس بلائی گئی۔ شرکاء میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف، چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر بھی شامل تھے۔ ❷

اس کانفرنس کے اختتام پر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف لاہور آئے اور میاں افتخار الدین کی وساطت سے علامہ اقبال سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اس تحریک کے اغراض و مقاصد رکھے۔ علامہ صاحب نے بڑی ہمت افزائی کی اور کہا:

"ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے، آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے"۔ ❸

اس سے اگلے سال (مارچ ۱۹۳۸ء) الٰہ آباد میں ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس میں لاہور سے فیض احمد فیض نے شرکت کی اور بعد ازاں اسی سال (دسمبر ۱۹۳۸ء میں) ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ اس طرح گویا دو ڈھائی سال کے عرصے میں ترقی پسند تحریک کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اسی اثنا میں ترقی پسند مصنفین کی نگارشات کو شائع کرنے کے لیے کئی ایک ہفتہ وار اور ماہوار جرائد کے علاوہ ماہوار "نیا ادب" جاری کیا گیا، جس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ تقریباً تین سال کے تعطل کے بعد انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی ۱۹۴۲ء میں

---

❶ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۳۵

❷ ایضاً، ص ۴۸

❸ روشنائی، سید سجاد ظہیر، ص ۱۶۰

دہلی میں منعقد کی گئی۔ اس اجتماع کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں وہ ادیب اور شاعر بھی شریک ہوئے جو ادبی نظریات میں ترقی پسند تحریک سے متفق نہیں تھے۔ خاص طور پر حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کا گروپ جو ''ادب برائے ادب'' کا قائل تھا اور ''ادب برائے زندگی'' کی افادیت سے انکار کرتا تھا۔ اس گروپ کے اکثر ادیب اور شاعر یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے۔ شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد کے بجائے ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔ ان کی بنیاد یہ تھی کہ ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف تھے اور اس کا وقتاً فوقتاً اور جا بجا اعلان بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی تحریک ترقی پسند تحریک سے زیادہ منظم تھی۔ اس گروپ کے شرکاء [1] میں میراجی' ن۔ م راشد' مولانا صلاح الدین احمد' یوسف ظفر' ممتاز مفتی' مختار صدیقی' عبدالمجید سالک' حفیظ جالندھری اور قیوم نظر شامل تھے' جو کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے دہلی آئے۔

ترقی پسند ادب کی تیسری کل ہند کانفرنس کے انعقاد (مئی ۱۹۴۲ء) تک' گزشتہ تین چار سال کے عرصے کے دوران میں ایک نئے گروہ [2] نے بھی تخلیق کے میدان میں قدم رکھا' جس میں شاعر' افسانہ نگار اور نقاد بھی شامل تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی' ساحر لدھیانوی' ظہیر کاشمیری' قتیل شفائی' فکر تونسوی' مخمور جالندھری' عبداللہ ملک' بلونت سنگھ اور جگن ناتھ آزاد کا تعلق خطہ پنجاب سے تھا۔ ان لوگوں نے بھی وہی راہ اختیار کی جو اب تک ترقی پسند تحریک کا مسلک تھا۔ بلکہ انھوں نے اس راہ کو مزید ہموار کیا اور ترقی پسند ادب کو حتی المقدور آگے بڑھانے میں معاون ہوئے۔ [3] ترقی پسند تحریک کی اگلی کانفرنس اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد دکن میں منعقد ہوئی۔ اس سے قبل کی کانفرنسوں میں ہر زبان کے ادیب موجود ہوتے تھے لیکن اس کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف اُردو کے ترقی پسند ادیب شامل تھے۔ یہ کانفرنس پانچ دن تک جاری رہی اور اس میں اہم مقالات پڑھے گئے' جس میں علی سردار جعفری کا مقالہ

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمن اعظمی' ص ۶۳

[2] ترقی پسند ادب' علی سردار جعفری' ص ۲۰۴

[3] ایضاً

''اقبال کی شاعری'' ساحر لدھیانوی کا مقالہ ''اُردو کی انقلابی شاعری'' [1] اور کرشن چندر کا ترقی پسند ادب سے متعلق ایک مقالہ شامل تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں لکھنؤ میں ہوئی جو تین دن تک جاری رہی۔ مجلس کے مقالات کی صدارت کے لیے رشید احمد صدیقی کو بلایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بمبئی میں ترقی پسند تحریک کا مرکزی دفتر باقاعدہ طور پر قائم کیا گیا اور علی سردار جعفری کو اس کا سیکرٹری بنایا گیا۔ چنانچہ بمبئی کو تحریک کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی لیکن بہر طور لکھنؤ اور لاہور کے مراکز کی حیثیت بھی مسلمہ تھی۔ ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند تحریک خوب پھلی پھولی اور اس کے بعد سے اس تحریک میں بڑی تیزی اور بیداری پیدا ہوئی جس کے زیرِ اثر وافر مقدار میں ادب تخلیق ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز (۱۹۳۶ء) سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برصغیر کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو شعر و ادب پر اس تحریک نے سب سے زیادہ اور گہرے اثرات چھوڑے، لاہور اس زمانے میں ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا اشاعتی مرکز تھا۔ [2]

یہاں سے اس زمانے میں ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' دو اچھے رسالے نکل رہے تھے۔ ہمایوں کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد اور مولانا حامد علی خاں تھے اور ادبی دنیا کے مولانا صلاح الدین احمد۔ فیض احمد فیض، ڈاکٹر تاثیر، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، ساحر لدھیانوی، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، بلونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد، عبداللہ ملک، مخمور جالندھری اور دوسرے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں شروع شروع میں انھیں رسالوں میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اور نئے ترقی پسند ادیبوں کی معاونت سے چودھری برکت علی نے ''ادبِ لطیف''

---

[1] سید سجاد ظہیر اپنی یادداشت پر مبنی کتاب ''روشنائی'' میں لکھتے ہیں کہ ''پنجاب سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ساحر لدھیانوی آئے تھے۔ انھوں نے اردو کی جدید انقلابی شاعری پر ایک چھوٹا سا لیکن اچھا اور دلچسپ مقالہ لکھا تھا۔''

(ماخوذ از روشنائی، ص ۳۵۰)

کا اجرا کیا اور ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک ادارہ "مکتبہ اردو" قائم کیا، جس نے پنجاب اور پنجاب سے باہر کے ترقی پسند ادیبوں کی کتابوں کو بہ حسن و خوبی شائع کیا۔ یہ وہ مادی محور تھا جس کے ارد گرد نئی ادبی تخلیقات کی پنجاب میں تشکیل ہوئی۔" ❶

"ادب لطیف" میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں جو ادب برائے ادب کی نمائندگی کرتی اور خالصتاً روایات پر مبنی ہوتی تھیں لیکن اس رسالے کا غالب رنگ ترقی پسندانہ تھا۔ اوپر کہیں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے آغاز میں صوفی تبسم کو اس کا عارضی سیکرٹری بنایا گیا تھا لیکن صوفی تبسم نے بوجوہ (غالباً سرکاری ملازمت میں ہونے کی وجہ سے) انجمن سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی اور ترقی پسند حضرات اپنے طور پر ترقی پسند خیالات کے پھیلانے کے لیے کام کر رہے تھے لیکن جب ۱۹۴۳ء میں عبداللہ ملک لاہور میں انجمن کے منتظم مقرر ہوئے ❷ تو انجمن میں قدرے باقاعدگی پیدا ہوئی اور انجمن کے زیر اہتمام منظم طریقے سے گاہے گاہے جلسے ہونے لگے۔ سید سجاد ظہیر ان کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لاہور تقسیم پنجاب سے پہلے کے دو ادبی جلسوں کی اور بھی مجھے یاد آ رہی ہے۔ غالباً ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء کے شروع کا زمانہ تھا اور اب پنجاب میں ہماری تحریک تنظیم و وسعت، ادبی تخلیق اور ترقی پسند رسالوں اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لحاظ سے دن بدن ترقی پذیر تھی۔" ❸

اس طرح ترقی پسند تحریک اپنی ابتدا سے لے کر برصغیر کی تقسیم تک پروان چڑھتی رہی، ترقی پسند رجحانات کے حامل لوگ زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک طرف تو اس تحریک سے وابستہ ادیبوں (خاص طور پر شاعروں) کا ربط محنت کش عوام سے استوار ہو رہا تھا اور دوسری طرف خود محنت کش مزدوروں اور کسانوں میں سے نئے شاعر پیدا ہو رہے تھے۔ ایک لحاظ سے ترقی پسند تحریک کا یہ

---

❶ روشنائی، سید سجاد ظہیر، ص ۲۲۸

❷ روشنائی، سید سجاد ظہیر، ص ۳۳۴

❸ ایضاً، ص ۳۳۷

ارتقا عام جمہوری ارتقا کا ایک جزو تھا جس سے ترقی پسند ادب پر موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک نمایاں اور اچھا اثر پڑا۔ اس طرح موضوعات میں تنوع کے ساتھ ساتھ زبان میں سادگی، وسعت اور عمومیت کا رجحان بڑھا اور ادب میں براہ راست سیدھا سادہ اور سہل طرز بیان اُبھرنے لگا۔ لیکن یہاں دو مکاتب فکر ایسے بھی تھے جو ترقی پسند تحریک کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان میں پہلے مکتب فکر کے لوگ قدیم ادبی روایات کے حامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ لوگ زبان و اسلوب کو آلودہ کر رہے ہیں، ان کے یہاں حسن کا فقدان ہے، یہ لوگوں کو خونی انقلاب، نفرت اور تخریب کاری کا سبق دیتے ہیں۔ بے دینی اور لامذہبیت پھیلاتے ہیں، اخلاق و آداب سے بغاوت اور جنسی بے راہ روی کی تبلیغ کرتے ہیں، ان کے خیالات اور نظریات بیرونی ہیں اور یہ کہ یہ لوگ ہماری روایات اور تہذیب کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں وغیرہ۔ دوسرے مکتب فکر کے لوگ نئے خیالات اور جدید رجحانات کے حامل تھے۔ ان کا ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ لوگ ادب میں افادیت اور مقصدیت داخل کر کے ادب کو اس کے اصلی منصب سے نیچے گرا رہے ہیں۔ ادب میں کسی نظریہ یا مقصد کی پابندی سے تخلیق کار کی قوت متخیلہ فنا ہو جاتی ہے۔ تخلیق کار کی ایک اپنی دُنیا ہوتی ہے جس میں وہ رہتا ہے، الفاظ ایک الہامی کیفیت رکھتے ہیں اور ایک فطری یا الوہی قوت تخلیق کار کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ تخلیق کار کی ذمہ داری صرف اس حد تک ہے کہ وہ اس قوت کو بروئے کار لائے۔ وہ سامعین، ناظرین، قارئین، سماج یا عوام میں سے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا وغیرہ۔

پہلے مکتب فکر کے لوگ زیادہ تر یو پی میں تھے اور دوسرے مکتب فکر کے لوگ پنجاب میں، جہاں ان کا محور ''حلقۂ ارباب ذوق'' تھا، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے اور اب قدرے تفصیل سے اگلے صفحات میں آئے گا۔

حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک

ترقی پسند ادبی تحریک جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے، خالصتاً ایک مقصدی تحریک تھی جس کا محور ایک مخصوص معاشی اور سیاسی فلسفہ تھا۔ اس تحریک کے بارے میں ایک مکتب فکر کا یہ خیال تھا کہ

ادب کو فقط مادی زندگی کے لیے وقف نہیں کر دینا چاہیے اور نہ ہی ادب کو محض زندگی کی خاطر برتنا چاہیے بلکہ ادب کو اوّل و آخر ادب ہی رہنا چاہیے۔ اس مکتبِ فکر کا یہ بھی خیال تھا کہ ادب چونکہ اپنے دور کے سماجی اور اقتصادی حالات سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوتا ہے اس لیے زندگی کا عکس ادب میں بہر صورت آ جاتا ہے' لیکن ادب پر کسی طرح کی قدغن لگانا کسی طور پر بھی جائز نہیں، چنانچہ اس فکر و خیال کے حامل لاہور کے کچھ لوگوں نے باقاعدہ طور پر ''بزمِ داستان گویاں'' کے نام سے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی جس نے بتدریج ''حلقہ اربابِ ذوق'' کی شکل اختیار کر لی۔

ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک کو کچھ لوگ ❶ باہم ''متوازی تحریکیں'' قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ یہ دونوں تحریکیں قریباً قریباً ایک ہی دور میں پیدا ہوئیں' ایک ہی جیسے سماجی اور اقتصادی حالات میں پروان چڑھیں' معنوی طور پر یہ رومانویت کے بطن سے ہی پھوٹی تھیں ❷ اور دونوں میں ایک ادب پرور دوستانہ فضا قائم تھی۔ ترقی پسند تحریک اور حلقے کے اراکین ایک دوسرے کو متاثر کر رہے تھے' ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے تھے' ایک دوسرے کی کانفرنسوں اور ادبی اجتماعات میں شرکت کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی تخلیقات پر دوستانہ ماحول میں اظہارِ خیال ہو رہا تھا۔ اسی بھائی چارے کی فضا میں کرشن چندر جیسے ترقی پسند نے حلقے کے باقاعدہ رکن ن۔ م راشد کے مجموعہ کلام ''ماورا'' کا دیباچہ لکھا۔ فیض جیسے ترقی پسند نے اپنے مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' کا دیباچہ ن۔ م راشد سے لکھوایا۔ ن۔ م راشد' میرا جی' مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' اور قیوم نظر وغیرہ نے ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس منعقدہ مئی ۱۹۴۲ء نئی دہلی میں شرکت کی۔ ❸

---

❶ مثلاً پروفیسر شہرت بخاری نے اپنے مقالے ''ادبی تحریکیں'' مطبوعہ نقوش لاہور نمبر بابت فروری ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۱۲ پر اور یونس جاوید نے اپنی تصنیف ''حلقہ اربابِ ذوق'' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء کے صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے کہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' کی تحریک ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ اس کے متوازی ادبی تحریک ہے''۔

❷ اُردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۵۵۴

❸ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' خلیل الرحمن اعظمی' ص ۶۴

میراجی اور ممتاز مفتی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسوں میں اکثر شریک ہوتے تھے ❶ اوپندرناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، فیض اور ظہیر کاشمیری وغیرہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستگی رکھنے کے باوجود نہ صرف حلقے میں مضامین وغیرہ پڑھتے بلکہ متذکرہ شعراء نے گاہے بگاہے حلقے کے جلسوں میں صدارتیں بھی قبول کیں۔ ❷ حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے شاعری کا انتخاب شائع ہوا تو میراجی نے ترقی پسند شعراء کی منظومات کو شامل کیا، حتی کہ حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے ایک انتخاب ترتیب دینے کے لیے ترقی پسند شاعر ظہیر کاشمیری بطور مرتب شریک ہوئے ❸ اسی طرح ترقی پسندوں نے جو شعری انتخابات شائع کیے ان میں حلقہ ارباب ذوق کے شعراء کا کلام بھی شامل کیا گیا۔ ترقی پسند مصنفین حلقۂ ارباب ذوق کے باقاعدہ رکن رہے اور بعض اب تک چلے آ رہے ہیں۔

مگر ہم مندرجہ بالا نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے کیونکہ بہرکیف ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق کے اراکین میں کوئی ذاتی عناد تو تھا نہیں۔ اگر وہ حلقے میں مل بیٹھتے تھے یا ایک دوسرے کی نگارشات پر اظہار خیال کرتے تھے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور اس سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نظریاتی طور پر دونوں تحریکیں ایک ہی مسلک کی حامی تھیں جبکہ حقیقت میں متذکرہ بالا دوستانہ فضا کے باوجود نظریاتی لحاظ سے دونوں تحریکوں میں خاصا بعد موجود رہا ہے کیونکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں کا نقطہ نظر خارجی تھا اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ لوگوں کا زاویۂ نظر داخلی تھا تاہم یہ ادب کی ہمہ گیر افادیت اور ادب اور زندگی کے محکم رشتوں پر یقین رکھتے تھے اور ''اپنی نگارشات میں تمام سائنسی انکشافات اور جدید علوم وفنون کو سمونا چاہتے تھے''۔ ❹ یہ لوگ اپنے واردات قلبی کو روایتی ہیئتوں اور الفاظ وتراکیب کا سہارا لیے بغیر نئے اسالیب میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنا رشتہ ماضی سے منقطع کرنے کی کوشش کی تھی مگر حلقۂ ارباب ذوق ماضی کے خزینے اور اپنی درخشندہ روایات کو

---

❶ اردو شاعری میں اشاریت، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۸

❷ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۷۱

❸ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۷۰

❹ ذ تحریکیں (سہ) پروفیسر شہیر بخاری، مطبوعہ نقوش لاہور نمبر، ص ۱۱۱۲

نئے انداز میں استعمال کرنے میں کوشاں تھا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک صریحاً ایک مقصدی، مادیت پسند نظریاتی تحریک تھی جبکہ حلقۂ ارباب ذوق ادب میں کسی مخصوص نظریاتی پابندی کا قائل نہ تھا۔ ❶ اور اس کا پلیٹ فارم ہر قسم کے نظریات کی صحت مند تنقید کے لیے کھلا تھا۔ ❷

جیسا کہ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''داخلیت اور خارجیت، مادیت اور روحانیت، مستقیم ابلاغ اور غیر مستقیم ابلاغ کی بنا پر ان دونوں تحریکوں میں واضح حدود اختلاف موجود ہیں.............ایک تحریک کا عمل بلاواسطہ، خارجی اور ہنگامی تھا اور دوسری کا عمل بالواسطہ داخلی اور آہستہ رو.........ترقی پسند تحریک نے مادی وسائل پر فتح حاصل کرنے کی سعی کی جبکہ حلقہ ارباب ذوق نے مادیت سے گریز اختیار کر کے روحانیت اور داخلیت کو فروغ دیا''۔ ❸

حلقہ ارباب ذوق کا آغاز بڑے ہی سیدھے سادے طریقے اور غیر ارادی طور پر ہوا۔ حلقے کے باقاعدہ آغاز سے قبل چند ہم خیال دوست ادیبوں نے اسے ''تقریب بہر ملاقات'' کے لیے قائم کیا تھا۔ جیسا کہ یونس جاوید، جنھوں نے حلقے کی تاریخ مرتب کی ہے، لکھتے ہیں:

''حلقے کو شروع کرتے وقت کوئی سیاسی یا دوسرا مقصد پیش نظر نہ تھا۔ صرف بعض ادیبوں اور دوستوں نے آپس میں مل بیٹھنے اور اپنے ادب پارے ایک دوسرے کو سنانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے کسی انجمن کو وجود میں لانے کی تجویز پیش کی تھی............'' ❹

۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء ❺ کو چند دوست جو شعر و ادب سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے، سید نصیر احمد جامعی (برادر خورد سید نذیر نیازی) کے مکان پر جمع ہوئے اور ایک ادبی جماعت کو تشکیل دیا۔ جس کا نام انھوں

---

❶ حلقہ ارباب ذوق، یونس جاوید، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء ص ۳۸

❷ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۷۱

❸ ایضاً، ص ۵۵۴، ۵۵۵

❹ حلقہ ارباب ذوق، یونس جاوید، ص ۴۰

❺ ایضاً، ص ۴۲

نے ''بزم داستان گویاں'' ❶ رکھا۔ دوستوں کی اس پہلی مجلس میں نسیم حجازی نے اپنا طبع زاد افسانہ ''تلافی'' پڑھ کر سنایا ❷ صدارت کے فرائض حفیظ ہوشیار پوری نے سرانجام دیے تھے۔ ❸ شرکاء میں ان کے علاوہ شیر محمد اختر' تابش صدیقی' محمد فاضل' اقبال احمد' محمد سعید' عبدالغنی اور چند دوسرے لوگ تھے ❹ باقاعدہ طور پر تشکیل پانے کے بعد ''بزم داستان گویاں'' کے یکے بعد دیگرے کئی اجلاس منعقد ہوئے' جن میں شرکاء افسانے سناتے' جن پر بحث و تنقید ہوتی اور آخر میں شعراء ارکان اپنا اپنا کلام سناتے اور اس طرح شرکاء کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تاآنکہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ❺ ''بزم داستان گویاں'' کا دسواں اجلاس منعقد ہوا جس میں بحث و تمحیص اور بڑے غور و فکر کے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ افسانوں کے ساتھ ساتھ شاعری پر بھی تنقید کی جائے اور ''بزم داستان گویاں'' کا نام بدل کر اس کو ''حلقہ ارباب ذوق'' کا نام دینے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ ❻

حلقہ ارباب ذوق کے نام سے اس کے پہلے اجلاس کا انعقاد یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ہوا ❼ اس کے بعد حلقے کے جلسوں میں نہ صرف باقاعدگی کی کیفیت پیدا ہوئی بلکہ جوش اور جذبے اور قول و عمل

---

❶ حلقہ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۲۰

❷ حلقہ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۲۲

❸ ایضاً

❹ ایضاً

❺ ایضاً

❻ دستیاب ریکارڈ سے یہ کہیں بھی ظاہر نہیں ہے کہ ''حلقہ ارباب ذوق'' کا نام رکھنے کی تجویز کس کی پیش کردہ تھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ ''حلقہ ارباب ذوق'' کا نام رکھنے کی تجویز پیش کرنے کا دعویٰ ڈاکٹر محمد باقر کا ہے جب کہ حاشیہ میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قیوم نظر ڈاکٹر محمد باقر کے اس دعوے کو درست قرار نہیں دیتے۔

(بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۵۵۷)

❼ حلقہ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۲۲

کے ملے جلے جذبات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔

ابتدا میں حلقے کے ارکان کو کافی مشکلات کا سامنا تھا۔ نہ تو ان کے پاس مل بیٹھنے کی کوئی مرکزی جگہ تھی، نہ کچھ اسباب اور نہ ہی سرمایہ تھا بلکہ ایک بے سروسامانی اور تذبذب کی کیفیت تھی اور بقول قیوم نظر ''حلقہ گردش میں رہتا'' ❶ لیکن اراکین کے دلوں میں ایک خلوص، ایک لگن اور ادب پارے تخلیق کرنے کے جذبات موجود تھے۔ چنانچہ ان ناسازگار حالات میں بھی یہ اجلاس بڑے تسلسل سے جاری رہے جیسا کہ یونس جاوید لکھتے ہیں کہ:

''وہ مشکلات جو حلقہ اربابِ ذوق کے ان ابتدائی دنوں میں درپیش تھیں، واقعی ایسی تھیں کہ باقاعدگی سے اس طرح جلسے جاری رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، جو مسلسل ایک جگہ پر بھی نہیں ہوتے مگر یوں (یہ جلسے) قاعدے اور قرینے سے جاری رہے۔ لکھنے والوں کی سچی لگن، خلوص اور وہ تڑپ جو ہر سچے تخلیق کار کو نامساعد حالات میں خاص طور پر جلا بخشتی ہے ان حضرات میں کسی نہ کسی طور پر موجود تھی''۔ ❷

لیکن حلقے کے ابتدائی آٹھ نو ماہ تک جلسوں میں لگن اور تحرک کے باوجود زیادہ تر ہمیں مل بیٹھنے کی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ البتہ ۵ نومبر ۱۹۳۹ء کو یعنی پہلی بار ان تجاویز کے ساتھ کہ ایک تو اراکین کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہونا چاہیے اور دوسرے حلقے کے انتظام و انصرام کے لیے ایک مجلس منتظمہ ہونی چاہیے۔' کچھ اغراض و مقاصد ❸ کا بھی تعین کیا گیا۔ جن کی ترتیب بقول قیوم نظر یہ ہے:

۱۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت

---

❶ اردو ادب تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۵۵۶

❷ حلقہ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۲۶

❸ ڈاکٹر محمد باقر کا خیال ہے کہ یہ اغراض و مقاصد کہیں نہیں لکھے گئے تھے اس لیے ان کا تعین کرنا ممکن نہیں۔
(بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۵۵۷)

۲۔ نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم و تفریح۔

۳۔ اُردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

۴۔ تنقید ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کرنا۔

۵۔ اُردو ادب و صحافت کے ناساز گار ماحول کو صاف کرنا۔ ❶

جلسوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور قواعد و ضوابط میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء ❷ کو منعقدہ جلسے میں بھی کچھ تجاویز پیش کی گئیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ حلقے کے عہدہ داروں کا انتخاب ہر سال ہوا کرے ❸ اور دوسری یہ کہ سالانہ جلسہ مئی کی پہلی اتوار کو ہو۔ اس کے لیے وائی ایم سی اے بورڈ روم کا انتظام کیا جائے اور اس موقع پر باہر سے ان اصحاب کو بھی بلایا جائے جنھیں علم و ادب سے دلچسپی ہو۔ ❹ ۱۱ راگست ۱۹۴۰ء ❺ کے جلسے میں حلقے کے لیے ایک لائحہ عمل اور اس کا نصب العین متعین کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان جلسوں کے تسلسل سے حلقۂ ارباب ذوق کا ایک طریق کار طے پا گیا اور کچھ روایات کی بنیاد پڑ گئی' جن سے عموماً انحراف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طریق کار اور ان روایات میں چونکہ حلقے کے داخلی مزاج اور اس کے اغراض و مقاصد کی جھلک موجود ہے لہٰذا ان کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

اوّل: حلقہ ارباب ذوق کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوگا۔

دوم: حلقہ ارباب ذوق کا صرف ایک مستقل سیکرٹری ہوگا۔

سوم: رُکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس نہیں لی جائے گی۔

چہارم: ہر سال کے لیے ایک سیکرٹری چنا جائے گا۔

---

❶ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۵۷

❷ حلقہ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۳۲

❸ ایضاً

❹ ایضاً

❺ ایضاً

پنجم: حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی اور حلقے کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہیں
حلقے کا رُکن بنائیں لیکن حلقے کے اجلاس ہر اس مرد اور عورت کے لیے کھلے ہوں
گے جس کو اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

ششم: حلقے کا جلسہ ہر ہفتے ایک رُکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمے سب کو چائے پلانا
ہوگا۔

ہفتم: حلقے کی ہر نشست میں کچھ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں گی۔ جن کو سننے کے بعد
ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا فرض ہوگا کہ وہ ناراض
ہونے کے بجائے خوش دلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید و اعتراض کو سنے اور
اس کا جواب دے۔

ہشتم: حلقہ کی کارروائی کو حتی الوسع مشتہر نہیں کیا جائے گا۔ ❶

حلقے کا یہ دور تشکیلی دور تھا۔ حلقے کو اب تک جو اراکین میسر آئے تھے، بقول ڈاکٹر انور
سدید" وہ تخلیقی طور پر تو بے حد فعال نظر آتے ہیں لیکن انفرادی طور پر ان میں تحریک کو واضح
جہت عطا کرنے کی قوت نظر نہیں آتی"۔ ایسے میں حلقے کو کچھ ایسے رفقا میسر آ گئے جو حلقے
کی تخلیقی قوت کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے اور حلقے کو ایک مخصوص جہت میں گامزن کرنے میں
کامران رہے۔ ان رفقاء میں میراجی کی شخصیت سب سے اہم ہے۔

میراجی کو حلقے سے قیوم نظر نے متعارف کرایا۔ ❷ قیوم نظر ۲ رجون ۱۹۴۰ء کو اور میراجی ۲۵ راگست
۱۹۴۰ء کو پہلی بار حلقے میں شریک ہوئے تھے۔ ❸ حلقے میں آنے سے پہلے میراجی "ادبی دُنیا" میں مولانا
صلاح الدین احمد کے مدیرِ معاون تھے اور اپنے تنقیدی مضامین کی وجہ سے ادب کی دنیا میں بڑے
معروف تھے۔ "ادبی دنیا" کی ادارت اور اپنی سحر انگیز شخصیت کی بنا پر ان کا حلقۂ اثر بھی خاصا وسیع تھا۔

---

❶ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۵۸

❷ ایضاً، ص ۵۶۰

❸ حلقہ ارباب ذوق، یونس جاوید، ص ۳۲

انھوں نے ایک تو اپنے ادبی ذوق اور وسیع مطالعہ کی بنا پر اور دوسرے اراکین حلقہ میں سب سے معمر ہونے کی وجہ سے جلد ہی حلقے میں محوری حیثیت کی جگہ حاصل کر لی اور اساسی کردار ادا کرنا شروع کیا۔

میراجی مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علوم کا ایک دلچسپ امتزاج تھے۔ ان کی ظاہری ہیئت کذائی، بے ترتیبی اور آزادروش کی بنا پر ان کے قریب آنے والا ہر شخص ان کی شخصیت کے طلسم میں ایسا گرفتار ہوتا کہ ساری عمر اس سے نکلنے کی راہ نہ پاتا۔ ❶ میراجی حلقے میں شامل ہوئے تو حلقے کی روایتی حیثیت ختم ہو گئی اور حلقے نے بتدریج اجتہاد اور جدیدیت کی طرف تیزی سے قدم بڑھانا شروع کیے۔ اب حلقے کی ترتیب نو، قواعد و ضوابط کی تنظیم اور پروگراموں کی تشکیل سب کے پس پشت میراجی ہی ایک محرک قوت کے طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ❷ نوجوانوں کی اس محفل میں میراجی کی حیثیت ''پیرمغاں'' کی سی تھی۔ ❸ حلقے میں ان کی تجاویز کو نہ صرف عملی جامہ پہنایا گیا بلکہ بعد میں حلقہ ارباب ذوق کی نئی روایات بھی ان کی تجاویز پر مسلسل عمل کر کے پیدا ہوئیں۔ مثلاً ''میراجی ہی کی تجویز پر حلقے میں پہلی مرتبہ قدیم تذکروں کی تنقید کے معیار سے ہٹ کر مغربی انداز کی تنقید شروع ہوئی اور محض ''بہت اچھا'' اور ''واہ واہ'' کے بجائے حلقے میں پڑھی گئی اصناف سخن پر ان کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی اور آج بھی یہ سلسلہ اسی روش پر جاری ہے بلکہ اس تنقیدی سلسلے کے بغیر حلقے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔'' ❹

حلقہ ارباب ذوق کے اس تشکیلی دور میں میراجی کے علاوہ قیوم نظر اور یوسف ظفر نے بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ قیوم نظر نے حلقے میں ابتدائی خدمات ایک تعارف نگار کے طور پر سرانجام دیں ❺ اور رفتہ رفتہ حلقے کی فعال اور متحرک شخصیت بن گئے اور انھوں نے حلقے کی تحریک کو نفی لحا

---

❶ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۶۰

❷ ایضاً ص ۵۶۲

❸ ایضاً، ص ۵۶۲

❹ حلقہ ارباب ذوق، یونس جاوید، ص ۲۸

❺ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۵۶۲

سے توانا بنانے میں شاید سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ ❶ جبکہ یوسف ظفر کا کارنمایاں یہ ہے کہ ان کی کوششوں نے ہر جلسے کے اختتام پر پڑھی جانے والی نظموں اور غزلوں کے تفریحی پہلو کو ختم کیا اور اصناف نثر کی طرح شاعری پر بھی تنقیدی بحث کی ابتدا کی۔ ❷ اس طرح حلقہ ارباب ذوق ان ارکانِ ثلاثہ کی قابل قدر خدمات کی بدولت ادب کی ایک فعال تحریک بن گیا۔

حلقے کی ابتدائی حیثیت' یعنی اپنے قیام سے لے کر میرا جی کی شمولیت تک' محض ایک تعارفی دور کی ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا دور یعنی میرا جی شمولیت سے لے کر اردو شاعری پر تنقید کے اجرا تک (اگست ۱۹۴۰ء سے دسمبر ۱۹۴۰ تک) تشکیلی نوعیت کا ہے لیکن تیسرے دور یعنی دسمبر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ میں قیام پاکستان تک حلقے نے ایک عظیم اور فعال ادبی تحریک کی صورت اختیار کی اور اس کی نظریاتی اساس نکھر کر سامنے آگئی۔ چنانچہ اس دور میں حلقے کے خلاف ردعمل کی شدید لہر اُبھری اور اسے اپنے عہد کی مضبوط ترقی پسند تحریک کا سامنا کرنا پڑا۔ ❸

ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے راستے کئی جہتوں سے مختلف ہیں۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہیں لکھا ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک ایک مقصدی تحریک تھی لیکن حلقہ ارباب ذوق کسی مخصوص نصب العین کے حصول کے لیے تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتا تھا۔ ❹ بلکہ تخلیقی ادب کے لیے جامد پابندیاں عائد کرنے کے بجائے ادیب کی تخلیقی آزادی کو فوقیت دیتا ہے۔ حلقے نے برخلاف ترقی پسند تحریک کے' جذبۂ خیال اور احساس کی ترجمانی کو بنیاد اور فن کے لوازم کو اہم قرار دیا۔ ترقی پسند تحریک ادب میں تاثریت' وجودیت' علامت نگاری اور روایت سے گریزاں تھی جبکہ حلقہ ارباب ذوق کے ادباء اور شعراء نے انھیں نہ صرف ازسرنو رواج دیا بلکہ مغربی فنون وادبیات میں نمایاں ہونے والی بیشتر تحریکوں کے اثرات قبول کر کے اُردو ادب میں تنوع' توانائی' وسعت اور رعنائی پیدا کی۔ تخلیقی ادب کے یہ

---

❶ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید ص ۵۶۳

❷ ایضاً' ص ۵۶۳

❸ ایضاً' ص ۵۶۴

❹ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید ص ۵۶۴

تجربات اُردو نظم میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ ❶ ترقی پسند تحریک کی گھٹی میں سیاست تھی جبکہ حلقے نے سیاست گری کے بجائے سیاست کے اثرات کو ادب کا موضوع بنایا جس میں اپنے عہد کا سماجی شعور بھی موجود تھا۔ ❷

اور یوں حلقہ ارباب ذوق کا یہ قافلہ ترقی پسند تحریک سے قدرے موافقت اور واضح مخالفت کی فضا میں حلقے کو زیادہ پر کشش بنانے اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف نظر آتا ہے۔ ❸ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک ترقی پسندوں کی تحریک سے زیادہ منظم تھی ❹ ۱۹۴۴ء تک حلقے کے جلسے بڑے اہتمام کے ساتھ گھروں کے دیوان خانوں اور صحنوں میں ہوتے رہے جن میں لاہور کے قریب قریب تمام شاعر اور ادیب تواتر کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں حلقہ وائی ایم سی اے کی عمارت میں اُٹھ آیا۔ ❺ ۱۹۴۵ء میں حلقے نے وسعت کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس کی ایک شاخ دہلی میں شروع ہوئی۔ جس کے سیکرٹری عبادت بریلوی صاحب مقرر ہوئے۔ ❻

---

❶ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۵۶۶

❷ اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید' ص ۶۱۶

❸ حلقہ ارباب ذوق کے متعلق یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ حلقے پر ابتدا سے ہی اعلیٰ سرکاری و نیم سرکاری افسران کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہ لوگ بوجوہ ترقی پسند تحریک میں شامل نہیں ہو سکتے تھے اور ادب سے پہلو تہی بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے حلقہ بظاہر ایک بے ضرر اور عمدہ ادبی پلیٹ فارم تھا۔ اس لیے انھوں نے حلقے سے وابستگی اختیار کی۔ ان میں سے بعض حضرات مختلف اوقات میں حلقے کے عہدیدار بھی رہے۔ ایسا بھی ہوتا رہا کہ ان حضرات کے ذریعے حکومتیں حلقے کو مالی امداد کی پیش کش کرتی رہیں لیکن حلقے کے اراکین کی اکثریت نے اپنے آپ کو کسی بھی ادارے سے، خواہ ادبی ہو یا سیاسی وابستہ کرنا پسند نہیں کیا۔ اس لیے جب بھی ایسی تجویز زیر غور آئی اس کی شدید مخالفت کی گئی اور اسے رد کر دیا گیا۔

❹ ترقی پسند ادب' علی سردار جعفری' ص

❺ حلقۂ ارباب ذوق' یونس جاوید' ص ۲۱

❻ ایضاً' ص ۲۱

اس طرح حیرت انگیز حد تک کم وقت میں (ابتدائے تشکیل سے لے کر قیام پاکستان تک) حلقے کا دامن وسیع سے وسیع ہوتا گیا اور اس نے ایسی ملک گیر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی جو بے حد فعال اور توانا نظر آتی ہے۔

حلقے نے اپنے لیے نئی علامات' نئے تلازمات اور نئے موضوعات کو منتخب کیا، ہیئت اور اسلوب کے بارے میں نئے تجربات کیے اور ادب و شعر کے معیار کو پرکھنے کے لیے اپنے جلسوں میں خالص ادبی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے تعمیری تنقید کا طریقہ اپنایا۔ اس طرح حلقے کے ہفتہ وار جلسوں کی وساطت سے بے شمار ادیب اور شاعر متعارف ہوئے' جن میں سے کچھ کے نام بر سبیل تذکرہ اوپر آ چکے ہیں ان کے علاوہ حلقے سے منسلک شعراء میں صوفی تبسم' تصدق حسین خالد' پنڈت ہری چند اختر' سید عابد علی عابد' عبدالحمید عدم' احسان دانش' مجید امجد اور مختار صدیقی وغیرہ کے اسمائے گرامی ایسے ہیں جو دنیائے شعر و ادب میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ ان حضرات کی شاعری کا تجزیہ آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

✿✿✿

پانچواں باب
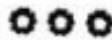
لاہور کا دبستانِ شاعری

۱۸۷۴ء تا ۱۹۴۷ء

اگر کسی زبان میں شاعری کے ارتقا کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شعری تاریخ کا ہر نیا موڑ نئے شعری رویوں کو جنم دیتا ہے اور اگر یہ رویے ان حالات کے بدلنے پر جن سے کہ یہ پیدا ہوئے تھے بدلنے لگیں تو شاعر بھی ان رویوں سے کم یا زیادہ انحراف کر کے مزید نئے رویوں کے پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ شاعر اپنے زمانے کے شعور میں سب سے زیادہ حساس مقام پر ہوتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ حساس دل رکھتا ہے اور زیادہ حیات آشنا ہوتا ہے اور پھر اپنے الفاظ کے تاثر خیز استعمال سے اپنے طرزِ فکر و احساس کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ بقول مولانا آزاد:

"قدرتی موجودات یا اُس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے"۔ ❶

اور بقول سید عابد علی عابد:

"شاعر افراد کے افعال اور جذبات کو ایسے طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ عمومی اور آفاقی بن جاتے ہیں۔" ❷

"چنانچہ شاعری' تجربے کی اصل خاصیت کو صحت اور لطافت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک ذریعہ اظہار ہے جو کسی دوسرے وسیلے کے بس کی بات نہیں۔

---

❶ آبِ حیات' مولانا محمد حسین آزاد' ص ۶۸

❷ اسلوب' سید عابد علی عابد' مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۱ء ص ۲۳

"دبستانِ شاعری" کسی خاص مرکز کا وہ اندازِ فکر، طرزِ اظہار اور شعری مزاج ہے جس کا اس مرکز سے وابستہ اکثر شعراء اپنی تخلیقات میں لحاظ رکھتے ہیں۔ دبستانِ شعر کی بنیاد بالعموم ان باتوں پر ہوتی ہے:

(الف) کسی خاص خطے کے رہنے والوں کا مخصوص مزاج، کردار، طرزِ معاشرت، رسم و رواج اور دیگر تہذیبی عناصر جن کی تشکیل میں سیکڑوں برس کے جغرافیائی، تاریخی و سیاسی عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

(ب) کوئی مخصوص فلسفۂ حیات یا تصورِ حقیقت۔

(ج) اس تصورِ حقیقت سے پیدا ہونے والا طرزِ فکر و احساس

(د) موضوعاتِ شعر، زبان اور اسلوبِ بیان کے بارے میں مخصوص رجحان۔

(ہ) اس خطے کے رہنے والوں کی نسلی خصوصیات جو اجتماعی لاشعور کی نختمثالوں میں اور جذبات کے ان سانچوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں جو قدیم علاقائی ادب، کہانیوں اور لوک گیتوں میں نظر آتے ہیں۔

اگر کسی مرکز کے اکثر شعراء کی تخلیقات میں موضوع اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے ایک غالب رویہ اُبھرتا ہے جو روایت میں کسی دوسرے مرکز کے شعراء سے منفرد اور مختلف بھی ہو تو ایک دبستانِ شعر کی داغ بیل پڑتی ہے۔ ایسے تمام شعراء جو بعد ازاں اس مکتبِ شعر کی پیروی کریں گے اسی دبستان سے متعلق سمجھے جائیں گے۔

اُردو نظم و نثر میں، بالخصوص ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک، مسلسل اس قدر اضافہ ہوا کہ اب اسے صرف دلّی اور لکھنو کے دبستانوں تک محدود کر دینا ممکن نہیں، جیسا کہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

"اُردو زبان اب دلّی اور لکھنو میں محدود نہیں رہی ہے۔ وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے۔ اس کے لیے اب اسی قدر وسعت کی ضرورت ہے، جس قدر کہ ہندوستان میں

وسعت ہے"۔ ❶

پنجاب میں اُردو زبان وادب کے ارتقاء اور نئے شعری رجحانات کے پیشِ نظر اور اہلِ زبان کے مربیانہ رویوں کے خلاف لکھتے ہوئے پطرس بخاری کے ایک فاضلانہ مقالے "یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں" میں دہلی اور لکھنؤ سے علیحدہ ایک دبستان کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روایات سے یک قلم مقاطعہ کرنے پر تلا ہوا ہے' کذب اور مبالغہ ہوگا.......... وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جاں بنا کر نہیں رکھا لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لیے اب وہاں جانا بے سود ہے' اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی.........." ❷

متذکرہ عرصے کے دوران میں پنجاب کی علمی وادبی خدمات بہت وقیع ہیں اور پنجاب اُردو زبان کی ترویج اور اپنی انفرادیت کے باعث ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کے ایک بڑے طبقے نے "اپنی تہذیب اور اپنے جذبات' عقیدت واُلفت کی وجہ سے اُردو ہی کو اپنے لیے بہترین ذریعہ اظہار سمجھا ہے"۔ ❸ لہٰذا اس خطے کا بھی ایک دبستان تسلیم کرنا چاہیے۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی دبستان کے گرد اس طرح کا حصار قائم نہیں کیا جا سکتا جس طرح ملکی سرحدیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم دبستانِ دلی کا تذکرہ کرتے ہیں تو دلّی سے ہماری مراد دلّی شہر نہیں بلکہ وہ صدہا سال کی تہذیب ہے جس کا مرکز دلّی رہا ہے اور جب ہم دبستان لکھنؤ کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد خطہ اودھ کی وہ تہذیب ہے جس کا نمائندہ لکھنو ہے۔ چونکہ لاہور' پنجاب کا مرکز بلکہ دل کہلاتا ہے اور خطہ پنجاب کی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے' اس مرکز کے باشندوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو پنجاب کا طرہ امتیاز ہے' اس

---

❶ دلّی کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۱

❷ کلیاتِ پطرس 'پطرس بخاری' مطبوعہ مکتبہ شعر وادب' لاہور سن ندارد' ص ۵۰۷

❸ ایضاً

لیے ہم نے اسے دبستان لاہور ❶ کہا ہے لیکن پیشتر اس کے کہ ہم لاہور کے دبستان شاعری کی خصوصیات کا ذکر کریں' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی نمایاں خصوصیات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں اور ان کے پس منظر میں ان حالات وکوائف کا بھی جائزہ لیں جن کی بنا پر ان دبستانوں میں اردو شاعری کی نشوونما اور ترویج ہوئی تاکہ ان سے موازنہ کرتے ہوئے لاہور کے دبستان کی خصوصیات واضح کرنے میں آسانی رہے۔

دلّی میں جب اُردو شعروشاعری کا رواج عام ہوا تو وہاں کی سیاسی' سماجی اور معاشی فضا قابلِ اطمینان نہیں تھی، اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد سے دلّی کی مرکزی حکومت ڈانواں ڈول تھی اور مغلیہ سلطنت کا اقتدار اور وقار شب و روز زوال کی طرف مائل تھا۔ مغل شہنشاہ یکے بعد دیگرے شطرنج کے مہروں کی طرح بساطِ سیاست سے پٹتے رہے۔ ملک بھر میں لاقانونیت' افراتفری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ مرہٹوں' جاٹوں' سکھوں' روہیلوں اور انگریزوں نے ملک کا امن وامان تہ و بالا کر رکھا تھا جبکہ مغل شہزادوں کی عظمت' کم ہمتی اور درباری سازشوں کی تفصیل کسی سے مخفی نہیں۔ اِن حالات وواقعات میں دلّی کی شان وشوکت اور تموّل اور خوشحالی قصہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی۔ "اقتصادی بدحالی کے نتیجے میں جو معاشی قباحتیں رونما ہوئیں شعراء کے یہاں اس کا شدید احساس موجود ہے"۔ ❷

اس پر مستزاد یہ ہوا کہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں ایران سے آکر دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نادر شاہ کا حملہ اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً سیاسی لحاظ سے یہ نہایت خطرناک اور ضرر رساں ثابت ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں اگرچہ مرہٹوں کو عبرتناک سزا دی اور مسلمانوں کے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی تاہم حالات سدھر نہ سکے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صوبیداروں نے اپنے طرزِ عمل میں آزادانہ رویہ اختیار کرلیا اور جگہ جگہ ریاستیں خودمختار ہوگئیں۔

---

❶ اس موضوع پر اس سے پہلے پروفیسر شہرت بخاری نے گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ "راوی" بابت مئی ۱۹۵۳ء کے صفحہ ۸۹ پر محمد عظیم نے ماہنامہ "نئی قدریں" حیدرآباد (پاک) کے ۱۹۶۵ء کے شمارہ نمبر ۱۰ کے صفحہ ۱۳ پر اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مکتبہ اردو زبان سرگودھا کی اشاعت "تنقید اور مجلسی تنقید" مطبوعہ جنوری ۱۹۷۶ء کے صفحہ ۱۵۵ پر اظہارِ خیال کیا ہے اور یہ زعماء بھی اپنے مختصر مقالات اور مضامین میں راقم الحروف کے خیالات کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

❷ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ' ڈاکٹر معین الدین عقیل' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان' کراچی ۱۹۷۶ء ص ۱۳۹

سفید پوش، اہل حرفہ اور فنونِ لطیفہ سے منسلک لوگوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو بچانا دشوار ہو گیا۔ ان لوگوں نے دلّی سے نکل کر ان علاقوں کا رُخ کیا جہاں ان کی دانست میں قدرے امن تھا۔

قاعدہ ہے کہ شعر و ادب کی پرورش ایک مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول میں ہوتی ہے اور شعر و ادب اسی ماحول میں ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ جو حالات قوموں کی تاریخ بناتے اور سماجی و اقتصادی ترقی کی راہیں متعین کرتے ہیں، ان سے ہر ادب کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ چونکہ یہ حالات براہ راست انسانی جدوجہد کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کا اثر لوگوں کے ذوق و وجدان پر بھی اسی طرح پڑتا ہے جس طرح عام زندگی پر۔ چنانچہ ہر دور کا ادب جہاں عصری تقاضوں سے اثر پذیر ہوتا ہے وہاں وہ معاشرے پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اس لیے فکر و خیال کا متاثر ہونا بھی لازمی ہے اور ظاہر ہے جب ملک کی سیاسی حالت ایسی ہو اور ملک میں غربت و افلاس اور پریشان حالی و بدامنی کا دور دورہ ہو تو لوگ لامحالہ دُنیا سے بیزاری، مایوسی، تقدیر پرستی، گوشہ نشینی اور زندگی سے فرار کے راستے اختیار کرتے ہیں اور طبعی طور پر ایسی چیزوں میں پناہ تلاش کرتے ہیں جو اُن کے لیے زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی میں معاون ہوں۔ ہمارے اس خیال کی تائید ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

> "اس صورت میں افراد اپنے ماحول اور زندگی سے دل برداشتہ ہو کر اپنے وجود میں فراریت کا رجحان پیدا کر لیتے ہیں۔ شعراء نے اپنے اشعار میں اس رجحان کے ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے جس کی موجودی پر انسان کا دل دُنیا سے بھر جاتا ہے اور اس پر یاسیت اور حزن و ملال طاری ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے اس قدر ناپائیدار ہونے کے احساس کے نتیجے میں انسان صبر و قناعت کے ذریعے زندگی کے چند لمحوں کو غنیمت جان کر سلیقہ مندی اور خدمت خلق کا مسلک اختیار کرتا ہے اور غم حیات میں مسرت و انبساط پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی راہ ہے جو معاشرے کو دُکھوں اور غموں سے نجات دلا کر اجتماعی فلاح و بہبود کی منزلوں تک لے جاتی ہے اور اسے صبر و قناعت کی تلقین کرتی ہے" [1]

---

[1] تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۱۴۱

چنانچہ اس پس منظر میں دلّی سکول ❶ کی شاعری میں دُنیا کی بے ثباتی 'یاس و حرماں نصیبی، گردش دوراں 'ترک دنیا' زندگی کو نقش بر آب سمجھنا اور حیات بعد الموت کو دلکش قرار دینے کے مضامین عام ملتے ہیں۔ مجاز سے حقیقت تک عشق کے مضامین بھی اہل دلّی کا خاصہ ہیں اور انھیں حالات کی بدولت ہیں۔ اس طرح کم وبیش تمام دہلوی شعراء کے یہاں تصوف پر مبنی منفی اور مثبت دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ ان میں سے منفی پہلو دُنیا کی بے حقیقتی سے پیدا ہوتا ہے جیسے:

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں درد
دیکھا چمن میں آکے تو کچھ اور رنگ ہے (درد)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے! (میر)

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دُنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا (سودا)

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا (ذوق)

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ 'ہے' نہیں ہے! (غالب)

اور زندگی کا مثبت پہلو اس تصور سے پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہیں' لہٰذا اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے حوالے سے اشیاء کی کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے اور یہ پہلو بھی کم یا زیادہ تمام دہلوی شعراء کے یہاں موجود رہا ہے۔ جیسے:

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہاں کی
خطرہ جو ہے سو آئینہ دل پہ زنگ ہے (درد)

---

❶ مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے مقدمے میں "دبستان کے مترادف کے طور پر "سکول" کی اصطلاح استعمال کی۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں! (میر)

غلام اس کی میں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے
جگر کے خون کو خوانِ تونگری جانے (سودا)

جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا! (ذوق)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رُسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں (غالب)

لیکن بہرکیف دہلوی شعراء کے یہاں لذتِ غم اور کاوشِ ہجر کے مضامین کی کثرت ہے۔اس کیفیت کے اظہار کو بعض لوگ داخلیت کے نام سے معنون کرتے ہیں' جس میں شاعر باہر کی دُنیا سے ناطہ توڑ کر صرف اپنے دل کی دنیا میں بستا ہے۔ یہ خصوصیت دِلّی سکول کی ایسی امتیازی صفت ہوگئی کہ لکھنو سکول کا شاعر جب داخلی رنگ کے شعر کہہ دیتا تھا تو اس کو بھی کہتے تھے کہ دِلی کے رنگ کا شعر ہے"۔ [1]

دِلّی سکول کے ابتدائی شعراء کو ایہام گوئی اور رعایت لفظی سے بڑی رغبت تھی تاہم اس سکول کا غالب رنگ' عام فہم جذبات کی ترجمانی کی صورت میں ہو یا تشبیہ و استعارہ کے استعمال میں' سادگی اور بے تکلفی ہے۔جس سے کلام میں نکھار اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول مولانا آزاد:

"ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل میں گزرتے ہیں' وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں' ایچ پیچ کے خیال' دور دور کی تشبیہیں' نازک استعارے نہیں بولتے۔ اس واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں ....کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ

---

[1] حرف غزل' مسیح الزمان' مطبوعہ خیابان الہ آباد ۱۹۵۷ء ص ۶۸

اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے"۔ ❶

دلی سکول کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ تصوف اور دور اندیشی کی تعلیم سے جہاں زندگی میں کچھ منفی رجحانات آئے وہاں اس کی وجہ سے دہلوی شاعری میں گہرائی' بلندی' وسعت اور رمز و کنایہ کے ساتھ ساتھ اخلاقی مضامین بھی در آئے اور سنجیدگی و پاکیزگی کی فضا قائم ہوئی اور یوں توازنِ فکر اور متانت یہاں کی امتیازی خصوصیات بن گئیں۔ پروفیسر آل احمد سرور "مقدمہ کلام آتش" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"دہلی کی شاعری دروں بینی کا کمال دکھاتی ہے۔ شاعر اپنی فکر کا باغ لگاتا ہے' اپنے زخموں کے چمن کھلاتا ہے۔ اُسے حسن سے زیادہ اپنا عشق عزیز ہے۔ یہ عشق' چشمِ خون بستۂ دلِ پُرخون کی گلابی میں ظاہر ہوتا ہے"۔ ❷

لکھنؤ کی شاعری دلی سے مختلف خصوصیات رکھتی ہے' لکھنؤ سکول کی نمایاں خصوصیات کے ذکر سے پہلے اس مرکز کے اس تاریخی اور سماجی پس منظر کا سمجھنا ضروری ہے جس کے پرتو سے یہاں کی شاعری کا رنگ مختلف ہے۔

کسی بھی سماج اور معاشرے کی تشکیل میں وہاں کے اقتصادی حالات' عقائد اور رسوم و روایات اہم درجہ رکھتی ہیں۔ صوبہ اودھ' جس کا مرکز لکھنؤ تھا' ان پہلوؤں سے دہلی سے بہت مختلف تھا۔ نواب برہان الملک اور نواب شجاع الدولہ نے دہلی کی سرپرستی سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اودھ کے علاقے کی باقاعدہ تنظیم کی۔ ان کی بیدار مغزی کی وجہ سے صوبے میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس طرح یہاں کے لوگوں میں نہ صرف مسرت و انبساط کے جذبات اُبھرے بلکہ صوبے کے سکون و اطمینان کی شہرت دور دور پھیلی۔ انتظامی امور اور عمدہ تحصیل وصول سے دولت کی ریل پیل ہوئی' جسے عوام کی فلاح و بہبود پر بے دریغ خرچ کیا گیا۔ نواب آصف الدولہ کا نام جود و سخا کے حوالے سے ضرب المثل بن گیا۔ ملک کے دوسرے صوبوں میں جب اس صوبے کی خوشی اور خوشحالی کی خبریں پہنچیں تو دور و نزدیک

---

❶ آبِ حیات' مولانا محمد حسین آزاد' ص ۷۵

❷ دیباچہ "مقدمہ کلام آتش"' خلیل الرحمٰن اعظمی' مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۹ء' ص ۵

سے لوگ یہاں آ آ کر بسنے لگے۔ اس طرح شعراء، اہل کمال، ہر طرح کے فن کار اور دوسرے لوگ پایہ تخت لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ دولت کی فراوانی اور سیاسی سکون کا نتیجہ عموماً آرام طلبی اور عیش کوشی ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اطلس و کمخواب، شاہد و شراب اور دوسرے لوازم و تکلفات روز مرّہ زندگی کا جزو بن گئے۔ ان تکلفات زندگی نے تہذیب و شائستگی کا ایسا معیار بنا دیا تھا کہ سادگی اور میانہ روی پستی مذاق کی نشانی قرار دیے جانے لگے۔ "تلخ بات بھی میٹھے الفاظ میں کہنا، کڑوی دوا کو شکر میں لپیٹ کر دینا، دستورِ زمانہ ہو گیا تھا۔ امراء کا ذکر نہیں، متوسط درجے کے لوگ بھی گلاب سے نہاتے، پھولوں پر لیٹتے، عطر و عود میں بستے تھے۔ سچے موتیوں کو بھون کر ان کا چونا پان میں کھاتے تھے، روز مرہ کھانوں میں وہ اہتمام کرتے تھے کہ آج امراء کی دعوتوں میں شاید ہی ہوتا ہو" ❶ ظاہر ہے کہ ایسی پر تکلف اور پر عیش زندگی میں نفاست اور ستھرے پن کا احساس بڑھ جاتا ہے اور قاعدہ ہے کہ "شاعری سوسائٹی کے تابع ہے" ❷ یعنی جیسا معاشرے کا انداز ہوتا ہے، شعراء بھی ویسی ہی شاعری کرنے لگتے ہیں اور بقول مولانا آزاد:

"قوم کی انشا پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے اور خیالات اس کے بموجب حالاتِ ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔" ❸

چنانچہ یہی کچھ لکھنوی شعراء کے ساتھ ہوا یعنی انھوں نے ایک طرف تو الفاظ کی تراش خراش اور وضع قطع سے زبان کی رعنائی پر توجہ اور الفاظ کے صحیح استعمال پر زور دیا اور دوسری طرف صنعت گری اور فارسی تراکیب سے اس کی زیبائش کی۔ بقول مصنف تاریخ ادب اُردو:

"لکھنؤ میں .... تحقیقِ الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، جس کی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور ان کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا۔ یہی لوگ اصطلاح میں زبان دان کہلاتے ہیں .... یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جاں فشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح لفظ اور

---

❶ حرف غزل، مسیح الزماں، ص ۷۶

❷ مقدمہ شعر و شاعری، خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۱۲۱

❸ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۶۲

محاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے تھے۔ اس چھان بین اور دقتِ نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے .... جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقے پر استعمال کیے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی"(۱)

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو داد دینا پڑے گی کہ لکھنؤ والوں نے زبان کی آرائش میں بڑی کاوش کی۔ تقریباً ہر شاعر کے لیے کسی اُستاد کی شاگردی اختیار کرنا بھی اسی بنا پر لازمی تھا کہ شاگرد کہیں تلفظ، محاورہ، روز مرہ، لفظ یا قواعد و عروض کی غلطی نہ کرے اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے لکھنؤ کی زندگی میں چونکہ آرام طلبی، تکلف، نمود و نمائش اور سجاوٹ و اہتمام کا بہت عمل دخل تھا اس لیے شعراء کو بھی محض سادگی اور سلاست میں لطف نہیں ملتا تھا بلکہ اشعار میں بھی بناوٹ اور سجاوٹ ہی ان کا معیار تھا۔ اس تصنع کے کئی پہلو تھے، مثلاً ایہام گوئی، رعایت لفظی و صنائع لفظی و معنوی وغیرہ۔ یہاں دولت کی فراوانی نے چونکہ ہر کہ و مہ میں ایک طرح کی خودنمائی اور فیشن پرستی پیدا کر دی تھی۔ اس لیے اس کے تقاضے کے طور پر غزل میں محبوب کے ظاہری حسن، اس کے خارجی لوازم اور معاملہ بندی کا اظہار بھی عام ہے۔ واضح رہے کہ لکھنؤ کی اس فضا میں عیش و عشرت کے باوجود اثنا عشری مسلک نے اخلاقی اقدار کو قوت بخشی۔ چنانچہ مرثیہ گوئی جسے ہم خالصتاً مذہبی شاعری کہہ سکتے ہیں، اسی فروغ کا نتیجہ ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی میں ہمیں اخلاقیات، بلند کرداری اور اولوالعزمی کے جو عظیم ترین معیار ملتے ہیں، اس کی مثال دُنیا کی بہت کم زبانوں میں ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں علم و فضل کی اعلیٰ اقدار کا بھی زور رہا ہے۔ اس ضمن میں علمائے فرنگی محل، جن کا نام آج بھی ادب سے لیا جاتا ہے، سب سے زیادہ اثر انداز رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر و ادب میں فصاحت و بلاغت، تخیل آفرینی اور عالمانہ رنگ لانے کے لیے عمداً اور بے اختیار عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے۔ غزل کے اشعار کی تعداد بے تحاشا بڑھ گئی اور ہر قافیہ باندھنا فنِ شعر گوئی پر عبور کی دلیل سمجھا جانے لگا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قافیہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حقیقتاً باندھا جاتا تھا اور شاعر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ یہ دکھا سکے کہ وہ قافیے کو کس کس انداز

---

(۱) تاریخ ادب اُردو، مرزا محمد عسکری (مترجم) مطبوعہ غضنفر اکیڈمی، کراچی، س۔ن، ص ۲۰۲

سے باندھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظی رعایت اور مناسبت کا خیال رکھنا بھی کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ قدرت کلام کے مظاہر کی ایک اور صورت مشکل ردیف و قوافی کے ساتھ سنگلاخ زمینوں کی تھی۔ کیونکہ ایسی زمین میں شعر کہنا ویسا ہی دشوار تھا جیسے پتھر پر بیج اُگانا۔ یہ انداز لکھنؤ کے ساتھ ساتھ دہلوی شعراء میں بھی مقبول ہوا۔ تمثالی پیرایۂ بیان اگرچہ دہلوی شعراء کے یہاں بھی ہے مگر لکھنوی شعراء نے اس سے بہت کام لیا ہے۔ لکھنؤ سکول کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبان پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے لکھنوی شعراء کی بندشیں بہت مضبوط ہیں۔ ان اسباب و علل سے یہ نتیجہ نکالنا شاید غلط ہوگا کہ متذکرہ خصوصیات صرف لکھنؤ سکول کے لیے مخصوص ہیں اور جو خصوصیات دہلوی شعراء کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً سادگی بیان' سلاست اور سوز و گداز' وہ لکھنوی شعراء کے یہاں نہیں ملتیں۔ اس کے برعکس بسا اوقات لکھنوی شعراء بھی سوز و گداز کے حامل نظر آتے ہیں اور اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ البتہ ان کے لہجے سے لکھنؤ کا عام رنگ جھلکتا ہے۔ بہر حال یہ بات بھی اہم ہے کہ اس زمانے میں بھی' جب دلّی اور لکھنؤ کے دبستان باقاعدہ الگ الگ قرار دیے جاتے تھے' دونوں دبستانوں کے شعراء نے ایک دوسرے سے اثرات قبول کیے ہیں۔ اکثر لکھنوی شعراء کے یہاں دلّی کا رنگ ملتا ہے جبکہ بہت سے دہلوی شعراء میں بعض لکھنوی خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے شعراء میں زبان اور اسلوب بیان' دونوں اعتبار سے فرق ہے مگر لکھنؤ کے بہت سے شعراء نے دلّی کی زبان کی پیروی کرنے میں کوئی عیب نہیں سمجھا۔ ناسخ پہلے شاعر ہیں' جنھوں نے دلّی اور لکھنو کے دبستان شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا' لکھنؤ کی زبان و شاعری کو قواعد و ضوابط کی سند دی اور اپنے مجوزہ اصولوں کو حتی الوسع اپنی شاعری میں ملحوظ رکھنے کی کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ وہ شعرائے لکھنؤ کے استاد [1] اور دبستان لکھنؤ کے بانی قرار دیے جاتے ہیں۔ لیکن آتش' ناسخ کے ہمعصر ہونے کے باوجود زبان اور موضوعات کے معاملے میں ان سے اختلافات رکھتے ہیں اور پیروی مصحفی کے حوالے سے دبستان دلّی کی بعض خصوصیات کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جذبات نگاری عام طور پر لکھنوی شعراء کے کلام میں مفقود ہے مگر آتش کا خاص رنگ ہے۔ اس کے برعکس ذوق' جنھیں دلّی کی زبان اور محاورے کا سرتاج سمجھا جاتا

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی' مطبوعہ اُردو مرکز لاہور ۱۹۶۷ء' ص ۳۰۵' ۳۰۶

ہے بعض معاملات میں ہمیں ناسخ سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ (خصوصاً لمبی ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں کے معاملے میں) شاہ نصیر کا بھی' جو ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے استاد ہیں' یہی عالم ہے۔ خود بہادر شاہ ظفر کے کلام میں ہمیں ناسخ کی سی سنگلاخ زمینیں اور لمبی ردیفیں ملتی ہیں اور ان حضرات کے کلام میں وہ چیز بھی ہے جسے ہم لکھنؤ کے حوالے سے خارجیت قرار دیتے ہیں۔ معاملہ بندی' جسے لکھنؤ کی خاص چیز سمجھا گیا ہے' مومن خان مومن کی شاعری کا اصل موضوع ہے۔ غالب بعض باتوں میں ناسخ کے مداح نظر آتے ہیں بلکہ بقول پروفیسر آل احمد سرور "غالب جیسا صاحب نظر ناسخ کے رنگ کی طرف بھی کبھی کبھی للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتا تھا" [1] اور بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "نصیر' مومن' غالب' ذوق سب کے ذہنی ارتقاء میں ناسخ کے کلام اور ان کی مثال کا کچھ حصہ ضرور ہے" [2]

یہاں یہ بات بھی یک گونہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ:

> "..........اُردو شاعری کی تاریخ میں ہر زمانہ اور ہر دور میں ایسے دو شاعر ایک دوسرے کے حریف نظر آتے ہیں' جن میں سے ایک فطرت کے قریب اور دوسرا شان و شوکت' تکلف و صناعی سے نزدیک ہوتا ہے۔ میر و سودا' مصحفی و انشا' آتش و ناسخ' انیس و دبیر اور داغ و امیر کی مثالیں اس کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں"۔ [3]

اِن سب باتوں کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا مقالہ اس کا متحمل ہوسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دلی اور لکھنؤ ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ خارجیت کے نقوش' جسے ہم دبستان لکھنؤ کا امتیاز سمجھتے ہیں' دبستان دلی میں بھی مل جاتے ہیں اور داخلیت کے آثار' جو دبستان دلی کی نمایاں خصوصیت ہے' دبستان لکھنؤ میں موجود ہیں۔ یہ اثرات صرف انھیں دو خطوں تک محدود نہیں رہے بلکہ برصغیر میں جہاں جہاں اُردو شاعری ہوتی رہی' شعراء ان سے متاثر ہوئے اور انھوں نے دونوں دبستانوں کے فرق کو ملحوظ رکھے بغیر کچھ معاملات میں' خصوصاً زبان کے معاملے میں دونوں کی

---

[1] مقدمہ کلام آتش' خلیل الرحمن اعظمی' دیباچہ از پروفیسر آل احمد سرور' ص ۱

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' ص ۳۳۳

[3] مقدمہ کلام آتش' خلیل الرحمن اعظمی' ص ۴۵

پیروی کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ مثلاً پنجاب کے لوگوں نے دلّی اور لکھنؤ کی زبان میں جہاں اختلاف دیکھا وہاں بہتر محاورہ اختیار کیا۔ [1] اس کے علاوہ ان کی شاعری میں مقامی اثرات بھی داخل ہوتے رہے کیونکہ بقول آزاد:

"ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔" [2]

دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا انحطاط ایک فطری اور تاریخی عمل تھا۔ کیونکہ ان دونوں دبستانوں میں فکر و خیال اور اسلوب کے اعتبار سے فارسی شاعری کے مصالحے سے جتنی عمارتیں قائم ہو سکتی تھیں۔ سب ہو چکیں اور موضوعات کو ہر صورت سے برتا جا چکا اور لوگ عشق و عاشقی، گل و بلبل اور باغ و راغ کے افسانے سن سن کر عاجز آ چکے تو شاعری میں ایک فکر انگیز انقلاب کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ جسے ان دبستانوں کی زوال پذیری کے زمانے میں ہی کچھ لوگوں نے محسوس کر لیا تھا۔ جس میں مولانا آزاد اور مولانا حالی کے نام سرفہرست ہیں۔ مثلاً مولانا آزاد نے "نظمِ آزاد" کے دیباچہ، اپنے مضامین اور لیکچرز اور "آبِ حیات" کے دیباچہ میں قدیم شعری روش سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے یعنی مضامینِ عاشقانہ، مے خواری، مستانہ، بے گل و گلزار وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصلِ موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، اسی میں فلک کی جفا کاری اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے۔" [3]

اسی بات سے متعلق وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے"۔ [4]

---

[1] ترقی اردو کے متعلق ایک نئی تحریک (تبصرہ) مولوی عبدالحق مطبوعہ رسالہ "اردو" اورنگ آباد دکن بابت جولائی ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۶۰

[2] آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۷۰

[3] آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۸۱، ۸۲

[4] آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۸۲

اسی طرح مولانا حالی نے بھی ''مجموعہ نظم حالی'' کے دیباچے ''مسدس حالی'' کے دیباچے اور پھر ''مقدمے'' میں قدیم رنگ سخن سے اجتناب کا مشورہ دیا تھا۔ ❶ اس انقلاب کا سبب کیا تھا؟ اس پر علامہ اقبال کے ان الفاظ سے بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ:

''مغربی علوم وفنون کی ہوا نے اُردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور شاید ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر کہ یہ زبان ہوئی ہے''۔ ❷

اور اسی ضمن میں ''دلّی کا دبستان شاعری'' کے مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''غرض کہ مضامین کی ہر صورت سے ضرب وتقسیم کی جاچکی تھی۔ صاف اور سپاٹ اور بے برگ وبار زمین کے لیے ضرورت تھی کہ اب پھر کہیں سے نئے پھولوں اور نئے درختوں کے بیج لائے جائیں جس سے اس اُجڑے گلستاں میں پھر بہار آسکے اور نئی چمن بندیاں ہوسکیں۔ اگر انگریزی تمدن اور ادب یہاں ایسے موقع پر نہ پہنچتا تو بھی زمانے نے کروٹ لے لی تھی۔ یہ لازمی تھا کہ بین الاقوامی اثرات کے تحت یہاں اور ہی رنگ قائم ہوجاتا لیکن تبدیلی اور انقلاب ضروری تھا۔ بارے انگریزی تمدن وادب کے آنے کی وجہ سے یہ انقلاب اسی کے اثرات کے ماتحت ہوا۔'' ❸

بہر کیف اُردو شاعری میں انقلاب کا آنا ناگزیر تھا۔ چونکہ دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے انحطاط کے بعد اُردو شاعری کے کئی ایک مرکز بنے' جن میں سے لاہور سب سے اہم مرکز ہے کیونکہ حیدرآباد' رامپور' بھوپال اور الہ آباد وغیرہ کے جو مراکز قائم ہوئے وہاں پرانی روایات اور روشِ شعری بدستور قائم رہی جبکہ لاہور کو یہ منصب نصیب ہوا کہ یہاں ایک انقلابی فکر کے زیر اثر نئے شعری رویوں نے جنم لیا۔ لہٰذا اس نئے انقلاب کی بازگشت سب سے زیادہ یہیں سنائی دی۔ جہاں مولانا آزاد

---

❶ اصل متن کا تذکرہ گزشتہ باب میں آچکا ہے اس لیے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

❷ مقالات اقبال' مرتبہ سید عبدالواحد معینی ومحمد عبداللہ قریشی' مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۱۹۸۲ء ص ۳۶

❸ دلّی کا دبستان شاعری' ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی' ص ۱۰۹

نے مناظموں ❶ کی ابتدا کر کے اس انقلاب کا آغاز کیا جس میں مولانا حالی بھی ان کے ساتھ شریک رہے۔ خود مولانا حالی نے "مقدمہ شعروشاعری" میں اس ناگزیر تاریخی انقلاب شاعری کی طرف لوگوں کو مدعو کیا اور چند سالوں میں ہی پرانے مسلمات شاعری کی کایا پلٹ دی۔ اس نئے انقلاب نے اُردو شاعری کے وہ تمام معیارات وموضوعات بدل دیے جو اُردو کی آفرینش سے لے کر اب تک چلے آ رہے تھے۔ اب دلّی اور لکھنؤ تو کیا تمام برصغیر کی کیفیت ہی جدا ہے۔ اسے قدرت کی ودیعت کہہ لیجیے یا کچھ اور مگر حقیقت یہ ہے کہ جو تحریک بھی لاہور سے اُٹھی وہ جلد ہی برصغیر کے تمام شہروں میں رواج پا گئی جس کا اعتراف مولانا تاجور نجیب آبادی نے بھی کیا ہے کہ:

"پنجاب کی مفید ومعتبر تحریکات سارے ہندوستان کو ہلا دیتی ہیں۔ پنجاب سے جو آواز اُٹھتی ہے تیس کروڑ کی ایک پوری دُنیا اس کی ہمنوا بن جاتی ہے۔" ❷

یہاں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس نئے انقلاب شاعری کے داعی یعنی مولانا آزاد اور مولانا حالی پرانے رنگ شاعری سے بھی بخوبی واقف تھے لیکن اس سے اسی قدر بیزار بھی تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پرانی شاعری سے زیادہ تر سلانے یا بہلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ جبکہ یہ لوگ شاعری سے جذبات کی آسودگی کے علاوہ ذہن کی بیداری کا کام بھی لینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ادب محض تفریح یا تعیش کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ بصیرت عطا کرتا ہے اور ان تجربات کو عام کرتا ہے جو انسانیت کی عظمت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"برکھارُت، خوابِ امن، مناظرہ رحم وانصاف، مناجات بیوہ، چپ کی داد میں شاعری پیمبری کا منصب سنبھال لیتی ہے"۔ ❸

بلاشبہ زبان، شاعری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہماری شاعری میں تو سب سے زیادہ توجہ ہی

---

❶ ان مناظموں کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ باب میں "انجمن پنجاب کی تحریک" کے ذیل میں آچکا ہے۔

❷ دیباچہ "روحِ انتخاب" جلد اوّل، مرتبہ مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلارام وفا، مطبوعہ شمشیر سنگھ اینڈ کمپنی لاہور، سن ندارد، ص ۳

❸ ادب اور نظریہ، پروفیسر آل احمد سرور، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء، ص ۲۴۱

بول چال کی زبان پر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نقادوں نے زبان کی سادگی، سلاست اور روانی پر بڑا زور دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعری صرف الفاظ کا طلسم نہیں ہوتی بلکہ جب تک اس میں جذبہ و خیال کا پر جوش اظہار نہ ہو یہ بے جان الفاظ کا مجموعہ ہے۔ بقول مصنف ''مقدمہ کلام آتش'':

''محض انداز بیان اور لطفِ زبان کے بل بوتے پر جو شعر اپنی طرف مائل کرتا ہے وہ ہمیشہ دوسرے درجے کا ہوتا ہے جبکہ اول درجے کا شعر ''شعر محض'' کے دائرے سے نکل کر براہ راست اور غیر محسوس طریقے سے دلوں میں اتر جاتا ہے اور ہم کو گمان بھی نہیں گزرتا کہ ان جذبات کی ترسیل کے لیے شاعر نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اور جن وسائل سے کام لیا ہے وہ کیا ہیں؟ اور یہی فنِ شعر کی معراج ہے''۔ ❶

اور بقول علامہ اقبال:

''شاعری محض محاورات اور اظہار بیان کی صحت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔'' ❷

پروفیسر آل احمد سرور نے ''مقدمہ کلام آتش'' کے دیباچے میں زبان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

''زبان کے تین پہلو ہیں: ایک علمی یا سائنسی زبان، ایک روز مرہ یا بول چال کی زبان اور ایک ادبی زبان۔ ادبی زبان نہ مکمل طور پر بول چال کی زبان ہو سکتی ہے نہ مکمل طور پر علمی، ہاں دونوں سے مدد لے سکتی ہے۔ ادبی زبان میں اظہار تخلیقی یا تاثراتی ہوتا ہے یعنی لفظ صرف مفہوم ادا نہیں کرتا، تاثر بھی رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی زبان، بول چال کی زبان یا علمی زبان دونوں سے زیادہ علمی یا رمزیہ ہوتی ہے۔ بول چال کی زبان میں بھی ایک تاثر ہوتا ہے مگر آئے دن کے کاروباری استعمال سے اس کا تاثر محدود اور مقررہ ہو جاتا ہے۔

---

❶ مقدمہ کلام آتش: خلیل الرحمن اعظمی، ص ۸۷

❷ خطوط اقبال: رفیع الدین ہاشمی (مرتب) مطبوعہ مکتبہ خیابان ادب، لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۳۳ (خط بنام سید شوکت حسین محررہ ۲، جنوری ۱۹۱۹)

علمی زبان تاثر عطا نہیں کرتی یہ صرف معلوماتی ہوتی ہے۔ ادبی زبان لفظ کے اندر چھپے ہوئے معنی اُجاگر کرتی ہے۔ یہ اس کے امکانات واضح کرتی ہے اور اس طرح زبان کے حدود کو وسیع کرتی ہے۔ ادیب (شاعر؟) کے استعمال سے لفظ میں ایک برقی رو منقید ہوجاتی ہے اور جب شعر پڑھا یا سنایا جاتا ہے، یہ شاعر سے سننے یا پڑھنے والے میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ برقی رو بول چال کی زبان سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور ایک حد تک علمی زبان کے سلیقے کے استعمال سے بھی مگر دراصل یہ ادبی زبان کی خصوصیت ہے اور اس کے ذریعے سے شاعری اپنا جادو جگاتی ہے یہ کبھی نشتر بنتی ہے کبھی ترشی، کبھی نشتر، کبھی تلوار، کبھی شعلہ، کبھی شبنم، کبھی طوفان، کبھی ساحل، کبھی جوئے کہکشاں اور کبھی بحرِ بیکراں"۔ ❶

پنجاب میں اُردو زبان عام بول چال کی نہ سہی لیکن علم و ادب کی زبان ہمیشہ رہی ہے۔ علمی و ادبی حیثیت سے اس کی ایک روایت اس سرزمین پر قائم ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی اور لکھنؤ کے مراکز اُجڑے تو یہ زبان پنجاب میں بس گئی اور یہاں علم و ادب کا ایک نیا مرکز قائم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہاں اُردو کا مرکز قائم ہوا تو اس میں پنجابی الفاظ کی شمولیت اور اس پر پنجابی محاورات ناگزیر ہوگئے۔ اب اُردو میں لکھنؤ اور دلی کے خالص محاورات کے ساتھ پنجابی محاورات اور الفاظ کی شمولیت کا حق بھی مسلم ہوگیا کہ زبان کے ارتقا کی یہی راہ ہے۔ بقول علامہ اقبال:

"اگر کوئی شخص اپنی اُردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کردے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اُردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علمِ زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے"۔ ❷

---

❶ مقدمہ کلام آتش (دیباچہ پروفیسر آل احمد سرور ص ۴،۳)

❷ مقالات اقبال، ص ۵۲، ۵۳

پنجاب کے بیشتر شعراء اہل زبان نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی اہل زبان ہونے کا دعویٰ کیا۔ ❶ البتہ انھوں نے اہل زبان کی پیروی کرنے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن اول تو انھوں نے دلّی اور لکھنؤ کی زبان کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی اور دوسرے یہ کہ انھوں نے زبان میں بعض مقامی الفاظ اور محاورات بھی شامل کیے کیونکہ بقول علامہ اقبال:

"یہ علم السنہ کا مسلم اصول ہے اور جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں بھی نہیں ہے کہ اس عمل کے اصول کو روک سکے کہ جہاں جہاں اُردو کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہا ہو"۔ ❷

لیکن چونکہ پنجاب کے شعراء دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے مخصوص شعراء کی طرح لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے زبان و بیان کے معاملات میں یہ اجتہاد کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی بلکہ اس بات پر اصرار کیا کہ اگر اُردو پنجاب میں بولی اور لکھی جائے گی تو اس میں پنجاب کی عام بول چال کے الفاظ اور محاورات بھی شامل ہوں گے اور ہونے چاہییں۔ جہاں تک خیالات اور اظہار کا تعلق ہے تو پنجاب، دلّی اور لکھنؤ سے جداگانہ اور منفرد انداز کا حامل ہے اور اس کا عکس بھی ہمیں پنجاب کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ دبستانِ دلّی کا امتیاز داخلیت ہے اور دبستانِ لکھنؤ کا خارجیت۔ لیکن پنجاب کو نہ تو ایسے حالات سے سابقہ پڑا تھا جنھوں نے دہلوی شعرا کو دروں بینی پر مجبور کر دیا تھا اور نہ ہی انھوں نے دولت کی وہ ریل پیل دیکھی تھی جس کی وجہ سے لکھنؤ عیش و عشرت کا گہوارہ بن گیا تھا اور یہ چیز ان کی

---

❶ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کی زبان پر اعتراضات کے سلسلے میں ایک خط میں لکھا: "نہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے نہ زبان دانی کا"۔ (خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی خط بنام سید فصیح اللہ کاظمی محررہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۹ء ص ۱۲۸) اور اسی بات کا اظہار اپنے ایک مقالے (اُردو زبان پنجاب میں) میں بھی کیا ہے جو "مخزن" اکتوبر ۱۹۰۲ء میں چھپا تھا کہ "زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزل میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا............" (مقالات اقبال ص ۷۲، ۷۳)

❷ مقالات اقبال ص ۵۲

پیروں بنی کا باعث بنی۔ لہٰذا انھوں نے جو شاعری کی اس میں دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص مزاج اور اپنے مخصوص انداز فکر اور اپنے خطّے کے خاص طور طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لہجے میں جو توانائی اور قوت ہے وہ ہمیں دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے شعراء کے کلام میں نہیں ملتی۔ چنانچہ دلّی اور لکھنؤ میں جو چیز لطیف ہے وہ پنجاب میں بلند آہنگ ہے، وہاں اگر زیر لب مسکراہٹ ہے تو یہاں قہقہہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے اہل برطانیہ کے یہاں سنجیدگی، رکھ رکھاؤ اور وضع داری ہے اور وہی چیز امریکہ میں بے ساختگی، برجستگی اور بے تکلفی ہے۔

دبستان دلّی اور دبستان لکھنؤ کے شعراء کی ریت رہی ہے کہ وہ اپنے کلام میں قدیم فارسی شعراء اور اپنے اساتذہ سے سند لیتے ہیں اور انھیں یہ روایت اتنی عزیز ہے کہ وہ اس دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کے برعکس خطہ پنجاب میں ایک تو طبعی طور پر لوگوں کے مزاج میں قبول عام کا مادہ زیادہ ہونے کی بنا پر اور دوسرے اردو زبان و ادب میں دوسری زبانوں اور ان کے ادب سے متاثر ہونے اور الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت ہونے کی وجہ سے اُردو ہر دم تغیر پذیر تھی جیسا کہ مولانا آزاد رقم طراز ہیں کہ:

"اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سن کی تصنیف کا دوسرے سن کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا"۔ ❶

دبستان لاہور کے شعراء کی نگاہیں زیادہ تر مغربی ادب بالخصوص انگریزی ادب کی طرف تھیں اور اس امر کا احساس کچھ لوگوں کو اس وقت ہی ہو گیا تھا جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت اور انگریزی زبان و ادب کا عمل دخل شروع ہوا مثلاً مولانا آزاد "آب حیات" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے۔ ہندو مسلمان بھائیوں کو اس دن کا انتظار کرنا چاہیے کہ عربی فارسی کے لفظ جواب تک ہمارے تمھارے باپ دادا بولتے رہے آئندہ ان کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود

---

❶ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد ص ۲۷

جگہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے"۔ ❶

چنانچہ یہی ہوا اور یوں لاہور کا دبستان شعر جلد ہی مشرقی اور مغربی فکر و احساس کا ایک حسین امتزاج بن گیا۔ جہاں مغربی افکار کے زیر اثر نئے نئے شعری موضوعات کی تلاش ہوئی اور ان کی قدیم اصناف اور اسالیب بیان سے اس طرح پیوند کاری کی گئی کہ وہ صناعی کا ایک عمدہ نمونہ بن گئے۔ با مقصد شعری موضوعات' نیچر کے عنوانات اور حب وطن کے مضامین کا سارا تصور مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ جس کی طرف رغبت سب سے پہلے مولانا آزاد نے لاہور میں رہ کر دلائی۔ "انجمن پنجاب" کے زیر اہتمام مشاعروں میں پڑھی گئیں مولانا کی نظمیں جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے' اس سلسلہ کی خوبصورت ابتدائی مثال ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مغربی علوم سے استفادہ کرنے کی راہیں کھل گئیں اور یہ سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔ جس سے نئے معاشرتی و سائنسی حقائق کا پتہ چلا اور جدید رجحانات کے ساتھ ساتھ جدید تصورات یعنی فلسفۂ حیات اور تصور حقیقت معلوم کرنے کی راہیں معلوم ہوئیں جس سے نہ صرف اُردو شعری روایت پر انحصار کم ہو گیا بلکہ اُردو شاعری پہلی بار بعض مقاصد کے ساتھ وابستہ ہوئی۔

مولانا آزاد اور مولانا حالی نے لوگوں کے اذہان و قلوب کی اس تبدیلی کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد نے لاہور آ کر مناسب وقت ملتے ہی لیکچرز کے ذریعے' حالی نے "مجموعہ نظم حالی" کے دیباچے' "مسدس" کے دیباچے اور پھر "مقدمے" میں قدیم اصناف سخن سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے "مقدمے" میں اُردو شاعری (خصوصاً غزل' جس کا اثاثہ اُردو شاعری میں سب سے زیادہ ہے) کی بیشتر خامیوں کا ذمہ دار متاخرینِ لکھنؤ کے شعراء کو ٹھہرایا ہے۔ ❷

اسے دبستانی عصبیت پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ فکر و فن کے ایک نئے احساس کی کارفرمائی تھی۔ فطرت' مغربی جمہوریت' قومیت اور وطنیت کے تقاضوں سے متعلق مضامین اسی نئے طرز احساس کا شاخسانہ ہیں۔

شاعری میں "انجمن پنجاب" کی تحریک جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے' جس نے اُردو

---

❶ آب حیات' مولانا محمد حسین آزاد' ص ۳۹

❷ مقدمہ شعر و شاعری' مولانا الطاف حسین حالی' ص ۲۰۶

شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور ہمارے شعر و ادب کو جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں خاص کردار ادا کیا' دلی اور لکھنؤ میں شاید نہ پنپ سکتی۔ کیونکہ دلی اور لکھنؤ میں:

الف: زبان و بیان کے معیارات قائم ہو چکے تھے۔

ب: شعری روایات کا ایک مضبوط حصار بن گیا تھا۔

ج: لوگ قدیم روایات میں اس طرح رس بس گئے تھے کہ تبدیلی کا کوئی عمل قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

د: اس روایت کے ساتھ جو تصورِ حقیقت وابستہ تھا اس کی نفی کیے بغیر روایت سے باہر نکلا نہیں جا سکتا تھا اور روایت پسند ہونے کی بنا پر یہ بات ان کے بس کی نہ تھی۔

جب کہ پنجاب میں یہ کام بآسانی ہو گیا کیونکہ نہ تو اہل پنجاب روایت پسند تھے اور نہ ہی ان کے گرد کوئی اس طرح کا حصار قائم تھا۔ چنانچہ پنجاب میں یہ تحریک خوب پھلی پھولی۔ اس کی مزید وجوہ ایک سے زیادہ ہیں جن کا جائزہ ہم ذیل میں لیتے ہیں:

- ہر چند اُردو پنجاب کی مادری زبان نہیں تھی مگر اردو پنجابی کی شکل و شباہت اور ان کی آپس میں گہری مماثلت کی بنا پر "اُردو پنجاب کو ماں کے دودھ کی طرح راس آئی" [1] اور اس نے پنجاب میں وہ فروغ پایا کہ باید و شاید۔ اسی مماثلت [2] کی وجہ سے اہل پنجاب نے اُردو کو نہ کبھی مغایرت کی نظر سے دیکھا اور نہ کبھی نامانوس سمجھا بلکہ "انجمن پنجاب" کی تشکیل (۱۸۷۴ء) کے بعد سے تو خصوصاً اس کے لیے اپنے بازو وا رکھے۔ اُردو اور پنجاب کے اسی تعلق کے ضمن میں سر عبدالقادر نے اپنے ایک مقالہ میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جس کا اقتباس یہاں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"............ تعجب ہے تو اس بات کا کہ پنجاب نے اُردو کو اس سرعت کے ساتھ اور اس شوق سے کس طرح قبول کیا............ پنجاب کے خاص حالات کو بھی

---

[1] پنجاب میں اُردو (مقالہ) سر عبدالقادر' مطبوعہ "روحِ انتخاب" جلد اوّل، مرتبہ مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفا' ص ۲۰۴

[2] اس مسئلے پر تیسرے باب میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

اس میں کچھ کم دخل نہ تھا۔ اوّل تو پنجاب کی اپنی زبان اُردو سے بہت ملتی جلتی تھی۔ یہ زبانیں گویا ماں جائی بہنیں تھیں جو مدت سے بچھڑی ہوئی تھیں اور اب آملیں۔ ایک بہن کی بولی شہروں میں رہتے ہوئے نکھر گئی تھی اور دوسری دیہات میں رہنے سے اپنا لب ولہجہ بدل چکی تھی۔ لیکن ملنے کی دیر تھی کہ ایک نے دوسری کو پہچان لیا اور گلے مل گئیں۔ ایسی کہ پھر جدا نہ ہوئیں۔ بے شمار لفظ اور محاورے ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں اور جسے شوق ہو وہ اس تلاش کو نہایت دلچسپ پائے گا"۔ ❶

(فاضل مقالہ نگار نے ایسے کچھ الفاظ کی فہرست بھی دے رکھی ہے۔)

دوسرے پنجاب میں اُردو کے فروغ کا باعث یہ امر بھی ہوا کہ اُردو نے 'جو ایک مخلوط زبان ہے' مقامی بولیوں کی گود میں پرورش پائی مگر بوجوہ اس پر فارسی رنگ غالب رہا۔ ممکن تھا کہ پنجاب کو فارسی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اُردو کو پنجاب کی آب و ہوا اس قدر راس نہ آتی مگر پنجاب کو فارسی سے قدیم الایام سے گہرا ربط رہا ہے۔ ایک تو جغرافیائی طور پر خطہ پنجاب کا سرحدی ممالک یعنی ایران وافغانستان سے نسبتاً قریب ہونا' اسی وجہ سے ان ممالک کے لوگوں کی آمد و رفت کا یہاں زیادہ ہونا اور دوسرے تاریخی لحاظ سے سکھوں کے عہد تک سرکاری زبان کا فارسی ہونا بھی یہاں اُردو سے زیادہ مانوس ہونے کا باعث ہوئے اور اُردو میں کثرت سے فارسی الفاظ کی آمیزش کی وجہ سے کسی نے اسے مغایرت کی نظر سے نہ دیکھا۔ چنانچہ "فارسی سے مناسبت قدرتی طور پر اُردو سے مناسبت کا سبب ہوئی"۔ ❷

ان قدرتی اسباب پر اضافہ یہ ہوا کہ پنجاب میں انگریزی حکومت کے آنے پر فارسی کی جگہ عدالتوں میں اُردو کو جاری کیا گیا۔ اس طرح اُردو کا رواج روز بروز بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ برصغیر بھر میں پنجاب میں اس کا مستقبل سب سے زیادہ درخشندہ نظر آنے لگا۔ جیسا کہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"پنجاب میں اس زبان نے جو فروغ حاصل کیا ہے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ اس زبان کے قدیم گہوارے (دلّی اور لکھنؤ) میں اب اس کا مستقبل اس

---

❶ پنجاب میں اردو (مقالہ) سر عبدالقادر ص ۲۰۳

❷ پنجاب میں اُردو (مقالہ)' سر عبدالقادر' ص ۲۰۳

قدر روشن نہیں، جس قدر پانچ دریاؤں کے صوبے میں"۔ ❶

اسی خیال کو محمد عظیم زیادہ وضاحت سے پیش کرتے ہوئے پنجاب کے مختلف علاقوں بالخصوص لاہور میں اُردو ادب وشعر کے فروغ کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

"اب ان مرکزوں (دلّی، لکھنؤ اور دکن) میں اُردو کا مستقبل کافی حد تک تاریک ہے۔ وہاں کے ادباء اور شعراء بھی کھنچ کھنچا کر لاہور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں بس چکے ہیں۔ اب بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شعر و شاعری اور ادب کا اگر کہیں پر چار عام ہے تو وہ لاہور ہے۔ پاکستان بننے سے کافی پہلے پنجاب اور خاص طور پر لاہور نے جو پائے کے ادباء اور شعراء پیدا کیے ہیں ان پر اُردو زبان جس قدر بھی ناز کرے کم ہے.......... ❷

♦ اُردو کو پنجاب نے ہمیشہ بنظرِ حسن وخوبی دیکھا ہے اور اس کی ترویج وترقی اور اشاعت کی خدمت جس قدر اہلِ پنجاب نے کی ہے کسی اور خطے نے نہیں کی۔ چنانچہ چھاپے خانے کے رواج کی ابتداء سے ہی جس قدر کتب ورسائل یہاں سے نکلے برصغیر میں کسی اور جگہ سے نہیں نکلے۔ اس کا اعتراف مولانا تاجور نجیب آبادی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پنجاب کے اُردو رسائل واخبارات کی تعداد ہندوستان کے تمام صوبوں کے اُردو رسالوں اور اخباروں کی مجموعی تعداد کے لگ بھگ ہے۔ حق یہ ہے کہ اُردو پر دلّی اور لکھنؤ سے زیادہ اب پنجاب کا حق ہے۔ اگرچہ پنجاب کی عام بولی پنجابی ہے لیکن اس کی علمی اور تعلیمی زبان غیر محسوس طور پر اُردو قرار پا گئی ہے" ❸

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اُردو کو پنجاب کی ادبی زبان تسلیم کرتے ہوئے لاہور کی علمی وادبی خدمات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب کی ادبی زبان اب اُردو ہو گئی ہے اور اہلِ پنجاب نے جس

---

❶ حکیم فرزانہ، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۷۰

❷ "اُردو ادب کا دبستان لاہور" (مقالہ) محمد عظیم، مطبوعہ ماہنامہ "نئی قدریں" حیدرآباد پاک شمارہ نمبر ۱۰، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷

❸ روحِ انتخاب (جلد اوّل) دیباچہ از مولانا تاجور نجیب آبادی، ص ا

شوق اور محنت سے اس کے حاصل کرنے اور ترقی دینے میں کوشش کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ شکریہ ہے۔ لاہور اس صوبے کا علمی مرکز ہے۔ وہاں سے اس قدر اُردو اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ ہندوستان کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا علاوہ اس کے مختلف انجمنیں خیالات اور زبان کی ترقی کے لیے قائم ہیں“ [1]

پنڈت دتاتریہ کیفی بھی مولوی عبدالحق کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

”بدیہی واقعہ ہے کہ پنجاب ان خطوں میں سے ہے جنھیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتم بالشان حصہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تصانیف وتالیف اور تراجم وغیرہ کی تعداد جو یہاں سے ہر سال اشاعت پاتی ہے، حکومت اور یونیورسٹی جس حوصلہ افزائی اور کشادہ دلی سے اُردو کی سرپرستی کرتی ہے اس دعوے کی حجت ناطق ہیں۔ اُردو ادب اور تہذیب انشا کے باب میں پنجاب کے شعراء اور اہلِ قلم کا بڑا حصہ ہے“۔ [2]

اس ضمن میں مولانا سیماب اکبرآبادی کی یہ رائے بھی اہم ہے۔ جس میں وہ پنجاب کو اُردو ادب کی ”ممتاز نشرگاہ“ تسلیم کرتے ہیں:

”پنجاب ہندوستان کا وہ مردم خیز صوبہ ہے جہاں نبی بھی پیدا ہوئے اور شاعر بھی۔ نبی جھٹلا دیے گئے اور شاعر پر ایمان لایا گیا۔ اس صوبے کے دو سب سے بڑے شاعر بہت مشہور ہوئے۔ گرامی اور اقبال .... پنجاب پہلے صوفیوں کا مرکز اور تصوف کی اشاعت گاہ تھا، اس کے بعد اُردو ادب کی ایک ممتاز نشرگاہ بن گیا.........“ [3]

مولوی عبدالحق اور سیماب اکبرآبادی کی آراء تو دوسرے علاقوں کے لوگوں کی ہیں لیکن پنجاب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بابت پنجاب کے ایک نامور فرزند اور مشہور اُردو دوست سرعبدالقادر اُردو کے اثر

---

[1] تبصرہ مولوی عبدالحق، سہ ماہی ”اُردو“ اورنگ آباد دکن، بابت جولائی ۱۹۲۳ء، ص ۳۶۰

[2] منشورات، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مطبوعہ معین الادب، لاہور ۱۹۵۰ء، ص ۳۰۳

[3] تبصرہ (رسالہ) ”شاعر“ آگرہ، مولانا سیماب اکبرآبادی، بابت ستمبر ۱۹۳۷ء، ص ۴۴

ونفوذ کو پنجاب کے دیہاتوں تک موجود پاتے ہیں:

"اس وقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کے جتنے اخبار اس صوبہ میں چھپتے ہیں کسی اور صوبہ میں نہیں چھپتے اور ان میں سے اکثر صرف لاہور سے نکلتے ہیں جو پنجاب کی سب تحریکوں کا صدر مقام ہے۔ اخبارات کے علاوہ مؤقر رسالے بھی جس کثرت سے لاہور میں شائع ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں اس کی مثال بھی کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں۔ یہ مؤقر رسالے زبان کی ادبی ترقی کے لیے اخبارات سے بڑھ کر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اخبارات ورسائل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جا بجا اُردو کا چرچا ہو گیا اور شہر کے کوچوں سے قدم نکال کر اُردو دیہات کی گلیوں تک پہنچ گئی"۔ ❶

◆ اہل پنجاب کی اُردو کے ساتھ غایت درجے کی دلچسپی اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ جب ایک انجمن "پنجاب پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے لاہور میں پنجاب کے تعلیمی مسائل کا جائزہ لینے کی غرض سے قائم ہوئی۔ (دیگر تعلیمی مسائل کے علاوہ یہ بھی طے کرنا تھا کہ پنجاب میں کون سا رسم الخط رواج دیا جائے اور یہ کہ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو) تو علامہ اقبال اس کے سیکرٹری تھے۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو اس کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا۔ ❷ اس میں اُردو سے متعلق دو اہم قراردادیں منظور کی گئیں۔ پہلی قرارداد یہ ہے:

"اس کانفرنس کی رائے میں اُردو رسم الخط کا متداول رہنا صوبہ پنجاب کی عام علمی اور تمدنی ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے اور اس کے موجودہ عالمگیر استعمال میں کسی قسم کی مداخلت کرنا صوبہ پنجاب کی علمی اور تمدنی ترقی کو سالہا سال پیچھے ڈال دے گا" ❸

---

❶ پنجاب میں اردو (مقالہ) سر عبدالقادر، ص ۲۰۵

❷ اقبال اور عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء ص ۳۲

❸ اقبال اور عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن، ص ۳۲

دوسری قرارداد:

"اس کانفرنس کی رائے میں صوبہ پنجاب کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص علمی اغراض اس امر کے متقاضی ہیں کہ اُردو زبان کو ہی صوبۂ پنجاب میں واحد ذریعۂ تعلیم رہنے دیا جائے"۔❶

اِن دونوں قراردادوں کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کا اُردو کے ساتھ ایک ایسا دیرینہ تعلق تھا، جو ہر قیمت پر قائم رہا اور بہ حیثیت زبان اُردو کے تشخص کو برقرار رکھنے میں پنجاب نے اہم کردار ادا کیا۔

- پنجاب کے لوگوں کی ایک خاصیت جو ان کو برصغیر کے دوسرے باشندوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہ لوگ سادہ لوح، مخلص، متحمل مزاج اور نیازمند قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ چرب زبان اور سبز باغ دکھانے والے پیروں اور فقیروں کے پھندوں میں بہت جلد پھنس جاتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کی اسی خصلت کا ذکر علامہ اقبال نے مولوی عبدالحق کے نام اپنے ایک خط محررہ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء میں کیا ہے۔ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اُردو کے صدر مقام اور پبلشنگ ہاؤس کو اورنگ آباد دکن سے کسی اور مرکزی مقام پر منتقل کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں علامہ صاحب کی رائے مانگی تھی۔ علامہ صاحب نے ان کے استفسار کے جواب میں ان کے سامنے لاہور کا مقام تجویز کیا۔

"......... یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو؟ میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں.............. یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات (کے لوگوں) سے بڑھ کر ہے"❷

علامہ اقبالؒ نے پنجاب کے مسلمانوں کی اس خصلت کا ذکر بہ انداز تائید و اثبات "ضربِ کلیم"

---

❶ اقبال اور عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن، ص ۳۲۔

❷ اقبال اور عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن، ص ۴۳۔

میں "پنجابی مسلمان" کے عنوان سے بھی کیا ہے:

"مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد!
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد!
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد" ❶

اسی سادہ لوحی اور اخلاص کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شاعری میں فنی محاسن کے تکلفات کے زیادہ قائل نہ تھے۔ اس کے برعکس براہ راست جذباتی اظہار سے تاثر قبول کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اتفاق یہ تھا کہ جدید شعری رجحانات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ شاعری میں صنعتوں اور رعایتوں سے گریز اور تاثرات کا براہ راست اظہار کیا جائے۔

♦ پنجاب ازمنۂ قدیم سے ہی ان طوفانوں کی زد میں رہا ہے جو نت نئے قافلوں' طالع آزماؤں اور نئے نئے خیالوں کو اپنے جلو میں لیے یہاں وارد ہوئے اور پھر یہاں کے جسمانی اور ذہنی انجماد کو بار بار توڑتے رہے۔ اس سے پنجاب کے باسیوں کے یہاں یہ میلان بطورِ خاص پروان چڑھا کہ یہ روایت پرست کبھی نہیں رہے بلکہ یہاں کے لوگ نئی باتوں کو پسند کرتے ہیں اور ان میں نئے اثرات' نئے تصورات اور نئے رجحانات قبول اور جذب کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ ان کے پیشِ نگاہ باتوں کے منفی پہلوؤں کے بجائے عموماً مثبت پہلو رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کسی کی ذات میں کیڑے نہیں نکالتے بلکہ اچھائی کے پہلو تلاش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے برصغیر کے مسلمانوں کی حالت بدلنے اور ان کی اصلاح و ترقی کے لیے انھیں انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم و فنون کی طرف راغب کرنے کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں تن من دھن کی بازی لگا دی تو ان کی مخالفت سب سے بڑھ کر صوبہ آگرہ اور اودھ میں ہوئی اور وہ یہاں تک دل برداشتہ ہوئے کہ بقول مولانا حالی:

"انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا پختہ

---

❶ ضربِ کلیم' اقبال' مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ۱۹۸۱ء ص ۶۱

ارادہ کرلیا تھا"۔ ❶

ان حالات میں ان کی پذیرائی سب سے زیادہ پنجاب میں ہوئی اور ان کے حوصلوں کو تقویت سب سے زیادہ اہل پنجاب نے پہنچائی۔ بقول حالی:

"انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا"۔ ❷

اس غرض کے لیے اس مردِ مجاہد نے چار مرتبہ ❸ پنجاب کا سفر اختیار کیا اور ہر بار اہل پنجاب نے دیدہ و دل فرش راہ کیا اور ہر بار ایسا استقبال کیا جس سے وہ اہل پنجاب کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سرسید احمد خان کے معتمد رفیق مولانا حالی اہل پنجاب کی سرسید تحریک کے ساتھ انتہائی رغبت اور دیگر خدمات کے معترف ہیں اور اس بارے میں "سرسید کی کامیابی اور اس کے اسباب" کے زیرِ عنوان سرسید کی سوانح حیات "حیاتِ جاوید" میں لکھتے ہیں:

"............ایک اور خداساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان، جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، سرسید کی منادی پر وہ اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انھوں نے ہر ایک صوبہ سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لیے بھیجے، ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھوں نے سب سے زیادہ دلچسپی

---

❶ حیاتِ جاوید (حصہ دوم) مولانا الطاف حسین حالی، مطبوعہ، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۰

❷ حیاتِ جاوید (حصہ دوم)، ص ۳۲۳

❸ انھوں نے پہلا سفر ۱۸۷۳ء، دوسرا ۱۸۸۴ء میں تیسرا ۱۸۸۸ء اور چوتھا اپنی وفات سے چند ہی سال پہلے ۱۸۹۴ء میں اختیار کیا تھا۔ (بحوالہ سرسید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب از مولوی سید اقبال علی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء تعارف از پروفیسر حمید احمد خان، صفحہ ل)

ظاہر کی' سرسید کی ہر قسم کی اصلاح میں انھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم
کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تقلید ❶ اختیار
کی' یہاں تک کہ ان کو" زندہ دلان پنجاب " کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔
حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سرسید کی ملنی چاہیے تھی اس کا حق پنجاب کے
مسلمانوں کے برابر کسی صوبے سے ادا نہیں ہو سکا"۔ ❷

• پنجاب کے لوگوں کا مزاج مہماتی قسم کا ہے یعنی مہم جوئی ان کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے
اور ان کی طبائع میں تجسس کا میلان بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو
جہاں یہاں کے باشندے مختلف پیشوں میں منہمک' مختلف شعبوں سے منسلک اور بود و باش نہ رکھتے
ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے مزاج میں ہر آن ایک نیا جوش' ولولہ اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجود رہتا ہے۔
بقول پنڈت کشن پرشاد کول:

"پنجاب والوں میں بڑی خوبیاں ہیں.................. کس بل ہے' حوصلہ و ہمت ہے' جوشِ
عمل ہے"۔ ❸

اور بقول سر عبدالقادر اس جوشِ عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ:

"پنجاب میں جو قومیں آباد ہیں ان میں سے اکثر جسمانی قویٰ کے لحاظ سے ہندوستان کی
مضبوط ترین قوموں میں شمار ہوتی ہیں اور اس سبب سے ان کی قوت عمل دوسروں سے کچھ
بہتر ہے۔ یہاں کے لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کسی کام کی طرف مائل ہو جائیں تو اُسے
بہت جوش اور سرگرمی سے کرتے ہیں............" ❹

---

❶ سرسید ہی کی تقلید میں اور ان ہی کے ایما پر لاہور میں " انجمن حمایت اسلام" قائم ہوئی جس نے پنجاب بالخصوص لاہور کے لوگوں کے رفاہ عامہ کے کاموں اور ان کی تعلیمی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کیا۔ انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے دبستان لاہور کے بہت سے شعراء جن کا ذکر آگے آئے گا منظر عام پر آئے بلکہ مشہور اور مقبول ہوئے۔

❷ حیات جاوید (حصہ دوم)' ص ۳۲۲' ۳۲۳

❸ ادبی اور قومی تذکرے پنڈت کشن پرشاد کول' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۱ء ص ۴۳

❹ پنجاب میں اُردو (مقالہ) سر عبدالقادر' ص ۲۰۵

اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"قاعدہ عام یہ ہے کہ طبیعت کا تجسس اور مہم جوئی کا میلان آخر میں کردار کی انفرادیت میں متشکل ہو جاتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو جاتا ہے جس کے افراد جسم سے لے کر فن تک ہر جگہ انفرادیت کا اظہار کرنے پر بضد نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایسے معاشرے میں پہلوان بھی پیدا ہوتے ہیں اور پہلوانانِ سخن بھی اور جہاں تک سخن کا تعلق ہے اس کا زیادہ اظہار بھی اس صنف میں ہوتا ہے جو تجربے کی منفرد اکائی کو پیش کرتی ہے نہ کہ تجربات کی لخت لخت کیفیت کو۔ اس لیے دہلی اور لکھنؤ کے معاشرے میں نظم نگاری کے رجحان کے باوصف زیادہ فروغ غزل کو ملا اور لاہور میں غزل کہنے کی روش کے باوجود نظم کو۔ غزل کی صورت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہے لیکن قافیہ ردیف سے منسلک ہونے کے باعث پوری غزل سے یوں چمٹا ہوا ہے جیسے فرد معاشرے کے ساتھ۔ جبکہ نظم کی صورت یہ ہے کہ یہ اپنی جگہ مکمل ہے اور ایک متجسس فرد کے باطن کا عکس نظر آتی ہے۔ پچھلے ایک سو برس میں دبستانِ لاہور میں پرورشِ نظم کا شدید رجحان اسے دوسرے دبستانوں سے واضح طور پر الگ کرتا ہے۔" ❶

♦ دبستان دلّی اور لکھنؤ کے شعراء پر روایت پسندی کی فضا کا ایسا تسلط قائم ہو چکا تھا کہ وہ شعری روایات کے حصار کو توڑ کر باہر نکلنے سے گریزاں تھے۔ اُردو زبان و ادب میں فارسی زبان و ادب کی تلمیحات، تشبیہات، استعارات اور لفظی تراکیب رائج تھیں اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"شعراء زبان کے علاوہ فکر کے بنے بنائے سانچوں میں قید تھے۔ لکھنؤ کی شاعری جو اس وقت کا ایک رائج اور مقبول سکہ تھا، جسم کی شاعری ہو کر رہ گئی تھی جس میں نئے موضوعات کا فقدان تھا اور رفعت و عظمت کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا"۔ ❷

مگر جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ پنجاب کے باشندے اپنی جغرافیائی اور

---

❶ "دبستان لاہور کا بانی .... آزاد" ڈاکٹر وزیر آغا "تنقید اور مجلسی تنقید" مطبوعہ مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا ۱۹۷۶ء ص ۱۵۹

❷ آزاد کا اسلوب فکر" (مقالہ) ڈاکٹر وزیر آغا "تنقید اور احتساب" مطبوعہ جدید ناشرین لاہور ۱۹۶۸ء ص ۲۳۰

تاریخی صورت حال کے پیش نظر روایت پرستی سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جدت کی تلاش، نئے نئے موضوعات اور تصورات کو جنم دینے اور قبول کرنے اور نت نئے تجربات کرنے سے کبھی نہیں گھبراتے خواہ یہ تجربات زندگی کے اقتصادی پہلو سے متعلق ہوں یا سیاسی سے، معاشرتی پہلو سے متعلق ہوں یا ادبی سے۔ اس معاملے میں یہ لوگ کوئی رکاوٹ یا تکلف روا نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے اُردو شاعری میں بھی نئے نئے تجربے کیے جو عام طور پر کامیاب رہے۔ خصوصاً اُردو نظم میں جتنے کامیاب تجربات لاہور میں کیے گئے کہیں اور نہیں ہوئے، چنانچہ اُردو شاعری کی ایک نئی ہیئت یعنی اُردو نظم ایک نئی صنف کے طور پر سامنے آئی۔ بقول پروفیسر شہرت بخاری:

> "پنجاب ہی کے ہاتھوں اُردو میں نظم نے باقاعدہ ایک صنف سخن کی حیثیت اختیار کی اور پھر اس قابل بنی کہ اگر یہ صنف سخن دیگر یورپی زبانوں کے برابر نہیں تو اتنی حقیر بھی نہیں رہ گئی کہ ہم سبکی محسوس کریں"۔ ❶

اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے لاہور کے دبستانِ شعر نے جنم لیا جس کا بیج آزاد نے بویا جس کی آبیاری، نشوونما اور قطع و برید مختلف اوقات میں مختلف ہاتھوں سے ہوئی اور جو قیام پاکستان تک ایک چھتنار درخت بن گیا۔

◆ پنجاب کی بول چال کی زبان بالعموم پنجابی رہی ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پنجاب نے ہمیشہ اُردو کو علمی اور ادبی زبان کے طور پر قبول کیا لہٰذا تحریر و تصنیف کا ذریعہ یہی زبان رہی۔ قاعدہ ہے کہ کوئی بھی زبان جس علاقے میں لکھی جاتی ہے اس علاقے کی بول چال کی زبان کے اثرات ضرور قبول کرتی ہے۔ چنانچہ فطری طور پر پنجاب میں جو علمی اور ادبی زبان رائج ہے وہ دلی اور لکھنو کی زبان سے مختلف ہے۔ اس میں فارسی الفاظ اور تراکیب تو کثرت سے داخل ہیں کیونکہ فارسی آٹھ سو سال تک اس علاقے کی واحد علمی و ادبی زبان کے طور پر رائج رہی۔ لیکن یہ زبان، اہل زبان کے انداز گفتگو اور روزمرہ و محاورات سے بہرہ یاب نہیں۔ لہٰذا پنجاب میں عام طور پر جو ادبی کتابیں لکھی جاتی ہیں، ان کا طرز تحریر اہل زبان کی لکھی ہوئی کتابوں کی نسبت زیادہ ثقیل اور رسمی ہوتا ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے

◆ اُردو نظم اور پنجاب (مقالہ) مطبوعہ مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور بابت مئی ۱۹۵۳ء ص ۸۹

ہیں:

''چونکہ یہاں اُردو بولنے کی زبان کے طور پر مستعمل نہیں رہی اس لیے اس کا جو انداز یہاں پروان چڑھا ہے (بالخصوص تحریر میں) اس میں محاورہ بندی' صفائی اور سادگی کے بجائے خطابت' شکوہ اور علمی و ادبی انداز نمایاں ہے۔ اس لیے لفظ کو جذبے کے متنوع پہلوؤں کو پیش کرنے کے بجائے خیال اور عمل کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کا رجحان عام ہوا ہے''۔ ❶

♦ اقبال اور پنجاب کے کئی دوسرے اہل قلم کی تصانیف کا مرتبہ اگرچہ ہمارے ادب میں اس قدر بلند ہے کہ ان کی زبان کی خامیوں کی طرف' جو یقیناً کم ہیں' نگاہ نہیں اُٹھتی لیکن زبان و بیان کا چٹخارہ لینے والے ان تصانیف سے وہ لطف نہیں اُٹھاتے جو وہ اہل زبان کی زبان اور ان کے طرز اظہار سے اُٹھاتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس قصے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو علامہ اقبال نے میر انیس کے خانوادے کی یادگار پیارے صاحب رشید کی نسبت خود بیان کیا:

''جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعروسخن کی ایک مجلس منعقد کی' جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ اُن کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب' انقباض اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتیں اور پھیل جاتی تھیں۔ کبھی آنکھیں یکبارگی کھلتیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر میں نے ادب سے پوچھا کہ ''آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی' لیکن جو کچھ عرض کیا ہے آپ نے ملاحظہ

---

❶ دبستانِ لاہور کا بانی۔ ''آزاد'' (مقالہ) ڈاکٹر وزیر آغا' ص ۶۰

فرمایا''؟ انھوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا''ہاں صاحب سنا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو ایسی اُردو نہ ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اُردو ہے یا کوئی اور زبان ہے''۔ ❶

لیکن ادبی زبان کا یہ اختلاف معمولی فرق سے' مقامی اثرات کے ساتھ ہمیں برصغیر کے ان تمام خطوں میں ملے گا جہاں تحریر و تصنیف کی زبان اُردو ہے اور یہ فطری عمل ہے کہ علمی و ادبی زبان ہمیشہ بول چال کی زبان سے متاثر ہوتی ہے۔ یہی نہیں اس کے برعکس یہ بھی ہوتا ہے کہ تحریری زبان کے اثرات بول چال کی زبان پر پڑتے ہیں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی رہتی ہیں اور اسے روکا نہیں جاسکتا۔ اگرچہ اہلِ دلی اور لکھنؤ نے یہاں اس عمل پذیری کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا' لیکن زبان ان کی اس روش کی پروا کیے بغیر اپنی راہ پر گامزن رہی۔ ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ اہلِ لاہور نے اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ایک تحریک شروع کی' جس کا بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''.........اہلِ لاہور کو اُردو زبان سے جو دلچسپی رہی ہے اور اس وقت ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں.........حال ہی میں ایک نئی تحریک اُردو زبان کی ترقی کے متعلق لاہور میں ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ پنجاب کو دلی اور لکھنو کے اہل زبان کی نام نہاد سیادت سے آزاد کیا جائے.........نئے الفاظ حسبِ ضرورت تجویز کیے جائیں اور دلی اور لکھنو کی زبان میں جہاں اختلاف ہو وہاں بہتر محاورہ اختیار کیا جائے.........اس تحریک سے اہل لاہور کا شوق اور دلچسپی ظاہر ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ اُردو زبان کی ترقی اور اصلاح میں مصروف ہیں۔ اہل دلی اور لکھنو کو برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ضرورت ہو تو ان کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ وقت ایسا ہے کہ اُردو کی ترقی کے لیے جو کوشش بھی کی جائے (خواہ وہ کہیں ہو) اسے غنیمت سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چند مقامی الفاظ کے جھگڑے کرنا زبان کی ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ ہم اہل لاہور کو مبارک باد دیتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ ان کی سعی بار آور ہوگی بشرطیکہ ان کی تحریک

---

❶ حکیم فرزانہ؛ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام؛ ص ۱۷۔

عامیانہ اور معاندانہ بحثوں سے پاک رہی"۔ ❶

♦ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بعض ابنائے حالات دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے لوگ لاہور رامپور' حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ کی طرف چلے گئے۔ اگرچہ لاہور کا دبستان تو اسی زمانے میں بننا شروع ہو گیا تھا لیکن چونکہ ابتدا میں اس خطے کے شعراء نے دلی اور لکھنؤ کے اساتذہ فن سے فیض اُٹھایا اور زبان و بیان کے اظہار میں عموماً ان اساتذہ کے کلام کو بطور نمونہ سامنے رکھا اس لیے اوّلین دور میں لاہور کے دبستانِ شعر کے خدوخال کسی حد تک غیر واضح رہے۔ لیکن یہ خدوخال ۱۸۷۴ء کے بعد بتدریج واضح ہوتے گئے۔ ۱۸۷۴ء کے بعد دبستانِ لاہور کا تعلق نہ تو دلی سے رہا اور نہ ہی لکھنؤ سے' بلکہ یہ دبستان ان دونوں کا ردعمل ہے۔ مثلاً دبستانِ دلی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہاں رنج والم' گریہ وزاری' کسمپرسی اور نااُمیدی کے مضامین عام ملتے ہیں مگر پنجاب میں اوّل تو یہ مضامین خال خال ہیں اور وہ بھی ایک طرح کے ضبط اور وقار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں بلکہ اکثر طور پر پنجاب میں اس فضا کو کسی نے بھی نہیں سراہا اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی فضا میں اصلاحی مقاصد کے تحت اس بات کی کوشش کی گئی کہ یاس اور افسردگی کے ماحول کو یکسر بدل دیا جائے۔ قومی زندگی میں اعلیٰ مقاصد اور عملی جدوجہد کے فروغ کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ نئے معاشرتی اور سیاسی تقاضوں کے تحت اعلیٰ عزم وارادے کی قوتوں کو بیدار کیا جائے۔ اس کوشش نے شاعری میں ایک نئے رجائی لہجے کی بنیاد ڈالی اور یہ لہجہ لاہور کے دبستانِ شعر کی ایک شناخت بن گیا۔ علامہ اقبال کا ارشاد ہے:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو' وہ بادِ سحر کیا
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز!

بلکہ علامہ اقبال کے نزدیک "یاس وحزن وخوف ام الخبائث است وقاطع حیات" اور انھوں نے جگہ جگہ اس کی مذمت کی ہے۔ "رموزِ بے خودی" کا تو ایک معتدبہ حصہ اسی بارے میں مختص ہے۔ چند

---

❶ "ترقی اُردو کے متعلق ایک نئی تحریک" مولوی عبدالحق' مجلہ سہ ماہی "اُردو" اورنگ آباد دکن' بابت جولائی ۱۹۲۳ء' ص ۳۶۰

اشعار یہ ہیں:

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست
زندگانی محکم از لاتقنطوست!

تار اُمید از آرزوئے پیہم است
نااُمیدی زندگانی را سم است

نا اُمیدی ہمچو گورٗ افشاردت
گرچہ الوندی ز پا ی آردت

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی!

خفتہ باغم در تہِ یک چادر است
غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است

اے کہ در زنداں غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر●

دبستانِ دلّی کی ایک اور نمایاں خصوصیت مابعد الطبیعیاتی تصور حقیقت ہے جب کہ دبستانِ لاہور اس کی نفی کرتا ہے۔ یہاں اس کے برعکس زیادہ تر زور عقلیت، سائنسی حقیقت، گردوپیش کی واقعاتی دُنیا، اخلاقیات کی بنیاد اور نیچر کے مضامین پر ہے کہ یہی اس وقت کی اصلاح معاشرہ کی تحریک کا بھی مطمعِ نظر تھا۔

● عام طور پر قدما زبان کو مضمون سے زیادہ اہم سمجھتے تھے اور طرفگی خیال پر طرزِ ادا کو فوقیت دیتے تھے۔ اس معاملے میں لکھنوی شعراء نے تو اپنا سارا زور صنائع بدائع، محاورہ بندی، رعایت لفظی، رمز و کنایہ اور زباندانی کے جوہر دکھانے میں صرف کر دیا۔ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" کے مصنف اعتراف کرتے

● اسرار و رموز اقبالؔ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ۱۹۸۳ء ص ۹۲

ہیں کہ:

''شعرائے لکھنؤ نے اپنی ساری قوت، شعر کو ظاہری حسن و خوبی سے مزین کرنے میں صرف کردی''۔ ❶

چنانچہ ان کی شاعری تکلف اور تصنع کا شکار ہوگئی۔ اس کے برعکس پنجاب کے لوگ مختلف نسلوں کے متنوع رویوں کے انضمام کے باعث تعمق خیال اور جدت مضامین کے دلدادہ ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اسی چیز کو سراہا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب کو برصغیر کے دوسرے علاقوں کی نسبت پنجاب میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیونکہ غالب کی اوّلین خصوصیت طرفگی اَدا' جدت اسلوب بیان اور فکر و خیال کی باریکی اور بلندی ہے اور ''انھوں نے زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھا ہے''۔ ❷ جیسا کہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''مرزا کی قدر دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ پنجاب میں اردو زبان بولی نہیں جاتی' لوگ زبان اور محاورہ کی لطیف خوبیوں سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہوتے جس قدر خیالات سے اور یہ اتفاق کہ زبان کا مستقبل دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب سے وابستہ ہوگیا ہے' دیوانِ غالب کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث ہوا''۔ ❸

یہاں یہ ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ پنجاب میں غالب کا کلام تو اپنی جدت' ندرت اور طرفگی ادا کی وجہ سے مقبول تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے مکاتیب کو بھی اس علاقے میں مقبولیت حاصل ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مکاتیب تصنع اور رعایت لفظی و معنوی سے پاک' براہ راست اظہار کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ اس امر کا اظہار خود غالب نے اپنے ایک خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر' محررہ جون ۱۸۶۵ء میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خان کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔

---

❶ لکھنؤ کا دبستان شاعری' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' مطبوعہ اُردو مرکز' لاہور ۱۹۶۷ء ص ۴۴۴

❷ حکیم فرزانہ' شیخ محمد اکرام' ص ۷۷

❸ ''تنقید غالب کے سو سال'' (غالب کی شاعری کے چار ادوار (مقالہ) شیخ محمد اکرام مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

فی الحال پنجاب احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے"۔ ❶

علامہ اقبالؒ کے کلام کی دوامی کشش کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ ان کا منتہائے مقصود شاعری کے ذریعے الفاظ کے خوش رنگ طوطے مینا بنانا نہ تھا بلکہ ان کا مطمحِ نظر اس سے کہیں بلند تھا۔ ان کے نزدیک زبان صرف ذریعہ اظہار ہے' سب کچھ نہیں۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک خط بنام سید شوکت حسین' میں اسی بات کا اظہار کرتے ہیں:

"شاعری محض محاورات اور الفاظ کے صحیح استعمال ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اس سے کہیں بلند تر شے ہے.......... میرے کلام میں شاعری محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ میری یہ قطعی خواہش نہیں ہے کہ میرا نام موجودہ دور کے شعراء میں شامل ہو"۔ ❷

اور یہی بات ان کے ایک دوسرے خط بنام ڈاکٹر سید یامین ہاشمی' جنھوں نے علامہ صاحب سے اپنے کلام کی اصلاح چاہی تھی' کے نام سے بھی آشکار ہے:

"زبان کے اعتبار سے آپ کے اشعار میں کسی قسم کی اصلاح کی گنجائش نہیں۔ خیالات بھی اچھے ہیں۔ ہاں تخیل کی کمی ہے اور اس کمی کو لفظی اصلاح پورا نہیں کر سکتی"۔ ❸

چنانچہ پنجاب میں ہر لحاظ سے موضوع اور فکر و خیال پر زیادہ زور دیا گیا' شگفتگی اور قوت بیان کو زیادہ اہم سمجھا گیا اور اسے حسنِ بیان پر ترجیح دی گئی۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ پنجاب نے حسنِ بیان کو سرے سے نظر انداز نہیں کیا البتہ تخیل کی بلندی اور توانائی کو ہمیشہ فوقیت دی۔ حقیقت یہ ہے کہ خالی حسن بیان سے عظیم شاعری تخلیق نہیں ہوتی۔ چنانچہ لکھنو کے چھوٹے درجے کے شعراء کے یہاں ہمیں لفظی رعایتیں اور صنائع بدائع وغیرہ تو ملتی ہیں لیکن شعری عظمت نہیں ملتی۔ عظیم فن پارہ تخیل کی بلندی اور توانائی کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ پنجاب کے اکثر شعراء نے تخیل کی بلندی اور توانائی کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ تخیل کی جولانیوں کو لفظ کی گرفت میں لینے کا یہ میلان دبستانِ لاہور کا

---

❶ عودِ ہندی' مرزا اسد اللہ خان غالب مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء ص ۲۳۱

❷ "معاصرین اقبال کی نظر میں" محمد عبداللہ قریشی' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء ص ۳۷۵ خط محررہ ۳ جنوری ۱۹۱۹ء

❸ خطوطِ اقبال' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی' مطبوعہ مکتبہ خیابانِ ادب لاہور' ۱۹۷۶ء ص ۱۶۹

سنگ میل ہے۔ دبستان لاہور میں ہمیں آزاد اور حالی سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر راشد اور فیض تک یہ شعری عظمت نمایاں نظر آتی ہے۔

♦ روایت پرستی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ ہوا کرتی ہے جبکہ روایت پسندی کئی لحاظ سے اچھی چیز ہے۔ پنجاب میں قدیم ایام سے اُردو شعری روایات چلی آ رہی تھیں۔ لیکن اس دبستان کے زیادہ تر شعراء نے ان روایات کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ان کو نئے قالب دے کر نئے ڈھنگ سے استعمال کیا۔ شاعری کی علامات وقت اور زمانے کے ساتھ اپنے مفاہیم بدل لیتی ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

"..........زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے"۔ ❶

علامہ اقبال اُردو کی شعری روایات سے انحراف نہیں کرتے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی علامات کو نئے مفاہیم عطا کیے بلکہ اُردو شاعری میں نئی اور جاندار علامتوں کا اضافہ بھی کیا۔ اسی طرح فیض کی شاعری ایک مخصوص سیاسی فکر کی آئینہ دار ہے۔ ان کے شعر میں توانائی ہے، کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہے، حوصلہ مندی اور جرأت کا اظہار ہے۔ لیکن انھوں نے بھی علامہ اقبال کی طرح اُردو کی شعری روایات اور علامات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک بڑا شاعر جب مروج علائم و رموز کو اظہار خیال کے لیے استعمال کرتا ہے تو اس روایت یا علامت کو نیا مفہوم مل جاتا ہے اور اس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً فیض کی شاعری سے ہمیں قاتل، خنجر، گلشن، قفس وغیرہ ایسی علامات ملتی ہیں جو ہمارے فرسودہ سے فرسودہ شاعر کے کلام میں بھی موجود ہیں لیکن فیض کی توانا فکر نے ان علامات کو نیا مفہوم دیا ہے اور ان میں ایک نئی آن بان پیدا کر دی ہے۔ یہی ایک بڑے فن کار کا کمال ہوتا ہے۔

♦ تاریخی عوامل اس بات کے شاہد ہیں کہ یہاں مختلف نسلیں آ کر ملیں اور بقول مولانا آزاد:

"جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ

---

❶ "معاصرین اقبال کی نظر میں" محمد عبداللہ قریشی ص ۱۳

پڑتا ہے"۔ ❶

اور یہ بھی فطرت کا اصول ہے کہ مختلف نسلوں کے اختلاط سے حسن اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اس اصول کو تہذیبوں پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پنجاب کی علاقائی تہذیب کا جب اُردو کی تہذیب سے باہمی اختلاط اور ارتباط ہوا تو وہ خاص قسم کی رعنائی اور توانائی لے کر آگے آئی اور ایک نئی قسم کی توانا' خوبصورت اور پرشکوہ شاعری پیدا ہوئی مزید برآں بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"پنجابی زبان میں تشدید کا جو آہنگ اور پنجابی کردار میں فطری توانائی کا جو رنگ ہے وہ دبستان لاہور کی اُردو میں نہ صرف ایک بولتے ہوئے بلند آہنگ لہجے کی صورت میں اُبھرا ہے بلکہ اس کا اظہار تخیل آفرینی کی اس صورت میں بھی ہوا ہے جس سے یہاں کی تخلیقات عبارت ہیں.............. اس کی مثال آزاد کی تحریر اور بہترین مثال علامہ اقبال" کا کلام ہے"۔ ❷

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مقتضائے حالات جب دلی اور لکھنؤ کی بساط اُلٹی تو یہاں کے دبستانوں کے لوگ لاہور' رامپور' حیدر آباد' بھوپال اور الہ آباد وغیرہ کی طرف چلے گئے۔ مولانا آزاد اور ان کے چند ہم عصر شعراء ❸ لاہور میں آئے تو دبستانِ لاہور کی داغ بیل اسی زمانے پڑ گئی۔ مگر اس کا تعلق نہ تو دلی کے دبستان سے تھا اور نہ ہی لکھنؤ کے دبستان سے بلکہ انجمن پنجاب کی تشکیل جس کا تفصیلی جائزہ ہم گزشتہ باب میں پیش کر چکے ہیں' لاہور میں نئے دبستان شعر کا نقطہ آغاز ہے۔ یہاں یہ امر واضح کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ انجمن پنجاب کی باضابطہ تشکیل (۲۱ جنوری ۱۸۶۵) ❹ سے پہلے بھی لاہور کے لوگوں کو شعر و ادب کے ساتھ والہانہ لگاؤ تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی بلکہ برصغیر میں دور دور تک شعر و ادب سے منسلک لوگ ان کی اس دلچسپی سے بخوبی آگاہ تھے۔ ثبوت کے طور

---

❶ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد ص ۲۷

❷ "دبستانِ لاہور کا بانی۔ آزاد" (مقالہ) ڈاکٹر وزیر آغا: "تنقید اور مجلسی تنقید" ص ۱۵۷

❸ ان شعراء کا ذکر گزشتہ باب میں "انجمن پنجاب" کے ذکر کی ذیل میں آ چکا ہے۔

❹ انجمن پنجاب کا قیام' مقصد اور اس کے اثرات (مقالہ) راقم الحروف' مطبوعہ "صحیفہ" لاہور جنوری مارچ ۱۹۸۷ء ص ۶۳

پر ہم ذیل میں مرزا غالب کے مکتوب کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں جو انھوں نے ۲ر نومبر ۱۸۶۴ء [1] کو مرزا علاؤالدین احمد خان علائی کو لکھا تھا:

"مزہ تو جب ملے گا کہ تم دلی آؤ اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامہ انجمن کا حال بیان کرو۔" [2]

بہرکیف اس انجمن نے اُردو شاعری کی ایک نئی ہیئت کو رواج دیا اور نظم ایک نئی صنف کے طور پر سامنے آئی۔ عنوان کے تحت نظمیں لکھنے کا رواج بھی پہلی بار انجمن پنجاب سے ہوا۔ انجمن پنجاب کی تحریک سے پہلے شاعری اصناف کے حوالے سے ہوتی تھی جبکہ اس تحریک نے موضوعات پر زور دیا۔ اس سے قبل اُردو شعراء کے یہاں قدیم استعاراتی انداز رائج تھا' جس کے پس منظر میں مابعد الطبیعیاتی نظام کارفرما تھا جسے اس تحریک نے رد کر دیا اور اس کے بجائے اخلاقی نظام کو رواج دیا۔ چنانچہ مولانا آزاد' مولانا حالی اور اس تحریک سے منسلک دوسرے شعراء نے عقلیت' اخلاقیات اور اصلاحی نقطہ نظر سے شاعری کا آغاز کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

"اُردو شاعری کی اصلاحی کوششوں اور انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جدید شاعری کو خاصا فروغ دیا۔ اِس طرح اُردو شاعری حیات و کائنات کے مسائل کی بھرپور ترجمانی کے قابل ہو سکی۔ شاعری کے موضوعات میں حب الوطنی' محبت و مروّت، محنت و کاوش' امن اور انصاف اور اخلاق و معاشرت شامل ہوئے .... اس دور کے تقاضوں کو نظم کی جدید تحریک نے زیادہ تر بالواسطہ پورا کیا اور اُردو شاعری پہلی مرتبہ اجتماعی تحریکات کی باقاعدہ ترجمان بنی۔" [3]

---

[1] سید مرتضیٰ حسین فاضل نے "اُردوئے معلّی' حصہ اوّل' جلد دوم' مطبوعہ مجلس ترقی اردو لاہور ۱۹۶۹ء کے صفحے ۷۸۷ پر حاشیہ میں لکھا ہے کہ "انجمن پنجاب کا قیام اکتوبر ۱۸۶۴ء میں عمل میں آیا تھا اور مرزا علاؤالدین احمد خان بحیثیت مندوب دہلی سے اس انجمن کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے" جبکہ حقیقتاً انجمن پنجاب باضابطہ طور پر ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو قائم ہوئی تھی۔ اور مرزا علاؤالدین احمد خان کے بحیثیت مندوب شریک ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ مرتب کا اندازہ ہے۔ زیادہ ممکن ہے کہ موصوف اپنے طور پر لاہور تشریف لائے ہوں اور مدعو کر لیے گئے ہوں۔

[2] اردوئے معلّی' حصہ اوّل' جلد دوم' مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل' ص ۷۸۷۔

[3] تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ' ڈاکٹر معین الدین عقیل' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی' ۱۹۷۶ء' ص ۳۷۱

پھر یہی نہیں کہ اس تحریک کے اثرات صرف مقامی رہے بلکہ اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے۔ مولانا حالی جو اس تحریک میں مولانا آزاد کے ساتھ پیش پیش تھے ''لاہور سے جدید نظم کی روایت لے کر علی پہنچے اور بالآخر سر سید احمد خان کی تحریک کے ایک موثر فعال اور ناموور رکن بن کر جدید نظم کے ذریعہ اس تحریک کے اصلاحی نظریات کی نشر و اشاعت کرنے لگے''۔ ❶

قدیم اردو شاعری میں سارا زور اسلوب بیان اور تخیل پر تھا۔ نئی شاعری میں تخیل کے ساتھ ساتھ گردوپیش اور مضامین فطرت پر زور ہے۔ اس بات کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی نیچرل شاعری اور جدید نیچرل شاعری میں فرق ہے۔ نظیر نے پہلے اپنے گردوپیش سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں اور بعد میں ان کو عنوان دیا لیکن جدید نیچرل شاعری عنوان دینے کے بعد لکھی گئی۔ نظیر کی تمام تر شاعری کی بنیاد مشیت ایزدی ہے۔ وہاں جا بجا تصوف کا اثر اور ''ہمہ اوست'' کی کارفرمائی ہے اور دنیا خالق کی مختلف نیرنگیوں کا مظہر نظر آتی ہے جب کہ جدید شاعری میں عقلیت اور تمثیل نگاری (Allegory) ہے۔

اوپر ہم نے کہیں لکھا ہے کہ لاہور کا دبستان شاعری دلی اور لکھنو دونوں دبستانوں کا ردعمل ہے۔ تو اس ردعمل کا آغاز اصل میں انجمن پنجاب سے ہی ہو جاتا ہے۔ جو دلی کی بے مقصد شاعری اور لکھنو کی پرتصنع شاعری کے خلاف احتجاج کی آواز ہے اور مختلف وسیلوں کی مدد سے اور مختلف انداز میں قیام پاکستان تک جاری رہتی ہے۔

سرزمین پنجاب نے بڑے بڑے نامی گرامی شعراء کو جنم دیا ہے۔ فارسی آٹھ سو سال تک شمالی ہندوستان کی علمی اور ادبی زبان رہی ہے۔ فارسی شعراء کی لڑی کے دونوں ابتدائی اور آخری موتی (مسعود سعد سلمان اور اقبال) اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔

اُردو شعراء میں بعض اتنے عظیم ہیں کہ اُردو کی دُنیا آج تک ان کی ممنون ہے۔ مولانا آزاد، مولانا حالی اور علامہ اقبال کا تذکرہ تو ہم پہلے بھی بارہا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اختر شیرانی، مولانا ظفر علی خان، فاخر ہریانوی، چوہدری خوشی محمد ناظر، حفیظ جالندھری، خواجہ دل محمد، فیض احمد فیض، میراجی، ن۔ م۔ راشد،

---

❶ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۱

غلام بھیک نیرنگ، تاجور نجیب آبادی، سید عابد علی عابد، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی اور بہت سے دوسرے ایسے شعراء ہیں کہ جن کی شعروادب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اقبال نے سچ ہی کہا تھا:

"افسوس کہ آج خانخاناں نہ ہوئے کہ ان کو معلوم ہوتا کہ خاک پنجاب شیراز و نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں" ❶

آئندہ صفحات میں ہم دبستانِ لاہور سے تعلق رکھنے والے شعراء کے کلام اور ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔ اس ضمن میں گو ہمارے پیشِ نظر دبستانِ لاہور سے منسلک وہ تمام نمائندہ شعراء ہیں جو بنیادی طور پر خطہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اور جو پنجاب کے مخصوص مزاج اور ان شعری روایات کے امین ہیں جنھیں ہم نے دبستانِ لاہور سے متعلق کہا ہے۔ یہاں ہم یہ بھی عرض کردیں کہ ہم نے ان شعراء کے کلام کو کسی خارجی کسوٹی پر نہیں جانچا بلکہ شاعر کو اس کے انداز طبیعت کو اس کے اسلوب خیال اور اسلوب بیان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کے کلام میں فی نفسہٖ کون سی خوبی ہے۔ ہماری نظر زیادہ تر مثبت پہلوؤں پر رہی ہے، کوتاہیوں اور منفی پہلوؤں پر نہیں۔ ہم نے ہر شاعر کے کلام میں پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں کیا ہے نہ یہ کہ اس میں کیا نہیں۔ ہم یہ بھی واضح کردیں کہ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں شعروادب نے بے پناہ کی ترقی کی ہے تاہم اس مقالے کو ہم نے اپنے موضوع کے مطابق تقسیم ملک سے پہلے کے شعراء تک محدود رکھا ہے۔

✿ ✿ ✿

---

❶ مکاتیب اقبال (بنام گرامی) مرتبہ محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۹۵

چھٹا باب

دبستانِ لاہور کے معروف شعراء

(بلحاظ ترتیب زمانی)

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء)

مولانا محمد حسین آزاد ۱۰ر جون ۱۸۳۰ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر علم و فضل کی بنا پر ہم عصروں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلّی کی سرزمین پر اُستاد ذوق، مومن اور غالب جیسے یکتائے روزگار شعراء کی بدولت شعر و سخن کی بڑی گہما گہمی تھی۔ مولوی محمد باقر، اُستاد ذوق کے قریبی دوست تھے۔ چنانچہ جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو اُن کے والد نے انھیں ذوق کے حوالے کر دیا۔ آزاد نے ذوق کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم کے مراحل بھی طے کیے اور نکات عروض اور فنِ شعر میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آزاد اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں سے مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب جیسے ساتھیوں کے ساتھ مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ کالج کے زمانہ تعلیم میں انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا اور نہ صرف پرنسپل نے ان کے بارے میں بڑی اچھی رپورٹیں دیں بلکہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں اُردو مضمون نویسی کا پہلا انعام بھی انھیں دیا گیا۔

مولانا آزاد کو شعر و ادب کے ساتھ بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ اس پر ذوق ایسے اُستاد کی تربیت سے وہ بہت جلد کلام کی پختگی، قدرت زبان اور رموز شاعری سے بہرہ مند ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں آزاد تقریباً ستائیس سال کے تھے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو پھانسی دے دی گئی

اور ان کے بھی وارنٹ نکلے مگر یہ دلی سے بھاگ نکلے اور کئی سال تک حکمرانوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے شہر شہر قریہ قریہ بادیہ پیمائی کرنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور علم و ادب میں گہرے شغف اور اپنی صلاحیتوں کے بل پر جلد ہی نہ صرف گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی اور عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے بلکہ تعلم اور تعلیم سے منسلک لوگوں میں ایک محوری جگہ حاصل کر لی۔ اُن کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر ان کو حکومت نے ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا۔ افسوس! اس جوہر قابل کو کسی کی نظر کھا گئی اور ۱۸۸۹ء سے آزاد کے دماغ میں کچھ اختلال کے آثار شروع ہوئے اور زندگی کے باقی بیس برس اس حالت میں گزرے کہ کبھی ان پر جذب و بیخودی کا عالم طاری ہو جاتا اور کبھی جنون کی کیفیت پیدا ہو جاتی، آخر ۲۲ رجنوری ۱۹۱۰ء کو اسی کیفیت میں رحلت فرمائی۔ مولانا حالی نے تاریخ وفات کہی:

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ '' ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا''

۱۳۲۸ھ

آزاد کی طبیعت میں ایجاد و اختراع کا مادہ بدرجہ اُتم موجود تھا۔ یہ آزاد ہی کی شخصیت تھی، جن کی کوششوں اور خلوص اور محبت سے لاہور میں ایک بزم ادب ''انجمن پنجاب'' قائم ہوئی۔ جہاں مغربی ادب کے زیر اثر' اُردو شعری تاریخ' میں پہلی بار بجائے طرحی غزلوں کے مختلف النوع موضوعاتی و اخلاقی اور مناظر فطرت و حقائق پر مبنی نظمیں پڑھی گئیں۔ اس طرح ۱۸۷۴ء سے اُردو میں ''نظم'' ایک مستقل صنف شاعری کے طور پر شروع ہوئی جس کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ آزاد کی اس تحریک نظم سے پہلے اُردو شاعری سے بالعموم ذہنی آسودگی کا کام لیا جاتا تھا جبکہ ان کی تحریک و اشاعت سے اُردو شاعری ذہنی اصلاح و فلاح کی راہ پر گامزن ہوئی۔ آزاد کی مثنویاں شب قدر' صبح اُمید' حب وطن' خواب امن' داد انصاف' وداع انصاف' گنج قناعت' ابر کرم' زمستان' مصدر تہذیب اور شرافت حقیقی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

لاہور کا دبستان شاعری' جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے' اپنی نمایاں خصوصیات کی بنا پر اُردو کے دوسرے دبستانوں سے مختلف ہے اور اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ایک علیحدہ دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دبستان کے جو امتیازی اوصاف ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک اس کے پہلے ہی علم بردار کی نگارشات میں یکجا ہو گئے تھے۔'' [1]

اگرچہ فنی محاسن کے اعتبار سے شاعری میں آزاد کا مرتبہ بہت اونچا نہیں ہے اور خواہ وہ جدید نظم کو معراج کمال تک نہ پہنچا سکے ہوں کیونکہ آزاد کا میدان صرف شاعری نہ تھا اور ان کے ادبی نظام میں یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی تھی تاہم جدید نظم اور اس کے فروغ میں اوّلیت کا شرف بلاشبہ انھیں حاصل ہے اور یہ وہ شرف ہے جو اُن کی تاریخی حیثیت متعین کرتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد اُردو شاعری میں اپنے اسلوب نگارش اور انداز فکر دونوں حوالوں سے دبستانِ لاہور کے بانی [2] قرار پائے جانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ آزاد پرانے دہلوی رنگ سے بھی بخوبی واقف تھے لیکن اُردو شاعری میں جدید رنگ پیدا کرنا اور اس کو رواج دینا ہی ان کا کمال ہے۔ جس کی پیروی آزاد کے بعد دبستانِ لاہور کے شعراء نے کسی نہ کسی انداز میں کی ہے۔ آزاد کی شاعری کا تفصیلی ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہاں بھی ان کی مثنوی ''ابرِ کرم'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ رنگ کم و بیش آزاد کی تمام نظموں میں موجود ہے:

اے ابر جوشِ سبزہ و گلشن نہیں ہے یہ
پھولوں نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ
مدت سے انتظار تھا تیرا جہاں کو
آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسماں کو

---

[1] تنقید اور مجلسی تنقید' ڈاکٹر وزیر آغا' ص ۱۵۵

[2] حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ ''اس جدت و ایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا اور انھوں نے خود کہہ کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر جدید نظموں کو رواج دیا۔ اس لیے یہ انقلاب شاعری آزاد کی اولیات میں شمار ہونے کے قابل ہے''۔

(بحوالہ داستان تاریخ اُردو' حامد حسن قادری' مطبوعہ لکشمی نرائن اگروال آگرہ' ۱۹۵۷ء' ص ۳۷۸)

آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے

دیوار و در سے آج برستا سرور ہے

تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے

سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

○○

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آب حیات کا

پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا

سب تجھ سے نونہال چمن سبزہ بخت ہیں

اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں

لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے

کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے

یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے

اے ابر یکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے ●

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ حالی ابھی نو سال کے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ کا دماغ مختل تھا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین یوپی میں انسپکٹر پولیس تھے۔ گھر پر صرف دو بڑی بہنیں تھیں جنھوں نے مولانا کی پرورش کی۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مولانا نے سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے صرف و نحو پڑھی۔ ابھی تعلیم ادھوری تھی کہ سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی کردی گئی۔ یہ تحصیل علم و فن کے شوق میں ایک دن رات کی تاریکی میں چپ چاپ گھر سے نکلے اور پیدل دلی روانہ ہو گئے۔ دلی میں حالی نے جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسے میں قیام کیا اور مولوی نوازش علی سے عربی پڑھی۔ ابھی عربی

● نظم آزاد از مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۰۶

پیاس بجھنے نہ پائی تھی کہ ان کے خاندان کے بزرگ اچانک دلی پہنچ گئے اور انھیں چاروناچار دلی چھوڑ کر پانی پت واپس آنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد یہ کسی مناسب ذریعہ معاش کی تلاش میں دوبارہ دلی پہنچ گئے اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے بچوں کی اتالیقی پر ملازم ہو گئے۔ نواب شیفتہ کی وفات کے بعد یہ لاہور آ گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انگریزی سے اُردو میں ہونے والے ترجموں کی درستی پر مامور ہو گئے۔ حالی نے یہ کام تقریباً چار سال تک کیا۔ اس طرح ان کو انگریزی شعر و ادب سے استفادے کا موقع ملا۔ اس دوران میں ان کی ملاقات کرنل ہالرائیڈ اور مولانا آزاد سے ہوئی جن کے کہنے پر یہ انجمن پنجاب ❶ کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ لیکن لاہور میں حالی زیادہ دیر نہ رہ سکے اور دہلی چلے گئے جہاں یہ اینگلو عربک سکول کے مدرس ہو گئے۔ اس عرصے میں ان کی ملاقات سر سید احمد خاں سے ہوئی جن کے ایما سے حالی نے مسدس "مدّ و جزر اسلام" لکھی۔ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد کے نواب سر عثمان جاہ نے حالی کی ادبی خدمات کی قدر کرتے ہوئے پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا جسے ۱۸۹۲ء میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے کر دیا گیا۔ اسی وقت سے حالی نے اینگلو عربک سکول کی ملازمت ترک کر دی اور ان کا زیادہ وقت اپنے وطن پانی پت میں گزرا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت نے ان کی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر انھیں "شمس العلما" کا خطاب دیا۔ دم واپسیں سے پہلے حالی اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر اسی کیفیت میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

حالی فطرت کی طرف سے موزوں طبیعت اور شعری ملکہ لے کر آئے تھے۔ اس پر مرزا غالب اور نواب شیفتہ کی صحبتوں نے انھیں مزید نکھار دیا۔ حالی اپنے سوانح میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک آدھ ہی غزل لکھ کر مرزا غالب کو دکھائی تھی کہ انھوں نے کہا:

"تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔ ❷

حالی کا ذوقِ شعری اعلیٰ درجے کا تھا۔ خمخانہ جاوید کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے شاید غالب کی شاگردی سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا شیفتہ کی صحبت سے"

---

❶ انجمن پنجاب کا تفصیلی ذکر تیسرے باب میں آ چکا ہے۔

❷ کلیات نظم حالی' خواجہ الطاف حسین حالی' مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء' ص ۸

شیفتہ کا شعار .... متانت اور وجاہت سے آراستہ ہے اور حالی کا کلام بھی انھی دو خصوصیات سے عبارت ہے"۔ ❶

مولانا حالی فنِ شاعری اور نقدِ شعر میں صاحب نظر و کمال تھے۔ اگر مولانا قدیم روش سے ہٹ کر جدید شاعری کی طرف راغب نہ ہوتے تو بھی وہ اُردو شعراء کی صف میں نمایاں مقام پاتے۔ لیکن مولانا کا اصلی جوہر اور کمال ان کے جدید رنگ میں ظاہر ہوا۔ جب انھوں نے لاہور میں رہ کر "انجمن پنجاب" کے، جس کا آغاز مولانا آزاد کی کوششوں سے ہوا تھا' پلیٹ فارم سے اپنی چار نظمیں برکھارت' نشاط اُمید' حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف پڑھیں۔ بقول صالحہ عابد حسین:

"یہ چاروں نظمیں بڑی دلکش، شیریں اور دلچسپ ہیں۔ خصوصاً "حب وطن" اپنا جواب آپ ہی ہے۔ حالی سے پہلے اور غالباً بعد میں بھی اس موضوع پر اتنی پُر خلوص' پُر کیف اور پُر اثر نظم کسی نے نہیں کہی"۔ ❷

ان نظموں کے بعد حالی نے شکوہ ہند (۱۸۸۶ء) مناجات بیوہ (۱۸۸۷ء) حقوق اولاد (۱۸۸۸ء) چپ کی داد (۱۹۰۵ء) اور عظیم الشان طویل نظم "مدّ و جزر اسلام" کے علاوہ بیسیوں چھوٹی بڑی نظمیں لکھیں، جنھوں نے اُردو شاعری میں انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی۔

حالی' قدیم رنگ شاعری سے طبعی طور پر بیزار تھے۔ نیچرل شاعری سے متعلق نظمیں اور مسلمانوں کی حالت زار اور پسماندگی کے مرثیے انھوں نے سرسید تحریک سے وابستگی سے قبل ہی لکھنا شروع کر دیے تھے البتہ اس کی مزید جلا دہلی کے قیام کے دوران میں سرسید تحریک کے زیر اثر ہوئی جیسا کہ حالی خود بیان کرتے ہیں:

"لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک سکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اس طرز کی' جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی' لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی

---

❶ خمخانہ جاوید' سری رام لالہ' جلد پنجم' مطبوعہ منشی نولکشور روا تیع لاہور ۱۹۱۱ء/ ۱۳۲۵ھ ص ۱۵۸

❷ یادگار حالی' صالحہ عابد حسین' مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۶ء ص ۳۰

جائے تو مفید ہوگی۔ چنانچہ میں نے اوّل مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں لکھیں۔ ❶

حالی نئے رجحانات کے شاعر تھے۔ نئے رجحانات کی شاعری کے فروغ کے لیے وہ اپنا کام ہر طرح کی مخالفت کے باوجود پوری لگن سے کرتے رہے اور خصوصاً ایسے حالات میں جب الفاظ کی سحرکاری، تخیل کی پرواز اور قیاسی دُنیا بسانا شاعری کا منتہائے مقصود سمجھا جاتا تھا، حالی کی زبان سے ایک انقلاب آفریں صدا بلند ہوئی، جس نے بہت سے دلوں میں گھر کر لیا اور یوں لاشعوری طور پر ایک نئے دبستانِ شعر کی بنیادیں استوار ہوتی گئیں۔

آپ نے کہا:

اے شعر دل فریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو ❷

مسدس کے علاوہ دوسری نظمیں بھی، جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر آ چکا ہے، حالی کی وہ نظمیں ہیں جن کو قدیم شعراء کے کلام کے ساتھ رکھا جائے تو اگرچہ زبان اور تخیل کے اعتبار سے ان کو فائق قرار نہیں دیا جا سکتا مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ نظمیں انگریزی شعری ادب کی اتباع میں اُردو شاعری کی عام ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں۔

اُردو شاعری پر ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس کے دامن میں عالم فطرت (اس میں فطرت کے خارجی اور داخلی دونوں پہلو شمار ہوتے ہیں) کے موضوعات پر شاعری کا سرمایہ بالکل نایاب نہ سہی، بہت ہی کم یاب ہے۔ جبکہ مغربی شاعری میں عالم فطرت ایک مستقل موضوع ہے۔ چنانچہ حالی اور ان کے گروہ نے اس کمی کو شعوری طور پر پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی کی یہ نظمیں، عالم فطرت کے

---

❶ کلیاتِ نظم حالی، جلد اوّل، ص ۸

❷ کلیاتِ نظم حالی، جلد اوّل، ص ۱۷۳

موضوعات کے اعتبار سے وہ نظمیں ہیں جن میں مغربی افکار کا پرتو ہے جو اُردو شاعری میں ہمیں پہلی مرتبہ نظر آتا ہے۔ حالی کی نظموں سے ذیل کے مختصر اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں
کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
برکھا رُت ❶

○○

اے مری اُمید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

---

❶ کلیاتِ نظمِ حالی، جلد اوّل، ص ۱۷۱

کاٹنے والی غم ایام کی
تھامنے والی دلِ ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
(نشاطِ اُمید)❶

○○

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
عزت قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا!
(حبِ وطن)❷

حالی نے شعروادب سے حقیقی زندگی کی ترجمانی کا کام لیا اور اسے اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے شعر کہنے کے اصول مقرر کیے.......... شعر کو سادہ حقیقت پسندانہ اور پُر تاثیر ہونا چاہیے خواہ لفظی و

---

❶ کلیاتِ نظمِ حالی' جلد اوّل' ص۲۸۲

❷ کلیاتِ نظمِ حالی' جلد اوّل' ص۳۹۱

معنوی آرائش سے عاری ہی کیوں نہ ہو............مزید برآں شاعری کی ضرورت اور شاعری کی ماہیت کو واضح کیا اور پھر انھوں نے نہ صرف ان اصولوں کی وضاحت کی بلکہ خود بھی انھیں کے مطابق شاعری کی۔

حالی نے شاعری میں جو اصول اپنائے، ہر چند لوگوں نے ان پر بہت اعتراض کیے لیکن چونکہ ان کی شاعری کی تہ میں ایک جذبۂ ایک خلوص اور ایک روح کار فرما تھی لہٰذا انھوں نے مخالفین کی پروا کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھا۔ اور بقول صالحہ عابد حسین:

> ''زمانے نے ثابت کر دیا کہ انھوں نے جو راستہ اپنے لیے اختیار کیا تھا وہی صحیح اور سیدھا راستہ تھا اور ان کے مخالفین ایک فرسودہ روایت کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے تھے''۔ ❶

آزاد اور حالی نے نئے انداز کی نظمیں لکھنے کا جو بیڑا اُٹھایا تھا اس کی غایت یہ تھی کہ اُردو کی شعری روایات کے ذخیرے سے فلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ قوم کا کام لیا جائے، حالی نے اس سلسلے میں زیادہ معنی خیز اور اثرات کے اعتبار سے زیادہ دُور رس کام لیا ہے۔

بہر کیف مولانا حالی کی نظموں سے دورِ جدید کی شاعرانہ خصوصیات اور خطہ لاہور سے اُبھرنے والے نئے دبستانِ شاعری کی خوبیوں اور عام میلانات و رجحانات کا بھی کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ مولانا حالی نے صرف نظم کے معاملے میں ہی اجتہاد سے کام لیا بلکہ انھوں نے مروجہ غزل کو بھی قدیم روش سے ہٹا کر نئی جہت دی۔ اس طرح اُردو شاعری کے دھارے کو موڑنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے اور یہ ایک ایسا احسان ہے جسے اُردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔

سورج نرائن مہر (۱۸۵۹ء۔ ۱۹۳۳ء)

سورج نرائن مہر دہلی میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی کے ایک معزز کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے لاہور کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا تھا۔ ان کے ابتدائی حالات اور کوائف زندگی واضح طور پر معلوم نہیں ہیں البتہ ان کے پہلے مجموعہ کلام ''کلامِ مہر'' کے دیباچے سے اتنا ضرور واضح ہے کہ آپ ۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور انھیں زمانہ طالب علمی ہی میں نہ صرف شعر و سخن سے والہانہ لگاؤ تھا بلکہ اس میں خاص دستگاہ بھی حاصل کر لی تھی اور لاہور و دہلی کے مشاعروں میں برابر

---

❶ یادگارِ حالی، صالحہ عابد حسین، ص ۲۱۷

شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کرنل ہالرائیڈ سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر تھے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کرنے کے بعد کرنل ہالرائیڈ کے ایما سے سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازمت اختیار کرلی اور پہلے تو لاہور میں رہ کر درسی کتابوں کے رپورٹر کی حیثیت سے اور پھر ایک دراز عرصہ تک بطور انسپکٹر مدارس خدمات انجام دیں۔

آپ کی نظمیں رسالہ ''کائستھ مترّ'' دہلی، رسالہ ''زمانہ'' کان پور اور رسالہ ''سادھو'' لاہور کے علاوہ شمالی ہندوستان کے بیشتر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا کرتی تھیں اور مقبول عام تھیں۔ مہر کے مجموعہ کلام کا پہلا حصہ ۱۹۰۸ء میں اور دوسرا ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا لیکن اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں ان کی وفات ہوئی اور کوئی اور مجموعہ شائع نہ ہوا۔

مہر کو اُردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اور وہ شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ و شستہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کے کلام کا رنگ خاص ہے۔ وہ غزل شاذ و نادر ہی کہتے تھے اور طبیعت زیادہ تر نظم گوئی کی طرف مائل رہتی تھی۔ چنانچہ ''کلام مہر'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''نظم کا موازنہ مرصع اشعار اور مصرعات سے کرنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ جن زبانوں میں معیار موازنہ کا درجہ ایسا اسفل ہو جاتا ہے ان میں اصلی شاعری مفقود ہو کر محض لفاظی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ شعر میں پھڑکا دینے والا عنصر زبان ہے۔ چستی بندش اور طمطراق و شوکت الفاظ ایسی چیزیں ہیں کہ سن کر زبان سے بے اختیار آفرین نکلتی ہے۔ مضامین کی جدت و ندرت اور معانی کی سنجیدگی و متانت طبیعت میں ضرور اثر پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ اثر پھڑکا دینے والا نہیں۔ اُلٹا خاموشی اور حیرت پیدا کر دینے والا ہے۔ پھڑکا دینے والے اشعار آدمی ایک کان سے سنتا ہے اور دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ ان کا حال بعینہٖ لطائف و ظرائف کا سا ہے کہ آدمی سنتا ہے اور پھڑک جاتا ہے۔ لیکن طبع سامع پر نہ گہرا اثر ہوتا ہے نہ دیرپا۔ برعکس اس کے اگر شاعر کے مرقعے میں مکمل تصاویر ہیں تو ان کی تاثیر دیکھنے سے متعلق ہے۔ جو صورتیں یہاں نظر سے گزرتی ہیں وہ آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہیں اور جو

صدائیں یہاں سننے میں آتی ہیں وہ برسوں تک کانوں میں گونجا کرتی ہیں"۔ ❶

اس سے صاف مترشح ہے کہ اُردو شاعری میں روایتی نازک خیالی' معنی آفرینی' تکلف اور تصنع کے قائل نہ تھے بلکہ انگریزی ادب کی طرف رجحان کے باعث سادہ اور نیچرل شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں کہ:

"انگریزی تعلیم نے جہاں ملک میں اور انقلابات عظیمہ پیدا کیے ہیں' وہاں مذاق سخن میں بھی بڑی بھاری تبدیلی کردی ہے۔ اب ارباب مذاق صرف غزل کے ہی دلدادہ نہیں بلکہ نیچر کی تصویریں بھی کھینچنے لگے ہیں .... جس میں پھڑکا دینے والا عنصر تو کم ہے اور طبیعت پر گہرا اثر کرنے والا حصہ زیادہ"۔ (۲)

مہر نے فطرت کے موضوعات اور اخلاقی نظموں کے علاوہ ایسے عنوانات پر بھی طبع آزمائی کی ہے جن سے عارفانہ اور صوفیانہ رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے جیسے اُن کی نظمیں' سائیں کی صدا' آرزوئے دیدار' شان الٰہی' تو ہی تو ہے' تیرا نشاں کہاں ہے' ہمہ اوست' دل صافی' انساں اور دل انساں' اعمال نیک' تقدیر' قناعت' تسلیم ورضا' صبروتحمل' اخلاص' یادحق' رحمت حق' طلب حق' خود فراموشی' رموز عشق' رموز عرفان اور وصال وغیرہ اسی رنگ کی حامل ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی کچھ غلط نہ ہوگا کہ یہ ان کا غالب رنگ ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو ان کا سنسکرت زبان وادب کا گہرا مطالعہ تھا جس میں ترک لذات اور بیراگ کی تعلیمات پر زور ہے اور دوسرے ان کی عامل اور رشی بزرگوں سے والہانہ عقیدت تھی۔

سورج نرائن مہر ایک حقیقت نگار شاعر تھے۔ انھوں نے اُردو شاعری میں تمام مروج اصناف سخن یعنی غزل' قصیدہ' مثنوی' مرثیہ' قطعہ' رباعی' ترکیب بند اور ترجیع بند میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں شعریت ضرور کم ہو جاتی ہے لیکن کلام زبان ومحاورہ وروز مرہ کا منتخب ذخیرہ اور خلوص کا آئینہ ہے جبکہ طرز بیان نہایت سادہ' صاف ستھرا اور رواں ہے۔

---

❶ کلام مہر (دیباچہ) منشی سورج نرائن مہر' مطبوعہ مطبع مفید عام لاہور ۱۹۰۸ء ص ۱۲'۱۳

❷ ایضاً' ص ۱۴

نمونہ کلام:

غلط ہے کہ دیدار کی آرزو ہے
غلط ہے کہ مجھ کو تری جستجو ہے
ترا جلوہ اے جلوہ گر کُو بہ کُو ہے
مصوری ہے ہر وقت تُو روبرو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے
ہر اک گُل میں بُو ہو کے تُو ہی بسا ہے
صدا ہائے بلبل میں تیری نوا ہے
چمن فیض قدرت سے تیرے ہرا ہے
بہار گلستان میں جلوہ ترا ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

(تو ہی تو ہے) ❶

✿✿

شرم برہنگی تھی شجر کو بہار سے
دست دعا بلند ہوئے شاخسار سے
یا رب ہمیں بچائیو اس ننگ و عار سے
اور تُو نے ان کو لادیا برگ و بار سے
پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

(باران رحمت) ❷

✿✿

دیکھا ہے مہر میں نے دنیا کا کارخانہ
سیر و سفر کیا ہے چھانا ہے سب زمانہ

---

❶ کلام مہر، ص ۱۵۹

❷ کلام مہر، ص ۱۷۳

اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانہ
خارِ وطن کو گل سے خوشتر ہے سب نے مانا
اہلِ وطن سے پوچھو تم خوبیاں وطن کی
بلبل ہی جانتی ہے آزادیاں چمن کی
کھاؤ ہوا وطن کی کچھ اور ہی مزا ہے
پانی پیو وطن کا امرت سے بھی سوا ہے
خاکِ وطن نہ کہیے اکسیر و کیمیا ہے
رُتبہ تری زمین کا کچھ اے وطن جدا ہے
جو شے غرض یہاں ہے دُنیا سے ہے نرالی
نامِ وطن نے اس میں تازہ ہے جان ڈالی

(حبِ وطن) [1]

○○

آئینہ دیکھنے کا شوق ہے وہ
اس کا ہر شخص مبتلا دیکھا
شوق ہے عام جامہ زیبی کا
جس کو دیکھا ہے خود نما دیکھا
دیکھا سب نے ہی اپنا جسم و لباس
لیک یہ طرفہ ماجرا دیکھا
دیکھنے سے ہوتی نہیں سیری
روز گو چہرہ بارہا دیکھا
اپنی صورت کے سب ہیں شیدائی
سب کو اپنا فریفتہ دیکھا

---

[1] کلام مہر، ص ۱۹۰

صورت ظاہری مگر اے دوست
جس نے دیکھی ہے اس نے کیا دیکھا
دیکھنے والا اس کو کہتے ہیں
جس نے باطن بھی برملا دیکھا
دل کا آئینہ پاس ہے سب کے
صاف ایسا کم آئینہ دیکھا
مجھ سے پوچھو تو وہ ہے نیک نصیب
جس نے یہ آئینہ ذرا دیکھا
(آئینہ دیکھا)❶

○○

ہے جہانِ گزراں خواب کا بالکل نقشا
دیدہ حضرت انساں کے لیے دھوکا سا
شادمانی کا تبسم ہے کہ آنسو کا غم
یہ بھی جھوٹا ہے جو میری سنو وہ بھی جھوٹا ہے
یاں ہے جو چیز وہ کچھ بھی نہیں جز نام خدا
نام و شہرت کے یہ چمکارے بھی بالکل جھوٹے
مثل نیرنگِ شفق ہم نے بدلتے دیکھے
عشق و اُمید ہے کیا حُسن سمجھتے ہو کسے
یہ وہ ہیں پھول چنے جائیں جو قبروں کے لیے
یاں ہے جو نُور وہ قائم نہیں جز نُور خدا

---

❶ کلام مہر، ص ۱۹۰

بحر طوفانی دنیا میں ہیں ہم سرگشتہ
موج غم میں ہے جہاز اپنا تھپیڑے کھاتا
روشنی عقل کی ہے وہم کا یا چمکارا
ان سے طوفاں کے سوا ہم نے نہ کچھ بھی دیکھا

یاں ہے جو شے وہ مسکن نہیں جز ذات خدا

(خواب دیکھا) ❶

(ولیم ورڈز ورتھ کی نظم All The Word's A Fleeting Show کا منظوم ترجمہ)

برجموہن دتاتریہ کیفی (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۵ء)

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اُردو کے بلند پایہ ادیب، جید انشا پرداز، کامیاب مصنف اور نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی طرح خلوص کے ساتھ اُردو زبان وادب کی خدمت میں گزار دی بلکہ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

"پنجاب میں وہی بابائے اُردو کے دست و باز و تھے"۔ ❷

آپ ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ❸۔ فارسی اور اُردو کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر واقع بازار سیتارام کے قریب ایک مکتب میں حاصل کی لیکن ان کی تکمیل اپنے نانا سے کی، جو فارسی کے جید فاضل تھے۔ اس کے بعد انگریزی کی تعلیم سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں ہوئی۔ اُردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ انھوں نے عربی، سنسکرت اور ہندی میں بھی مہارت تامہ بہم پہنچائی تھی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو یورپ کے سفر اور وہاں کے طور طریقے، خیالات اور حالات جاننے کا موقع بھی ملا ❹ ایک عرصہ کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ اس ملازمت کے بعد کچھ عرصہ تک ریاست چینی میں کلکٹر رہے۔ تقسیم سے پہلے آپ کا قیام زیادہ تر لاہور میں رہتا تھا جہاں آپ کے صاحبزادے پنڈت پیارے لال دتاتریہ انگریزی روزنامہ "ٹریبون"

---

❶ کلام مہر، ص ۳۹۴

❷ وے صورتیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۳۲۸

❸ کیفیات واردات کیفی (مجموعہ کلام پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی) سوانحی حالات از منصور احمد مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۴۲ء ص ۹

❹ عہد جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، عبدالشکور، مطبوعہ کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۳ء ص ۹۶

کے ایڈیٹر تھے۔ زمانہ قیام لاہور میں آپ برابر ادب اور فن کی خدمت کرتے رہے۔ آپ کا درجہ نہ صرف اُردو زبان کے محقق کے طور پر بہت بلند ہے بلکہ آپ دیگر زبانوں میں بھی خاص درک رکھتے تھے۔ ان کی نثر کی کتابوں میں سے "منشورات" اور "کیفیہ" آج بھی اُردو ادب کے طلبہ کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے دوران میں جب اُردو تحریک نے سیاسی رنگ لے لیا تو آپ نے نہ صرف انجمن ترقی اُردو پنجاب کی قیادت قبول فرمائی بلکہ اُردو کے حق میں ایسے وقت' جب پنجاب کے عام ہندو اخبارات اُردو میں نکلنے کے باوجود اُردو زبان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف تھے' دن رات کام کرتے رہے' [1] اس کے علاوہ کیفی کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ مشہور تذکرہ "خمخانۂ جاوید" کی تالیف رُک گئی تھی' انھوں نے جہاں تک ہو سکا اس کام کو آگے بڑھایا۔ [2] قیام پاکستان کے بعد آپ دہلی چلے گئے جہاں انجمن ترقی اُردو (ہند) میں مولوی عبدالحق کے شریکِ کار ہوئے۔ انجمن میں مولوی عبدالحق کے بعد آپ ہی کا درجہ تھا۔ [3] آخرکار اُردو کی خدمت کرتے کرتے یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو سفر کرتے ہوئے قصبہ غازی آباد میں انتقال فرمایا۔ نثری تصانیف کے علاوہ آپ کا مجموعہ کلام "واردات" کے نام سے طبع ہوا ہے۔

پنڈت کیفی کو شعروسخن کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلے پہل زمانے کے عام رواج کے مطابق غزل کہتے تھے مگر انقلاب زمانہ سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوئے یہاں تک کہ نظم گوئی میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ آپ ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کے کئی دور دیکھے ہیں۔ کئی کہنہ مشق شعراء کے علاوہ آپ میر مہدی حسین مجروح کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوئے تھے۔ سرسید احمد خان' مولانا محمد حسین آزاد' مولانا شبلی نعمانی اور مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ کے خاص نیاز مند تھے اور مولانا حالی سے تو اصلاح لینے کا بھی شرف حاصل ہے۔ [4]

اس کے علاوہ ہم عصر شعراء میں سے مرزا ارشد گورگانی' چکبست' مولانا غلام قادر گرامی' وحشت' صفی'

---

[1] وے صورتیں الٰہی' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' ص ۳۲۸

[2] چند بڑے ادیب (مقالہ) عابد علی عابد' نقوش لاہور نمبر' ص ۱۰۷۱

[3] ادیب اور مصنف (مقالہ) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی' نقوش لاہور نمبر' ص ۹۴۱

[4] جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) ص ۳۲۰

ظریف' آرزو' سراج' قدیر' آزاد انصاری' حسرت موہانی' آغا شاعر قزلباش' مولانا تاجور' ناظر' نیرنگ اور علامہ اقبال سے خاص روابط تھے۔ ❶ غرض یوں سمجھنا چاہیے کہ پنڈت کیفی ایک مجسم روایت اور ایک انجمن تھے۔

پنڈت کیفی کی توجہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں' نظم کی طرف زیادہ مرکوز رہی ہے لیکن غزل ہو یا نظم ان کے یہاں ایک تو تغزل کا رنگ ہر جگہ غالب ہے دوسرے فکر و خیال کے اعتبار سے ''ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کو شیر و شکر کرنا عام طور پر ان کے مدِ نظر رہا ہے ❷ ابتدائی کلام میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین ہیں جن میں رواں بیان و اسلوب کے علاوہ روز مرّہ اور محاورے کا لطف اور درد و اثر ہے۔ انھوں نے اپنی نیچرل شاعری میں حسنِ حقیقی کی کارفرمائی کے مضامین کی بڑی خوبصورتی سے مرقع کاری کی ہے۔ اس کے علاوہ اصلاح قوم' وطن پرستی اور ہنگامی و واقعاتی منظومات میں بھی فکر و خیال کی بلندی اور زبان و بیان کی ایسی لطافتیں موجود ہیں کہ پڑھنے والا ان کی قادر الکلامی کا قائل ہو جاتا ہے۔ کیفی نے ماہر لسانیات ہونے کی بنا پر اپنے کلام میں جا بجا فارسی' عربی' سنسکرت اور ہندی کے الفاظ' اصطلاحات اور محاورات بھی استعمال کیے ہیں مگر اس خوبی کے ساتھ کہ شعریت برقرار رہتی ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر کیفی کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے' جس کے متعلق مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کیفی کے مجموعہ کلام ''کیفیات واردات کیفی'' کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ:

''میں بیان کی قدرت و تازگی اور تخیل کی رفعت و پاکیزگی کا نمونہ سمجھتا ہوں۔'' ❸

کہا بخشی ہے مجھ کو ہجر کی تم نے مصیبت کیا
تو فرمایا کہ ناداں وصل کی ہے ہجر لذت کیا

کہا یہ دل سی شے کیا مفت اُڑا لے جاؤ گے اس کو
تو فرمایا یہ جنسِ بے بہا ہے اس کی قیمت کیا

---

❶ ایضاً۔ ص ۳۲۰

❷ ایضاً' ص ۳۲۹

❸ کیفیات واردات کیفی (تعارف) مولوی سید ہاشمی فرید آبادی' مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۴۱ء ص ۵

یہ کی عرض آپ پر مرتے ہیں ہم اور آپ غیروں پر

ہوا ارشاد اے ناداں محبت میں رقابت کیا

کہا اب ہجر میں جان لب پر آئی ہے تو فرمایا

جو ہر دم دل میں ہو کیا اس کا وصل اور اس کی فرقت کیا

کہا مرتا ہے تیرے عشق میں کیفی تو فرمایا

میں کیا جانوں کسے کہتے ہیں اُلفت اور محبت کیا

اور کیفی کی نظموں طلوع سحر، حسن کی دُنیا اور باغ دل سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

تھا دُور ایک منزل ابھی لشکرِ سحر

سرہنگِ شب نے بھانپ کے دنیا کو دی خبر

شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھ کر

ان سے صبا نے سن کے خبر کی وہ مشتہر

سرگوشیاں تھیں غنچوں میں "ہے کس کا انتظار"؟

جو رایتِ شفق ہوا مشرق سے آشکار

چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا

غنچوں کے دل کو فرطِ طرب سے کھلا دیا

بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا

شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا

غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے

انگڑائی لے کے سرد بھی جیسے ہوئے کھڑے!

رنگِ شفق سے تھا جو افق ملک زرنگار
یکمشت گل نے کیسۂ زر کر دیا نثار
دلکش عروجِ باغ کا تھا حسن اور نکھار
صدقے ہزار جان سے تھی عندلیب زار

منہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے
سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

(طلوعِ سحر) ❶

✿✿

دیر و حرم میں کس لیے بھٹکا کرے کوئی
خالق کو خلق ہی میں نہ دیکھا کرے کوئی

حسنِ ازل کی ہر کہیں ظاہر ہے آب و تاب
ہاں شرط ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی

قطرے میں بحر ذرّے میں خورشید دیکھ لے
یہ آنکھ یہ نگاہ تو پیدا کرے کوئی

یہ تیرہ خاکداں بنے خلد کا سماں
چشمِ دروں کو گرم تماشا کرے کوئی

(حُسن کی دنیا) ❷

✿✿

---

❶ کیفیات واردات کیفی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ص ۲۵۰

❷ ایضاً، ص ۱۳۰

تمیزِ زلف و عارض، خال و ابرو کچھ نہیں رہتی

فروغِ حُسن کی تاثیر و برکت ایسی ہوتی ہے

نظر آتا ہے نورِ روئے جاناں اس کو ہر شے میں

نگاہِ محوِ نظارہ کی حیرت ایسی ہوتی ہے

رقابت اور غیریت کا بوجھ اس سے نہیں اُٹھتا

خیالِ حسنِ جاناں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے

خبر رکھتے ہیں کل کی آپ سے وہ بے خبر ہو کر

مئے عرفاں کے سرمستوں کی غفلت ایسی ہوتی ہے

نہ دل ہو طالبِ وصل اور نہ شوقِ دید آنکھوں کو

اسی کو عشق کہتے ہیں، محبت ایسی ہوتی ہے

اگر اس باغِ دل کا تو کبھی محوِ تماشا ہو

تو علمِ ذات حاصل کرکے خود اپنے پہ شیدا ہو •

• (باغِ دل)

○○

میاں شاہ دین ہمایوں (۱۸۶۸ء-۱۹۱۸ء)

میاں محمد شاہ دین نام' ہمایوں تخلص' ۲راپریل ۱۸۶۸ء کو باغبانپورہ لاہور کے ایک باوقار اور ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ شاہان مغلیہ کے وقت سے شہرہ آفاق شالامار باغ کے انتظامی امور کی نگہبانی اسی خاندان کے سپرد رہی تھی۔ آپ کے والد میاں نظام الدین اپنے وقت کے ایک فاضل بزرگ تھے اور دادا میاں قادر بخش فارسی' عربی کے جید عالم اور صاحب ذوق انسان تھے۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خالصہ شاہی خاندان کے نوجوانوں کے اتالیق تھے۔ شعرو سخن کے لیے بھی طبیعت نہایت موزوں پائی تھی اور نادر تخلص کرتے تھے۔

ہمایوں نے ابتدائی تعلیم باغبانپورہ میں حاصل کی۔ آپ فطری طور پر بڑے فطین واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ صرف چھے سال کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اوّل رہے، انٹرنس میں انگریزی کے مضمون میں پنجاب بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور بی اے میں یونیورسٹی میں دوم رہے۔ ۱۸۸۷ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے لاہور واپس آئے۔ ابتدا میں کچھ عرصہ تک پریکٹس کی پھر پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رُکن بن گئے اور ازاں بعد لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس مقرر ہوئے جہاں چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ تک پہنچے۔

مطالعہ کتاب ہمایوں کا محبوب مشغلہ تھا جس میں آخر عمر تک انہماک جاری رہا، بچپن کی راتیں اور جوانی کے دن مطالعہ میں گزرے۔ دُنیا بھر کی سیر کی لیکن کتابیں ہی رفیق زندگی رہیں۔ یہ ذوق یہاں تک بڑھا کہ دماغ دل کا ہم نوا بن گیا اور روز وشب دنیا ومافیہا کے مظاہر میں مستغرق رہنے لگے۔ وہ اگرچہ ایک زبردست دل ودماغ لے کر آئے تھے لیکن جسم کمزور اور منحنی تھا جو اس مشقت کا متحمل نہ ہو سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا عمر طبعی پانے سے برسوں پہلے نقاہت کا شکار ہو کر ۲رجولائی ۱۹۱۸ء کو عالم جاودانی کو رحلت کر گئے۔ علامہ اقبال نے اس سانحہ عظیم سے متاثر ہو کر تاریخ وفات کہی:

در گلستان دہر ہمایوں نکتہ سنج — آمد مثال شبنم وچوں بوئے گل رمید

می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت — علامہ فصیح زہر چار سو شنید

۴ x ۳۳۴ = ۱۳۳۶ھ

مطالعہ کتب اور فرائضِ منصبی کے علاوہ جسٹس شاہ دین ہمایوں کی تمام عمر اصلاحِ قوم کی عملی سرگرمیوں میں گزری۔ ہر چند دیکھنے میں آپ دھان پان تھے تاہم بڑے مستعد، بلند ہمت اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ پنجاب کو علمی و ادبی لحاظ سے اُبھارنے میں انھوں نے انتہائی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اس امر کا احساس کر کے کہ مسلمان میدانِ تعلیم میں اپنی ہمسایہ قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور جدید علوم و فنون میں بے بہرہ ہونے کے باعث ضروریاتِ زمانہ سے مطلق آگاہ نہیں۔ انھوں نے لاہور میں ایک انجمن ''انجمن نوجوانانِ اسلام''❶ (Young Men's Mohammadan Association) کی بنیاڈالی۔ جس میں ہر ہفتہ مختلف النوع دلچسپ اور سود مند موضوعات پر بحث و تمحیص کی جاتی تھی۔ خلف الرشید جسٹس شاہ دین ہمایوں ایڈیٹر رسالہ ''ہمایوں'' میاں بشیر احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''پنجاب کے بعض نامور مسلمانوں نے پہلے پہل اسی انجمن میں فن تقریر و تحریر سیکھا اور ان کی اظہار خیالات کی قوت بھی یہیں نشوونما ہوئی''۔❷

علاوہ ازیں وہ تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے اور چونکہ پنجاب یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ میں وہ ایک خاص اہل الرائے سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے جہاں ان کی رایوں سے صوبہ کی تعلیم پر معتدبہ اثر پڑا وہاں عورتیں بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوئیں۔

آپ سر سید احمد خان اور ان کی مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی طرف راغب کرنے کی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انگلستان سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے ''محمڈن کانفرنس'' میں مسلمانانِ پنجاب کی تعلیمی حالت پر ایک معنی خیز اور بیدار کن لیکچر دیا۔ سر سید احمد خاں لیکچر کی عمدگی اور مقرر کی سنجیدگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے آئندہ سال انھیں، جبکہ ان کی عمر ابھی چھبیس سال

---

❶ ''یاد ہمایوں'' (مضمون مشتمل بر حالات زندگی جسٹس شاہ دین ہمایوں) میاں بشیر احمد، جذبات ہمایوں (مجموعہ کلام ہمایوں) مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور۔ (س۔ن) ص ۱۳

❷ یاد ہمایوں، میاں بشیر احمد، ص ۱۴

کی تھی، مَدُن کانفرنس کی صدارت پیش کی۔ [1] اس طرح ان کی اُردو تقریروں اور سودمند مشوروں سے نہ صرف پنجاب بلکہ علی گڑھ والوں پر بھی ان کی علم و دانش اور قوت بیان کا سکہ بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خان کو ان سے اور ان کو سرسید سے ایک خاص اُنس پیدا ہو گیا۔ آئندہ کوئی اہم کام نہ ہوتا تھا جس میں ان کے موجود ہوتے ہوئے سرسید ان سے مشورہ نہ لیتے تھے۔ [2] ۱۹۱۳ء میں وہ دوبارہ کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے [3] اور ان کا خطبہ صدارت بلحاظ اپنی وضاحت، جدّت خیالات اور نوعیت تجاویز، پسندیدہ خاص و عام ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے اُردو شاعری کی اصلاح اور تعلیم نسواں کی اہمیت پر بہت زور دیا اور قوم کی فلاح و بہبود پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے قوم کی توجہ کو اس جانب مبذول کیا۔

مختصر یہ کہ جسٹس شاہ دین ہمایوں کا دل قومی اور ملی جذبات سے پُر تھا۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی قومی بھلائی کے کاموں میں تمام کی۔ ان کی انہی قومی خدمات اور تعلیمی مساعی کے پیش نظر شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک نظم میں جو انھیں کے نام سے معنون کی گئی ہے اور ''بانگ درا'' کے صفحات کی زینت ہے، زبردست خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے:

اے ہمایوں! زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی!

گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبع بلند

کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اِک مشتِ خاکستر میں تھا

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

---

[1] ایضاً، ص ۱۵

[2] یادِ ہمایوں، میاں بشیر احمد، ص ۱۵

[3] ایضاً، ص ۱۶

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی [1]

ہمایوں فطرت کی طرف سے طبع موزوں اور ذوقِ سخن لے کر آئے تھے۔ چنانچہ کم عمری میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں وہ بھی صرف رہی صنف غزل میں ہی طبع آزمائی کرتے اور مشاعروں میں بھی غزل ہی پڑھتے۔ جب ۱۸۸۷ء میں انگلستان روانہ ہوئے تو غزلیات پر مشتمل ایک خاصا دیوان اپنے بھائی کے پاس بطورِ امانت رکھ گئے۔ انگلستان سے واپس آنے پر بھائی نے امانت پیش کی لیکن ادھر چونکہ آپ نے انگلستان میں قیام کے دوران میں انگریزی شعروادب کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کیا تھا اور انگریزی شاعری کے مذاق، خیالات اور موضوعات سے واقف ہو چکے تھے جس سے آپ میں وسعتِ نظری پیدا ہو چکی تھی چنانچہ آپ اُردو شاعری میں بھی رجحانات کی تبدیلی کے دل سے آرزومند تھے اس لیے غزلیات کا دیوان حقیر معلوم ہوا کہ بقول میاں بشیر احمد:

> ''عشقیہ غزلیات کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھ کر طبیعت گھبرائی اور چاہا کہ اسے تلف کر دیں۔ بھائی نے روکا اور کہا کہ اس میں تمھارے ایامِ شباب کے اچھوتے پن کی نشانیاں ہیں جو اِک اپنی سی دلکش ادا رکھتی ہیں۔ انھیں برباد نہ کرو۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور یہ کہہ کر اس ''دفترِ بے معنی'' کو جلا دیا کہ یہ خیالات تضیعِ اوقات کا باعث تھے، مجھے ان کا زندہ رکھنا کسی طرح گوارا نہیں۔'' [2]

چنانچہ روایتی شاعری سے الگ ہو کر شعر میں صحیح جذبات کی ترجمانی شروع کر دی۔ انھوں نے اس دور میں یعنی کم و بیش ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک جو نظمیں کہیں مثلاً سیرِ چمن، شالا مار باغ کشمیر، شعرائے قوم سے خطاب، زمانہ، آزادگی، عدن سے خطاب وغیرہ ان کا وہی رنگ اور آہنگ ہے جس کی ابتدا مولانا آزاد اور مولانا حالی لاہور میں کر چکے تھے اور جو اس وقت ملک کے طول و عرض میں پھیل رہا تھا۔ جیسے ''شعرائے قوم سے خطاب'' میں ہمیں وہ مولانا حالی کی ہمنوائی کرتے نظر آتے ہیں:

---

[1] بانگِ درا، اقبال، ص ۲۵۴

[2] ''یادِ ہمایوں''، میاں بشیر احمد، ص ۹

اے شاعرانِ قوم! زمانہ بدل گیا
پر مشکِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا
پیٹو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو
بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا
اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

....

اے نوجوانو! آؤ کہ کچھ کر دکھائیں ہم
طرزِ قدیم شعر و سخن کو مٹائیں ہم
لفظوں کا سحر چھوڑ کے ہوں معنی آفریں
فکرِ رسا کے خوب کرشمے دکھائیں ہم
اِک طرزِ دلفریب کی بنیاد ڈال دیں
اور دل سے محو کر دیں وہ اگلی ادائیں ہم ⓿

ہمایوں کی شاعری بامقصد اور اصلاحِ قوم و معاشرہ کی شاعری ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں بعض فنی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن انھوں نے جس جذبہ اور لگن کے تحت شاعری کی ہے اس کا پلہ عیوبِ کلام پر بہت بھاری ہے۔ ان کی منظومات سے صاف طور پر واضح ہے کہ ان کے دل میں ملک اور قوم کی فلاح کے لیے ایک جذبہ ایک تڑپ اور ایک لگن موجزن ہے بقول مولانا تاجور نجیب آبادی:

"(حضرت ہمایوں) ان چند تلامیذ الرحمٰن میں سے ہیں جن کی اعجاز کاریاں بھٹکی ہوئی قوم اور گم کردہ راہ کارواں کے لیے چراغِ ہدایت و خضرِ راہ ہیں۔ وہ ایک جادۂ عمل پیش کرتے ہیں جس پر چل کر کوئی قوم منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی ہے' وہ ایک دلسوز ناصح' ایک بے باک نکتہ چیں، ایک اخلاق آموز ہادی کی حیثیت سے سرشارِ غفلت قوم کو اس کی بے حسی و تن

⓿ جذباتِ ہمایوں' جسٹس شاہ دین ہمایوں' ص ۸۹

آسانی کے ہولناک انجام پر متنبہ کرتے ہوئے اسے زندہ رہنے کے لیے ایسے گراں قدر اصول بتاتے ہیں جن پر عمل درآمد کرکے وہ زندگی کی دوڑ میں زندہ اقوام کے دوش بدوش رہ سکتی ہے"۔ ❶

ہمایوں کے کلام میں جذبات نگاری کے مرقعوں کے علاوہ مظاہر فطرت کی بھی بڑی خوبصورت اور دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ یہ تصویریں دُور از کار تخیل کے بجائے محاکات سے رنگیں ہوتی ہیں۔ جذبات نگاری ہو یا منظر آرائی' بامقصد شاعری ہو یا فلسفہ آفرینی' بہر طور ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت طرفگیِ خیال اور جدت بیان ہے۔ اس معاملے میں ان کی قوت مشاہدہ اتنی قوی اور گہری ہے کہ وہ معمولی سے معمولی چیز بھی کام کی باتیں' نیا پن اور نیا انداز دیکھ لیتے ہیں۔ ذیل میں ایک مثال ان کی فطری شاعری کی ملاحظہ کیجیے:

اے باغ ! لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو!
اور عظمتِ گزشتہ کی اِک یادگار ہو!
کیا تم ہی زندہ ناموں کے باعث ہو نامور
کیا تم ہی مردہ سلطنتوں کے مزار ہو؟
کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں رازداروں کے پیچ
تم اِک کلیدِ قفلِ درِ روزگار ہو!
ہاں کچھ بتاؤ اگلے زمانے کی کیفیت
تم واقعات دہر کے نامہ نگار ہو!
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں
کس بزمِ سربہ مہر کے تم رازدار ہو!
فوارہ کی زبان سے کہو کچھ تو اپنا حال
کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو؟

---

❶ کلام ہمایوں (تبصرہ) مولانا تاجور نجیب آبادی، جذبات ہمایوں، ص ۲۱

اور تم بتاؤ پانی کی نہرو! کہ کس لیے

مضطر ہو، پیچ کھاتی ہو اور بیقرار ہو؟

کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمھیں؟

دل دادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو؟

(شالا مار باغ کشمیر) ❶

ہمایوں غزلیں بھی کہتے تھے لیکن اس میں جدید رنگ کے حامل تھے۔ چند شعروں پر مشتمل ایک اقتباس دیکھیے:

ہم نوا! لطفِ فغانِ غائبانہ اور ہے

اور چمن میں شاخِ گل پر چہچہانا اور ہے

جنگِ عالمگیر نے دُنیا کی کایا دی پلٹ

مہر و ماہ کہتے ہیں "یہ دورِ زمانہ اور ہے"

نوجوان اقوام کی چتون بدل جائے نہ کیوں

زالِ دُنیا کی ادائے دلبرانہ اور ہے

ہے یہ کشت وخونِ یورپ! تیرے عصیاں کی سزا

یا سمندِ ناز پر اِک تازیانہ اور ہے

اے ہمایوں! چشمِ ظاہر بیں سے تُو اس کو نہ دیکھ

جنگِ عالم میں نہاں کوئی بہانہ اور ہے ❷

خوشی محمد ناظر (۱۸۶۹ء۔۱۹۴۴ء)

خوشی محمد نام، ناظر تخلص، ۱۸۶۹ء ہریا والا ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک با اثر زمیندار گھرانے میں

---

❶ جذباتِ ہمایوں، ص ۸۱

❷ ایضاً ص ۹۶

پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری مولا داد خان تھا۔ ناظر نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسے اور ثانوی تعلیم گجرات میں حاصل کی۔ ذہین اتنے تھے کہ مروجہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے حصول کے دوران میں ہی اپنے گاؤں کے فارسی مکتب میں بھی تعلیم پاتے رہے اور فارسی درسی سلسلہ کی تمام کتابیں بھی پڑھیں اور میٹرک کا امتحان دیا تو پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر رہے۔ ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے بی۔اے پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے نہ صرف فارسی اور انگریزی میں آنرز حاصل کیا بلکہ تمام مسلمان طلبہ میں اول رہنے پر طلائی تمغہ اور کالج میں اول رہنے پر ایک مزید طلائی تمغہ حاصل کیا۔

ناظر کو بچپن ہی سے شعر وسخن سے بڑی رغبت تھی۔ ابتدا میں شغلِ شعر صرف فارسی میں کرتے تھے۔ آپ نے پہلی نظم ۱۸۸۱ء میں حضرت غوث الاعظمؒ کی مدح میں لکھی تھی تو اس وقت آپ کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ بچپن میں فارسی نظموں کے علاوہ چند فارسی غزلیں بھی کہیں لیکن ثانوی تعلیم کے زمانے میں ہی تذکرۃ الشعراء "آب حیات" اور بعض شعرائے اُردو کے کلیات کے مطالعے نے ان کو اُردو میں شعر کہنے کی طرف مائل کر دیا۔ مگر آپ کی شاعری کا اصل زمانہ علی گڑھ کے قیام سے شروع ہوتا ہے جہاں آپ نے سر سید احمد خاں اور پروفیسر آرنلڈ کی ادبی صحبتوں اور کالج کی علم پرور فضا میں رہ کر نیچرل شاعری کے انداز میں نظمیں کہیں۔ آپ اپنے مجموعہ کلام "نغمۂ فردوس" کی جلد اول میں کالج کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "سر سید نیچرل شاعری کے حامی تھے اور مسٹر آرنلڈ نیچرل شاعری کی ترغیب وتربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے اور دو سال متواتر انعامی نظم کا اعلان فرماتے رہے۔ یہ دونوں انعام میں نے حاصل کیے اور یہ دونوں نظمیں یعنی "اخوت" اور "چہار موسم" اسی وقت شائع ہوگئی تھیں..........." ❶

آپ مولانا حالی اور ان کی اصلاح شاعری کی تحریک سے بہت متاثر تھے' چنانچہ شعر وسخن میں بھی ان ہی سے اصلاح لینا شروع کی اور تجیبِ اُستاد میں ان کی کتاب "مقدمہ شعر وشاعری" کے انداز

---

❶ نغمۂ فردوس' حصہ اول (تمہید) چودھری خوشی محمد ناظر' مطبوعہ انجمن ارباب ذوق لاکھپور' ۱۹۳۷ء' ص ۱۱

میں شاعری کے مختلف رائج الوقت نظریوں کے متعلق دو سو صفحات کی ضخامت سے زائد پر مشتمل ایک مقدمہ اور تبصرہ بھی لکھا [1] جو بوجوہ شائع نہ ہو سکا۔

یہ سرسید احمد خاں یا پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں کا اثر تھا یا مولانا حالی کی اصلاح شعر کا کہ آپ پر نیچرل شاعری کا ایسا رنگ چڑھا کہ تادم زیست اس کے شیدائی رہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں کو آپ مسلمانان پنجاب کے قومی دربار سے تعبیر کیا کرتے تھے [2]۔ چنانچہ آپ نے بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر انجمن کے بہت سے جلسوں میں بطور خاص شرکت کی اور قومی نقطہ نظر کی حامل نظمیں' درس عشق' خواتین سے خطاب' تصویر عبرت' سرود افلاک' آیات بینات' آنچہ مادر کار داریم اکثرے در کار نیست اور ''پیام حالی'' پڑھیں۔

ناظر کا شمار دبستان لاہور کے شعراء کے اس گروہ میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو شاعری کی روایت سے ہٹ کر شاعری کی اور مظاہر فطرت' مجالس' زندگی اور واردات زندگی کو اُردو شاعری میں داخل کیا۔ اگرچہ انھیں جملہ مروجہ اصناف شعر پر دسترس حاصل تھی اور بپاس خاطر احباب مولانا حالی کے نیچرل رنگ میں غزل بھی کہتے اور مشاعروں میں شریک بھی ہوتے رہے [3]۔ لیکن انھوں نے متداول غزل گوئی کو کبھی بنظر احسن نہیں دیکھا اور ان کا طبعی میلان نظم گوئی کی طرف ہی رہا۔ مناظر قدرت سے متعلق ان کی زیادہ تر نظمیں کشمیر کے قیام (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۶ء) کے دوران میں کہی گئی ہیں جن میں سے فردوس زمیں' پانی میں' لسوڑی' شمشاد' چنار' کانگڑی اور جوگی موضوع و خیال کے لحاظ سے اور فنی محاسن کے اعتبار سے بڑی خوبصورت اور دلکش نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے مظاہر قدرت کی جس طرح لطیف اور حسین مرقع کاری کی ہے اس سے نہ صرف شاعر کی فن شعر میں پختگی اور مشاقی ٹپکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مناظر قدرت کا اس قدر شیفتہ ہے کہ اس نے ان مناظر میں کھو کر شاعری کی ہے۔

ناظر کی شاعری پر اس وقت تک تبصرہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان کی معرکۃ الآرا نظم ''جوگی'' کا

---

[1] نغمہ' فردوس' حصہ اوّل (تمہید) چودھری خوشی محمد ناظر' ص ۶

[2] نغمہ' فردوس' حصہ اوّل (تمہید) چودھری خوشی محمد ناظر' ص ۱۱

[3] نغمہ' فردوس' حصہ اوّل (تمہید) چودھری خوشی محمد ناظر' ص ۱۴

ذکر نہ کیا جائے۔ اُردو کی اس کلاسیکی نظم کی جملہ خصوصیات پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں تاہم بقول مصنف ''جدید شعرائے اُردو'' اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ:

> ''یہ اُردو کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اس کی تخلیق کرتے وقت سچ مچ جوگ سادھ لیا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے یہ قلندرانہ ٹھاٹھ جو اس نظم کا طرہ امتیاز ہے کیوں کر پیدا ہو سکتا تھا۔ نظم کے خیالات' اس کے الفاظ اور خاص طور پر وہ بحر جس میں یہ کہی گئی ہے ایک دوسرے سے بہت ہی ہم آہنگ ہیں اور اسی ہم آہنگی کی بدولت اس میں بلا کی نغمگی و ترنم اور درد و اثر پیدا ہو گیا ہے''۔ ❶

اور بقول ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی:

> ''قبول عام کی سند حاصل کرنے میں حالی کا ''مسدس'' اقبال کا ''شکوہ'' اور ناظر کا ''جوگی'' کم و بیش برابر تھے''۔ ❷

اس نظم سے متعلق یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مہاراجہ کشمیر نے ''جوگی'' کی تعریف سنی تو پہلے تو یہ نظم خود شاعر (ناظر) کی زبان سے سنی اور بہت متاثر ہوئے اور پھر گاہے گاہے فقط یہ نظم سننے کے لیے اپنے دربار میں ایک خوش الحان میر مغنی ملازم رکھا گیا۔ ❸ ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے یہ نظم ترکیب بند میں کہی گئی ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل (نغمہ حقیقت) میں ۱۳۵ اشعار ہیں اور حصہ دوم (ترانہ وحدت) کل ۱۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ نظم کے عنوان اور موضوع کے تقاضے کے پیش نظر شاعر نے ہندی کے شیریں الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ نظم کا اسلوب سوال و جواب کا ہے جو اتنا دلکش ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نظم کے حصہ اوّل (نغمہ حقیقت) سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا

---

❶ جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) ص ۲۹۱

❷ چٹان' ہفت وار' ۲۸ جون ۱۹۷۱ء تبصرہ' ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

❸ نغمہ فردوس' حصہ اوّل (تمہید) ص ۱۳

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی

ہر وادی وادیِ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی

شمشاد و چنار ستار ہوئے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے مستانہ وہ تانیں اُڑانے لگے

اشجار بھی وجد میں آنے لگے گلزار بھی بزمِ سرور ہوا
سبزے نے بساط بسائی تھی اور بزمِ نشاط سجائی تھی

بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظرِ باغ و جہاں اور چال صبا کی مستانہ

اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرِ دیوانہ

✿✿

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

اک مست قلندر جوگی نے پربت پر ڈیرا ڈالا تھا
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی

سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا

تیکھے چتون سے جوگی نے تب ناظر سے یہ کلام کیا

(جوگی۔ نغمۂ حقیقت) ❶

ناظر نے مضامینِ فطرت کے علاوہ قومی اور اسلامی نظمیں بھی کہی ہیں جن کا وہی رنگ اور وہی انداز ہے جو مولانا آزاد اور مولانا حالی کا ہے۔ مولانا حالی کے اثر سے ان کے اسلوب بیان میں سلاست اور روانی پیدا ہو گئی ہے اور سادہ زبان میں احساسِ درد کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہمیں وہ بھی آزاد اور حالی کی طرح بدلے ہوئے حالات میں نئے ماحول سے ناطہ جوڑنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی اس تلقین میں کہیں بھی واعظانہ انداز نہیں ہے بلکہ وہ اس معاملے میں بڑے لطیف اشاروں اور کنایوں سے کام لے کر اپنے کلام میں مزید دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ناظر خطۂ پنجاب کے ان نامور شعراء میں سے ہیں جنھوں نے جدید اردو شاعری میں ایک حد تک مولانا حالی کی پیروی کرتے ہوئے اسے سرزمین پنجاب میں پھیلایا۔ ان کی شاعری عمدہ اسلوب بیان اور سادگی خیال کی بدولت بہت مقبول ہوئی۔ ان کے کلام میں وہی نیا رنگ اور آہنگ ہے جو جدید شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ چند مزید اقتباس ملاحظہ ہوں:

اللہ اللہ ہے کیا حسنِ چمن پانی میں

سبزہ و لالہ و گل، سرو و سمن پانی میں

کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں

کوہ پانی میں، چمن پانی میں، بن پانی میں

---

❶ نغمۂ فردوس حصہ اول ص ۴۴

اک طرف کوہ پہ ہے تختِ سلیماں قائم
اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں
(پانی میں) ❶

✿✿

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا
مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
مگر عالم میں اے گلزار کشمیر!
کوئی خلدِ بریں تجھ سا نہ دیکھا
چمن زاروں میں آب جو کا منظر
وہ موجِ نسیم کا لہراتا دیکھا
(فردوس زمین) ❷

✿✿

دورِ گردوں میں نیا اِک انقلاب آنے کو ہے
میکدہ میں محتسب مستِ شراب آنے کو ہے
تاج سلطانی پہ اب وہ ظلِ سبحانی نہیں
خسروی زیرِ لوائے انتخاب آنے کو ہے
ٹھن گئی سرمایہ داری اور مزدوری میں جنگ
دیکھیں کون اس معرکہ سے کامیاب آنے کو ہے
(انقلاب) ❸

✿✿

مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خاں ارضِ پنجاب کے وہ نابغۂ روزگار فرزند تھے جنھیں دھرتی کبھی کبھی جنم دیتی ہے۔ مولانا نصف صدی تک ایک صاحب طرز انشاپرداز بیباک صحافی' شعلہ بیان مقرر اور قادر الکلام شاعر کی

---

❶ نغمۂ فردوس (حصہ اوّل)' ص ۱۱۵
❷ نغمۂ فردوس (حصہ اوّل)' ص ۱۲۳
❸ ایضاً' ص ۱۳۹

حیثیت سے ملک کے اُفق پر چھائے رہے۔ اگرچہ ان کی زیادہ تر زندگی سیاسیات کی اُلجھنوں سے عبارت ہے اور اس سلسلے میں انھیں کئی مرتبہ قید اور نظر بندی کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن شعر وشاعری کے ذوق میں کسی مرحلے پر بھی خلل واقع نہیں ہوا۔ حسیات' نگارستان' بہارستان اور چمنستان ان کے شعری مجموعے ہیں جن میں نظموں کی تعداد دو ہزار سے کم نہیں۔ اگرچہ مولانا کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ان کی حیثیت عارضی ہے تاہم ان کی مستقل حیثیت کی نظموں کی تعداد بھی کسی بڑے شاعر کی نظموں سے کم نہیں۔

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں کوٹ مہرتھ (متصل ریلوے سٹیشن سوہدرہ تحصیل وزیر آباد) میں پیدا ہوئے۔ "ظفر علی" آپ کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۰ھ سال ولادت نکلتا ہے [1] ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان پٹیالہ سے پاس کیا۔ علی گڑھ سے بی۔اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک نواب محسن الملک کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا اور بعد میں ایک عرصہ تک حیدر آباد میں معقول مشاہرے پر مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران میں مولانا کے والدؒ مولانا سراج الدین خاں نے سرکاری ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد وزیر آباد سے متصل اپنے آبائی گاؤں کرم آباد سے ہفت روزہ اُردو اخبار "زمیندار" نکالنا شروع کیا تو مولانا نے اس کی ادارت سنبھال لی اور جلد ہی اخبار کا دفتر لاہور منتقل کر لیا اور اسے ہفتہ وار سے روزنامہ کر دیا۔ مولانا کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا کہ "زمیندار" ۱۹۱۲ء سے لے کر قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک برصغیر کی صحافت کے میدان میں پورے طور پر چھایا رہا۔ جب طرابلس و بلقان کے جنگ و جدل کے ہنگاموں نے برصغیر کے مسلمانوں میں ہیجان برپا کر دیا تو مولانا ظفر علی خاں کی جرأت و بے باکی نے قلم و زبان کی کاٹ کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کا نام ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجنے لگا۔ بعد ازاں تحریک خلافت' تحریک عدم تعاون و ترک موالات' قید و بند اور مختلف نوع کے نشیب و فراز کے بعد مولانا کی شخصیت ملک کی سیاست میں خاص اہمیت اختیار کر گئی اور آپ یکے بعد دیگرے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ بالآخر ایک تہلکہ خیز مگر قابلِ تقلید زندگی بسر

---

[1] (ظ=۹۰۰+ف=۸۰+ر=۲۰۰+ع=۷۰+ل=۳۰+ی=۱۰=۱۲۹۰ ہجری)

کرنے کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو انتقال فرمایا۔

مولانا بحیثیت ایک انسان کے بے حد جذباتی مگر شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج، دوست نواز اور شفیق بزرگ واقع ہوئے تھے۔ بغیر کسی ناغے کے سیر اور کسرت کرنا آپ کے روزمرہ معمولات میں شامل تھا۔ آپ کو چائے بہت پسند تھی اور حقے کے تو آپ رسیا تھے۔ چراغ حسن حسرت ''مردم دیدہ'' میں مولانا کا خاکہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے شعر کہنے کا انداز یہ ہے کہ حقہ بھروالیا اور شعر کہنے بیٹھ گئے۔ طبیعت کی روانی کا یہ حال کہ کبھی کبھی فی کش ایک شعر کے حساب سے کہتے چلے جاتے ہیں''۔ (۱)

مولانا کو شاعری کا یہ شوق زمانہ طالب علمی سے ہی تھا۔ علی گڑھ کے قیام نے اس پر مزید جلا بخشی۔ مولانا نے کالج کے قومی جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھیں تو سرسید احمد خاں اور مولانا شبلی نعمانی نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور آپ جلد ہی باکمال شاعر تسلیم کیے جانے لگے۔

آپ بلا کے طباع، قادرالکلام اور بدیہہ گو تھے اور شعر میں زبان و محاورے کا استعمال حیرت انگیز حد تک برمحل کرتے تھے۔ نئے نئے قافیے باندھنا اور مشکل ترین اور سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالنا انھیں خوب آتا تھا۔ فقیر سید وحیدالدین مولانا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ظفر علی خان زود گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قدرت کلام، مشاقی، حاضر دماغی اور آمد کا یہ عالم کہ الفاظ اور مضامین تو ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ سنگلاخ اور دشوار زمینوں میں شعر کہتے، بلکہ یوں کہیے پھول کھلاتے۔ ان کا خاص کمال یہ تھا کہ نامانوس اور غریب الفاظ کو اس حسن و خوبی کے ساتھ شاعری میں استعمال کرتے کہ شعر کی روانی اور سلاست میں اور اضافہ ہو جاتا۔'' (۲)

مزید برآں مدح و ذم کے معاملے میں ان کی طبع دریائے رواں کی مانند تھی۔ خاص طور پر طنز اور برجستہ نگاری تو کمال اعجاز کو پہنچی ہوئی تھی البتہ نعت گوئی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ نعت کے مضامین کو وہ

---

(۱) مردم دیدہ، چراغ حسن حسرت، مطبوعہ دارالاشاعت لاہور (س۔ن) ص ۱۳۶

(۲) انجمن (ذاتی یادداشتوں اور تاثرات کا مجموعہ) فقیر سید وحیدالدین، مطبوعہ لائن آرٹ پریس، کراچی ۱۹۶۶ء ص ۶۳

اپنے دل کی گہرائیوں سے نکالتے تھے اور بقول اصغر حسین خان لدھیانوی:

"ان کی صحافت' ان کی سیاسی قیادت' ان کی شاعری اور ان کی تمام سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ عشق رسول ﷺ تھا۔ مولانا جب نعت کے میدان میں آتے تھے تو وہ شراب مجاز سے مست ہو کر سراپا عشق بن جاتے تھے"۔ [1]

تاہم بحیثیت مجموعی انھوں نے زیادہ تر قومی' سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر ہی نظمیں کہیں اور روایتی شاعری یا غزل گوئی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ ہاں البتہ نظموں میں کہیں کہیں ایسے اشعار کہہ گئے ہیں جو رنگ تغزل کا بہترین نمونہ ہیں۔ مگر نیچرل شاعری میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی اور اس رنگ میں ان کے بڑے دل آویز مرقعے موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مولانا کی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے اہل زبان ان کی زبان دانی کے قائل تھے۔ اگر صرف شعر و شاعری تک محدود رہتے تو اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہوتے لیکن وہ سیاسی اور صحافتی شاعری کی طرف زیادہ مائل رہے جو بہرحال عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے شعری مجموعوں میں ایسا کلام مل جاتا ہے جسے اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک مستقل مقام حاصل ہے"۔ [2]

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مسلم ہوں میں غلام ہیں شمس و قمر میرے
اپنا یہ درجہ مجھ سے گھٹایا نہ جائے گا

میں گرچہ ناتواں ہوں مگر بار کائنات
میرے سوا کسی سے اُٹھایا نہ جائے گا

---

1. فن تنقید اور شعراء پر تنقیدیں' اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی' مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۷۷ء' ص ۳۲۵
2. دے صورتیں الٰہی' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' ص ۲۲۲

مجھ سے بجز خدا تو کسی کے حضور میں
اپنا سرِ نیاز جھکایا نہ جائے گا
(اتمامِ نور سے اقتباس)[1]

○○

اے نکتہ ورانِ سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گرانِ چمنستانِ معانی
مانا کہ دل افروز ہے افسانۂ عذرا
مانا کہ دل آویز ہے سلمیٰ کی کہانی
مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلہ میں عہدِ جوانی
گرمائے گا یہ ہمہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی
لیکن کبھی اس بات کو بھی آپ نے سوچا
یہ آپ کی تقویم ہے صدیوں پرانی
معشوق نئے' بزم نئی ، رنگ نیا ہے
پیدا نئے خاے ہوئے ہیں اور نئے مانی
بدلا ہے زمانہ تو بدلیے روش اپنی
جو قوم ہے بیدار یہ ہے اس کی نشانی
(سخنورانِ عہد سے خطاب سے اقتباس)[2]

○○

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

---

[1] بہارستان، ظفر علی خاں، اردو اکیڈیمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء، ص ۱۵۱،۱۵۲

[2] بہارستان، ظفر علی خاں، ص ۶۵۲،۶۵۳

آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادر آب سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
جھوم کر اٹھی گھٹا برسی برس کر چھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہوگیا
جوش مستی کا میری رگ رگ میں ساری ہوگیا

(رامائن کا ایک سین) [1]

✿ ✿

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشہ بتولؑ
اسلام کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسولؐ
کرتی رہے گی پیش شہادت حسینؑ کی
آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول
تھی داستاں دراز بھی اور دل گداز بھی
لیکن کہاں یہ دل کہ دیا جائے اس کو طول

(خونِ جگر کی چند بوندیں) [2]

---

[1] نگارستان، ظفر علی خاں، مطبوعہ یونائیٹڈ پبلشرز (س۔ن) ص ۲۸۔
[2] نگارستان، ظفر علی خاں ص ۱۰۵

چڑھا بت خانۂ تہذیب نو پر
تمیز نسل کا رنگیں چڑھاوا
تو بڑھ کر شہسواران عرب نے
دیا توحید کے گھوڑے کو کاوا
انھیں میراث دی ہندوستاں کی
ہے جاگیر اُن کی برما اور جاوا
تمہیں حشیت نے سر پر چڑھایا
انھیں اسلام دیتا ہے بڑھاوا
دھرا رہ جائے گا سب مغربی ٹھاٹھ
کیا جب لشکرِ مشرق نے دھاوا
تمہارے ساز و سامان کو کسی دن
بہالے جائے گا مکہ کا لاوا
گلہ ہم کو ہو کیا ہندو سبھا سے
کہ ہے بگڑا ہوا آوے کا آوا
مسلمانو کفن سر سے لپیٹو
کہ آیا ہے محمدؐ کا بلاوا
(تہذیب نو کا بت خانہ) ❶

⚬⚬

شریعت کے نگہباں پابجولاں ہوتے جاتے ہیں
مسلمانوں کی آزادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
پرستارانِ خاکِ کعبہ بے تابانہ بڑھ بڑھ کر
رسولؐ اللہ کی عزت پہ قرباں ہوتے جاتے ہیں

---

❶ نگارستان ص ۱۲۳

بلی کہہ کر جسے کشمیر کی مٹی نے باندھا تھا

خدا سے استوار اب پھر وہ پیماں ہوتے جاتے ہیں

بلوچ اس وقت اگر ہیں قید کل آزاد بھی ہوں گے

ہوا کیا اُن سے گر آباد زنداں ہوتے جاتے ہیں

ادب کا ذوق ہے جن کو مرے اشعار سُن سُن کر

سخنور بنتے جاتے ہیں سخنداں ہوتے جاتے ہیں

("ذوق ادب" سے اقتباس) ❶

✿ ✿

سید غلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶ء۔1952ء)

سید غلام بھیک نام' نیرنگ تخلص' ۲۶ر ستمبر ۱۸۷۶ء کو موضع دورانہ ضلع انبالہ کے ایک معزز و خوشحال سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں متانت اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ ابتدائی تعلیم انبالہ سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۵ء میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول رہے ❷ مزید تعلیم کے حصول کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو ایک تو یونیورسٹی میں اول آنے کی بنا پر اور دوسرے حد درجہ ملنسار طالب علم ہونے کی وجہ سے ان کے گرد دوستوں کا مجمع لگ گیا۔ ایسے یادگار دوستوں میں علامہ اقبال ❸ سر فضل حسین' میاں عبدالعزیز فلک پیما' چودھری جلال الدین اکبر اور مرزا اعجاز حسین اعجاز قابل ذکر ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کرنے کے بعد لاء کالج لاہور سے قانون کی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۰۰ء میں اپنے آبائی شہر انبالہ میں وکالت شروع کردی اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالہ ہی میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے فرائض سر

---

❶ نگارستان' ص (۱۶۱٫۱۶۰)

❷ سید غلام بھیک نیرنگ (تحقیقی مقالہ ایم۔ اے۔ اردو ۱۹۷۱ء) گیتی آرا سالک' غیر مطبوعہ مملوکہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور' ص ۴

❸ محمد عبداللہ قریشی اپنی تصنیف "معاصرین اقبال کی نظر میں" مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء ص ۶۳ پر لکھتے ہیں: "حسن اتفاق سے جس سال نیرنگ انبالہ سے میٹرک کے امتحان میں اول آکر سال اول کی کلاس میں داخل ہوئے اسی سال (۱۸۹۵ء میں) اقبال نے سیالکوٹ سے آکر سال سوم میں داخلہ لیا"۔

انجام دیے لیکن ۱۹۲۰ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو کر قائداعظمؒ کے دست و بازو بنے اور بقیہ عمر سیاست اور اپنی قوم کی فلاح میں بسر کر دی۔ ان کی اس زندگی کے بارے میں محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے اپنے اندر ملت کے اتنے دکھ سمیٹ لیے تھے کہ ان کے وجود کو ملی جدوجہد کے حوالے کے بغیر دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔" ❶

مثلاً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک انھوں نے تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۳۴ء میں آپ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رُکن بنے۔ اس دوران میں آپ نے وہ مسودۂ قانون پیش کیا جسے شریعت بل کہتے ہیں۔ اس کے ماسوا آپ تقریباً پچیس تیس برس تک "انجمن حمایت اسلام لاہور" کی جنرل کونسل کے ممبر رہے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی کی کورٹ و ایگزیکٹو کونسل سے بھی سالہا سال تک متعلق رہے۔ علاوہ ازیں انجمن تبلیغ الاسلام انبالہ کے بانی اور انجمن اسلامیہ انبالہ کے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۳ء تک صدر رہے، قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں آپ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہو گئے لیکن آپ نے یہ خدمت زیادہ عرصہ انجام نہیں دی تھی کہ ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو لاہور میں انتقال کیا اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

سید صاحب محض صدق و صفا اور خلوص کے پیکر ایک سیاستدان ہی نہ تھے بلکہ کمال کے شاعر بھی تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق انھیں فطری تھا اور وہ کالج کے زمانے میں بازار حکیماں والے تاریخی مشاعروں میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ دادِ سخن دیتے تھے ❷۔ شاعری میں ان کو بھی فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے تلمذ حاصل تھا ❸۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے "مخزن" جاری کیا تو نیرنگ نے بھی اس میں اپنی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اس لحاظ سے ان کا شمار بھی "مخزن" کے اولین قلمی

---

❶ "معاصرین ..... اقبال کی نظر میں" محمد عبداللہ قریشی، ص ۸۲،۸۰

❷ جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز)، ص ۳۷۷

❸ سید غلام بھیک نیرنگ (تحقیقی مقالہ)، ص ۱۲

معاونین ❶ میں ہوتا ہے۔

نیرنگ دبستانِ لاہور کے ان شعراء میں شامل ہیں جو مولانا آزاد، مولانا حالی اور سرسید احمد خاں سے براہِ راست متاثر ہوئے اور جنھوں نے اُردو شاعری میں زندگی اور زندگی کے مسائل کو داخل کیا۔ آپ بھی علامہ اقبالؒ کی طرح ایک بامقصد شاعر ہیں اور آپ کے دل میں بھی ملت کے درد کی کسک موجود تھی۔ چنانچہ آپ کی نظموں کا عام رنگ بھی وہی اصلاحی اور تعمیری ہے جن میں زندگی کے حقائق اور انسانیت کے سچے اور پاکیزہ جذبات بڑے دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح نیرنگ ہمیں

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

کی تصویر نظر آتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی نظمیں 'انسان کی فریاد' 'تلاشِ محبت' 'ایک آنسو سے دو دو باتیں' 'خواب یتیم' اور 'جانِ شیریں' لافانی نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ہمہ گیر انسانی جذبات و افکار کو بڑے سادے اور دل نشیں پیرائے میں پیش کیا ہے۔

نیرنگ نے برسوں تک انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں قومی اور ملی موضوعات پر نظمیں سنائیں۔ اِن نظموں میں سے ''پیغامِ عمل'' ایک ہے جو اس انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۷راپریل ۱۹۱۷ء ❷ کو سنائی گئی۔ یہ نظم حسنِ معنی اور دلکش الفاظ کا ایک بہترین مرقع ہے۔ خیالات میں روانی اور علامات سے ملتِ بیضا کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں:

ہم نفس عہدِ سلف کی یاد خوانی ہو چکی !
چھوڑ اس قصے کو رنگیں داستانی ہو چکی

---

❶ حکیم احمد شجاع اپنے مقالے ''لاہور کا چیلسی'' مطبوعہ نقوش لاہور شمارہ نمبر ۱۰۳-۱۰۲ بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ ''مخزن نے ایک ایسی محفل سجائی کہ اس میں اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب مل بیٹھے۔ سر محمد اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر، مرزا اعجاز حسین، میر غلام بھیک نیرنگ، عبدالرشید چشتی، مولوی ظفر علی خاں، شیخ محمد اکرام اور تلوک چند محروم اس محفل کے مستقل رکن تھے''۔

❷ سید غلام بھیک نیرنگ (تحقیقی مقالہ) ص ۵۰

گردشِ گردوں کا شکوہ بخت واژوں کا گلہ

داستانِ انقلاب دار فانی ہو چکی

تابکے آخر رہے گا شغلِ یاد رفتگاں

دور ماضی کی بہت کچھ نوحہ خوانی ہو چکی

کام کے میدان کی اب کھائیے چل کر ہوا

یعنی سیرِ باغِ الفاظ و معانی ہو چکی ❶

نیرنگ کی نظموں میں سے "آہنگِ عمل" کو ہم ان کی نمائندہ نظم کہہ سکتے ہیں۔ یہ نظم لطفِ بیان اور معنی آفرینی دونوں اعتبار سے ایک حسین اور فکر انگیز شاہکار ہے۔ اس نظم سے یہ بھی مترشح ہے کہ نیرنگ کے لیے شاعری سرمایہ تفریح نہیں بلکہ رشد و ہدایت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ نظم تصوف و حکمت، عشق و موعظت، اثر و رجائیت کا نادر امتزاج ہے اور اس کے ایک ایک شعر سے ملی غیرت و حمیت اور اسلامی جذبہ و جوش ہر آن جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ نظم جو نیرنگ نے ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے بتیسویں سالانہ اجلاس میں بمقام سورت پڑھی، ❷ بے حد مقبول ہوئی۔ اس مطبوعہ نظم کی تمہید میں لکھا ہے کہ:

"اس نظم کے سوز و گداز نے مسلمانانِ سورت کے مُردہ دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ہر شعر پر نعرۂ تحسین بلند ہوا۔" ❸

بعد ازاں باون اشعار پر مشتمل یہ نظم نہ صرف جلی حروف میں پمفلٹ کی صورت میں چھپی اور تقسیم ہوئی بلکہ برصغیر کے مختلف موقر رسائل و جرائد نے بھی اسے شائع کیا۔ اس نظم سے متعلق لوگوں کا عام تاثر یہ تھا کہ "آہنگِ عمل" واقعی عمل کا پیغام ہے۔ ہمیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے"۔ ❹

---

❶ کلام نیرنگ، میر غلام بھیک نیرنگ، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، مطبوعہ مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۳ء ص ۱۷۶

❷ آہنگ عمل، سید غلام بھیک نیرنگ، مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور (سن ندارد) ص ۲

❸ تمہید "آہنگِ عمل" سید غلام بھیک نیرنگ، ص ۲

❹ ایضاً، ص ۲

نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی

کبھی سوچا بھی ہے تجھ کو کہ اب رنگِ چمن کیا ہے
کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا کیا ہے زمانے کی

یہ گلچیں، باغباں، صیاد یہ تیرے کرم فرما
لیے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے ستانے کی

مگر اِک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن سے
ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی

پرانے برگ و گل سب چھانٹے جائیں گے خیاباں سے
لگی ہے باغباں کو دھن نیا گلشن بنانے کی

اگر گلشن میں رہنا ہے، بدل لے تُو بھی ڈھنگ اپنا
سماعت اب نہیں ہوگی کسی حیلے بہانے کی

(آہنگِ عمل) ❶

نیرنگ نے نہ صرف ملی اور قومی موضوعات اور حقائقِ حیات کو دلآویز پیرائے میں بیان کیا ہے بلکہ مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی ایسے والہانہ انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا وجد کرنے لگتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں جوش، روانی اور بے ساختگی ہے اور زبان سادہ اور شستہ ہے۔ انھیں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل تھی اور ان کی قوت مشاہدہ اتنی تیز تھی کہ وہ معمولی مظاہرِ فطرت کو بھی اپنی خوش بیانی سے دلکش بنا دیتے تھے اور ان میں انسانی زندگی کے ایسے فلسفیانہ نکات بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ شامل کر دیتے تھے جو ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ان کے اس نیچرل رنگ وصوت کی ایک مثال دیکھیے:

گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
ہر طیر نغمہ سنج سرِ شاخسار ہے

---

❶ آہنگِ عمل، سید غلام بھیک نیرنگ، ص ۶۳، ۶۴

سرگرم ہیں جو ایسے ہی قدرت کے کارکن

کل لالہ زار ہوگا جو اب کوہسار ہے

محسوس کون باغ کی کرتا نہیں کشش

ہے کون دل پہ آج جسے اختیار ہے

مخمل کا فرش باغ میں سبزہ بچھا چکا

اب تو عروسِ گل کا فقط انتظار ہے

کچھ حظ اُٹھالے تُو بھی کہ دو دن ہیں سیر کے

ناداں ! بہار باغ کا کیا اعتبار ہے

مُنہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار نے

جو قطرہ اس کا ہے وہ دُرِّ شاہوار ہے

ہے موسمِ بہار جنوں خیز بے خودی

جو شے ہے بیقرار ہے' بے اختیار ہے

(فصلِ بہار) ❶

نیرنگِ شفق اور فصلِ بہار کے علاوہ بھی ان کی وہ نظمیں جو فطرت کے موضوعات پر ہیں مثلاً: برکھارت' بادل' بھونرا' چاندنی رات میں بادل' کوہستان کا نظارہ' مرجھایا ہوا پھول اور خار وغیرہ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کو جدید رجحانات سے روشناس کرانے میں نیرنگ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہماری شاعری کو انھوں نے جس طرح مشرق و مغرب کے حسین امتزاج سے اُبھارا ہے اور اس میں جدت ادا اور ندرت خیال کا رنگ بھرا ہے یہ انھیں کا کام ہے۔ ان کا کلام قدما کے رنگ میں بھی اپنے دور کے کئی نئے اُفق لیے ہوئے ہے اور اُردو شاعری کی روایات کے باوجود ان کا انداز بیان جداگانہ رنگ میں خلوص کا آئینہ دار ہے:

ہمارے بزرگ ادیب اور محقق محمد عبداللہ قریشی نے نیرنگ کے متعلق بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے۔ آپ

---

❶ کلام نیرنگ' سید غلام بھیک نیرنگ' ص ۵۵

فرماتے ہیں کہ:

"............آخری عمر میں شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر بالکل قومی کاموں کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ اگر وہ اقبال کے شانہ بشانہ چل کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے تو دوسرے اقبال ہوتے............ اقبالؒ نے انھیں اپنا ہم نوا بے وجہ نہیں کہا تھا۔

نادر و نیرنگ ہیں اقبالؒ میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے" ❶

✿ ✿

منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷ء۔۱۹۴۵ء)

محمد الدین نام' فوق تخلص' فروری ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ سے متصل موضع کوٹلی ہرنرائن میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ جہاں سے آپ کے جد امجد' مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں پنجاب آ گئے تھے اور ضلع سیالکوٹ کے موضع گھڑ تل میں آباد ہو گئے تھے۔ اسی موضع میں آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ کچھ عرصہ موضع جاکے ضلع سیالکوٹ میں بھی پڑھتے رہے۔ پھر تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک آدھ چھوٹی موٹی ملازمت بھی کی۔ ۱۸۹۶ء میں آپ اپنے بڑے بھائی منشی رحیم بخش شیدا کے پاس لاہور آ گئے اور پھر تادم آخر (۱۴راگست ۱۹۴۵ء) لاہور ہی میں رہے۔ لاہور میں ان دنوں مشاعروں کا بڑا زور تھا۔ فوق کی تعلیم تو واجبی ہی تھی لیکن فطری ذہانت اور مطالعے نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ حافظہ غضب کا پایا تھا جو شعر ایک بار سن لیتے تھے' فوراً یاد ہو جاتا تھا۔ شعر کہنے کا ذوق بچپن سے تھا۔ لیکن آپ ابتدا ہی سے محض تک بندی' لفاظی اور قافیہ پیمائی کرنے کے بجائے جذبہ کے تحت شعر کہتے تھے۔ اسی ضمن میں پروفیسر مولانا علم الدین سالک مرحوم' جو فوق کے نہایت قریبی ساتھی رہے ہیں' لکھتے ہیں:

"فوق صاحب فطری شاعروں کی طرح بچپن ہی سے شعر کہتے ہیں اور آپ کی شاعری فقط لفظی جگت بازی یا قافیہ پیمائی تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ اس وقت شعر کہتے ہیں جب کوئی خاص جذبہ آپ کے قلب اور جگر پر اثر کرتا ہے اور آپ کے جذبات میں ہیجان پیدا

---

❶ معاصرین اقبال کی نظر میں' محمد عبداللہ قریشی' ص ۸۵

ہوتا ہے"۔ ❶

فوق علامہ اقبالؒ کے دوستوں میں درجہ اختصاص رکھتے تھے۔ یہ دوستی اس زمانے سے شروع ہوئی جب اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے کے طالب علم تھے اور بازار حکیماں بھاٹی دروازہ کی "انجمن اتحاد" کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور فوق بھی استداد زمانہ کے ہاتھوں روزگار کی تلاش میں لاہور آئے، ان مشاعروں کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اور ان میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے۔ ایک مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح مصرع تجویز کی گئی تھی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں حضرت داغ دہلوی کی شاگردی پر یوں فخر کا اظہار کیا ہے:۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخن داں کا

اس مشاعرے میں فوق نے جو غزل پڑھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا
نہ چھوڑا تار کوئی دشت وحشت نے گریباں کا
بہائے آنکھ نے شرم گنہ سے اس قدر آنسو
کہ ہر اشکِ ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
خدا نے رشکِ مہر اے فوق اس بُت کو بنایا ہے
مقابل ہو رُخِ روشن کے کیا منہ ماہ تاباں کا ❷

۱۸۹۸ء میں علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا مقطع سے متاثر ہو کر فوق نے بھی مرزا داغ کی شاگردی

---

❶ مقدمہ "کلام فوق" مولانا پروفیسر علم الدین سالک، مطبوعہ ظفر برادرس لاہور ۱۹۳۲ء ص ب

❷ شاعر کشمیر (محمد الدین فوق کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ) محمد عبداللہ قریشی، مطبوعہ ظفر برادرس بیرون شیرانوالہ دروازہ، لاہور (س ن) ص ۷

اختیار کرلی اور یہ سلسلہ مرزا داغ کی وفات (۱۹۰۵ء تک جاری رہا[1] اور یہیں سے اقبال اور فوق کی دوستی کا آغاز ہوا۔ بقول محمد عبداللہ قریشی:

"ذوق و مشرب کی یگانگت کی بنا پر دونوں کی طبیعت مل گئی اور ان میں کچھ ایسی اُلفت و محبت ہوگئی' جسے جیتے جی زمانے کی دستبرد کوئی گزند پہنچا سکی نہ بُعدِ مکانی و مفارقت زمانی کا امتداد ان کی گرمی اور جوش میں افسردگی پیدا کرسکا"۔[2]

فوق' بعد میں اگرچہ ایک شاعر کی بہ نسبت ایک اخبار نویس' انشا پرداز اور مورخ کی حیثیت سے زیادہ معروف ہوئے لیکن آپ کے شاعرانہ کمالات ایسے ہیں جن کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ آپ کی شاعری کا محور بالعموم وادئ جنت نظیر کشمیر' ڈوگرہ سامراج کے تحت وادی کے مفلوک الحال باشندے اور ان کی اصلاح و بیداری و آزادی کے موضوعات رہے ہیں، اس لیے کشمیر اور پنجاب سے باہر کی دُنیا آپ کے زندگی افروز کلام کی معجز نمائیوں سے چنداں واقف نہیں ہوسکی۔ حالانکہ اس بے بدل شاعر اور اس کی شاعری کی جتنی بھی قدر کی جائے وہ کم ہے۔ علامہ اقبال فوق کو انھی خوبیوں کی بنا پر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے بلکہ بقول محمد عبداللہ قریشی:

"فوق صاحب کی انھی خدمات کشمیر سے متاثر ہوکر اقبال انھیں مجدد کشامرہ کہا کرتے تھے"۔[3]

فوق اپنی شاعری کی خصوصیات کی بنا پر دبستانِ لاہور کے نمائندہ شعراء میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری کے اس پہلو کا تذکرہ تو ہم سطور بالا میں کرچکے ہیں کہ آپ شعر کا ذوق فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے اور وقت بے وقت شعر کہنے کے بجائے ایک جذبہ و لگن کے زیر اثر شعر کہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے کلام میں مزید کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس دبستان کے اُردو شعراء کی صف میں آپ کو ایک انفرادی مقام حاصل ہے۔ ذیل میں ہم آپ کی ان شعری خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو' نظیر لدھیانوی' مطبوعہ عشرت پبلشنگ ہاؤس' لاہور ۱۹۵۳ء' ص ۲۸۷

[2] حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں' محمد عبداللہ قریشی' بزم اقبال لاہور ۱۹۸۲ء' ص ۲۴۴

[3] معاصرین۔ اقبال کی نظر میں' محمد عبداللہ قریشی' ص ۳۳۸

فوق کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح غالب کے خطوط سے مرزا غالب کے زمانے کے دلی کی تاریخ بخوبی مترتب ہو سکتی ہے اسی طرح اگر کوئی پنجاب اور کشمیر کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ کی تدوین کرنا چاہے تو ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کے واقعات سے متعلق بہت سا مواد اُسے کلام فوق سے دستیاب ہو جائے گا۔

ان کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہر نظم کی ابتدا میں نظم کی شان نزول بھی بیان کی ہے۔ یہ تمہید دلچسپ' مختصر اور جامع الفاظ میں ہوتی ہے کہ قاری پہروں تک محظوظ ہوتا رہتا ہے' بعض بعض جگہ تو تمہیدیں اس قدر پر لطف ہیں کہ اصل نظم سے بھی زیادہ لطف دے جاتی ہیں۔ اور بقول پروفیسر مولانا علم الدین سالک:

"یہ وہ خصوصیت ہے جو اُردو شعراء میں تو بالکل ہی مفقود ہے البتہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنویات اور آپ کے دیوان میں پائی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق تک کے دور اسلامیہ کی تاریخ کی بہت سے غلطیاں اس کے مطالعہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کلام ہمارے درمیان سے معدوم ہو جاتا تو یقیناً ہندوستانی تاریخ کا یہ دور بالکل پردے میں جا چھپتا اور ہمارے حریفانِ چابک دست جنھیں مسلمانوں کی تاریخ سے قلبی خصومت ہے' اسے بگاڑ کر خدا معلوم کیا کچھ بنا دیتے"۔ ❶

کلام فوق کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک شعر حب وطن' خدمت وطن اور اسلام کے درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ خاص طور پر کشمیر اور اہل کشمیر کی محبت ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ چنانچہ فوق پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مستقل طور پر کشمیر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک طرف تو دنیا کو ان کی مظلومی اور ناگفتہ بہ حالات سے روشناس کیا اور دوسری طرف اہل کشمیر کے سامنے مشاہیر اسلام کی روایات پیش کرتے ہوئے انھیں غیرت دلائی کہ وہ بھی انھیں کے نقش قدم پر گامزن ہوں اور دینی و دنیوی فلاح سے ہمکنار ہوں۔ ان کے ایسے کلام میں بھی جس کا تعلق کشمیر سے

---

❶ مقدمہ کلام فوق' پروفیسر مولانا علم الدین سالک

نہیں ہے لاشعوری طور پر کہیں نہ کہیں کشمیر کا ذکر ضرور آ جاتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جناب فوق کشمیر کے مولانا حالی ہیں۔(۱) یعنی جس طرح "مسدس حالی" نے ہند کے مسلمانوں کو نیند سے بیدار کیا اور ان کو ان کے پرشکوہ ماضی سے آگاہ کر کے ایک منزل کا راستہ بتایا اسی طرح کلام فوق نے کشمیر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکایا اور ان کے اندر احساسات کا انقلاب پیدا کیا اور یہ ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

کلام فوق کی چوتھی خصوصیت مناظر نگاری ہے۔ اگرچہ دبستانِ لاہور کے کم و بیش تمام شعراء نے ہی مناظر نگاری کے بڑے بڑے دلآویز مرقعے پیش کیے ہیں تاہم ان میں فوق کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اس موضوع کو اس رنگ و آہنگ اور شائستگی سے پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ مناظر کی دل فریبیوں اور رنگینیوں اور کوہساروں' مرغزاروں' آبشاروں اور گلعذاروں کا بیان جوش و جذبہ اور سلاست و روانی سے کرتے ہیں اور پھر بڑی حسرت اور کسک کے ساتھ وطن کی ذلت و بے حسی اور بے کسی و بے بسی کی طرف اس خوبصورتی سے گریز کرتے ہیں جس سے انسان تاثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلام فوق کے محاسن کے متعلق لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں جو رائے ظاہر کی تھی اس کا ملخص بھی جناب عبداللہ قریشی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے:

> "کلام فوق بلاشبہ قابلِ داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہیں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں' شوخی کا اظہار بھی۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاق اور ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر تو جی چاہتا ہے کہ داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں۔ نیچر کی کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں

---

(۱) مقدمہ کلام فوق' پروفیسر مولانا علم الدین سالک

خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کی شانِ نزول نے تو آپ کی جدت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے"۔ ❶

اگرچہ فوق ایک بلند پایہ نظم گو شاعر ہیں لیکن وہ غزل بھی کہتے رہے البتہ ان کی غزلوں میں گل و بلبل، نغمہ و سرود، عیش و طرب، شاہد و شباب اور حسن و ہوس کا پر کیف ماحول اور تفننِ طبع کا سامان نہیں بلکہ آپ نے اس صنف میں بھی بلند و پاکیزہ خیالات کو نہایت شستہ اور دلآویز پیرایہ میں پیش کیا ہے اور تغزل کا رنگ بھی اتنا گہرا کر دیا ہے کہ قاری غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ آپ نے کیا کہا ہے اور یہی قلب و نظر کا منعطف کرنا شاعری کا اصل مدعا اور سرمایہ ہوتا ہے۔

غرض فوق کے کلام کے مطالعے سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا ابتدائی کلام آزاد مشقِ سخن کے بعد اپنے نصب العین کی طرف پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر نظر میں وسعت اور خیالات میں پختگی پیدا ہو جانے کے بعد ان کا کلام حکمت و موعظت، عبرت و بصیرت اور حقائق و معارف کا گراں بہا خزینہ ہے۔ جیسا کہ جناب عبداللہ قریشی نے بھی ان کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کا کلام علوئے خیال اور پختگی مذاق کی وجہ سے حاصل زندگی کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں دردِ دل کا بیان بھی ہے اور قومی و ملی جذبات کا اظہار بھی۔ جذبات کے شعلے بھی ہیں اور سوئے ہوؤں کے لیے تیر و نشتر بھی .... اور آخر میں تو آپ کی شاعری ایک ایسا موضوع اختیار کر گئی تھی جو آپ کے مذاقِ تاریخ اور فنِ صحافت کے بالکل مطابق تھا۔ یعنی تاریخ اور سیاست اور یہ ایسی چیزیں ہیں، جن کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہو سکتی اور جو آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی"۔ ❷

نمونہ کلام:

کشمیر میں اسلام کا کچھ حال نہ پوچھو
غفلت ہے مسلمانوں میں غفلت سے زیادہ

---

❶ شاعر کشمیر محمد عبداللہ قریشی، ص ۳۲

❷ شاعر کشمیر محمد عبداللہ قریشی، ص ۳۶، ۳۷

ہر چند نمازوں کا بہت جوش ہے لیکن
ہے جھوٹ کا چرچا بھی صداقت سے زیادہ

اس قوم میں ایسے بھی ہنر رکھتے ہیں اکثر
جو چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھے نہ دکھائے

غیروں کی حکومت کے اگر ظلم سنو تم
ممکن نہیں یہ سنتے ہی دل کانپ نہ جائے

کم علم بھی بے علم بھی ناقہم بھی ہیں ہم
ہے دل سے دعا سب کو خدا علم پڑھائے

پر علم وہی جس سے کہ دُنیا بھی ہو حاصل
تعلیم وہ کیا جس سے کہ دینداری بھی جائے

(مسلمانانِ کشمیر کی پُردرد حالت)●

○○

جو عصائے پیر ہو وہ نوجوانی چاہیے
جو مفیدِ خلق ہو وہ زندگانی چاہیے!

آرزو ہے گر ثمر چکھنے کی تو اے باغباں
نونہالانِ چمن پر گل فشانی چاہیے

چل بسا علم و ہنر اور مٹ گیا نام سلف
اور اے دستِ تاسف کیا نشانی چاہیے

وہ بھی کیا قصہ کہ جس کو سن کے نیند آنے لگے
جس سے غفلت دور ہو ایسی کہانی چاہیے

منزلِ مقصود تک دم میں پہنچ جائیں گے وہ
نوجوانوں کی ذرا ہمت بڑھانی چاہیے

● کلامِ فوق: ص ۹۱

قوم ہو عسرت میں اور عشرت میں ہوں افرادِ قوم
ایسے جینے پہ ہمیشہ نوحہ خوانی چاہیے
قوم کی حالت سے جو دائم رہی ہو بے خبر
زندگی وہ نذرِ مرگِ ناگہانی چاہیے!
یاد ایامے کہ روشن اخترِ اسلام تھا
اس طرح دشمن نہ اپنا چرخِ نیلی فام تھا
(صدائے فوق) ❶

○○

خطۂ کشمیر میں ہر کوئی بے توقیر ہے
علم کے دشمن جو ہیں ان کی بھی تعزیر ہے
حسن بھی میوے بھی چشمے بھی ہوا بھی پُر فضا
پھر یہ کیا جو کوئی دل والا ہے وہ دلگیر ہے
تُو نے تو گرتی ہوئی قومیں اُٹھائی ہیں بہت
اے فلک اس کے سنبھلنے کی بھی کچھ تدبیر ہے؟
عنقریب آنے کو ہے کشمیر میں بھی انقلاب
وقت اُستادِ زماں ہے اور زمانہ پیر ہے
شامتِ اعمال کے پردہ میں آئی کانگڑی
اور پھرن کا پیرہن پھوٹی ہوئی تقدیر ہے
(کانگڑی اور پھرن) ❷

○○

شانِ رفتہ دیکھ لی ہے تو نے دورِ آسماں
آہ! جس حالت میں مسلم ہیں تو وہ حالت بھی دیکھو

---

❶ کلامِ فوق، ص ۱۳۳
❷ کلامِ فوق، ص ۱۵۵

کھا چکا الوانِ نعمت مدتوں اے ہم نفس
قوم درماندہ کے غم کھانے کی اب لذت بھی دیکھو
جن مسلمانوں کے قدموں پر تھے نازاں تخت و بخت
ان مسلمانوں کی اب کشمیر میں ذلت بھی دیکھو
مدتوں جس قوم نے لوٹی ہے ثروت کی بہار
دیدۂ عبرت سے اب اس قوم کی نکبت بھی دیکھو
تو نے وہ "قلت" بھی دیکھی ہے تجھے جس پر ناز ہے
شرم جس کو دیکھ کے آجائے وہ "کثرت" بھی دیکھو
(دل کی تڑپ) ❶

✿ ✿

علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

علامہ اقبالؒ خود اپنی ذات میں ایک دبستان ہیں لیکن دبستانِ لاہور کی سب سے منفرد اور اعلیٰ نمائندگی انھیں کے دم سے ہوتی ہے۔ مزید برآں اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک عصرِ جدید کے معمار ہیں۔ انھوں نے ایک طرف آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور اکبرؔ کے اصلاحی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور دوسری طرف اپنی ملی شاعری کے ذریعے ملت مسلمہ کے سامنے مستقبل کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہوئے انھیں منزل کی راہ پر گامزن کیا۔ وہ صرف فارسی اور اُردو کے قادرالکلام اور بالغ نظر شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے اُردو شعر و ادب کو خیالات اور الفاظ و تراکیب کا بیش قیمت سرمایہ عطا کیا اور زبانِ شعر میں وہ حقائق و معارف بیان کیے جو کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

اقبال ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء (علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں ایک عرصہ تک اختلاف رہا۔ بالآخر ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا گیا) کو سیالکوٹ میں، جو سرزمین پنجاب کا ہمیشہ سے ایک مردم خیز خطہ رہا ہے، پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق کشمیری برہمنوں کی ایک گوت "سپرو" سے تھا، جس کا مسکن کشمیر میں نواح سری نگر تھا۔ علامہ کے خاندان نے سترھویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔

---

❶ کلام فوق ص ۲۳۹

اٹھارویں صدی کے آخر میں اس خاندان کے کچھ لوگ کشمیر سے بوجوہ ہجرت کر کے پنجاب میں آ بسے تھے۔ اقبال کے والد' شیخ نور محمد بڑے پرہیزگار اور عبادت گزار انسان تھے۔ وہ اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن انھیں مذہبی علوم خصوصا تصوف سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ فرصت کا بیشتر وقت عالموں اور فاضلوں کی صحبت میں بسر کرتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک' شیخ نور محمد کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

''بعض ہم عصر اکابر علم ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد اَن پڑھ فلسفی ہیں۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں پڑھ کر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے شیخ صاحب سے رجوع کرتے تھے''۔ ❶

اقبال کی والدہ امام بی بی بھی بڑی خلیق' نیک سیرت اور زاہدو عابد خاتون تھیں، ان کا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں ان کا کردار بخوبی واضح ہوتا ہے:

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات ❷

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تصنیف ''اقبال کامل'' میں شیخ نور محمد کے احوال میں علامہ اقبال کی ولادت سے متعلق ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس سے ملتا جلتا واقعہ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی ''ذکر اقبال'' میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی روایت کے حوالے سے بیان کیا ہے.......... مولانا عبدالسلام ندوی کا بیان ہے کہ:

''ان کی ولادت سے چند روز پہلے ان کے والد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی

---

❶ ذکر اقبال' مولانا عبدالمجید سالک' مطبوعہ بزم اقبال' لاہور ۱۹۵۵ء ص ۸

❷ بانگ درا' ص ۲۲۶

عجیب وغریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں مَیں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آکر گرا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پیدا ہوئے تو انھوں نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے۔ یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا"۔ ❶

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تحقیق کے مطابق:

"شیخ نور محمد نے طبیعت بھی موزوں پائی تھی' چنانچہ ان کی بیگم یعنی اقبال کی والدہ امام بی بی کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کی وفات پر چند درد بھرے شعر کہے تھے۔" ❷ شیخ نور محمد اور امام بی بی کی تربیت کا فیضان تھا کہ اقبال بچپن ہی سے عارفانہ رنگ میں رنگے گئے اور انھیں اولیائے عظام اور صوفیائے کرام سے خاص عقیدت پیدا ہوگئی۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم کچھ عرصے تک مولانا غلام حسن کے مدرسے میں اور بعد ازاں مولوی میر حسن کی معروف درس گاہ میں ہوئی۔ مولوی میر حسن' اقبال کے والد شیخ نور محمد کے دوست اور عربی فارسی کے متبحر عالم تھے۔ ان کی تدریس کا یہ اعجاز تھا کہ وہ اپنے شاگردوں میں خالص ادبی استعداد اور ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال کو عربی اور فارسی سے طبعی مناسبت ویسے بھی اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ اس پر میر حسن ایسے فاضل کی تربیت نے اسے نکھار دیا۔ انھی دنوں میر حسن سکاچ مشن ہائی سکول میں معلم مقرر ہوگئے۔ انھوں نے اقبال کو بھی عربی فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کے لیے اس سکول میں داخل کرا دیا۔ اقبال اپنے استاد میر حسن کا کس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے ان دعائیہ اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انھوں نے یورپ جاتے ہوئے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی درگاہ پر کہے تھے:

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

---

❶ "اقبال کامل" مولانا عبدالسلام ندوی' مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء ص س

❷ محمد اقبال ۔ ایک ادبی سوانح حیات' پروفیسر جگن ناتھ آزاد مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۲۱

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
(التجائے مسافر) ❶

ایک اور شعر میں اپنے اُستاد کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں ❷

فقیر سید وحید الدین "روز گار فقیر" میں مولوی میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب مولوی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تھے' اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسوہ رسولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی ہیں"۔ ❸

مولانا عبدالسلام ندوی' مولوی میر حسن کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اُستادی اور شاگردی کا یہ مسئلہ سیالکوٹ کے زمانۂ طالب علمی ہی تک قائم نہیں رہا بلکہ بعد کو بھی ڈاکٹر صاحب ان سے اپنے فارسی کلام کے متعلق اصلاح و مشورہ لیتے رہے"۔ ❹

اقبال نے سکاچ مشن سکول سے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ انھی دنوں اسی سکول میں انٹرمیڈیٹ کے درجے کھل گئے اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا۔ چنانچہ اقبال

---

❶ بانگ درا' ص ۹۶

❷ ذکر اقبال' ص ۱۷

❸ روز گار فقیر' فقیر سید وحید الدین' جلد اوّل' مطبوعہ آتش فشاں پبلی کیشنز' لاہور ۱۹۸۸ء ص ۵۷

❹ اقبال کامل' مولانا عبدالسلام ندوی' ص ۸

نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم بھی یہیں جاری رکھی۔ ۱۸۹۵ء میں ایف اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے اقبال لاہور آ گئے کیونکہ سکاچ مشن کالج میں اس وقت تک بی۔ اے کی کلاسیں نہیں کھلی تھیں اور وہ مرے کالج کے نام سے موسوم ❶ نہ ہوا تھا۔

بی۔ اے کرنے کے لیے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور اختیاری مضمون فلسفہ منتخب کیا۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا اقبال کی خوش قسمتی پر محمول کیجیے کہ گورنمنٹ کالج میں انھیں فلسفہ پڑھانے کے لیے نامور فلسفہ دان پروفیسر ٹامس آرنلڈ مل گئے جو علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ اقبال کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے فلسفہ کے ساتھ اقبال کے فطری لگاؤ کو دیکھ کر ان کے خیالات کو مزید جلا بخشی اور ان کی تعلیم و تربیت نے اس قدرتی جوہر کو اور بھی چمکا دیا۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ:

> "پروفیسر آرنلڈ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے"۔ ❷

اقبال نے تعلیم کے اس عمدہ ماحول میں ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے اور ۱۸۹۹ء میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے پاس کیا اور دونوں امتحانوں میں یونیورسٹی میں اوّل آنے کی بنا پر طلائی تمغے حاصل کیے۔ حصول تعلیم سے فراغت پا کر آپ نے کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ کے مضامین پڑھائے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ کی تربیت و فیض نے آپ میں جو علمی ذوق پیدا کر دیا تھا وہ ہنوز تشنہ تھا جس کی سیری کے لیے آپ انگلستان جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں حالات سازگار دیکھ کر آپ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ تشریف لے گئے۔ جہاں ٹری نٹی کالج کیمرج سے آپ نے فلسفہ اخلاق میں اور اس کے بعد جرمنی جا کر میونخ یونیورسٹی سے میٹافزکس آف پرشیا (ایران اور مابعد الطبیعیات) کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور اسی دوران میں آپ نے بارایٹ لاء بھی کر لیا اور کچھ عرصہ تک لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عارضی طور پر عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۰۸ء

---

❶ ذکر اقبال' مولانا عبدالمجید سالک' ص ۱۶

❷ ایضاً ص ۱۷

میں اقبال یورپ سے وطن واپس آ گئے اور تھوڑے عرصے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھانے کے بعد وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ کم وبیش ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔

یوں تو اقبال نے شعر گوئی اس زمانے سے ہی شروع کر دی تھی جب آپ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے لیکن آپ کی شاعری کی عظمت کا سنگ بنیاد لاہور میں رکھا گیا جہاں شعر وادب کی فضا نے ان کی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور کے بازار حکیماں میں مرزا ارشد گورگانی اور میر ناظم حسین لکھنوی نے شعر وسخن کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس دوران میں اقبال نے حضرت داغ دہلوی سے خط وکتابت کے ذریعے شرف تلمذ اور کلام غالب سے معنوی فیض حاصل کیا لیکن ان کی حقیقی شاعری حمایتِ اسلام لاہور کے پلیٹ فارم سے شروع ہوئی اور یہ سلسلہ بغیر کسی وقفہ کے ان کے انتقال تک چلتا رہا۔

۱۹۲۲ء میں حکومت نے آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کو ''سر'' کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں احباب کے پرزور اصرار پر آپ پنجاب کی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے امیدوار ہوئے اور منتخب ہو کر حلقہ لاہور کی نمائندگی کی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ مدراس یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور اسلامی افکار کی جدید تشکیل کے موضوع پر چھے اہم لیکچر دیے جو ''ریکنسٹرکشن آف ریلجس تھاٹ ان اسلام'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد کے اجلاس میں اپنا وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں برصغیر کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل پاکستان کے قیام کی تجویز کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ دوسری گول میز کانفرنس لندن میں مسلمانانِ برصغیر کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور واپسی پر ہسپانیہ، اٹلی، مصر، فلسطین اور ترکی کی سیاحت کی۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کی معیت میں کابل کے جشنِ استقلال میں شرکت فرمائی۔ آخر دنیائے علم وادب اور عالم اسلام کا یہ آفتاب جہاں تاب ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں غروب ہو گیا۔ مرحوم کے جسدِ خاکی کو عالمگیری مسجد کے مینار کے سائے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اقبالؒ کے انتقال کو ایک قومی سانحہ قرار دیا۔ اس موقع پر مولوی

صاحب نے اپریل ۱۹۳۸ء کے ماہنامہ "اُردو" میں یہ تعزیتی شذرہ لکھا:

"اقبال کی موت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے۔ ایسا بلند خیال اور عالی فکر شاعر صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے شاعری بھی اُٹھ گئی۔ مولانا حالی کے بعد شاعری سے اگر کسی نے حقیقی کام لیا تو وہ اقبال تھا.......... اس کے کلام نے دلوں میں گرمی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اس نے قومی اور ملی مسائل میں خیال و فکر کی رو بدل دی تھی۔ بیسیوں لفظ' خاص ترکیبوں اور بعض خاص خیال اور افکار ہندوستان کے اُردو ادیبوں اور شاعروں میں محض اقبال کے کلام کی بدولت سکہ وقت کی طرح رائج ہو گئے تھے.......... اس کے کلام نے اُردو زبان کا مرتبہ بڑھا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اس میں کتنی وسعت و قوت اور صلاحیت ہے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے اس کا کلام زندہ رہے گا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ولولہ' فکر میں بلندی' جذبات میں درد اور تخیل میں پرواز پیدا کرتا رہے گا"۔ ❶

اقبال کی شاعری کا سیر حاصل جائزہ ہم چونکہ چوتھے باب میں لے چکے ہیں، اس لیے اسے اس جگہ دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

⚪⚪

جوش ملسیانی (۱۸۸۴ء۔۱۹۷۶ء)

پنڈت لبھو رام نام' جوش تخلص' یکم فروری ۱۸۸۴ء کو قصبہ ملسیان ضلع جالندھر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ملسیان میں ہی ہوئی۔ ابھی آپ چودہ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آنکھ پہلے ہی افلاس اور تنگدستی میں کھولی تھی آنجہانی کے انتقال سے گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑ گیا۔ پھر اقتصادی مشکلات سے قطع نظر جوش کو ماحول بھی انتہائی غیر شاعرانہ ملا۔ تیس بتیس سال کی عمر تک آپ کا قیام ملسیان میں رہا۔ ۱۹۱۲ء سے آپ نے مستقل طور پر نکودر میں جو ملسیان سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے' بود و باش اختیار کر لی۔ لیکن آپ کو وہاں بھی شعر و ادب اور علم و فن کے وہ مواقع میسر نہ آئے جن کے آپ متلاشی تھے۔ ایسے حالات میں جوش کا ایک باکمال شاعر بن جانا سوائے فطرت کی ودیعت کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

---

❶ اقبال اور عبدالحق' ڈاکٹر ممتاز حسن (مرتب)' ص ۲۹

آپ نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکولوں میں مدرسی کرتے گزار دیا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو سرگباش ہوئے لیکن دوران ملازمت میں اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی آپ کے دو ہی پسندیدہ مشغلے تھے' ایک شعر کہنا اور دوسرے شطرنج کھیلنا۔

جوش ملسیانی قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ تھے۔ مزاج انتہائی سادہ پایا تھا لیکن جب شعر پڑھتے تو جوش اور ولولے کا یہ عالم ہوتا کہ سامعین مبہوت رہ جاتے۔ پنڈت ہری چند اختر نے جوش ملسیانی کے مجموعۂ کلام ''جنون و ہوش'' کے مقدمے میں ۱۹۳۲ء میں ہونے والے کپور تھلہ کے ایک مشاعرے کا حال لکھا ہے جس کی صدارت شیخ عبدالقادر نے کی تھی۔ آپ کے شعر پڑھنے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لیے اُٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و توصیف کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شامل ہو گئے ہیں...........'' ❶

جوش نے پہلے پہل قدرتی اور اخلاقی مضامین پر اشعار لکھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سارے ہندوستان میں حضرت داغ دہلوی کے کلام کی دھوم تھی۔ پنڈت جی بھی بذریعہ خط و کتابت ۱۹۰۲ء سے ان سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ داغ کے انتقال (۱۹۰۵ء) تک جاری رہا۔ ❷ اس کے بعد کسی اور سے اصلاح نہ لی البتہ فن اور زبان کے متعلق جو شکوک ہوتے انھیں دور کرنے کے لیے داغ کے ایک ممتاز شاگرد نسیم بھرت پوری سے خط و کتابت کر لیا کرتے تھے۔ ❸

جوش نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر قسم کے مضامین کو شعر اور شعریت کا

---

❶ مقدمہ (جنون و ہوش' مجموعہ کلام جوش ملسیانی) پنڈت ہری چند اختر' مطبوعہ منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی ۱۹۵۱ء ص ۸

❷ حالات مصنف (ابتدائیہ ''بادۂ سرجوش'' مجموعہ کلام جوش ملسیانی) نوح ناروی مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر جالندھر) ۱۹۳۰ء ص ۷

❸ مقدمہ (جنون و ہوش)' پنڈت ہری چند اختر' ص ۱۶

جامہ پہنایا ہے اور بقول پنڈت ہری چند اختر:

"حق یہ ہے کہ جس صنف میں اور جس موضوع پر کچھ کہا' حق ادا کر دیا۔ آپ کا یہ شعر "سخن گسترانہ بات" نہیں بلکہ حقیقت و صداقت کا اظہار ہے۔

ہم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو تخم بو دیا وہی گل ریز کر دیا" ❶

اس میں مبالغہ سہی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جوش کا غزل کی طرف زیادہ رجحان رہا ہے، افتادِ طبع کے علاوہ اس کا بڑا سبب حضرت داغ کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ اسلوب بیان کے علاوہ مضمون کی متانت اور جذبات کی بلندی کے اعتبار سے اس صنف میں انھوں نے اپنی طبیعت کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ جس سے آپ کا کلام فصاحت اور حسن بیان کا قابل ستائش نمونہ بن گیا ہے۔ آپ کا پہلا مجموعہ "بادہ سر جوش" کے نام سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوا جو ترمیم و اضافہ کے ساتھ "جنون و ہوش" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں دہلی سے دوبارہ طبع ہوا۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

چارۂ حال زار کیا معنی
جبر میں اختیار کیا معنی

راحت و رنج کیوں ہیں دوش بدوش
گل کے پہلو میں خار کیا معنی

وہ کرم کر جسے دوام بھی ہو
زندگی مستعار کیا معنی!

کیف اور تو ہے شراب فقط
ساغر زرنگار کیا معنی

---

❶ مقدمہ (جنون و ہوش) پنڈت ہری چند اختر، ص ۱۷

چھیڑ ہے یہ قفس نصیبوں سے
مژدۂ نو بہار کیا معنی
کس گنہ گار کو یقین نہیں
اتنے قول و قرار کیا معنی
جنت اک چیز ہی سہی لیکن
حشر تک انتظار کیا معنی
ہیں وہی بانیٔ ستم اے جوش
ستمِ روزگار کیا معنی! ❶

○○

خواب سمجھو خیال راحت کا
زندگی نام ہے مصیبت کا
آہ و فریاد نالہ و شیون
یہ انعام ہے محبت کا
اُنس ہم کو نہیں گناہوں سے
امتحان کر رہے ہیں رحمت کا
خود نمائی تو اس کی فطرت ہے
حسن بھوکا نہیں ہے شہرت کا
آدمی ہیں شمار سے باہر
قحط ہے پھر بھی آدمیت کا
راہ ناپید رہنما ناپید
سامنا ہے عجب مصیبت کا

---

❶ جنون و ہوش' جوش ملسیانی' ص ۴۷

یہی برتاؤ ہے تو جاتا ہوں
شکریہ آپ کی عنایت کا
نقص تو جذب دل میں ہے لیکن
نام بدنام ہے محبت کا
روح اس شعر میں کہاں اے جوش
جس میں جوہر نہ ہو فصاحت کا ❶

○○

ہر اِک مقام میں ہے جلوۂ خدائے غفور
کسی جگہ وہ نمایاں کسی جگہ مستور
اسی کے حُسن سے تاباں ہوئے ہیں شمس و قمر
اسی کے نور سے روشن ہوا ہے شعلۂ طور
اسی کی شانِ کرم کا ہے یہ کرشمۂ خاص
گناہگار بھی رحمت پہ ہو گیا مغرور
اسی کے حسنِ عنایت سے ہے ملا آباد
اسی کے جلوہ رحمت سے ہے خلا معمور
غرض وہ روحِ مجرّد ہر ایک جسم میں ہے
ہر ایک ذرّے میں ہے اس بسیطِ کُل کا ظہور
(خدا کس جگہ نہیں) ❷

○○

امین حزیں سیالکوٹی (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۸ء)

خواجہ محمد مسیح الدین پال ❸ جو امین حزیں کے نام سے معروف ہوئے، سیالکوٹ کے ایک متوسط

---

❶ جنون و ہوش، جوش ملسیانی، ص ۹۸
❷ جنون و ہوش، جوش ملسیانی، ص ۲۱۰
❸ پال، کشمیری راجپوتوں کی ایک گوت کا نام ہے۔

گھرانے میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ❶۔ اجداد کسی زمانے میں وادیٔ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہو گئے تھے۔

آپ کے والد مولوی احمد دین پال، جماعت اہل حدیث میں ایک دیندار عالم اور فاضل بزرگ تھے اور یہی دونوں خوبیاں امین حزیں اور ان کے چھوٹے بھائی اثر صہبائی کو ورثہ میں ملی تھیں۔ امین حزیں نے مروجہ مشرقی علوم کی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی، جن کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے شاگردوں میں عربی، فارسی اور اُردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ سید میر حسن سے اکتساب علم کے بعد آپ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور سیالکوٹ کے مشن ہائی سکول اور مشن کالج میں تعلیم مکمل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ایک طویل مدت تک گلگت میں پولیٹیکل محکمے کے دفتر میں ملازمت کی لیکن دوران ملازمت میں اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی دم آخر تک شعر و ادب کی طرف غالب رجحان رہا۔ آخر ۱۴؍ اگست ۱۹۶۸ء کو انتقال ہوا۔

امین حزیں نے شاعری شروع کی تو اس زمانے میں پنجاب میں غالب اور اقبال کے کلام کی دھوم تھی۔ ۱۹۰۲ء میں جب امین حزیں کی ایک غزل لکھنؤ کے "پیام یار" میں چھپی اور پسند کی گئی تو سر عبدالقادر کے الفاظ میں:

"اس وقت ان کو خیال ہوا کہ اقبال کی شاگردی کریں۔ ان کو ملے اور اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا "شاعری خداداد چیز ہے۔ اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشق سخن کیے جایئے اور اساتذہ کا کلام بغور پڑھیے تا کہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔ اس دن سے امین صاحب اس مشورے پر عامل ہیں۔ ابتدا میں مولوی ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی (جوہر) کے رنگ سے متاثر تھے لیکن بعد ازاں ان کی طبیعت پر اقبال کا رنگ بالکل چھا گیا"۔ ❷

---

❶ تذکرہ شعرای پنجاب، خواجہ عبدالرشید ص ۷۱ پر سن پیدائش ۱۸۸۳ء درج ہے لیکن تذکرہ جدید شعرائے اُردو مطبوعہ فیروز سنز جلد دوم، ص ۲۸۸ پر اور سر عبدالقادر نے گلبانگ حیات (اردو مجموعہ کلام امین حزیں) کے دیباچے میں ۱۸۸۴ء لکھا ہے۔

❷ مقدمہ "گلبانگ حیات (مجموعہ کلام امین حزیں سیالکوٹی)" سر عبدالقادر، مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۴۰ء۔

امین حزیں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن انھیں غزل اور نظم زیادہ مرغوب ہے اور زبان وبیان پر انھیں پورا عبور حاصل ہے۔ ان کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اکثر وبیشتر علامہ اقبال کے رنگ اور موضوعات کو اپنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کلام اقبال کے مقابلے میں امین حزیں اپنا وہ مقام پیدا نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ بقول محمد عبداللہ قریشی:

"وہ اقبال کے چھتنار کے سایہ میں دب کر رہ گئے اور اُبھر نہ سکے"۔ [1]

بہرکیف امین حزیں ان قابل قدر جدید شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ وہ ہر صنفِ شاعری میں زندگی کی حقیقتوں اور عارفانہ جذبات کا بڑے پُر کشش انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

وہ مرغ جس کی تگ و دو مجاہدانہ نہیں
گماں یہی ہے کوئی اس کا آشیانہ نہیں

نہ دے اس آگ کو نارِ خلیل سے نسبت
کہ جس کے سوز میں گلزار جاودانہ نہیں

شکستِ ہمت عالی ہے بے خودی کی تلاش
کہ کارخانہ ہے دُنیا شراب خانہ نہیں [2]

بلبلِ سوختہ ساماں سے سنا ہے میں نے
عشق اِک آتشِ بے شعلہ ہے گلزار ہے حُسن

صاف آتا ہے نظر دیدۂ بینا کو یہی
عشق اقرار حقیقت ہے اور اظہار ہے حُسن

---

[1] معاصرین۔ اقبال کی نظر میں محمد عبداللہ قریشی، ص ۵۳۶

[2] گلبانگ حیات امین حزیں سیالکوٹی ص ۶۲

عشق بیچارہ ہی آگاہ نہیں ہے ورنہ
روز میثاق سے خود اس کا طلبگار ہے حسن ❶

حریم ناز خداوندِ ناز کی سوگند!
نگاہ پاک دل پاکباز کی سوگند!
قسم ہے حسن کے انداز بے نیازی کی
جبین عشق سراپا نیاز کی سوگند!
قسم ہے غزنوی بت شکن کے بازو کی
کمند زُلفِ دراز ایاز کی سوگند!
قسم ہے مہر و مہ و انجم درخشاں کی
کرشمۂ فلکِ شیشہ باز کی سوگند!
قسم ہے عکسِ رُخِ مہر و ماہ طلعت کی
اور اس کے درد بھرے نارساز کی سوگند!

ملی ہے جس کو مئے لا الٰہ اِلا اللہ
وہ رندِ میکدہ مغضوب ہو نہیں سکتا

(لا الٰہ الا اللہ) ❷

خواجہ دل محمد (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۱ء)

خواجہ دل محمد کا نام پنجاب کی تعلیم اور تعلم کی دنیا میں ایک طویل مدت تک بہت معروف رہا ہے۔ خواجہ دل محمد کا تعلق، جو "دل" ہی تخلص کرتے تھے، لاہور کی شیخ برادری سے تھا۔ خواجہ صاحب ۹ رفروری ۱۸۸۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ نظام الدین تھا جو اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی بنا پر اپنی برادری میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دل کی ابتدائی تعلیم اندرون شیرانوالہ

---

❶ گلبانگِ حیات، امین حزیں سیالکوٹی، ص ۱۱۶

❷ گلبانگ حیات، امین حزیں سیالکوٹی، ص ۳۴

گیٹ کے اسلامیہ ہائی سکول میں ہوئی۔ پھر لاہور کی عظیم درسگاہ اسلامیہ کالج سے ایم۔ اے (ریاضی) کیا اور اسی کالج میں ریاضی کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اسی کالج کا وائس پرنسپل اور پھر پرنسپل بنا دیا گیا جہاں سے آپ ۱۹۴۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کا زیادہ عرصہ شعرو شاعری اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرنے میں بسر کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں انتقال کیا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور لاہور میونسپل کارپوریشن کے ممبر بھی رہے۔ رفاہ عامہ کے کام کرنے میں آپ ہمیشہ مستعد رہا کرتے تھے۔ سیاست میں بھی ہمیشہ حصہ لیا مگر بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

"ان کی سیاست شہر لاہور میں محدود تھی"۔ ❶

لاہور کی وہ سڑک جو چوک دالگراں سے لکشمی چوک تک جاتی ہے آپ کے نام کی نسبت سے خواجہ دل محمد روڈ کہلاتی ہے۔ یہ لاہور کے باشندوں کی طرف سے آپ کی تعلیمی و سماجی خدمات کا اعتراف ہے۔

اگرچہ ریاضی خواجہ صاحب کا خاص موضوع تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی حد درجہ لگاؤ تھا۔ آپ نے حساب، الجبرے اور جیومیٹری کی بہت سی کتب طلبہ کے لیے لکھیں جن میں اکثر ثانوی اور اعلیٰ درجوں کے لیے سرکاری طور پر نصاب میں داخل تھیں۔ شاعری کا شغف خواجہ صاحب کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھا لیکن پبلک طور پر اس کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوا جب آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اپنی قومی نظم پڑھی۔ اسلامیہ کالج لاہور کے ایک سابق پرنسپل، سید محمد علی جعفری "حیات نو" کے دیباچے میں قومی شعراء کی نسبت سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں اور ان جلسوں میں خواجہ صاحب کے پہلی بار نظم پڑھنے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"............ ملک میں ان شعراء کو قومی شعراء کہتے ہیں۔ ان شعراء کے سرخیل مولانا حالی ہیں اور ان کے بعد سر شیخ محمد اقبال اور ان کے رفقاء کا نام آتا ہے۔ انھی قومی شعراء میں ایک نمایاں اور قابل قدر شخصیت کے مالک ہمارے خواجہ دل محمد ہیں جنھوں نے سب سے اول ۱۹۰۶ء میں میرے رُوبرو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں اپنی قومی نظم پڑھی۔ قدیم بلغا کے عکاظ کے

---

❶ دے صورتیں الٰہی' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' مطبوعہ قومی کتاب لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۶۰

میلے کے مثل لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ایک قسم کا ملی میلہ ہوتا ہے۔ جس میں ہزاروں مسلم ملک کے اطراف واکناف سے آتے ہیں تاکہ علماء وزعماء وشعراء کے ارشادات اور پیغامات سنیں .... ۱۹۰۶ء کے اس سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر مولوی نذیر احمد' سر محمد شفیع' جسٹس سر شاہ دین مرحومین اور دیگر مشہور ومعروف زعماء وادباء واکابر تشریف رکھتے تھے۔ جنھوں نے خواجہ صاحب کی اس نظم کی تحسین وتعریف کر کے ان کی ہمت افزائی فرمائی۔ اس روز سے انجمن کے سالانہ اجلاسوں میں خواجہ صاحب کی نظموں نے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔" ❶

اس زمانے میں لوگوں کو یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی تھی کہ باوجودیکہ خواجہ صاحب نے ایم اے کا امتحان ریاضی میں پاس کیا اور عمر بھر کالج میں ریاضی ہی پڑھاتے بھی رہے' ان کو شاعری سے اس قدر موانست ہے جبکہ ریاضی ایک خشک مضمون سمجھا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے عموماً شاعری سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتے مگر خواجہ صاحب کی طبیعت کی ہمہ گیری نے ان دونوں میدانوں میں خوب نام پیدا کیا۔ ریاضی کے معنوی پس منظر نے ان کے فکر وخیال میں ایک کائناتی وسعت پیدا کر دی تھی۔ ویسے بھی ریاضی اور شاعری کے اصول نہ صرف مماثل ہیں بلکہ شانہ بشانہ ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ چنانچہ شاعری ان کے سدِ راہ نہیں بلکہ خضر راہ ثابت ہوئی۔ ریاضی اور شاعری کے باہمی ملاپ کے پیشِ نظر سر عبدالقادر نے "صد پارۂ دل" کے دیباچہ میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب کے روبرو ایک شخص نے ریاضی اور نظم کے تضاد کا ذکر کیا تو انھوں نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ ان دونوں فنون کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اپنی انتہائی منزل میں ریاضی اور شاعری دونوں کا مطمحِ نظر ایک ہی ہے۔ ریاضی کو ایک ذرہ ہیچ مقدار میں وہی قوت عظیم اور گردش لامتناہی نظر آتی ہے جو نظام شمسی میں کار فرما ہے اور فضا کی لا انتہائیوں میں اجرام سماوی کی بے پایاں حرکات

---

❶ تعارف (دیباچہ) حیات نو' خواجہ دل محمد' مطبوعہ خواجہ بک ڈپو لاہور ۱۹۶۰ء صفحہ (د)

اسے محوِ حیرت بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح شاعری چشم بصیرت سے عالم شہود کی انھی بے پایانیوں اور لاانتہائیوں سے لطف اندوز ہوتی ہے جو انسان کو عالم ہست و بود سے کیف و تخیل میں لے جا کر مست و بیخود کر دیتی ہیں"۔ ❶

خواجہ صاحب' علامہ اقبال کے زبردست مداحوں میں سے تھے۔ جب اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا اس وقت خواجہ صاحب اسلامیہ کالج میں طالب علم تھے۔ آپ اقبال کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ ❷ چنانچہ آپ نے اپنی شاعری کا آغاز انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے سے کیا تو اقبال کے طرز ترنم میں قومی رنگ کی نظمیں پڑھتے تھے۔ ❸ ان نظموں کے مجموعے درد دل' آئینۂ اخلاق' دل کی گیتا' صد پارۂ دل' پیت کی ریت' حیات نو' روحانی نغمے اور بوستان دل کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور اہل ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

خواجہ دل محمد ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ہم یہاں ان کی صرف قومی و اسلامی نظموں' رباعیوں اور دوہوں کا ذکر کریں گے جن میں انھیں خاص امتیاز حاصل ہے۔

خواجہ صاحب علامہ اقبالؒ کے فکر و خیال سے بہت متاثر تھے۔ علامہ اقبالؒ نے جس طور سے اپنی سحر انگیز شاعری کے ذریعے اپنی درماندہ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ایک منزل مقصود کی طرف گامزن کر دیا تھا' خواجہ صاحب نے بھی فکر و عمل کے لیے یہی راہ اپنائی۔ خواجہ صاحب نے اخلاقی و عرفانی شاعری کی شمع روشن کی اور ادبی و شعری روایت کو تادیر زندہ رکھا جو اُردو میں قریب قریب نابود ہو رہی تھی۔ "درد دل" "آئینۂ اخلاق" اور "حیات نو" خواجہ صاحب کی اخلاق آموز نظموں کے مجموعے ہیں جن میں ان اسلامی قدروں کو اُجاگر کیا گیا ہے جو اسلامی معاشرے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً شجاعت' صداقت' امانت' دیانت' مروّت' اخوت' تواضع' اخلاص' تقویٰ' عدل و انصاف' محبت و ایثار'

---

❶ سر آغاز (دیباچہ) صد پارۂ دل' خواجہ دل محمد' مطبوعہ خواجہ بک ڈپو' لاہور' ۱۹۳۶ء ص "ب"

❷ ایضاً

❸ ایضاً

علم و حکمت، علم و عمل، خودداری، سیر چشمی اور جہانِ فنا میں تلاشِ بقا وغیرہ۔ خلوصِ نیت خواجہ صاحب کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ ان کی شاعری فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے سبق آموز ہے۔ ان کی نظموں کے ایک ایک لفظ سے مترشح ہے کہ وہ فرد اور قوم کے ذاتی اور اجتماعی میلانات کو بدل کر انھیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی طرف گامزن کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ "خاص طور پر وہ اس کے ذریعے کچھ اخلاقی سبق نوجوانوں تک ضرور پہنچانا چاہتے ہیں"۔ ❶ اسی لیے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ان کی شاعری دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، خواجہ صاحب کی شاعری کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انھوں نے اپنی زندگی میں جتنی بھی شاعری کی ہے وہ کسی نہ کسی طریق سے قومی ہے۔ اس کا ایک رُخ اجتماعی ہے اور دوسرا رُخ فرد کی زندگی سے متعلق ہے۔ وہ جہاں افراد کے باطن کی صفائی اور تزکیۂ نفس کے مقاصد کو پورا کرتی ہے وہاں اجتماعی اخلاقیات کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ بایں ہمہ ان کی شاعری کا خطاب دل ہی سے ہے۔ وہ خود دل ہیں۔ اس لیے انھوں نے دل کی باتیں کی ہیں اور شاعری میں ان مضامین کو کم جگہ دی ہے جو محض حواس پروری اور تن پرستی کے لیے منظوم کیے جاتے ہیں۔ دلوں کو بدل دینے کی کوشش ان کی شاعری کا مقصود ہے۔........خواجہ دل محمد صاحب نے وہ شاعری کی ہے جس سے فرد اور اجتماع کے ضمیر منور ہو جائیں اور اس طرح ان کو حیات کا ایک ایسا اسلوب مہیا ہو جائے جس سے وہ اعلیٰ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں اور ان کے دل ان راحتوں سے لبریز ہو جائیں جو عارضی نہیں ازلی و ابدی ہیں"۔ ❷

خواجہ صاحب کی شاعری علم و عمل، حکمت و دانش اور عرفان و مسرت کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ ان کے یہاں فکری گہرائی نہیں اور نہ ان کے لہجے میں فلسفیانہ ثقالت ہے۔ بلکہ اندازِ بیان عموماً اتنا سلیس، رواں اور عام فہم ہے کہ خاص و عام بھی اس سے حسبِ مقدور بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

> "دانش آموزی کا یہ رنگ ہمارے یہاں بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ اسی وجہ سے

---

❶ دیباچہ صد پارۂ دل، سر عبدالقادر، ص ب

❷ سر آغاز (دیباچہ) بوستانِ دل، خواجہ دل محمد، مطبوعہ خواجہ بک ڈپو لاہور ۱۹۶۰ء ص د

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ اُردو کی عارفانہ اور اخلاقی شاعری میں.............. یعنی
پاکیزگی اور طہارت کی شاعری میں.......... خواجہ صاحب ایک منفرد مقام کے مالک ہیں
وہ اپنے زمانے کے لوگوں سے الگ چلے ہیں پھر بھی انھوں نے زمانے کو بہت کچھ دیا ہے
اور ایک لحاظ سے زمانہ ان کا شکر گزار بھی ہے کہ انھوں نے بعض ایسے تقاضے پورے کیے
ہیں جن سے زمانہ خود غافل تھا مگر انسانیت کو ان کی ضرورت تھی"۔ [1]

دل کی نظموں میں ملت مسلمہ کے زوال کا رنج' اس کی سربلندی کی بے پناہ خواہش اپنے عہد کی دلگیر خطابت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

مسلم جو سر بلند تھے کیوں آج پست ہیں
اغیار کے غلام ہیں کیوں زیردست ہیں
حرص و ہوا کے دام میں کیوں پائے بست ہیں
اپنے قدح کی خیر منانے میں مست ہیں

جوہر جو تھے کمال کے ناپید ہو گئے
صیاد اپنے دام میں خود صید ہو گئے

(شام اندلس) [2]

علامہ اقبالؒ کی طرح خواجہ دل محمد بھی زندگی کے نقیب تھے اور زندگی کو مسلسل جدوجہد، عمل پیہم' شوق اور جستجو کے مترادف سمجھتے تھے:

زندگی تنظیم ملت' زندگی نظم قوی
زندگی پیغام فطرت' زندگی جہد بقا

زندگی کے واسطے جوش عمل مقیاس ہے
زندگی شوق تجسس' زندگی احساس ہے

---

[1] سر آغاز (دیباچہ) بوستان دل' خواجہ دل محمدؒ ص ؤ، ز
[2] حیات نو' خواجہ دل محمدؒ ص ۱۱۷

زندگی ہنگامہ پرور، زندگی گرم ستیز
موت ہے آسودگی کا شوق، محنت سے گریز

زندگی احساسِ ملت، زندگی سوز و نوا
زندگی شوقِ شہادت، زندگی سازِ وفا

(صبح صادق) ❶

رباعی اُردو میں قدیم الایام سے مروج ہے۔ لکھنو کے اُستادانِ مرثیہ خصوصاً میر انیس، مرزا دبیر اور ان کے مقلدین نے اس صنفِ سخن میں جولانیِ طبع کے خوب جوہر دکھائے ہیں پھر مولانا حالی اور اکبرالہ آبادی کی رباعیات نے بھی اُردو شاعری کے اس شعبے میں گراں قدر اضافے کیے۔ حالی اور اکبر کے بعد جن شعراء نے اس صنف میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں ان میں خواجہ دل محمد بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"رباعی کی صنف کے ساتھ وہ طبعی مناسبت رکھتے ہیں اور اپنے افکار و خیالات کو اس صنف کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالتے ہیں"۔ ❷

خواجہ صاحب نے پانچ سو رباعیاں کہی ہیں جن میں بڑی خوبصورتی سے عرفان و مستی، نیرنگِ شہود، اسرارِ حقائق، اعمال و اخلاق اور نیرنگِ جذبات کے موضوعات بیان کیے ہیں اور اپنے نام کے وصف سے بھی جا بجا فائدہ اُٹھایا ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

خورشید لٹائے نور، مانگے نہ عوض
انگور بھی دے سرور، مانگے نہ عوض
انسان کو بھی چاہیے، بنے ابرِ سخا!
برسے نزدیک و دور مانگے نہ عوض ❸

---

❶ ایضاً، ص ۱۳۱

❷ پیت کی ریت، خواجہ دل محمد، مطبوعہ خواجہ بک ڈپو لاہور، ۱۹۶۰ء تبصرہ از ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۰

❸ صد پارۂ دل، ص ۱۷۳

بے ذوقِ عمل کام کہاں چلتا ہے
چلتی ہے زمیں تو آسماں چلتا ہے
مُردوں کے لیے ہے ساری دنیا بے جان
جب تک چلتا ہے دل جہاں چلتا ہے! ❶

دوہا ہندی صنفِ شعر ہے اور ہندی شاعری میں اس کی ایک درخشاں روایت موجود ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے بابا گورو نانک، بھگت کبیر، تلسی داس یا بہاری ست سَئی میں سے کسی ایک کے بھی عاشقانہ اور عارفانہ دوہے نہ سنے ہوں۔ مگر اُردو شاعری کے لیے یہ صنف بالکل نئی ہے، ایک آدھ اُردو شاعر نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اگر کبھی ایک آدھ دوہا کہہ لیا ہو تو وہ الگ بات ہے البتہ کسی اُردو شاعر نے خواجہ دل محمد سے پہلے بطورِ خاص اس صنف کو نہیں اپنایا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ اُردو شاعری پر سنسکرت اور برج بھاشا سے کہیں زیادہ فارسی کا اثر رہا ہے اور اُردو شعراء جن بحروں میں شعر کہتے ہیں وہ فارسی کے توسط سے آئی ہیں۔ بلاشبہ فارسی کی طرح اُردو میں "فرد" یا "بیت" کی صنف موجود ہے اور پھر غزل میں بھی عموماً ہر شعر بجائے خود ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مستقل صنفِ سخن کے اعتبار سے فرد یا بیت کا کوئی مقام نہیں اور نہ اسے دوہے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ اُردو شاعری میں موضوعاتی لحاظ سے رباعی ایک ایسی صنف ہے جس کی دوہے سے بہ اعتبارِ اختصار مماثلت ہے لیکن وزن اور ہیئتی لحاظ سے دوہا رباعی سے مختلف ہے۔ دوہا خالص ہندی صنف ہے اور ہندی شاعری میں یہ وہ صنف ہے جس میں شاعر دو مصرعوں کے اندر ایک جہانِ معنی بند کر دیتا ہے۔

اُردو میں دوہا کہنے کا اوّلین شرف دبستانِ لاہور کے شاعر خواجہ دل محمد کو حاصل ہے۔ ہمارے خیال کی تائید ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بعض شعراء نے ہندی زبان اور ہندی بحروں میں اُردو شاعری کی۔ ایسے شاعروں میں عظمت اللہ خاں کا نام سرِفہرست ہے لیکن اُنھوں نے بھی دوہے کی صنف کی طرف

---

❶ صد پارۂ دل، ص ۱۶۷

باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی۔ انھوں نے تو بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کی زبان اور وزن و آہنگ ہندی ہے لیکن دوہے کی صنف سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواجہ دل محمد صاحب نے دوہے کی صنف کی طرف سب سے پہلے توجہ کی اور باقاعدگی سے دوہے لکھنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے"۔ ❶

خواجہ صاحب کو اپنے فکر و خیال کے اظہار کے لیے فطرتاً رباعی کی صنف پسند ہے اور اسی فطری مناسبت نے انھیں دوہے کی صنف کے قریب لا کھڑا کیا ہے، چنانچہ انھوں نے رباعی کی طرح اس صنف میں بھی اپنی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"رباعی کی صنف کے ساتھ طبعی مناسبت نے انھیں دوہے کی صنف سے بھی قریب کر دیا ہے"۔ ❷

خواجہ صاحب کے تمام تر دوہے عرفان، عشق و مستی، شہود، حسن مجاز، علم، عمل، حرص و ہوا، عالم آشوب، فنا اور بقا جیسے موضوعات پر مبنی ہیں۔ اگرچہ خواجہ صاحب کے یہاں فکر کا عنصر غالب نہیں ہے تاہم انھوں نے اپنی قوت مشاہدہ اور مخصوص زاویہ نظر سے کام لے کر ان حقائق و رموز کی کامیاب ترجمانی کی ہے جو عام طور پر صوفی شعراء کا مسلک رہا ہے۔ جس سے ایک تو ان مضامین کے اظہار و ابلاغ میں مدد ملی ہے، دوسرے ان میں ایک انفرادی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے دوہوں کی تمام تر زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم اُردو ہے۔ اس کو کسی طور پر ہندی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ اس میں ارادتاً ہندی کے ایسے کومل اور شیریں الفاظ ضرور لائے گئے ہیں جو اُردو کے ہم مزاج ہو گئے ہیں اور جو ہماری روز مرّہ گفتگو میں مستعمل ہیں اور ظاہر ہے کہ دوہوں کے لیے یہی زبان موزوں بھی تھی۔ عنوانات اگرچہ عربی فارسی کے ہیں لیکن یہ بھی ایک اوسط فہم سے دور نہیں بلکہ یہ عنوانات اگر ہندی میں ہوتے تو شاید ہمارے لیے عجیب و نامانوس ہوتے۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ خواجہ صاحب کے دوہوں کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تو اِن دوہوں کی زبان کو ہندی کہنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ زبان لازماً اور اساساً اُردو

---

❶ پیت کی ریت (تبصرہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص د

❷ پیت کی ریت (تبصرہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ہ

ہے۔ اُردو کی مختلف شیوئن ہیں۔ مرزا غالب اور نظیر اکبر آبادی کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن کون ہے جو ان دونوں کو اُردو کا مایۂ ناز شاعر نہیں مانتا۔ جس طرح شعر کی زبان اور ہے' صحافت کی زبان اور ہے' علمی زبان اور ہے اسی طرح دوہوں کی زبان بھی دوسری اصناف لسان سے مختلف ہے۔ لیکن یہ اصناف زبان' اُردو ہی کی ہیں۔ ان کو عربی' فارسی' ہندی نہیں کہا جا سکتا''۔ ❶

اور اسی ضمن میں مولانا چراغ حسن حسرت رقم طراز ہیں:

''اگرچہ ان دوہوں میں ہندی کے دوہوں کی پیروی کی گئی ہے۔ یعنی بحر بھی وہی ہے جس میں عام طور پر ہندی میں دوہے کہے جاتے ہیں۔ پر اُن کی زبان بڑی سیدھی سادی' سبک اور لطیف ہے۔ جن لوگوں کو اُردو زبان کی وسعت اور اس کے سرمایۂ الفاظ کا صحیح اندازہ نہیں' وہ ان دوہوں کی زبان کو چاہے ہندی کہہ لیں چاہے کوئی اور نام رکھ دیں لیکن میں تو اُسے اردو ہی کہوں گا۔.......... انھیں ہندی دوہے کہنا بڑی بدمذاقی ہے۔ دراصل جن الفاظ کو بعض لوگ غلطی سے ہندی الفاظ سمجھتے ہیں' وہ اُردو کے الفاظ ہیں اور ہماری زبان کے بڑے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں کی تصانیف میں موجود ہیں..........'' ❷

اب ذرا خواجہ دل محمد کے' جن کو مولانا عبدالمجید سالک نے ''اُردو کا تلسی داس'' ❸ کہا ہے' ہر رنگ کے دوہے ملاحظہ فرمایئے اور حسنِ بیان اور زبان کا لطف دیکھیے:

اب کی اب کے ساتھ ہے' جب کی جب کے ساتھ
جس کی رب کے ساتھ ہے' اس کی سب کے ساتھ

(عرفان) ❹

---

❶ پیت کی ریت (تعارف) مولانا عبدالمجید سالک' ص ۷

❷ پیت کی ریت (پیش لفظ) مولانا چراغ حسن حسرت' ص ۱۴

❸ ایضاً

❹ پیت کی ریت' خواجہ دل محمد' ص ۱۷

سورج نکلا، دن چڑھا، ہوئے ستارے ماند

بن میں پھروں اُداس میں جیسے دن میں چاند

(عشق و مستی)❶

گوری تیرے نین میں، بستے ہیں دن رین

عیش، جوانی، روپ، رس، لاج، حیا، سکھ چین!

(حسن مجاز)❷

دُنیا کو تسخیر کر، ذرّے کا دل چیر!

لیکن پہلے صاف کر، اپنا پاک ضمیر

(علم)❸

موتی جس کو چاہیے، جل میں ڈبکی کھائے

ندی کنارے رونے سے موتی ہاتھ نہ آئے

(علم)❹

جاکی ہونی ہو چکی، دیر نہ جات لگائے

پکا میوہ ڈال سے، آپ ہی گرتا جائے

(فنا)❺

---

❶ پیت کی ریت، خواجہ دل محمد، ص ۹۱

❷ ایضاً، ص ۱۳۶

❸ ایضاً، ص ۱۴۷

❹ ایضاً، ص ۱۶۷

❺ پیت کی ریت، خواجہ دل محمد، ص ۲۱۹

ہم ساگر کے بلبلے' پھولیں اور لہرائیں
دم نکلے تو ٹوٹ کر' ساگر میں مل جائیں!

(بقا) ❶

✿ ✿

تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۶ء)

تلوک چند نام' محروم ❷ تخلص' یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ پیشہ آباء کاشت کاری تھا لیکن آپ کے والد نے موروثی اراضی کے دریا برد ہونے پر تجارت کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے جے اے وی کا امتحان پاس کیا اور درس و تدریس کے مشغلے کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھا اور کچھ عرصے بعد بی اے اور ایس اے وی کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۲۵ء تک اپنے آبائی وطن عیسیٰ خیل میں اور پھر کلورکوٹ میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات رہے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ راولپنڈی منتقل ہو گئے جہاں پہلے تو کنٹونمنٹ بورڈ سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے پھر گارڈن کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس معروف ادارے سے آپ کا تعلق تقسیم ہند تک رہا۔ گویا محروم کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں بسر ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ دہلی چلے گئے جہاں ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو انتقال کیا۔ ❸

محروم طبعاً شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور چونکہ مظاہر فطرت سے بڑی شیفتگی تھی اس لیے سیر و سیاحت کے بھی شوقین تھے۔ ابتدا میں اُردو میں اظہار کرنا قدرے مشکل نظر آتا تھا لیکن خداداد صلاحیت اور محنتِ شاقہ کی بدولت زبان و بیان کا اسلوب نکھرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب آپ میٹرک کے طالب علم تھے تو آپ کا کلام "مخزن" اور "زمانہ" جیسے ادبی رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔

جس زمانے میں محروم پیدا ہوئے وہ اُردو شاعری کا عبوری دور تھا۔ ایک طرف کلاسیکی اور مناظر

---

❶ پیت کی ریت' خواجہ دل محمد' ص ۲۴۵

❷ کبھی کبھی "محروم" کے بجائے نام کا مخفف کر کے "تلک" بھی بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔

❸ محروم ــــــ میرے والد (مضمون) "آنکھیں ترستیاں ہیں" پروفیسر جگن ناتھ آزاد' مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۸۲ء ص ۱۸۳

فطرت کے موضوعات جگہ پا رہے تھے۔ دوسری طرف آزاد و حالی کے اثر سے قومی، اصلاحی اور مناظر فطرت کے موضوعات جگہ پا رہے تھے۔ پامال راہوں سے نکل کر نئے راستوں پر چلنا آسان نہ تھا لیکن محروم نے نئی راہ اپنائی۔ جیسا کہ علامہ نیاز فتح پوری محروم کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کا اثر سب سے زیادہ محروم ہی نے قبول کیا۔ وہی سادگی بیان، وہی پُر خلوص لہجہ، وہی صداقتِ جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے نہ سرفروشانہ تبلیغ لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں''۔ ❶

اگرچہ محروم نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن فطری میلان، طبعی متانت اور خلوص و صداقت کے باعث ان کی ملی، وطنی، سیاسی، اصلاحی اور نیچرل نظموں کا پلہ دیگر اصناف پر بہت بھاری ہے۔ خاص طور پر ان کی نیچرل رنگ کی نظمیں بہت بلند پایہ اور اعلیٰ درجے کی ہیں اور ان میں سے بھی وہ نظمیں جن کا موضوع وطن یا حب وطن ہے، اپنی مثال آپ ہیں بلکہ ان کی شاعری کا محور ہی اسی موضوع کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''کاروانِ وطن'' سے دو نظمیں، صبح وطن اور شام وطن سے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

شیدا ہے دل بے تاب ترا
جان تجھ پہ نثار اے صبح وطن

کیا دلکش ہیں کیا روح افزا
تیرے انوار اے صبح وطن

پرواز تخیل نے اڑنا
سیکھا ہے تیری فضاؤں میں

---

❶ کاروانِ وطن، تلوک چند محروم، مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۰ء ص ۷،۸

بوباس ہے جنت کی گویا
کیا لطف ہے تیری ہواؤں میں
(صبح وطن) ❶

○○

کیا سانولی صورت ہے تیری
اے شام وطن، اے شام وطن
کیا موہنی مورت ہے تیری
اے شاہد لیلیٰ فام وطن
ہاں صبح ازل سے شام وطن
سودا ہے تیری ملاحت کا
پہلو میں دل شیدائے محن
پروانہ ہے شمع اُلفت کا
(شام وطن) ❷

محروم کے مجموعہ ہائے کلام خصوصاً ''گنج معانی'' اور ''نیرنگ معانی'' میں بہت سی ایسی دلچسپ اور لطیف نظمیں ہیں جنھیں انھوں نے جذبے میں ڈوب کر بڑے والہانہ انداز سے لکھا ہے۔ سبزۂ نو' فریاد یتیم' بلبل کی فریاد' چڑیا کی زاری' مچھلی کی بے تابی' اپنا گھر' بچہ' نیند' شاعر اور شاعری' دنیا' سندھ کو پیغام' کنار راوی' ماہ تاباں' نمود شام' پنجاب کے میدان' ترغیب سفر حیات' جاوید' خواب جہانگیر' نور جہاں کا مزار' پروانہ وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن کو زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ کنار راوی سے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

ہم کہاں اور سیر باغ کہاں
ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشن دہر میں فراغ کہاں
چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں
شام غم ہے، کنار راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

---

❶ کاروان وطن' تلوک چند محروم' مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۰ء ص ۷۷، ۷۸
❷ کاروان وطن' تلوک چند محروم' مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۰ء ص ۸۰

آہ! اے درد نوجوانی ' آہ!
آہ! اے موت کی نشانی' آہ!
کیا ہوئی دل کی شادمانی آہ!
ہے کدھر مرگ ناگہانی' آہ!

شام غم ہے کنار راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے ❶

''نور جہاں کا مزار'' محروم کی بہت ہی خوبصورت اور دلکش نظم ہے۔ نظم کیا ہے الفاظ کی مصوری ہے۔ یہ چند بند دیکھیے:

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی ' وہ شمع تہ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سر مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شب دیجور کا عالم

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سر فرش ہے کوئی' نہ دری ہے
کیا عالم بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام ' یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو' مگر یوں سر صحرا نہیں ہوتی

---

❶ گنج معانی' تلوک چند محروم' دہلی کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ء ص ۱۳۰ تا ۱۳۲

دنیا کا یہ انجام ہے' دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ' نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اِک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے ❶

محرومؔ پنجاب کے ایک دور افتادہ علاقے' ضلع میانوالی کے رہنے والے تھے لیکن ان کو زبان و بیاں پر پورا عبور حاصل ہے بلکہ بقول سر عبدالقادر:

''اس جنگل میں خدا نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنو تک پھیلی۔'' ❷

اس سے ہمارے اس دعوے کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اُردو قدیم الایام سے سرزمین پنجاب کے دور دراز قصبات اور دیہات میں بھی سمجھی' بولی اور لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو یہ زبان مرغوب تھی۔ محروم نے معانی و بیان سے مالا مال ایسی زبان استعمال کی ہے کہ مستند اہلِ زبان اساتذہ نے بھی ان کے کلام کے محاسن کی داد دی ہے۔ جیسے حضرت اکبرالہ آبادی مرحوم نے یہ رباعی لکھ کر ان کی طباعی کی تعریف کی تھی:

ہے داد کا مستحق کلام محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم ❸

غرض محروم کے کلام میں الفاظ کی برجستگی' بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ صلح و محبت' انسان دوستی اور مظاہرِ فطرت کے مضامین کو انھوں نے جس سادہ و موثر اور دل نشیں انداز میں

---

❶ گنج معانی' تلوک چند محروم' ص ۲۷۵'۲۷۶

❷ گنج معانی' دیباچہ از سر عبدالقادر' ص ۱۹

❸ دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء' عبدالشکور' مطبوعہ کتاب خانہ دانش محل' لکھنو' ۱۹۴۳ء' ص ۱۰۸' اور گنج معانی' دیباچہ سر عبدالقادر' ص ۱۹

پیش کیا ہے اس کی وجہ سے یہ مضامین ان کی شاعری کا امتیاز بن گئے ہیں۔ ایک اور چیز جو اُن کے کلام کو نمایاں کرتی ہے وہ ان کے مزاج کی دردمندی ہے۔ بہار ہو یا خزاں بلکہ قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے ان کی طبیعت میں درد و گداز کے جذبات زیادہ رکھے تھے۔ طبیعت کے اسی گداز نے ان کے کلام میں ایسا رنگ بھرا ہے کہ پڑھنے والا اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

✿✿

مولانا تاجور نجیب آبادی (۱۸۹۰ء۔۱۹۵۱ء)

احسان اللہ خان نام' ابو العرفان کنیت' تاجور تخلص' جائے ولادت نینی تال اور سن پیدائش ۱۸۹۰ء [1] ہے۔ آپ نسباً درّانی افغان تھے۔ وطن نجیب آباد ضلع بجنور (یو۔ پی' بھارت) ہے۔ جہاں آپ کے آباء احمد شاہ ابدالی کے لشکریوں کے ہمراہ ہندوستان میں وارد ہو کر آباد ہو گئے تھے۔ مولانا نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی اور پھر جب ان کی عمر دس سال کی تھی تو دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بنے' جہاں دس سال رہ کر درسِ نظامیہ کی تکمیل کر کے سندِ فضیلت حاصل کی۔ اگست ۱۹۱۴ء میں لاہور آئے' شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی کے حسب ایما اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل پاس کیا اور اسی سال رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج میں اُردو و فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اسی ادارے سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۱ء میں رسالہ "ہمایوں" کے معاون مدیر بنے۔ ۱۹۲۶ء میں لاہور کے مشہور کتب فروش ادارے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے تعاون سے "اُردو مرکز" کے نام سے ایک ادارۂ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ جس نے بہت کم وقت میں بیش قیمت تصانیف شائع کیں۔ پنجاب میں جدید اُردو ادب کی تعمیر و تزئین خصوصاً غیر مسلموں میں اُردو کو مقبول بنانے میں مولانا موصوف کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھیں اُردو کی خدمت کرنے کا جنون تھا اور انھوں نے

---

[1] شمس العلماء تاجور (مقالہ) مولانا محمد وارث کامل' مطبوعہ نقوش لاہور (تاجور نمبر) ۱۹۶۵ء ص ۳۳

اسی جنون کی بدولت اپنا تمام سرمایہ اپنی جوانی، اپنی صحت وطاقت اور اپنے متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ نثار کردیا۔ اس ضمن میں حکیم احمد شجاع کا بیان ہے کہ:

"............ میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا تاجور نے اپنی زندگی، اپنی صحت اور اپنی عمر بھر کی کمائی اسی بازی پر لگادی اور اسی دھن میں لگادی کہ اُردو زبان کو پنجاب میں روز بروز فروغ حاصل ہو............" ❶

۱۹۲۹ء میں مولانا نے رسالہ "ادبی دنیا" اور ۱۹۳۳ء رسالہ "شاہکار" جاری کیا۔ لیکن "ادبی دنیا" چند سالوں کے بعد دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا البتہ "شاہکار" وہ برابر نکالتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں حکومت ہند نے ان کی علمی وادبی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ اس طرح تمام عمر درس و تدریس، تصنیف وتالیف، شعروشاعری اور صحافت کے میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے ۳۰؍جنوری ۱۹۵۱ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا تاجور اپنی ذات میں شعروادب کا ایک مکمل ادارہ تھے۔ اگرچہ آپ کی شاعری کا آغاز لاہور میں آنے سے پہلے ہی ہوچکا تھا تاہم آپ کی شہرت کا آغاز یہیں سے ہوا۔ آپ لاہور میں ۱۹۱۴ء میں تشریف لائے تھے۔ اس سے اگلے برس کا واقعہ ہے ❷ کہ آپ نے یونیورسٹی ہال میں دوستوں کے کہنے سننے پر ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کی۔ جس میں بڑے بڑے مستند شعراء تشریف فرما تھے۔ پنجاب کے چیف سیکرٹری مسٹر ٹامسن مشاعرے کی صدارت کررہے تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر عظیم الدین اور شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی جج کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ آپ کے اشعار کو سامعین نے بے حد پسند کیا اور دیر تک تالیوں کی گونج اور تحسین وآفرین کی صدائیں آتی رہیں۔ یہی مشاعرہ ادبی حلقوں میں آپ کی شہرت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔

---

❶ تاجور نجیب آبادی (مقالہ) حکیم احمد شجاع، نیچرلاہور، تاجور نمبر، ص ۶۲

❷ یہ واقعہ پیام شاہجہانپوری کے مقالے "شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی" مطبوعہ نیچرلاہور، تاجور نمبر صفحہ ۲۹ سے ماخوذ ہے۔

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں آپ نے حیات بخش رسا رامپوری ❶ سے اصلاح لی تھی اور پھر عمر بھر دوسروں کو اصلاح دی۔ آپ کی اصلاح کا انداز بہت دلکش تھا۔ آپ بہت خوش اخلاق، متواضع، ملنسار اور شفیق بزرگ تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتے۔ شاگردوں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔ جن میں ہندو اور سکھ شاگردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مولانا کے ہندوؤں کے ساتھ مراسم اور ہندو شاگردوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوؤں کے ساتھ مولانا کے خصوصی تعلقات تھے۔ بہت سے ہندو ادیب اور شاعر ان کے شاگرد تھے۔ ہندو مسلم اتحاد انھیں مرغوب تھا اور وہ بھی اس حد تک کہ انھوں نے ایک بیٹے کا نام محمد پرکاش رکھ دیا۔ جس پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں کیونکہ عام مسلمانوں کو ایک فاضل دیوبند سے ایسی توقع نہیں تھی۔" ❷

دراصل پنجاب بلکہ سارے ہندوستان میں اُردو کی ترویج واشاعت کے بارے میں مولانا کا ایک خاص نظریہ تھا؛ وہ یہ کہ جب تک اُردو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی مقبول نہیں ہوگی اس کا کوئی مستقبل نہیں اور بقول جگن ناتھ آزاد:

"اُردو کو ہندوؤں میں ہردلعزیز بنانے کے لیے انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا"۔ ❸

اسی ضمن میں سید عابد علی لکھتے ہیں:

"ان کی رائے میں پنجاب میں اُردو تبھی مقبول ہو سکتی تھی کہ دوسری قومیں یعنی

---

❶ حضرت رسا رامپوری داغ کے شاگرد تھے۔ اصل میں سکندرآباد ضلع بلند شہر (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ شروع میں سکندرآبادی کہلاتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں رامپور گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ عموماً تذکرہ نگاروں نے انھیں رامپوری ہی لکھا ہے۔ حضرت داغ اپنے اکثر شاگردوں کی غزلیں مصروفیت کے سبب انھیں اصلاح کے لیے دیا کرتے تھے۔ ان کے اپنے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ جگر مرادآبادی اور دورِ جدید کے بعض نامور شعراء ان کے شاگرد تھے۔ (ملکِ سخن کا تاجور .... (مقالہ) راقم الحروف، مطبوعہ ماہِ نو، لاہور بابت جون ۱۹۸۵ء ص ۲۳)

❷ وے صورتیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۱۰۳

❸ آنکھیں ترستیاں ہیں، جگن ناتھ آزاد، ص ۱۹

ہندو اور سکھ بھی اس زبان و ادب کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوں اور انھیں اس زبان کی ثقافت اور تہذیب سے اتنی ہمدردی پیدا ہو جائے کہ اس میں شعر کہنے کو جی چاہے"۔ ❶

یہی وجہ ہے کہ مولانا کے غیر مسلم شاگردوں ❷ کی تعداد ان کے مسلمان شاگردوں سے زیادہ تھی۔

مولانا تاجور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں "انجمن ارباب علم" کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ادبی انجمن مولانا نے سر عبدالقادر کی سرپرستی میں لاہور میں قائم کی تھی جس کی منعقدہ مجالس میں مختلف مضامین و مقالات اور غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ مولانا کی محنت و کاوش سے یہ انجمن نہ صرف لاہور میں معروف و کامیاب ہوئی بلکہ اس کی شاخیں پنجاب کے بعض دوسرے اضلاع میں بھی قائم ہوئیں۔ اس طرح اس انجمن کے ذریعے پنجاب کے اکثر علاقوں میں اُردو شعر و ادب کی ترویج ہوئی اور نئی نسل میں اس کا ذوق پیدا ہوا۔

مولانا تاجور قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ❸ مولانا کی غزل کا انداز بھی روایتی غزل گوئی سے قدرے جدا تھا۔ صنف غزل کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ غزل کے موضوعات کو اس طرح وسیع کرنا چاہیے کہ زندگی کے تمام پہلو اس میں سما سکیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"ضرورت اس امر کی ہے کہ غزل نگاری کا انداز بدلا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس

---

❶ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابد، مطبوعہ نقوش لاہور نمبر، ص ۱۰۸۲

❷ مولانا تاجور کے ہندو اور سکھ شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کے شہرت یافتہ شاگردوں میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، اودے سنگھ شائق، میلا رام وفا، کرپال سنگھ بیدار، گوپال متل، پورن سنگھ ہنر، جگن ناتھ آزاد سر فہرست ہیں۔ تلوک چند محروم مولانا کے تقریباً ہم عمر تھے اور دوستانہ تعلقات تھے تاہم شعر کے معاملے میں وہ بھی مولانا سے مشورہ طلب کیا کرتے تھے۔

❸ ان کا کلام رسائل میں چھپتا رہا اور مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ان کا بیشتر کلام ضائع ہو چکا ہے کیونکہ انھوں نے اسے محفوظ رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

کے موضوعات کو بھی وسعت دی جائے۔ انسانی عز و شرف کے تمام پہلو غزل کی صورت میں بہ انداز سوز پیش کیے جاسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ شاعر سلیقہ مند ہو............ بے سلیقگی کسی فن کو بھی سازگار نہیں' چہ جائیکہ شاعری جو از سرتا پا حسن سلیقہ کی طلب گار ہے"۔ ❶

مولانا کی غزل میں بلا کا جوش اور زور ہے۔ تراکیب خوبصورت ہیں' بندش اور مصرعے چست ہیں اور زبان سادہ و شیریں۔ جس کو روز مرّہ اور محاورہ نے مزید نکھار دیا ہے۔ بقول سید عابد علی عابد:

"ان کی غزل کی یہ خصوصیت تھی کہ محاورے کی چاشنی اور زبان کی مٹھاس رفعتِ مطالب سے گھل مل جاتی تھی۔" ❷

مولانا کو غزل کے ساتھ ساتھ نظم کہنے پر بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ چنانچہ آپ کی وہ نظمیں جو وقتاً فوقتاً مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، پریم، سدا بہار، شاہکار، اتحاد اور ہمارا پنجاب میں چھپتی رہی ہیں اس صنف میں آپ کی قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں تو تاریخی حیثیت کی حامل ہیں مثلاً جنگ عظیم اوّل کے خاتمہ کے بعد جب اتحادیوں نے ترکی پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ اسلام کو نظر بند کر دیا اور وہاں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جانے لگا تو دُنیائے اسلام میں اتحادیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس یاس انگیز وقت میں مولانا نے ایک دردناک نظم لکھی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیسا ٹوٹا ہے ہم پر یہ کوہ الم' سچ یہ ہے موت کا سامنا ہوگیا
لٹ رہی ہے خلافت اب اسلام کی' دارالاسلام کا خاتمہ ہوگیا

اے مسیحائے چرخِ چہارم نشیں' تو نے مُردے جلائے ذرا شک نہیں
تیری اُمت کے جور و ستم سے مگر' آج زندوں کو جینا بلا ہوگیا

تری اُمت کی بھیڑیں تھیں بھیڑیں کبھی اب تو دنیا کی حالت بدل سی گئی
تیری ہر بھیڑ خونخوار ہونے لگی ، تیرا ہر اُمتی بھیڑیا ہوگیا

اے طبیب عجم اے مسیح عرب' لے رہے ہیں سنبھالے ترے جاں بلب
اہلِ اسلام کا آخری وقت ہے' دردِ اسلام اب لادوا ہوگیا

---

❶ "غزل" (غزل کے موضوعات کے متعلق مختصر اقتباس) مولانا تاجور' مطبوعہ پیکر لاہور' تاجور نمبر ص ۱۵۵

❷ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابدؔ ص ۱۰۸۳

خضر ہیں نوید مسرت کے سب' جوش دریائے رحمت میں آئے گا کب

شافع روز محشر ہے تیرا لقب' اُٹھ کہ دُنیا میں محشر بپا ہو گیا [1]

تھوڑے ہی عرصے بعد مصطفےٰ کمال اتاترک نے جب ترکی کو آزاد کرا لیا اور انقرہ میں ترکی کی آزاد جمہوری حکومت قائم کر لی تو اس زمانے میں مولانا نے ایک طویل نظم "غازیٔ اسلام" کے عنوان سے لکھی۔ اس نظم میں آپ نے نہایت بے باکی سے مسلم ممالک پر یورپ کے مظالم کو بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ہر شعر میں تلوار کی کاٹ ہے:

کشور برطانیہ کا وہ خدائی فوجدار
زندگی چند روزہ کی طرح بے اعتبار

حکم برداری ہے جس کے جور کا مشہور نام
قوم ایوبی سے لیتا تھا صلیبی انتقام

مجلسِ اقوام میں وہ اہلِ عالم کے کفیل
کر رہے تھے قوم عثمانی کو برباد و ذلیل

آہ لائڈ جارج کی دنیا میں بد نامی نہ پوچھ
گرگ باراں دیدۂ یورپ کی ناکامی نہ پوچھ

مُسلم آزادی کی دُھن میں اپنی عزت کھو گیا
چاہ کن را چاہ در پیش' آخرش سچ ہو گیا

اے وہ یورپ نام جس کا ایشیا آزار ہے
اے کہ دُنیا کے لیے اک فتنہ بیدار ہے

بڑھ چلا ہے حد سے تیری بربریت کا جنوں
مغربی تہذیب سے آنے لگی ہے بُوئے خوں

---

[1] علامہ تاجور (مقالہ) اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی' مطبوعہ پنچ لاہور' تاجور نمبر' ص ۳۷

نقش کر دل پر کہ یہ تاریخ کا فرمان ہے
جور ہی مظلوم کی امداد کا سامان ہے ❶

اس نظم میں مولانا نے مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک سے یوں خطاب کیا ہے:

اے سپہ سالار اعظم اے دلیرِ بے نظیر
اے شہِ سیف و قلم اے غازیٔ گردوں سریر
غازیٔ اسلام! فخر قوم عثمانی ہے تو
شک نہیں اُمت کے حق میں خالدِ ثانی ہے تو
خودسری یورپ کی رکھی رہ گئی سب طاق میں
تو نے ہل چل ڈال دی معمورۂ آفاق میں
دھاک یورپ میں بٹھا دی تو نے اپنے نام کی
لاج رکھ لی تیری تیغ تیز نے اسلام کی ❷

ان کی دیگر مشہور نظموں میں جہانگیر اور اس کا مقبرہ، ملکہ نور جہاں، نوائے غم، شراب خانہ خراب، ساقی نامہ، تصویر بہار، برسات، نوید مستقبل، عید سعید، حسن وعشق سے جنگ، دردِ دل وغیرہ ہر لحاظ سے بہت عمدہ نظمیں ہیں۔ ''جہانگیر اور اس کا مقبرہ'' میں جہانگیر کے مزار سے مخاطب ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

انتخاب ہفت کشور خطۂ پنجاب ہے
اور تو پنجاب کا اِک گوہرِ نایاب ہے
یہ سپہر حُسن تو خورشیدِ عالم تاب ہے
تیری پیشانی دل افروز اولو الالباب ہے
یہ جو محمل ہے تو اس کا صاحب محمل ہے تُو
پہلوئے پنجاب میں کچھ شک نہیں ہے دل ہے تُو

---

❶ علامہ تاجور (مقالہ) اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، مطبوعہ ''نیچر'' لاہور، تاجور نمبر ص ۴۷

❷ ایضاً، ص ۷۵

زندگی کی کشمکش سے جس کا جی گھبرا گیا
سیر سے جو اس تمدن زار کی اُکتا گیا
جو ہجوم غم سے گھبرا کر تیرے پاس آگیا
رازِ ہستی تُو اشاروں میں اُسے سمجھا گیا
حل کیا تو نے یہ مضمونِ ادق اس کے لیے
بن گیا تو زندگی کا اِک سبق اس کے لیے ❶

مجموعی طور پر مولانا کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بڑی رچی ہوئی شعریت موجود ہے اور وہ اپنے اشعار میں اپنے جذبات واحساسات کی گری سمونے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

✿✿

❶ "جہانگیر اور اس کا مقبرہ" (نظم) مولانا تاجور نجیب آبادی، مطبوعہ نیچرل لاہور، تاجور نمبر، ص ۲۵۲

حکیم احمد شجاع ساحر (۱۸۹۳ء۔۱۹۶۹ء)

حکیم احمد شجاع لاہور کے معروف فقیر خاندان میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اپنے علم و فضل کی بنا پر بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لاہور کا بازار حکیماں انھیں کے بزرگوں کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے والد حکیم شجاع الدین اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب تھے اور ''سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارت کامل رکھتے تھے'' [1] بازار حکیماں میں ہونے والے مشاعروں کی بنیاد بھی جہاں علامہ اقبالؒ نے پہلی بار اپنا کلام سنایا' حکیم شجاع الدین نے رکھی تھی۔ [2] آپ نے گھر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے ۱۹۰۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ سے ایف اے اور میرٹھ کالج سے امتیازی حیثیت میں بی اے کیا۔ بی اے کرنے کے بعد آپ کو اسی کالج میں انگریزی لٹریچر اور تاریخ ہند کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن آپ کچھ ہی دنوں بعد بوجوہ اپنے وطن لاہور واپس آ گئے۔ جہاں سے پندرہ روزہ ادبی مجلہ ''ہزار داستان'' جاری کیا۔ بعد میں آپ اسسٹنٹ سیکرٹری لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب کے عہدے پر فائز ہوئے جہاں سے سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصہ دفتری زبان کے اُردو ترجمے کے لیے حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی سے وابستہ رہے۔ پھر کچھ عرصہ خانہ نشین رہ کر ۴ر جنوری ۱۹۶۹ء کو انتقال کیا۔

حکیم احمد شجاع بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے اور انھیں شعر و سخن کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ آپ نے اپنے حالات اور کلام پر مبنی تصنیف ''خون بہا'' شائع کی ہے۔ جس میں زندگی کے پہلے بائیس سال (۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۵ء تک) کے مشاہدات قلم بند کیے ہیں اور اس عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا نقشہ پیش کیا ہے' لکھتے ہیں:

''میں نے پندرہ ہی برس کی عمر میں شیکسپیر کے تخیل اس کے اسلوب نگارش اور اس کی نظم کی باریکیاں سمجھنے اور بیان کرنے میں فنی مہارت پیدا کر لی۔ جو اس وقت بھی حیرت انگیز تھی

---

[1] خون بہا' حکیم احمد شجاع' مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۵۰ء ص ۱۷۹

[2] خون بہا' حکیم احمد شجاع' ص ۱۷۹

اور آج بھی حیرت انگیز ہے۔ اُردو ادب سے میری شناسائی کی یہی سند کافی ہے کہ سر عبدالقادر نے اپنے مقبول عام و خاص ادبی رسالے "مخزن" میں اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے مشہور معروف تنقیدی جریدے "پنجاب ریویو" میں میری نظمیں اور مضامین شائع کیے"۔ ❶

اس میں شک نہیں کہ حکیم احمد شجاع کو ڈرامہ لکھنے اور سٹیج کرنے میں بہت شہرت ملی لیکن شعر گوئی کے معاملے میں بھی وہ اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔ بہت پُرگو تھے بلکہ بقول فقیر سید وحید الدین:

"ان کی شعر گوئی کا یہ عالم رہا ہے کہ کسی واقعے یا کیفیت سے متاثر ہوئے اور اشعار خود بخود موزوں ہوتے چلے گئے"۔ ❷

مگر اس کے باوصف بھرتی کے شعر نہیں کہتے تھے۔ اس بات کا انھیں خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ "خون بہا" کے تعارف (دیباچہ) میں لکھتے ہیں:

"جو کچھ اس کتاب میں ہے' میں نے اس میں وہی اور اتنی ہی بات لکھی ہے جو مجھے شعر نظر آئی اور جس کے اظہار کو میں نے شعر سمجھا' خواہ مخواہ کی طوالت اور سخن سرائی نہ میری شاعری کا مقصود ہے نہ میرے اشعار میں اسے تلاش کرنا چاہیے"۔ ❸

انھوں نے اگرچہ تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کا ہر صنف کا کلام تمام شعری خوبیوں سے مزین ہے تاہم حمد و نعت' مناجات و منقبت اور قومی اور جدید نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ ساحر تخلص کرتے تھے جسے انھوں نے شاذ و نادر ہی شعر میں استعمال کیا ہے۔ شاعری میں علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے چنانچہ ان کے کلام میں اقبال کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

حُسنِ مشرق پردۂ مغرب میں جب روپوش ہو
کاروانِ ماہ و انجم خانماں بر دوش ہو!

---

❶ خون بہا' حکیم احمد شجاع' ص ۱۹۲

❷ انجمن' فقیر سید وحید الدین' مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی' ۱۹۶۶ء' ص ۱۸۷۔

❸ خون بہا' حکیم احمد شجاع' ص ۹

ظلمتِ شب خانہ بر انداز صبر و ہوش ہو

جب وفورِ درد سے بیمارِ غم خاموش ہو

مایۂ تاب و تواں ہوتی ہے اُمیدِ سحر

محوِ دید مطلعِ خورشید رہتی ہے نظر!

(اُمیدِ سحر) ❶

کھوگئے ایک ہی جلوے میں سرِ طور کلیمؑ

کس کو دعویٰ ہے ترے سامنے ہشیاری کا

حشر میں ڈھونڈھ رہی ہے تری رحمت مجھ کو

یہ بھی اعجاز ہے اِک میری گنہگاری کا

ساحرؔ اب بھی کہیں ملتا ہے تو میخانے میں

کس قدر پاس ہے اس رند کو خودداری کا

(غزل سے اقتباس) ❷

سوز سے معمور میرے شعر کا پیمانہ کر

ماسوا سے میرے ذکر و فکر کو رُسوا نہ کر

حسن کو چالاک کر، پھر عشق کو بے باک کر

کچھ علاجِ گردشِ ایامِ عبرت ناک کر

قلب کو تاب پرِ پروانۂ بے تاب دے

آنکھ کو اشکِ رواں و فطرتِ سیماب دے

جامِ صہبائے کہن ہاں دور میں آجائے پھر

تیرے دیوانوں کی ہُو سے آگہی گھبرائے پھر

---

❶ خونِ بہا' حکیم احمد شجاع' ص ۴۳

❷ خونِ بہا' حکیم احمد شجاع' ص ۶۸

وسعتِ صحرا پہ ہو پھر خندہ زن دیوانگی

سرخ رُو ہو جائے وحشت، منفعل فرزانگی!

نعرۂ حق را ز شعرِ من بلند آوازہ کن

یادِ بزمِ رفتگاں را از فغانم تازہ کن

(نذر بحضور رحمۃ للعلمینؐ) ❶

✿✿

مولانا عبدالمجید سالک (۱۸۹۴ء۔۱۹۵۹ء)

مولانا عبدالمجید سالک دبستانِ لاہور کے ایسے شاعر ہیں جن کی شعر گوئی کا وہ چرچا نہ ہوا جس کے وہ مستحق تھے اور ان کی شاعری ان کی دوسری خوبیوں' انشا پردازی' سیاسیات اور صحافت کے پردے میں چھپ کر رہ گئی، حالانکہ وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ انھیں جدید دور کے کسی بھی بڑے شاعر کے مقابلے میں بخوبی رکھا جا سکتا ہے۔ آپ ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے اور ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء سے خاکِ لاہور میں محوِ استراحت ہیں۔

مولانا سالک ان گنت صفات کے مالک تھے۔ طبیعت بڑی باغ و بہار پائی تھی۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن جبیں پر کبھی شکن نہ آئی۔ شعر کی طرف خاص رجحان تھا اور طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتے تھے۔ ایک آدھ بار علامہ اقبالؒ سے اصلاح لی ❷ لیکن باقاعدہ تلمذ حضرت رسا رامپوری سے حاصل تھا' جنھوں نے ایک ڈیڑھ سال کی اصلاح کے بعد لکھ بھیجا تھا کہ:

"اب اصلاح کی ضرورت نہیں اور آپ جن اصناف میں فکرِ سخن کر رہے ہیں ان میں اصلاح دینا میرا منصب بھی نہیں۔ میں تو صرف غزل کی حد تک جا سکتا تھا۔" ❸

مولانا نے ایک دراز عرصے تک مختلف رسائل و جرائد میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ ایک طویل مدت مولانا ظفر علی خان کے ساتھ "زمیندار" سے منسلک رہے۔ بالآخر ۲۱ر مارچ ۱۹۲۷ء سے مولانا

---

❶ گردِ کارواں' حکیم احمد شجاع' مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۵۰ء ص ۳۷

❷ معاصرین۔ اقبال کی نظر میں' محمد عبداللہ قریشی ص ۵۰

❸ سرگزشت' عبدالمجید سالک' مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۶۶ء ص ۲۶

غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر روزنامہ "انقلاب" کا اجرا کیا جو قیام پاکستان کے بعد تک برابر جاری رہا۔

مولانا کی شاعری کا سرمایہ اگرچہ زیادہ نہیں لیکن آپ نے جو کچھ کہا ہے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک ماہرِ فن اور اُستاد کے شایانِ شان ہے۔ آپ نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزلوں میں آپ کے یہاں قدیم و جدید رنگ کا حسین امتزاج ملتا ہے جبکہ نظموں میں بیشتر رنگ قومی و ملی شاعری کا ہے اور ان میں علامہ اقبال کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ جسٹس ایس اے رحمٰن کے الفاظ میں:

"اجتماعی نقطہ نظر سے سالک، وطن دوست، ملت پرست اور انسانی اقدار کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں"۔ ❶

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے:

رنگِ تغزل:

ہم نفسو! اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہوا

عشق ہے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیٔ مے کے غمزۂ ہوش رُبا کو کیا ہوا

اب نہیں جنت مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا

دشتِ جنوں میں ہوگئی منزلِ یار بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

---

❶ مقدمہ (راہ و رسم منزلہا، مجموعہ کلام عبدالمجید سالک) ایس اے رحمٰن، ص ۱۳

نالۂ شب ہے نارسا آہ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا میرے خدا کو کیا ہوا ❶

نظم کا رنگ:

عظمت رفتہ جو چاہے تو جگر پیدا کر
زور بازو میں ' دعاؤں میں اثر پیدا کر
اسی پانی سے ہری کشتِ تمنا ہو گی
ابر نیساں کی طرح دیدۂ تر پیدا کر
تا کجے طوق غلامی میں رہے گی گردن
جس میں سودائے حکومت ہو وہ سر پیدا کر
روئے گا بے پر و بالی پہ قفس میں کب تک
ہے اگر خواہش پرواز تو پر پیدا کر
اٹھ کے جو خرمنِ دشمن پہ گریں برق صفت
خاک میں اپنی وہ جاں سوز شرر پیدا کر
راہب گوشہ نشین خضرِ راہ عشق نہیں
رہنما کوئی مہیائے سفر پیدا کر
آبرو دار ہیں آپس میں جو رکھتے ہیں ملاپ
سب سے رشتہ صفتِ سلکِ گہر پیدا کر
تیرے دل میں ہے اگر شوق جمال مطلوب
چشمِ بینا میں تجسس کی نظر پیدا کر
لے کے خورشیدِ جہاں تاب سے مقراضِ شعاع
دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کر

---

❶ راہ و رسم منزلہا' عبدالمجید سالک' مرتب عبدالسلام خورشید' مطبوعہ ماجد بیلا ہور ۱۹۶۰ء ص ۱۳۹

رونقِ محفلِ ایام دوبالا کر دے
اس سیہ خانۂ عالم میں اُجالا کر دے

(شرر پیدا کر) ❶

تمھیں سے اے مجاہدو جہاں کا ثبات ہے
تمھاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے
تمھاری ضو سے پُر ضیا جبینِ کائنات ہے
کواکبِ بقا ہو تم، جہاں اندھیری رات ہے
شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری
بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخلِ تاک کی
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم میں ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جس کی قوم لے تمھیں وہ شہسوار ہو
تمھیں وہ سرفروش ہو تمھیں وہ جاں سپار ہو
تمھیں وقارِ و احترامِ دین کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو
تمھاری تیغ ضامنِ نظامِ کائنات ہے

(مجاہدین و شہداء) ❷

✿ ✿

❶ راہ و رسمِ منزلہا، عبدالمجید سالک، مرتب عبدالسلام خورشید، ص ۲۶
❷ راہ و رسمِ منزلہا، عبدالمجید سالک، مرتب عبدالسلام خورشید، ص ۱۱۱

عبداللطیف تپش (۱۸۹۵ء۔۱۹۴۲ء)

شیخ عبداللطیف نام، تپش تخلص، ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ وطن مالوف لاہور ہے۔ تمام تعلیم لاہور ہی میں رہ کر حاصل کی۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد بتدریج ایف اے، بی اے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ایم اے (فارسی) کے امتحانات پاس کیے۔ ایم اے کے امتحان میں آپ پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے تھے اور سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ چند سال پسرور کالج میں السنۂ شرقیہ کے اُستاد رہے، بعدازاں ایمرسن کالج ملتان میں ایک عرصہ تک پڑھاتے رہے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ابھی آپ جوان ہی تھے کہ ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔

تپش بڑے شائستہ اور ادبی ذوق کے مالک تھے۔ شعروشاعری کے ساتھ بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ خوش قسمتی سے آپ کو سر عبدالقادر کی دامادی کا شرف بھی حاصل ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحبت میں رہ کر آپ کے شعروادب کے ذوق کو مزید جلا ملی۔ بلکہ سر عبدالقادر کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کے باوجود ان کی طبیعت نظم گوئی کی طرف مائل نہ ہوئی لیکن ان کا غالب رجحان صنفِ غزل کی طرف ہی رہا۔ آپ ابتداً پرگوئی کے شائق تھے لیکن کثرت مشق کے بعد جلد ہی پختہ گوئی کا دور آیا اور پھر گاہے گاہے شعر کہنے لگے۔

تپش کا کلام اُردو کلاسیکی غزل کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی اور دل نشینی ہے اور زبان و بیان پر کامل قدرت ہونے کی بنا پر وہ اپنے جذبات اور مسائل زندگی کے موضوعات کو بڑے سادہ اور دل کش پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ بقول مصنف ''تذکرہ شعرائے اُردو''

> ''تپش پنجاب کے ان غزل گو شعراء میں سے ہیں جنھیں ہندوستان کے غزل گو اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے''۔ [1]

تپش کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا لیکن آپ کا کلام تواتر کے ساتھ ''معارف'' اور دیگر معروف ادبی رسائل کی زینت ہوا کرتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، نظیر لدھیانوی، ص ۳۲۰

مے سے پرہیز شیخ توبہ کرو
ایک ہی چیز تو ہے پینے کی
تم سے کہتا ہے آئینہ خودبیں
باتیں سنتے ہو اس کمینے کی
ہوگیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی
چشمِ تر آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی
اہلِ دنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش کس سے تو نے کی نیکی ❶

⭘⭘

جلوۂ بُت خانۂ ظلمات ہوں
پردہ بردار طلسمِ ذات ہوں
تلخ کامی ہائے ہستی کیا کہوں
میں حریصِ فتنۂ لذات ہوں
عیشِ غم ہو کیوں نہ لذت آفریں
جرعہ نوشِ بادۂ ہیہات ہوں
خاکساری بھی ہے میری جلوہ ریز
آفتابِ عالمِ ذرات ہوں
ہے بقا مصروف اندوہ فنا
یادگار منفی و اثبات ہوں

---

❶ شعرائے پنجاب: تسیم رضوانی، ص ۱۱۱

میری بے قدری نہ کر اے کج نظر
دور کی بھیجی ہوں سوغات ہوں
انتشار طبع کیا کہیے تپش
مدتوں سے مورد آفات ہوں ❶

⭘⭘

وقار انبالوی (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۸ء)

ناظم علی نام' وقار تخلص' ۲۳ جنوری ۱۸۹۶ء ❷ کو ضلع انبالہ کے موضع ملانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد نصیر الدین ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان میں آئے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ ملا محمد طاہر کو "ملانہ" مغل بادشاہوں کی طرف سے جاگیر میں ملا تھا۔ پہلے اس کا نام "مغلانہ" تھا جو کثرت استعمال سے "ملانہ" رہ گیا۔ آپ ابتدا میں عاصف ملانوی ❸ کے نام سے لکھتے تھے لیکن مولانا تاجور نجیب آبادی کے مشورے سے وقار انبالوی قلمی نام اختیار کیا! ❹

آپ نے اپنے بچپن کے ابتدائی دس سال پشاور میں بسر کیے جہاں آپ کے دادا قدرت علی جیلر کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کے دادا کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا' نتیجتاً آپ کے کان بھی پشاور کے دوران قیام میں ہی شعر و شاعری سے آشنا ہو گئے تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد جب آپ اپنے آبائی وطن ملانہ گئے تو آپ کے والد صفدر علی نے نواب احمد مرزا دہلوی کی ایک عزیزہ سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ وقار کی یہ والدہ اہلِ زبان ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں اور خود بھی شعر کہتی تھیں۔ چنانچہ ان کی صحبت میں رہ کر وقار نے نہ صرف زبان دانی میں خاص دستگاہ بہم پہنچائی بلکہ شعر و شاعری کا وہ ذوق بھی' جو ان کے ذہن میں پشاور کے قیام کے دوران میں جگہ بنا چکا تھا' نکھرنا شروع ہوا۔ غرض زبان' اسلوب اور فنِ شعر کی باریکیوں سے آگاہی کے معاملے میں آپ اپنی والدہ کے رہینِ منت ہیں اور یہ

---

❶ تذکرہ شعرائے اُردو' نظیر لدھیانوی' ص ۳۲۰

❷ ہمارے اہلِ قلم' زاہد حسین انجم (مرتب) مطبوعہ ملک بک ڈپو لاہور ۱۹۸۸ء ص ۵۰۳

❸ عاصف بمعنی نرم دل

❹ "شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی............ چند تاثرات" (مقالہ) اکبر لاہوری' مطبوعہ ماہنامہ "پنچ" لاہور (تاجور نمبر) ص ۲۲

انھیں کا فیضِ صحبت تھا کہ آپ کو کسی اور سے مشورہ سخن لینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

وقار انبالوی کا شمار قیامِ پاکستان سے قبل بھی برصغیر کے ممتاز صحافیوں اور شاعروں میں ہوتا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد جہاں وہ پاکستان کے ایک قابلِ احترام صحافی اور شاعر تھے وہیں ان کے افکار سے برصغیر کے وہ تمام حلقے جنھیں صحافت اور شاعری سے کچھ بھی دلچسپی ہے فیض یاب اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ آپ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ''زمیندار'' میں پروف ریڈر کی حیثیت سے کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کانگریسی اخبارات ''پرتاب''، ''ملاپ'' اور ''ویر بھارت'' میں فکاہی کالم بھی لکھتے رہے۔ مگر نظریاتی اختلافات کی بنا پر ان اخبارات کے ساتھ آپ کی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ چنانچہ ان سے علیحدہ ہو کر ۱۹۲۹ء میں روزنامہ ''احسان'' میں آ گئے۔ بعد ازاں کچھ عرصے کے لیے اپنا اخبار ''سفینہ'' بھی نکالا لیکن اس کی بندش کے بعد پھر ''احسان'' کے مدیر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء تک چلتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے آپ روزنامہ ''وفاق'' کے عملۂ ادارت میں بھی شامل رہے لیکن زیادہ تر آپ کا تعلق ''احسان'' ہی سے رہا۔ ''احسان'' کے بعد روزنامہ ''نوائے وقت'' سے تقریباً بیس سال تک منسلک رہے اور اس میں قطعات اور سرراہے کے عنوان سے فکاہی کالم لکھتے رہے اس کے بعد ایک عرصہ خانہ نشینی کی زندگی بسر کی اور ۲۶ر جون ۱۹۸۸ء کو قصبہ کھیووال نزد شرق پور ضلع شیخوپورہ میں، جہاں آپ کی موروثی جائیداد ہے، انتقال کیا۔

وقار انبالوی کا تعلق بھی مولانا ظفر علی خاں کی طرح چونکہ صحافت سے زیادہ رہا ہے، اس لیے انھوں نے غزل کو تو شاذ و نادر ہی ذریعہ اظہار بنایا ہے بلکہ جو کچھ کہا ہے بیشتر نظم کی ہیئت میں کہا ہے۔ پیشہ صحافت سے تعلق کی وجہ سے ان کے یہاں روایتی شاعری کے بجائے ہنگامی شاعری کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، جن میں ہم عصر سیاست اور صحافت کے تقاضے پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایسی نظموں میں وہ کثر ہلکے پھلکے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب سے بھی کام لیتے ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی تقریباً تمام نظمیں بے ساختہ انداز بیان، دلچسپ اسلوب اور روزمرہ کی زبان میں ہیں جن سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وقار انبالوی کا تعلق بنیادی طور پر دیہات سے رہا ہے۔ اس لیے متذکرہ موضوعات کے علاوہ

انھوں نے دیہات کی فضاؤں کے متعلق بھی بڑی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ جن میں دیہات کی دلکشی، پرسکون ماحول اور دیہاتیوں کی سادہ و معصوم زندگی کے دلآویز مرقعے بڑی دلکشی، بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

بہرحال ہنگامی شاعری ہو یا دیہاتی ماحول کی عکاسی ان کی نظموں میں جو بے تکلفی کا انداز اور شگفتہ پن پایا جاتا ہے وہ مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

خدا نے تجھ کو دیا ہے دل حمیت کوش
سریر و تاج پہ ہنستے ہیں تیرے خرقہ پوش

پہنچ سکے نہ ترے شہپرِ عزیمت کو
اگرچہ پھرتے رہے صید مند دام بدوش

تری نگاہ سے ٹوٹا فرنگیوں کا طلسم
ترے کلام نے غیروں کو کر دیا خاموش

خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری
بتانِ عصر ترے خوف سے رہیں روپوش

قوی پہ طنز رہے ترا جسم زار و نحیف
تیرے عتاب سے عاجز ہو صاحب تن و توش

تری زباں پہ رہے لا الٰہ الا اللہ
ترے لہو میں رہے زندگی کا جوش و خروش

کٹھن ہے راہ تمنا قدم بڑھائے جا
قضا و قدر کے رہگیر ہیں تیرے ہم دوش

ترے عمل پہ تقاضا ہے سخت کوشی کا
امیرِ قافلۂ سخت کوش و پیہم کوش

کہ درقبیلۂ ما حیدری زکزاری ست

(ایک لیگی رہنما سے) ❶

○○

جب اہلِ زر کے سر میں سماتی ہے ممبری
گل باغِ آرزو میں کھلاتی ہے ممبری

ممبر کی آرزو پہ زمانے کو رشک ہے
ممبر کے خلق و خو پہ زمانے کو رشک ہے
شہرت پہ ہاؤ ہو پہ زمانے کو رشک ہے

جو کچھ بھی چاہے کرکے دکھاتی ہے ممبری
سو سو طرح کے ناچ نچاتی ہے ممبری

حاکم پہ اس کا رُعب ہے محکوم اس کے ساتھ
چھوٹی بڑی ہزار سفارش ہے اس کے ساتھ
منہ زور ہو جو کوئی تو رشوت سے دے یہ ناتھ

خُرد و کلاں پہ رُعب جماتی ہے ممبری
اچھے بُرے پہ دھونس جماتی ہے ممبری

منتر ہے اِک یہ مال جہاں کے حصول کا
وا اس کی ہر دعا کے لیے در قبول کا
کھٹکا رسوم کا ہے نہ جھگڑا اُصول کا

پابندیوں پہ چوٹ لگاتی ہے ممبری
پمِٹ اور مل الاٹ کراتی ہے ممبری

منزل یہ عیش کی ہے، مگر راستہ کٹھن
لاکھوں ہی کرنے پڑتے ہیں اس کے لیے جتن
ہے دور انتخاب کا اِک دور پُرفتن!

---

❶ بیانِ حال، وقار انبالوی، مکتبہ نوائے وقت لاہور (سن ندارد) ص ۵۶، ۵۷

جب ووٹروں کے ناز اٹھاتی ہے ممبری
نیچا بڑے بڑوں کو دکھاتی ہے ممبری

("ممبری" سے اقتباس) ❶

✿ ✿

رسا جالندھری (۱۸۹۷ء۔۱۹۷۷ء)

محمد کبیر خان نام' رسا تخلص' جالندھر کے نواح میں پٹھانوں کی ایک بستی "غزان" کے ایک باحیثیت زمیندار خاندان میں ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ گھریلو اور سکول کی تعلیم کے بعد علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ طبیعت فطرتاً موزوں پائی تھی اور شاعری کا آغاز سکول کے زمانے ہی سے ہو گیا تھا مگر جب کالج میں عمدہ ادبی ماحول ملا تو اس نے خوب جولانیاں دکھائیں۔ اسی زمانے میں مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ہوا۔ (وفات ۱۹۱۴ء) تو رسا نے بڑے معرکے کا ایک مرثیہ کہا' جو بہت مقبول ہوا اور اس پر انھیں کالج کی طرف سے حالی میڈل انعام ملا۔ اس وقت تک رسا نے کسی سے اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ بعض دوستوں کے مشورے سے ۱۹۱۷ء سے صفی لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی۔ یہ سلسلہ صفی کی وفات (۱۹۵۰ء) تک جاری رہا۔ صفی کو اپنے شاگرد رسا پر بڑا ناز تھا۔ ان سے متعلق صفی کا شعر ہے:

حلاوت سخن دلپذیر کیا کہنا
صفی! رسا ہے نظیری نظیر کیا کہنا" ❷

۱۹۱۷ء کے اواخر میں رسا کے والد کا انتقال ہو گیا تو خانگی ذمہ داریوں کا سارا بوجھ رسا کے کندھوں پر آ پڑا۔ چنانچہ انھیں تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع کرنا پڑا اور ان کی مشق سخن میں بھی خلل واقع ہوا۔ ان دنوں جالندھر شعر و سخن کا ایک مرکز بنا ہوا تھا اور وہاں باقاعدگی سے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جن میں مولانا غلام قادر گرامی اور حفیظ جالندھری جیسے اساتذہ شریک ہوا کرتے تھے۔ رسا بھی اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے وقت نکال کر ان مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں جالندھر میں

---

❶ بیان حال' وقار انبالوی' ص ۱۰۳ تا ۱۰۶
❷ تذکرہ معاصرین' مالک رام' جلد چہارم' مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۶۶

"بزم اقبال" ❶ قائم ہوئی تو رسا اس بزم کے زیر انتظام ہونے والے مشاعروں میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرنے لگے۔ اس طرح ان کی فکر اور ان کا کلام روز بروز نکھرتا چلا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد رسا لاہور چلے آئے اور یہاں کی محافل کو ایک طویل عرصے تک گرماتے رہے۔ آخر ۴ر اپریل ۱۹۷۷ء کو لاہور ہی میں انتقال ہوا۔

رسا کو اگرچہ رباعی، قطعہ، مرثیہ، تاریخ گوئی بلکہ جملہ اصناف سخن پر پوری قدرت حاصل تھی مگر انھیں طبعاً غزل اور نظم کی صنف زیادہ مرغوب تھی اور وہ زبان، اسلوب بیان اور فکر و خیال کے معاملے میں بہت منجھے ہوئے شاعر تھے۔ مصنف "تذکرہ شعرائے اُردو" رسا کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھتے ہیں کہ:

"کلام اہل زبان کا سا ہے۔ غزل گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ زبان نہایت شیریں اور شگفتہ ہے۔ بندشیں چست اور استادانہ ہیں۔ تخیل بلند اور ارفع ہے۔" ❷

نمونہ کے طور پر ایک مکمل غزل ملاحظہ کیجیے:

لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا، دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خواب زلیخا کہیں جسے

---

❶ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ سب سے پہلی "بزم اقبال" تھی جو علامہ اقبال کی اجازت سے جالندھر میں قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں محمود نظامی نے خاص طور پر لاہور میں علامہ سے مل کر اجازت لی تھی۔ (بحوالہ تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد چہارم، ص ۶۷

❷ تذکرہ شعرائے اُردو، نظیر لدھیانوی، ص ۳۳۹۔

دل کی رگوں میں دوڑ کے بے تاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچتا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

پھرتی ہے اِک موج سی ان کی نظر کے ساتھ
اہلِ نشاط نشۂ صہبا کہیں جسے

اِک نقشِ پا ہے شاید فطرت کا راہ میں
دُنیا کی اصطلاح میں دُنیا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اِک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بیکسی کہ ہوا ہے وبالِ دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رسا
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے ❶

✿✿

صوفی تبسم (۱۸۹۹ء۔۱۹۷۸ء)

صوفی غلام مصطفیٰ نام، تبسم تخلص کرتے تھے۔ ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ چرچ مشن ہائی سکول امرتسر سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد خالصہ کالج امرتسر میں داخلہ لے لیا لیکن بی اے کے آخری سال میں لاہور چلے آئے اور ایف سی کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا۔ بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کیا۔ تعلیم اور ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ چند ماہ تک گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں پڑھایا اور پھر وہیں بطور اے ڈی آئی تعینات رہے۔ ۱۹۲۷ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج

---

❶ تذکرہ شعرائے اُردو نظیر لدھیانوی، ص ۳۳۰

لاہور میں پڑھانے پر مامور ہوئے پھر وہاں سے ۱۹۳۱ء میں لاہور کی عظیم درس گاہ گورنمنٹ کالج میں آ گئے۔ جہاں ایک طویل عرصہ تک پڑھاتے رہے اور اسی ادارے سے ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چھے سال تک خانہ فرہنگ ایران لاہور کے ڈائریکٹر رہے اور ساتھ ہی سول سروس اکیڈمی اور فنانس سروسز اکیڈمی میں اُردو پڑھاتے رہے۔ دو سال تک ہفت وار ''لیل و نہار'' لاہور کے ایڈیٹر رہے اور اس کے بعد سے عمر کے آخری حصہ تک ریڈیو سے وابستہ رہے۔ ۷/ فروری ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا۔

صوفی تبسم نے اپنی شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی کر لیا تھا اور چونکہ فارسی زبان و ادب سے انھیں شروع سے ہی بہت رغبت تھی، اس لیے ابتدا میں صرف فارسی زبان میں ہی شعر بھی کہتے تھے اور چونکہ فارسی کلاسیکل ادب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کے فارسی کلام پر قدیم فارسی شعراء کی گہری چھاپ ہے۔ فارسی میں انھوں نے غزل اور نظم ہر دو اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا یہ فارسی کلام ان کے مجموعے ''انجمن'' میں ''بوی گل'' کے عنوان سے ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔ ''انجمن'' کی اشاعت سے پہلے ان کے تین مجموعے دو کشمیر کے سفر میں اور ایک ایران کی سیاحت کے دوران میں ضائع ہو گئے تھے۔ [1] ان میں ان کا فارسی اور اُردو کا کلام درج تھا اور اکثر غیر مطبوعہ تھا۔

صوفی تبسم فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو اور پنجابی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ آپ چونکہ فارسی اور اُردو کی کلاسیکی روایت کا رچا ہوا ذوق رکھنے کے سبب کلاسیکی طرز کے شیدائی تھے اس لیے جذبے کی تہذیب اور توازن آپ کے کلام میں کثرت سے نظر آتا ہے اور غزل چونکہ بحیثیت صنف سخن جمالیاتی بُعد اور نظم و ضبط کی متقاضی ہے۔ اس لیے طبعاً وہ اس صنف کی طرف زیادہ مائل تھے لیکن نظم بھی کہتے تھے اور نظم میں بھی فنکارانہ پختگی کے ساتھ روایت کا گہرا شعور، زبان پر قدرت اور لفظوں کی نشست کا سلیقہ ان کی کہنہ مشقی پر دلالت کرتا ہے۔ ان کی دو نظموں ''اپنا اپنا غم'' اور ''سراغ منزل'' سے یہ دو اقتباس ملاحظہ کیجیے جن میں تبسم نے فنی مہارت کے ساتھ کس قدر سبک لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

اپنا اپنا غم کھاؤ اور اپنا اپنا درد سہو

---

[1] عرض حال (دیباچہ ''انجمن'') صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، فیروز سنز لاہور، سن ندارد، ص ۳

جھوٹے آنسو بہتے ہیں اور جھوٹے ماتم ہوتے ہیں
غیر کا دُکھڑا سننے والے اپنا دُکھڑا روتے ہیں

اپنے من کی بات سنو اور اپنے دل سے راز کہو
اپنا اپنا غم کھاؤ اور اپنا اپنا درد سہو

شمع کے جتنے شیدائی ہیں سب اپنے دیوانے ہیں
اپنی آگ میں سب جلتے ہیں سب اپنے پروانے ہیں

اپنے ہی سب ناز اُٹھاؤ اور اپنے ہی غمخوار رہو
اپنا اپنا غم کھاؤ اور اپنا اپنا درد سہو ❶

✿ ✿

ایک کھوئی ہوئی منزل پہ پہنچنے کے لیے
ہم کئی راہگزاروں سے گزر کر آئے

خارزاروں سے، بیابانوں سے ویرانوں سے
موت کے خوف سے سہمے ہوئے میدانوں سے

کرب و آلام کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے
زندہ لاشوں کے مزاروں سے گزر کر آئے

ان کڑی راہوں میں ایسے بھی مقامات آئے
جستجوؤں کو سفر گاہوں کی راہیں نہ ملیں

اس کٹھن وقت میں کچھ ایسے بھی دن رات آئے
شام کی نور سحر گہ سے نگاہیں نہ ملیں ❷

صوفی تبسم کو نظم کی نسبت غزل زیادہ مرغوب رہی ہے۔ ان کی غزلیں حسن و عشق کی رنگینی کے ساتھ ساتھ ایک حساس اور دردمند دل کی کیفیات کا دلکش اظہار ہیں۔ ان کے یہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار

---

❶ انجمن، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ص ۲۱۱

❷ ایضاً۔ ص ۲۲۲

باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کیفیت اس دور کے اکثر غزل گو شعراء کے یہاں بھی ملتی ہے مگر صوفی تبسم نے اپنے احساسات و جذبات کو جس سادگی، لطافت اور نغمگی کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے ان کے اسلوب بیان میں ایک امتیازی وصف پیدا ہو گیا ہے۔ اسی اسلوب بیان کی بدولت خاص طور پر ان کی چھوٹی بحر والی غزلوں [1] میں سہل ممتنع کی خاصیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایسے بھی تھے کچھ حالات
دل سے چھپائی دل کی بات

ہر اک نے اک بات کہی
کوئی نہ سمجھا دل کی بات

شام و سحر کا نام نہ تھا
ایسے بھی دیکھے دن اور رات

عشق کی بازی کیا کہیے
سوچ سمجھ کر کھائی مات

حسن کے تیور کیا کہنے
ہر لحظہ اک تازہ بات

اشکوں کا طوفان اُٹھا
غم میں ڈوب گئی برسات

سہمی سہمی سی وہ نگاہ
بدلے بدلے سے حالات

اک تبسم اشک آلود
بھیگی بھیگی درد کی بات [2]

○○

[1] ان کی غزلیات کا معتدبہ حصہ چھوٹی بحر والی غزلوں ہی پر مشتمل ہے۔

[2] ''انجمن'' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ص ۱۳۹

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء)

حفیظ نام کا نام تخلص '۱۴ر جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر (بھارت) میں ایک مفلوک الحال محنت کش اور ان پڑھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنے سوانحی حالات کے ضمن میں خود لکھتے ہیں کہ:

''میرے کنبے میں دور دور تک شوق علم تھا نہ ذوق ادب''۔ ❶

ابتدائی سات جماعتوں تک کی تعلیم جالندھر ہی میں حاصل کی مگر پھر مفلسی اور بعض دوسری مجبوریوں کے باعث باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ زیادہ عرصے نہ چل سکا۔ گویا حفیظ معدودے چند اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس کارگہ حیات میں اپنی ذاتی کاوشوں سے کوئی مقام پیدا کیا اور شعر و ادب کی دنیا میں اپنا سکہ بٹھایا۔ حفیظ کو ابتدائی عمر ہی سے علم و ادب سے بے حد دلچسپی تھی اور انھوں نے ذاتی مطالعے سے باقاعدہ تعلیم کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر لیا تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق چونکہ فطری تھا اس لیے لڑکپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے اور جب اپنے زمانے کے فارسی شعر و ادب کے فاضل اُستاد' اپنے ہم وطن' مولانا غلام قادر گرامی سے اصلاح سخن لینے لگے تو ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اور نکھر گئیں۔ علم و ادب سے تو دلچسپی تھی ہی لہٰذا لاہور میں رہ کر جو ایک زمانے سے طباعت و اشاعت اور شعر و ادب کا مرکز چلا آرہا ہے تھا بلکہ بقول شاہد احمد دہلوی:

''لاہور سدا سے ادب و شعر کی منڈی رہا ہے''۔ ❷

ادبی رسائل و کتب کی ادارت و اشاعت کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کیا۔ بعد ازاں دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت نے ان کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے انھیں آل انڈیا ریڈیو (دہلی) میں ڈائریکٹر جنرل سانگ پبلسٹی کا اہم عہدہ تفویض کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے مستقل طور پر لاہور میں بود و باش اختیار کر لی۔ پاکستان کے مختلف شہروں اور آزاد کشمیر میں کئی سال تک شعبہ نشر و اشاعت میں فرائض سرانجام دیے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شعر و سخن کی

---

❶ تکاپوئے شیریں' حفیظ جالندھری' مجلس اردو' کتاب خانہ حفیظ لاہور ۱۹۵۹ء ص ۱۸

❷ بزم خوش نفساں' شاہد احمد دہلوی' مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی' مطبوعہ اسلوب کراچی' ص ۱۴۵

طرف بھرپور توجہ دی اور ایک مدت تک شعر و ادب کی آبیاری کرتے ہوئے آخر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو انتقال کیا۔

فردوسی کے "شاہنامہ" کے انداز پر اُردو میں "شاہنامہ اسلام" لکھنا جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں حفیظ نے اسلام کی درخشندہ تاریخ کو نہایت موثر پیرائے میں نظم کیا ہے بلاشبہ حفیظ کا ایک کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مملکتِ خداداد پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کی بنا پر پاکستان کا ہر فرد حفیظ سے متعارف ہے۔ لیکن حفیظ کی شاعری کا کمال ان دونوں چیزوں سے اتنا ظاہر نہیں ہوتا جتنا ان کے گیتوں اور گیت نما نظموں سے ہوتا ہے۔ یہ نظمیں لکھنے میں حفیظ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے گیت کی قدیم روایات کی پابندی کرتے ہوئے اس میں نئی نئی راہیں نکالی ہیں اور اپنی طبیعت کی اختراع سے حسن و موسیقی کا ایسا امتزاج پیدا کیا ہے جس سے رجز یہ جوش اور سرمستی کا اظہار ہوتا ہے۔ گیت کی صنف پر تبصرہ کرتے ہوئے ہری چند اختر نے "سوز و ساز" کے دیباچے میں حفیظ کو اس صنف کا موجد قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ وہ صنف ہے جس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی حالانکہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان یہ سوال کر سکتا ہے کہ موسیقی جو ہندوستانی طبائع پر زبردست اثر رکھتی ہے کیا اس کا اُردو پر اتنا حق بھی نہ تھا کہ ہمارے شعراء اپنے سوز و گداز کا اظہار کرتے وقت اس سے کام لیتے؟
دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و سرمستی کا اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں حفیظ مخصوص صنف کا موجد ہے اور کامیاب موجد۔ اس کے گیتوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی لذت ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ اس کے قلم نے گیت کو وہ مقام بخشا ہے کہ اُردو زبان ہمیشہ حفیظ کی احسان مند رہے گی"۔ [1]

حفیظ نے اپنے گیتوں میں چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں، ہندی کے نرم و نازک الفاظ فارسی کی

---

[1] دیباچہ "سوز و ساز" پنڈت ہری چند اختر مطبوعہ مجلس اُردو کتاب خانہ حفیظ اُردو بازار لاہور ۱۹۵۸ء ص ۳۶

شیریں تراکیب کے استعمال، تکرار الفاظ، بول چال کے لب ولہجہ اور انداز بیان کی گھلاوٹ سے ایسے خوبصورت گیت لکھے ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔ حفیظ کے گیت 'ابھی تو میں جوان ہوں' برسات' کرشن کنھیا' طوفانی کشتی' بسنتی ترانہ' فرقت یار میں' پی جا' تاروں بھری رات' جاگ سوز عشق' کرشن بنسری' دل ہے پرائے بس میں' پرانی بسنت، پریت کا گیت' سپنا' اُلفت کا اظہار' اندھی جوانی' حسن اور موت اور کامل کا گیت اُردو میں گیت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں موسیقیت' نغمگی اور تاثیر اس درجہ ہے کہ پڑھنے والا جھوم جھوم جاتا ہے۔ ''ابھی تو میں جون ہوں'' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

ہوا بھی خوشگوار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنم ہزار ہے بہار پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا
ادھر تو لوٹ' ادھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اُٹھا سبُو سبو اُٹھا
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیال زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں [1]

حفیظ کی انفرادیت یہی نہیں کہ انھوں نے اُردو شاعری میں نئی طرز کے گیت لکھے اور انھیں عام کیا بلکہ موضوعات' خیالات' منظر کشی کے منفرد انداز اور تشبیہات وتلمیحات کے اعتبار سے بھی ان کا کلام انقلاب آفریں جدت کا حامل نظر آتا ہے۔ حفیظ خالصتاً ہندوستان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری

---

[1] نغمہ زار' حفیظ جالندھری' مطبوعہ مجلس اُردو' کتاب خانہ حفیظ لاہور ۱۹۵۷ء ص ۵۹

میں اسی سرزمین کے تمدن اور طرز معاشرت کی عکاسی کی ہے جبکہ اکثر و بیشتر متقدمین شعراء کی شاعری کا پس منظر ایران ہے۔ ان کی شاعری میں خیالات و جذبات بلکہ محاورات اور طرزِ تکلم تک سب کچھ ایران سے مستعار ہے۔ بقول پروفیسر پطرس بخاری:

"ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں"۔ ❶

وہ قدرت کے مناظر کا مقابلہ صرف مانی اور بہزاد کی مرقع کاریوں سے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اگر زمین پر عکس گلبن پڑتا ہے تو انھیں نرگسِ شہلا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ حالانکہ ہندوستان میں ہیں لیکن کنارِ رکنا باد کی بزم مے نوشی اور گلگشت مصلیٰ سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایرانی باغوں اور مرغزاروں کے طور پر بلبل کے سوا کسی اور پرندے کا زمزمہ فردوسِ گوش نہیں بنتا۔ لیکن اس کے برعکس حفیظ کے یہاں بسنت بہار کا پیش خیمہ ہے، جب سرسوں پھولتی ہے تو باغوں اور کھیتوں میں لڑکے ڈور اور پتنگ کی خاطر باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ کوئی مار کھاتا ہے کوئی ہنستا کھلکھلاتا ہے اور کوئی کھڑا منہ چڑاتا ہے۔ خون میں جوش ہے اور عشق و جنون کو سرمستی کی کیفیت ہے اور دوسری جانب عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی عورت پھولوں کے زرد گہنے پہنے اپنے شوہر کے فراق میں اُداس ہے جو پردیس میں ہے:

اک نازنیں نے پہنے — پھولوں کے زرد گہنے
ہے مگر اُداس — نہیں پی کے پاس — غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے — اک نازنین نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

(بسنتی ترانہ) ❷

---

❶ نغمہ زار (دیباچہ) سید احمد شاہ بخاری پطرس، ص ۱۸

❷ نغمہ زار (دیباچہ) سید احمد شاہ بخاری پطرس، ص ۸۵

اسی طرح جب برسات آتی ہے تو باغوں میں بلبل کے بجائے کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی ہے۔ آموں کی ڈالیوں میں لڑکیاں پینگیں چڑھاتی ہیں اور میٹھے میٹھے اور رسیلے گیت گاتی ہیں۔ کبھی ہنستی مسکراتی ہیں تو کبھی ایک دوسری کا منہ چڑاتی اور ہلّو مچاتی ہیں:

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے برق افگنوں نے

گیت ان کے پیارے میٹھے رسیلے!

ہلکی صدائیں سادہ ادائیں

گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں

خود مسکرانا خود منہ چڑانا پھر جھینپ جانا

الھڑ پنے سے!

(برسات) ❶

"نغمہ زار" کے علاوہ حفیظ کے دوسرے مجموعوں "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" کی نظموں میں بھی یہی مقامی رنگ اسی طرح نمایاں ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مقامی رنگ کے باوجود نظموں کی دلچسپی محدود نہیں ہوتی بلکہ ایرانی فضا کے مقلدوں کو بھی ان سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو خالص ہندوستانی

---

❶ نغمہ زار ص ۲۶

شاعری سے ہونا چاہیے اور یہی حفیظ کی قادر الکلامی اور شعر سے فطری مناسبت کا ثبوت ہے۔

اقبال اور ان کے کلام کے ساتھ والہانہ شغف نے اس زمانے کے بہت سے شعراء کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کے انداز کلام سے متاثر کیا۔ حفیظ بھی اس سے متاثر ہوئے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''اقبال مسلمانان ہند کے عملی اور ذہنی رہنما تھے۔ فلسفی بھی تھے۔ حکمت آموز اور حکمت شناس بھی تھے۔ حفیظ پر ان کا مستقل اور دیرپا اثر ہوا''۔ (۱)

چنانچہ حفیظ کی بہت سی نظموں سے اس اثر کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظموں 'نصب العین' رندگی' مدینے کا مسافر' شہیدوں کی عید' درہ خیبر' آخری رات' اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے' نیرنگِ فرنگ' عزم آدم' تصویر کشمیر اور خون کے چراغ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے خیالات کی تفسیر کی گئی ہے.......... ''نیرنگِ فرنگ'' سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ فلسفہ یہ علم یہ حکمت یہ کمالات
یہ فکر یہ تدبیر یہ اعمال و خیالات
یہ بحث یہ تمحیص' جوابات سوالات
یہ گولہ یہ بارود' ہلاکت کے یہ آلات

ہر صبح' جلال و غضب و طیش کی صورت
ہر شام' جمال و طرب و عیش کی صورت (۲)

غرض کہ حفیظ نہ صرف ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق کی حیثیت سے بلکہ اپنے نئی طرز کے مترنم گیتوں اور اپنی شاعری کے متنوع موضوعات' خیالات' جذبات' تشبیہات' تلمیحات اور مخصوص انداز کی منظر کشی

---

(۱) حفیظ جالندھری کی شاعری ___ نالہ پابند نے (سخن ور) ڈاکٹر سید عبداللہ' مطبوعہ مغربی پاکستان۔ اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۱۳۵

(۲) تکلفہ شیریں' حفیظ جالندھری' ص ۱۳۹

کے اعتبار سے اپنے دور کا بڑا اہم شاعر ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

''حفیظ جو کچھ بھی ہے اپنے دور کی رومانی ادبی تحریک کا ناقابل فراموش' مقبول ترین اور اثر چھوڑنے والا شاعر ہے جس کی شاعری کے نقوش اتنے مستقل اور دیرپا ہیں کہ مٹانے کی ہر کوشش کے باوجود نہیں مٹ سکے'' ❶

✿ ✿

مولانا حامد علی خاں حامد (۱۹۰۱ء۔۱۹۹۵ء)

مولانا حامد علی خاں' مولانا سراج الدین احمد کے بیٹے اور مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ ۱۴ رجنوری ۱۹۰۱ء کو کرم آباد ❷ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں ہوئی جہاں سے امتیاز کے ساتھ بی اے کیا۔ کالج کے ایام میں ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ آپ نے دوران تعلیم میں ہی اس میں بھی پرجوش حصہ لیا اور اس زمانے میں صرف کھدر میں ملبوس رہتے تھے۔ ❸

بی اے کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ تک وہیں پڑھاتے رہے لیکن طبیعت اُچاٹ ہو جانے پر واپس پنجاب چلے آئے اور ۱۹۲۵ء میں ماہنامہ ''ہمایوں'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ بیس سال تک بہ حسن وخوبی یہ فرائض سرانجام دے کر قابلِ تقلید مثال قائم کی۔ اس کے علاوہ آپ نے مختلف اوقات میں ''مخزن'' اور ''الحمرا'' کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے اور ان تاریخی کردار کے حامل رسائل کے ذریعے اُن گنت ادیبوں اور شاعروں کو دنیائے علم وادب سے روشناس کرانے کے بعد بام عروج تک پہنچایا۔ آپ ہمیشہ نام ونمود سے گریزاں اور اپنے کام میں منہمک رہے۔ خلوت پسند ہونے کی بنا پر لوگوں سے روابط کچھ زیادہ نہیں لیکن شعروادب کا ذوق ورثے میں پایا تھا' اس لیے زیادہ تر خانہ نشین رہے۔ قوی مضمحل ہو گئے مگر پھر بھی مقدور بھر شعروادب کی خدمت میں تادم آخر مصروف رہے۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

---

❶ حفیظ جالندھری کی شاعری .... نالہ پابند نے (سخنور) ڈاکٹر سید عبداللہ' ص ۱۵۳

❷ ''کرم آباد'' مولانا سراج الدین احمد کے والد مولوی کرم الٰہی کے نام سے منسوب ضلع گوجرانوالہ میں وزیر آباد سے سیالکوٹ جانے والی سڑک کے کنارے وزیر آباد سے چند کلومیٹر دور ایک سرسبز وشاداب چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی آخری آرام گاہ بھی اسی جگہ ہے۔

❸ شعرائے پنجاب' تبسیم رضوانی' ص ۱۶۳

مولانا حامد علی خاں صاف ستھری نثر لکھنے میں بھی معروف ہیں۔ مگر ان کا شعری ذوق انتہائی پاکیزہ اور ارفع ہے۔ کسی زمانے میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں سے متاثر ہو کر کثرت سے قومی نظمیں بھی لکھیں اور انھیں کے رنگ میں غزلیں بھی کہیں مگر اس طرح کہ متانت کا رنگ ہر جگہ غالب ہے اور یہ "متانت اس قدر ہے کہ صف اوّل کے شعراء میں بھی شاید ہی کسی کے کلام میں موجود ہو" ❶ خاص طور پر غم واندوہ اور حرمان و بدنصیبی کے مضامین باندھنے میں انھیں یدطولیٰ حاصل ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کی نظم "یتیم بچی" سے اقتباس اور ایک مختصر غزل ملاحظہ کیجیے:

مجھ سے محبت کرنے والا
اُلفت کا دم بھرنے والا
کوئی نہیں اس دنیا میں
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

پیار سے کون بلائے مجھ کو
گود میں کون بٹھائے مجھ کو
میرے ناز اُٹھانے والا
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

اچھی کہانی مجھ کو سنا کر
پیار سے اپنے پاس بلا کر
چہرے پہ نظریں گاڑنے والا
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

جاگ اُٹھوں نہ سلائے کوئی
سوتی رہوں نہ جگائے کوئی
جس کو ہو میری بھی پروا
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

---

❶ شعرائے پنجاب، تسیم رضوانی ص ۱۶۴۔

سوتے سوتے اگر ڈر جاؤں

پھر بھی تم کو پاس نہ پاؤں

اماں! اماں! پیاری اماں　　　　اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

(یتیم بچی) ❶

✿ ✿

غم خانہ کہیں اور ہے مے خانہ کہیں اور

دل آج کہیں اور ہے دیوانہ کہیں اور

ہر شعلہ ہے اے شمع اسے نار براہیم

جل ہی نہیں سکتا ترا دیوانہ کہیں اور

اے راہ نوردانِ حرم میری خبر لو

کیا لے گئی وہ نرگسِ مستانہ کہیں اور

جب تک کہ سلامت ہے قدم پیرِ مُغاں کا

جائز ہی نہیں سجدۂ شکرانہ کہیں اور

پہلے ہی یہ عالم ہے دو عالم سے پرے ہوں

لے جائے گی کیا گردشِ پیمانہ کہیں اور

ہاں اے دلِ دیوانہ یونہی خوب نبھے گی

ہم اور کہیں ، حامدِ فرزانہ کہیں اور ❷

✿ ✿

تصدق حسین خالد (۱۹۰۱ء۔۱۹۷۱ء)

تصدق حسین خالد کو لاہور کے دبستان شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اُردو شعر و ادب کے کم و بیش تمام نقادوں نے تسلیم کیا ہے کہ اُردو آزاد نظم سب سے پہلے خالد ہی نے شروع کی تھی۔ نظم

❶ شعرائے پنجاب، تسیم رضوانی، ص ۱۹۴

❷ تذکرہ شعرائے اُردو نظیر لدھیانوی، ص ۳۳۴

آزاد کے قافلے کے اس پیش رو کا آبائی وطن مشہور مردم خیز قصبہ بٹالہ ضلع گورداسپور ہے۔ جہاں خالد کا خانوادہ صدیوں سے آباد اور اپنے علم و ہنر کی بنا پر دور و نزدیک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خانوادے کے تعلیم اور تعلّم کی نسبت سے اکثر افراد کا نام بہت معروف تھا۔ خالد کے پردادا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اتالیق تھے اور دادا اپنے وقت کے مشہور عالم و فاضل تھے، جن کی مساعی سے بٹالہ ہائی سکول قائم ہوا تھا۔ میاں فضل حسین کا تعلق بھی، جو تقسیم ہند سے پہلے پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں، اسی قصبے اور اسی خاندان سے تھا۔

خالد ۱۹۰۱ء میں پشاور میں، جہاں ان دنوں آپ کے والد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے کچھ ہی دنوں بعد آپ کے والد کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا، جہاں ان کا ایک طویل عرصہ بسر ہوا۔ چنانچہ خالد نے اپنا لڑکپن راولپنڈی میں گزارا۔ آپ بچپن ہی سے بڑے ذہین و فطین تھے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی سے ۱۹۱۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد گارڈن کالج میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۹ء میں فرسٹ ڈویژن ہی میں انٹرمیڈیٹ کیا اور کالج میں اوّل آئے۔ بی اے کرنے کے لیے آپ لاہور چلے آئے جہاں ان دنوں آپ کے بڑے بھائی محمد صادق سلامیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۱ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد انگریزی زبان و ادب میں اپنی استعداد کے بل بوتے پر ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر انگریزی میں ایم اے بھی کر لیا۔ اسی سال سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں بطور ای اے سی تعینات رہے لیکن ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک چل سکا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء ہی میں آپ انگلستان گئے جہاں سے بیرسٹری پاس کی اور اسی دوران میں ''لندن سکول آف اورینٹل سٹڈیز'' کی معرفت لندن یونیورسٹی سے مولانا حالی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ مستقل طور پر لاہور آ گئے اور وکالت شروع کر دی۔ جلد ہی آپ کا شمار لاہور کے کامیاب ترین وکلاء میں ہونے لگا۔

خالد نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا اور اپنے افکار سے اپنے عہد کو بہت کچھ دیا۔ ان کی تخلیقی

کاوشوں سے ادبی سرمایے میں اور بھی اضافہ ہوتا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۱۳؍مارچ ۱۹۷۱ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

خالد کو شعر و ادب کے ساتھ زمانہ طالب علمی ہی سے دلچسپی تھی۔ قیام انگلستان کے دوران میں آپ کی ملاقات انگریزی ادب کے مشہور ادیب مسٹر برٹن اور معروف شاعر مسٹر روزیٹی سے ہوئی۔ ❶ جن کی وساطت سے ان کا وہاں کے ادبی حلقوں میں آنا جانا ہو گیا اور اس سے نہ صرف جدید شعراء، مصنفین اور نقادانِ فن سے راہ و رسم ہو گئی بلکہ انھیں جدید انگریزی ادب اور شعر آزاد (Verslibre) کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ جس سے ان کے اپنے خیالات میں بھی زبردست تبدیلیاں آئیں اور ان کے ذہن میں آزاد شاعری کی صنف کو اُردو میں بھی رواج دینے کا خیال پیدا ہوا۔ لکھتے ہیں:

"انگلستان میں آزاد شعر کے وسیع مطالعہ اور اس کے امکانات کو دیکھ کر میں نے اسے باقاعدہ اُردو شاعری میں روشناس کرنے کا ارادہ کیا"۔ ❷

خالد اپنی افتادِ طبع اور انگریزی ادب میں ادراک کی مناسبت سے انگلستان جانے سے پہلے ہی اُردو میں چند آزاد نظمیں لکھ چکے تھے اور فیروز پور میں منعقدہ ایک مشاعرے میں سنا بھی چکے تھے۔ ❸ لیکن اس صنف کو اُردو میں متعارف کرانے اور رواج دینے کا عزم راسخ انھوں نے قیام انگلستان کے عرصے میں ہی کیا۔ چنانچہ انگلستان سے وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اس انداز کی نظمیں لکھ کر بھیجتے رہے۔ ❹

اُردو میں آزاد نظم کی داغ بیل سے متعلق تفصیل میں جانا اگرچہ ہمارا موضوع نہیں تاہم اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا بیان دہرانا ضروری ہے تاکہ حق بہ حق دار رسید کے

---

❶ لامکاں تا لامکاں' تصدق حسین خالد' مطبوعہ مکتبہ نصرت کراچی ۱۹۷۶ء ص "ز"

❷ لامکاں تا لامکاں' تصدق حسین خالد' مطبوعہ مکتبہ نصرت کراچی ۱۹۷۶ء ص ش

❸ ایضاً

❹ ایضاً ص ت

مصداق خالد کو ان کا حق مل سکے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''............جس شاہراہ کی اگلی منزلوں کے خوش نصیب راہرو میراجی اور ن۔م راشد وغیرہ تھے اس کا پہلا حوصلہ مند مسافر خالد ہی تھا''۔ ❶

اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا بیان ہے کہ:

''وہ (خالد) اُردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے قافیے اور ردیف کی پابندیوں سے نجات پا کر شعرِ آزاد کی بنیاد رکھی''۔ ❷

خالد کی شاعری کی انفرادیت دو خصوصیات پر مبنی ہے۔ ان میں سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ انھیں اس صنف میں اوّلیت کا رتبہ حاصل ہے اور اس طرح اُردو نظم کو ایک قدم اور آگے بڑھنے کا موقع ملا' اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اور دوسری خصوصیت ان کا وفور جذبہ اور شدت احساس ہے۔ یہ جذبہ اور احساس اگرچہ مختلف ادوار میں مختلف رنگ اختیار کرتا نظر آتا ہے تاہم ان کی شاعری کا لازمہ ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کی نظموں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

مسرت کھیلتی ہے شاد کام آرزو ہو کر
جمال و ناز و موسیقی کی رنگیں' دلستاں پریاں
صداقت' درد اور معصومیت کی دل نشیں حوریں
محبت کی حریم قدس میں اِک رقص کرتی ہیں
حسین فطرت کی زیبائی میں سو طرح رنگ بھرتی ہیں
نوائے وقت کی اِک راگنی منظوم ہوتی ہے
جہاں میں زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

(محبت) ❸

✿✿

تعارف (لامکاں تا لامکاں) ڈاکٹر سید عبداللہ' ص غ

دے صورتیں الٰہی' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' ص ۱۴۳

لامکاں تا لامکاں' تصدق حسین خالد' ص ۱۰

مغرب کے تمدن زار میں،
خیرہ کن رعنائیوں کے درمیاں بیٹھا ہوا،
دل میں اُٹھا اضطراب،
چھا رہا ہے کائناتِ روح پر سیلابِ نور
شعبدہ ہے، خواب ہے، اعجاز ہے
اے وطن!
تو کہ اتنا دور تھا، اس وقت میرے پاس ہے
کیا بات ہے؟

(یادِ وطن) ❶

⭘ ⭘

وہ سسکتے ہوئے، مرجھائے ہوئے موت کے دن
بیت گئے
آج پامال ہے باطل کا طلسم،
آج آزاد فضاؤں میں ہے سرگرمِ خروش،
روحِ بیباک کی آتش نفسی،
اک نئے دور کی صبح
چیر کر سینۂ مشرق کو اُبھر آئی ہے
آؤ اس صبح کی رنگینی کو
سرخیٔ خونِ شہیداں دے کر
ابدی سوز کا جوہر بخشیں

(بھول جاؤ غم واندوہ کے دن) ❷

⭘ ⭘

---

❶ لامکاں تا لامکاں، تصدق حسین خالد، ص ۲۷

❷ لامکاں تا لامکاں، تصدق حسین خالد، ص ۱۴۳

ہری چند اختر (۱۹۰۱ء۔۱۹۵۸ء)

پنڈت ہری چند جو اختر تخلص کرتے تھے اپریل ۱۹۰۱ء میں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم زیادہ تر لاہور میں حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد منشی فاضل اور پھر بتدریج انگریزی میں ایم اے کیا۔ ابتدا میں تین چار سال اخبار نویسی کی پھر پنجاب اسمبلی کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ بعدازاں حکومت ہند کے جنگی پروپیگنڈا کے محکمے سے منسلک رہے پھر آل انڈیا ریڈیو میں پہنچ گئے۔ تقسیم ملک تک ان کا زیادہ تر قیام لاہور ہی میں رہا۔ تقسیم کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔

ہری چند کو ابتدا ہی سے زبان اُردو اور شعر سے خاص شغف تھا۔ طبیعت میں مزاح کا مادہ بے حد تھا۔ اس لیے احباب میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ''لاہور کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص حیثیت کے شخص تھے۔'' [1] مصنف تذکرہ شعرائے اُردو جن کا آپ سے دوستانہ تھا' آپ کے احوال میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے پنڈت جی سے اسی زمانہ میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ جب آپ ایم اے میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس زمانے میں حفیظ جالندھری اور سید عابد علی عابد سے بہت دوستی تھی۔ مزاحیہ اشعا کہنے اور دوسرے شعراء کے کلام کی پیروڈی لکھنے میں بہت مشاق ہیں۔ دوسرے شعراء کے پڑھنے کی بھی نقل اُتارنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ غرض ہر وقت دوستوں کے لیے قہقہوں کا سامان مہیا کرنے میں مصروف رہتے ہیں''۔ [2]

پنڈت ہری چند اختر نے مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں قسم کی شاعری کی ہے۔ اپنی شگفتہ طبیعت اور اپنی جاندار شاعری کی بدولت انھیں تمام طبقوں میں پسند کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> ''پنڈت ہری چند اختر پنجاب کے نامی گرامی شاعر تھے۔ تحت اللفظ کلام سناتے لیکن مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول تھے اور شاید مسلمانوں میں زیادہ ہی پسند کیے جاتے تھے.......... ان کے حلقہ احباب میں مسلمان ادیبوں اور

---

[1] ادیب اور مصنف' شیخ محمد اسماعیل پانی پتی' نقوش (لاہور نمبر) ص ۹۱۶

[2] تذکرہ شعرائے اردو' نظیر لدھیانوی' ص ۳۶۴

شاعروں کی کثرت تھی"۔ ❶

ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدہ شاعری میں انھیں صنفِ غزل پسند ہے اور غزل میں کلاسیکی انداز کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ زبان نہایت صاف ستھری، رواں، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

سیر دُنیا سے غرض تھی، محوِ دنیا کر دیا
میں نے کیا چاہا، مرے اللہ نے کیا کر دیا

آرزو کی پُرسکوں بستی میں ہل چل ڈال دی
اِک نگہ سے تو نے دل میں حشر برپا کر دیا

ہاں اسی کمبخت دل نے کر دیا افشائے راز
ہاں اسی کمبخت دل نے مجھ کو رسوا کر دیا

سرد آہوں کے سوا اب دل میں کچھ باقی نہیں
تو نے اے سوزِ محبت مجھ کو ٹھنڈا کر دیا

زندگی بیٹھی تھی اپنے حسن پر بھولی ہوئی
موت نے آتے ہی سارا رنگ پھیکا کر دیا

حسن کو پہنا چکے جب خود نمائی کا لباس
عشق نے سر پیٹ کر پوچھا کہ یہ کیا کر دیا

حسن کی پہلے تو سب مجھ پر حقیقت کھول دی
اور پھر خاموش رہنے کا اشارا کر دیا

بیکسی کے دوش پر ایک بوجھ تھا بادِ اُمید
مرحبا اے یاس تو نے بوجھ ہلکا کر دیا ❷

✪✪

❶ دے سے صور تیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۳۳

❷ تذکرۂ شعرائے اُردو، اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، ص ۲۶۵

حکیم نیرؔ واسطی (۱۹۰۱ء۔۱۹۸۲ء)

حکیم نیرؔ واسطی ۱۹۰۱ء میں یوپی کے ایک قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں واسطی سادات کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سید علی احمد اور تخلص نیرؔ تھا۔ والد سید مظفر حسین' جو حال وقال اور تصوف وعرفان کی محفلوں میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوا کرتے تھے' نگینہ ضلع بجنور میں وکالت کرتے تھے۔ نیر ابھی نو سال ہی کے تھے کہ باپ کے سایے سے محروم ہو گئے لیکن حصول علم کا شوق تھا اس لیے باوجود مشکلات کے مذہبی تعلیم اور علوم متداولہ کے علاوہ طبی تعلیم میں کمال حاصل کیا۔ آپ لاہور میں ۱۹۲۵ء میں آئے ❶ اور جلد ہی حکمت کے میدان میں آپ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ حکمت کے علاوہ شاعری آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک طویل عمر پانے کے بعد لاہور ہی میں ۱۹۸۲ء میں انتقال کیا۔

نیرؔ کو شاعری کے ساتھ بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ ابتدا میں نعت اور غزل کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ مختلف اوقات میں اکبر وارثی میرٹھی' بیخود دہلوی اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لی۔ اس دور میں عقیدت اور محبت ان کا خاص موضوع سخن رہا۔ لاہور میں آنے کے بعد علی برادران' علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خاں' مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے قومی زعماء سے متاثر ہو کر طبیعت نظم گوئی بالخصوص قومی رنگ کی نظموں کی طرف مائل ہو گئی۔ ۱۹۲۶ء سے آپ کا دوستانہ اختر شیرانی سے ہو گیا تھا ❷ جو اختر کی وفات (۱۹۴۸ء) تک قائم رہا۔ اختر شیرانی ان کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ ❸ نیر بھی اختر کی بلانوشی کے باوجود ان کی بڑی تکریم کرتے تھے۔ ❹ لیکن گہرے تعلقات کے باوجود شاعری میں ان سے بہت کم اثر لیا ہے۔

نیرؔ نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہی ہے۔ وہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''اپنے میلان کے اعتبار

---

❶ حکایت جنوں (مقدمہ) شعر وحکمت نیر واسطی مطبوعہ ملک سراج دین اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۸ء ص ۱۹

❷ ایضاً ' ص ۲۳

❸ ایضاً ص ۲۴

❹ حکایت جنوں (مقدمہ) شعر وحکمت نیر واسطی ص ۲۵

سے ایک رومانی شاعر ہیں"۔ ❶ ان کی نظموں میں حریت اور آزادی کے جو احساسات ملتے ہیں ان سے ان کے کردار کے انفرادی نقوش بھی نمایاں ہوتے ہیں جو اُن کی نظموں اور غزلوں میں یکساں ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر ایک مختصر نظم اور ایک غزل سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

چشم سے گوں ہے تری بادہ چکاں اے ساقی!
ترے ساغر سے ہے سرشار جہاں اے ساقی
تو نے پھر ابلقِ ایام کا رُخ پھیر دیا
تھی ترے ہاتھ میں قسمت کی عناں اے ساقی
تو نے صحرا میں پھر اک آبلہ پا بھیج دیا
خشک تھی دیر سے کانٹوں کی زباں اے ساقی
مٹ گئے اور سب آثار جم و کے لیکن
تیرا خم خانہ ہے آباد یہاں اے ساقی
مجھ کو اس شاعرِ روماں ❷ سے ہے نسبت خاص
تھا جو سر حلقۂ رندانِ جہاں اے ساقی
(خطاب بہ ساقی)❸

✿✿

بہار صبح نے گُل کو رُلا کے چھوڑ دیا
شراب ناب کو شبنم بنا کے چھوڑ دیا
کوئی بتائے کہ اس ناخدا کو کیا کہیے
سفینہ جس نے بھنور میں پھنسا کے چھوڑ دیا

---

❶ نقادانِ فن کے تاثرات (اختتامیہ) شعر و حکمت، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۸۷

❷ اختر شیرانی

❸ شعر و حکمت، نیر واسطی، ص ۷۵

وہ سخت جاں ہوں کہ جب کامیاب ہو نہ سکی
تری جفا نے مجھے آزما کے چھوڑ دیا
ستم ہے تیری جفائے وفا نما کہ مجھے
جفا و جور کا خوگر بنا کے چھوڑ دیا
وہی ہے زمزمہ پیرا دلوں میں اے نیر
جسے نصیب نے شاعر بنا کے چھوڑ دیا ❶

⭘⭘

فاخر ہریانوی (۱۹۰۱ء۔۱۹۷۸ء)

دین محمد نام' فاخر تخلص' ۱۳ر نومبر ۱۹۰۱ء کو ہریانہ ضلع ہوشیار پور (بھارت) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے ابتدائی حالات صرف اس قدر معلوم ہیں کہ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے ایک ہونہار طالب علم تھے جہاں سے بی اے کرنے کے بعد ۲۶۔۱۹۲۵ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے قائم کردہ ''اردو مرکز'' لاہور کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے رُکن بن گئے اور اصغر گونڈوی کے چلے جانے کے بعد مرکز کے منتظمین میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں چند ماہ تک لجیسلیٹو کونسل میں مترجم کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ سررشتہ تعلیم پنجاب سے منسلک ہوئے اور مختلف سرکاری سکولوں میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے ۱۹۴۲ء میں تبدیل ہو کر پسرور (سیالکوٹ) آئے' بالآخر ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں (گجرات) سے بحیثیت ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے اور بقیہ حیات مستعار پسرور (سیالکوٹ) میں عزلت اور گوشہ نشینی میں بسر کرنے کے بعد ۲۱ر اپریل ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔

فاخر کو شعر و سخن کے ساتھ فطری لگاؤ تھا۔ چودہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ شاعری کے ابتدائی دور کا پبلک طور پر آغاز جالندھر سے ہوا۔ لاہور آئے تو حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی' سید عابد علی عابد' عبدالمجید سالک' صوفی تبسم' ہری چند اختر' اختر شیرانی، حکیم احمد شجاع' ڈاکٹر تصدق حسین خالد' جیسے سخنوروں اور سخن شناسوں کی رفاقت اور صحبت نے شاعری کے خداداد جوہر کو مزید جلا بخشی۔ آپ کی شاعری کا دورِ عروج ۱۹۲۱ء سے لے کر کم و بیش قیام پاکستان تک ہے۔ کلام زیادہ تر ادبی دنیا' شاہکار'

---

❶ شعر و حکمت' نیر واسطی' ص ۱۴۱

ہمایوں، نیرنگِ خیال اور شباب اُردو میں شائع ہوا کرتا تھا جو یکجا ہو کر "موجِ صبا" کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

فاخر ہریانوی اوّل و آخر "نظم" کے شاعر ہیں اور انھوں نے زیادہ تر فطرت کے موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی سے بنایا ہے کہ وہ شاعرِ فطرت کہلانے کے مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری اپنے وقت کی تصویر بھی ہے، جس میں نہ صرف عام طور پر اُردو شعر کی تحریکوں کے شواہد ملتے ہیں بلکہ سیاسی اور سماجی فضا کی عکاسی بھی ہے۔ ان کی وہ نظمیں جو فطرت کے رنگ اور آہنگ کی حامل ہیں مثلاً کوئل، شام، تاروں بھری رات میں (ڈل کے کنارے پر)، ہمالہ، ہریانہ، جنگل کی شہزادی، راوی کے کنارے، دیہات کی صبح، دیہات کی رات، برسات وغیرہ ہمیں علامہ اقبال کی فطری شاعری کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کی بعض نظموں سے مثلاً شہرِ حسن، دیارِ محبت، آخری ملاقات، لمحۂ گریزاں، فراق، پھر آ گیا وہی مہینہ، پیامِ عشق، ان کا خط، پرائے دیس میں، محبت کی ابتدا، اختر شیرانی کا اندازِ نظر مترشح ہوتا ہے۔ بعض نظموں مثلاً شبنمِ اشکبار، مغربی استعمار، داستانِ ناتمامی، جمہوریت، جنگِ عالمگیر ثانی کے بعد، چراغ گورستان وغیرہ سے ظفر علی خاں کی سیاسی بصیرت جھلکتی ہے اور ان کی بعض نظمیں مثلاً جنتے ہیں پھول، مزدور کی صدا، سرمایہ دار، غریبوں کو حقارت سے نہ دیکھو، ترقی پسندانہ رجحانات کی غمازی کرتی ہیں۔ اس پر مستزاد فاخر کی قادر الکلامی اور ان کے اسلوب کی روانی اور نغمگی ہے جس سے قاری شاعر کے تخیل کی طراوت اور خلوصِ گفتار پر ایک خوشگوار استعجاب محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بقول حمید احمد خاں:

> "فاخر کا عالمِ خیال کوئی متلاطم سمندر نہیں ہے بلکہ ایک پر سکون اور شفاف آبجو ہے جس کے آئینے میں ہم سب اپنی مشترک انسانیت کو منعکس دیکھتے ہیں"۔ [1]

نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

شفق کے رنگ میں سورج غروب ہوتا ہے
وداعِ شام کا منظر بھی خوب ہوتا ہے

---

[1] موجِ صبا، فاخر ہریانوی، مرتبہ طاہر شادانی، ضیا محمد ضیاء، مطبوعہ ایوانِ ادب، لاہور ۱۹۶۶ء، "تعارف" از پروفیسر حمید احمد خان، ص ۳

لیے ہے سرخ فضا ہاتھ میں شراب کا جام
چھلک پڑا ہے کنارے پہ آفتاب کا جام
سنہری بادلوں کے خوشنما کنارے سُرخ
درخت، دشت، زمیں، آسماں، سارے سرخ
نہا کے چشمۂ زریں میں آفتاب چلا
گلوں کا رنگ، نباتات کا شباب چلا
(شام)❶

✿ ✿

فنا کا قانون ازل کے دن سے ہے کار فرما جہاں میں لیکن
نوائے مرغِ حیات ہے آج بھی سرِ شاخسار پیدا
بہار کے عارضِ حسیں پر خزاں کی زردی جھلک رہی ہے
خزاں کے چہرے سے ہو رہا ہے شبابِ حسنِ بہار پیدا
ہوئے ہیں دشتِ حیات کی وسعتوں میں گم قافلے ہزاروں
ہوئے ہیں گردِ عدم کے پردے سیکڑوں شہسوار پیدا
اُدھر فضا شب کی تیرگی میں حسین تاروں کو کھا رہی ہے
اِدھر فلک کر رہا ہے انجم کے گوہرِ تاب دار پیدا
ہزاروں صدیاں گزر گئی ہیں مگر ہے جاری یہ کارخانہ
کہ جیبِ گردوں سے آج تک ہو رہے ہیں لیل و نہار پیدا
اگرچہ ظاہر میں رنگ دُنیا کا اور سے اور ہو رہا ہے
فنا کا بھی دور ہو رہا ہے بقا کا بھی دور ہو رہا ہے
(فنا اور بقا کا دور) ❷

✿ ✿

---

❶ موجِ صبا' فاخر ہریانوی' ص ۴۲
❷ موجِ صبا' فاخر ہریانوی' ص ۱۰۵

انسانیت کا روگ ہے سرمایہ دار قوم
یہ قوم جس نے ملک کی حالت تباہ کی
تاریک ہے غریب پہ ہر منظرِ حیات
روشن ہوں لاکھ مشعلیں خورشید و ماہ کی
ہے مفلسی سے تلخ تر احساسِ مفلسی
بدتر گناہ سے ہے ندامت گناہ کی

(سرمایہ دار) ❶

کہاں ہیں مرگِ آزادی کے دیوانے یہاں آئیں
چراغِ کشتۂ ملّت کے پروانے یہاں آئیں
کہ ہوتی ہے یہاں کی خاک سے دل کی غذا حاصل
فنا کے منظرِ خاموش سے درسِ بقا حاصل
ابھی تک آرہی ہے یہ صدا تربت کے سینے سے
اگر ذلت کا جینا ہو تو موت اچھی ہے جینے سے
شناور ڈوب کر دریا میں آخر پار جاتے ہیں
وہ بازی جیت لیتے ہیں جو بازی ہار جاتے ہیں

(سلطان شہید حضرت ٹیپو کے مزارِ پُر انوار پر) ❷

دولت کے آستاں پہ ہے طاقت جھکی ہوئی
پرسانِ حال کون ہے بے روزگار کا
شخصی حکومتوں کا ہے جمہوریت لباس
ہاں یہ بھی اک فریب ہے سرمایہ دار کا

سوزِ صبا۔ص ۴۲۸

❶❷ سوزِ صبا، فاخر ہریانوی، ص ۱۹۰

ہنستے ہیں پھول بے خبر اس سے کہ باغ میں
منہ خشک پیاس سے ہے ہر اک شاخسار کا
قبضہ کیا خزاں نے چمن میں بہار پر
جاری مگر ہیں گیت لب جوئبار پر
(ہنستے ہیں پھول) ❶

✿✿

اثر صہبائی (۱۹۰۱ء۔۱۹۶۳ء)

سرزمین پنجاب میں خطہ سیالکوٹ صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ ارض سیالکوٹ نے ایسے شعراء کو بھی جنم دیا ہے، جنھوں نے ایک دُنیا سے اپنی شاعری کا لوہا منوایا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، مختار صدیقی اور امین حزیں کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ اثر صہبائی کا تذکرہ مقصود ہے، جو امین حزیں کے چھوٹے بھائی تھے۔

اثر صہبائی، جن کا پورا نام خواجہ عبدالسمیع پال ہے، ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ❷ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی جہاں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور چلے آئے۔ جہاں اسلامیہ کالج سے ۱۹۲۲ء میں بی اے اور لا کالج سے ۱۹۲۴ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ پریکٹس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ لیکن وکالت ہی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس سلسلے میں ایک طویل مدت تک سیالکوٹ، جموں اور لاہور میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر خدمات سرانجام دینے کے بعد ۲۶ر جون ۱۹۶۳ء کو انتقال کیا۔

اثر صہبائی نے اگرچہ سکول کے زمانے میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا تاہم اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علمی کے زمانے میں لاہور کی ادبی فضا نے ان کے ذوق شعر کو نکھارا۔ اصناف سخن میں انھیں غزل، نظم، رباعی اور قطعہ کی صنف مرغوب ہے۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی امین حزیں سے اصلاح لی۔ اس کے علاوہ بعض شعری معاملات میں علامہ تاجور نجیب آبادی، علامہ کیفی دہلوی اور حضرت

---

❶ سوج صبا، فاخر ہریانوی، ص ۲۲۵

❷ پس منظر "روح صہبائی" (مجموعہ کلام) اثر صہبائی، مطبوعہ راج محل پبلشرز جموں ۱۹۳۶ء، ص ۳

ژ لکھنوی سے بھی استفادہ کیا۔ اثر صہبائی کے مجموعہ کلام "رفعت" کے تعارف" میں مولانا حامد علی خاں نے ان کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور نو عمری' جوانی اور بے فکری کا دور ہے اور چونکہ شاعری شاعر کی داخلی اور خارجی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے اس لیے اس دور میں فطرتاً ان کی شاعری میں مناظر فطرت' حسن و عشق' ولولہ شباب' شوق و مستی اور رندی و بے باکی کے مضامین ہیں۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور ۱۳ رمئی ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب ان کی رفیقۂ حیات "راحت" کا پر ملال انتقال ہوا۔ یہ دور کئی سال تک جاری رہتا ہے۔ اس دور میں لامحالہ وہ نوحہ سرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "راحت کدہ" زندگی کے اسی دور کی یادگار ہے۔ اس مجموعے کو مولانا حامد علی خاں اور بعض دوسرے نقادوں نے "تاج محل" (۱) سے بڑی دلپذیر تشبیہ دی ہے۔ ان کی شاعری کا تیسرا دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے جس میں وہ حزن و ملال سے آہستہ آہستہ فکر و تدبر' حق و صداقت اور حسنِ عمل کی قوتوں کو آشکار کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جبکہ ان کی شاعری کا چوتھا، آخری اور اہم دور ۱۹۴۷ء سے دم آخر تک ہے۔ اس دور کو ہم ان کی قومی شاعری کا دور کہہ سکتے ہیں جس میں انھوں نے زبانِ شعر میں اپنی روح کا پیغام دنیا کو پہنچایا۔ ان کی نظم "مقامات عشق" ان کی زندگی کے حسب حال ران ادوار کا خوبصورت مرقع ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس نظم کے اشعار کی تعداد بھی چار ہے اور اس نظم کو بقول مولانا حامد علی خاں:

ژ صہبائی نے بارہا اپنا پسندیدہ ذریعہ اظہار سمجھا ہے۔ (۲)

سبق عشق کی ابجد ہے اثر عجز و نیاز
یعنی اک پیکرِ تسلیم و رضا ہو جانا
کیف و مستی کا پھر اک باب ہے' اس کے آگے
یعنی لذت کش و سرمستِ ولا ہو جانا

تعارف (دیباچہ) "رفعت" (مجموعہ کلام) اثر صہبائی، حامد علی خاں، مطبوعہ اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ج

ایضاً، ص ط

آخری باب میں ہے ذکر فنا فی المحبوب
یعنی محبوب کی ہستی میں فنا ہو جانا
اس فنا میں ہے مگر جامِ بقا کی مستی
ہے یہی بندے کا ہم رنگِ خدا ہو جانا
(مقاماتِ عشق) ❶

✿ ✿

بلحاظ مجموعی اثر صہبائی کے کلام میں عشق و محبت کی رنگینیاں اس قدر نہیں ہیں جتنا انھوں نے نرم و شیریں زبان اور دھیمے لہجے میں حکیمانہ اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی ہے۔ ان پر کہیں کہیں میر اور غالب کے اثر کا گمان ہوتا ہے لیکن انھوں نے بھی اپنے بڑے بھائی امین حزیں کی طرح دوسرے شعراء کی نسبت اقبال سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے لیکن اس کے باوصف ان کا رنگِ سخن منفرد ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

محبت پھول ہے صحرائے ہستی کی فضاؤں میں
محبت ضوفشاں ہے زیست کی تاریک راہوں میں
محبت کی ضیا ہے چاند میں سورج میں تاروں میں
محبت کا سرود جانفزا ہے جوئباروں میں
اسی سے چاندنی راتوں میں دریا کا تلاطم ہے
یہی موجوں کی مستی ہے یہی ان کا ترنم ہے
محبت ایک طوفانِ طرب ہے بحرِ ہستی میں
خرد کو جو بہائے جا رہا ہے جوشِ مستی میں
اسی سے رات کی بیداریاں سرشار رہتی ہیں
اسی سے روح کی سب قوتیں بیدار رہتی ہیں

---

❶ رفعت اثر صہبائی ص ۹۶

یہی غم خانۂ ہستی میں لطفِ زندگانی ہے

یہی غوغائے عالم میں سرود شادمانی ہے

یہ نور بصیرت ہے یہی ذوق عبادت ہے

اسی سے گریہ ہائے نیم شب میں کیف ولذت ہے

محبت سے جگر کے داغ برق طور ہوتے ہیں

اسی سے خاک کے پتلے سراپا نور ہوتے ہیں

اسی کے دم سے شاعر عرش تک پرواز کرتا ہے

مکینانِ حریم قدس کو ہمراز کرتا ہے

محبت روحِ ہستی ہے محبت غیر فانی ہے

محبت نوریزداں ہے محبت جاودانی ہے

چڑھا کر جام صہبائے محبت جاوداں ہوجا

سلاسل توڑ کر کون و مکاں کے لامکاں ہوجا

(محبت) ❶

✿ ✿

ڈاکٹر محمد دین تاثیر (۱۹۰۲ء-۱۹۵۰ء)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر قصبہ اجنالہ ضلع امرتسر میں ۲۸ رفروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ ایف سی کالج اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پائی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار ہوگئے۔ ۱۹۳۳ء میں ولایت گئے اور کیمرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ تاثیر پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ❷
ایم اے او کالج امرتسر سری پرتاب کالج سری نگر اور اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ ۳۰ رنومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

---

❶ رفعت از صہبائی ص ۱۱۵۸ تا

❷ روزگار فقیر (جلد دوم) فقیر سید وحید الدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی ۱۹۶۵ء ص ۲۶

ڈاکٹر تاثیر دُنیائے شعروادب کی معروف شخصیت ہیں۔ لاہور کی تاریخ' جو زمانہ قدیم سے علم و ادب اور دانش و عرفان کا گہوارہ رہا ہے' ڈاکٹر تاثیر کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ آپ ایک مخلص ادیب' ناقد' ماہر تعلیم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ شاعری تو آپ کے مزاج کا جزو تھی۔ ان کے بعض ایسے اشعار:

دل نے آنکھوں سے کہی' آنکھوں نے ان سے کہہ دی

بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے! ❶

یہ رہ عشق رہ عشق ہے اے اہلِ ہوس

منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں ❷

داور حشر! مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں ❸

اور وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے:

میری وفائیں یاد کرو گے

روؤ گے فریاد کرو گے

ارباب ذوق آج بھی اپنی محفلوں میں پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر ایک محفل آرا شخصیت کے حامل تھے اور ان کی ذات اپنے اشعار کی طرح بڑی مسحور کن تھی۔ جیسا کہ فقیر سید وحید الدین کا بیان ہے کہ:

"ان کی شخصیت میں شعر و نغمہ کی سی دل کشی اور ان کے کلام و پیام میں لالہ و گل کی سی شگفتگی موجود تھی"۔ ❹

جس زمانے میں آپ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے تو آپ کا گھر لاہور کے ذہین ادیبوں'

---

❶ آتش کدہ' ڈاکٹر محمد دین تاثیر' انشا پریس لاہور (سن ندارد) ص ۱۵۵

❷ آتش کدہ' ڈاکٹر محمد دین تاثیر' انشا پریس لاہور (سن ندارد) ص ۱۵۵

❸ ایضاً' ص ۱۶۶

❹ انجمن' فقیر سید وحید الدین' ص ۱۵۲

نشاپردازوں اور نئے لکھنے والوں کا مستقر بنا ہوا تھا۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ:

''وہ ہر ایک کو مشورہ دیتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی ایسی دھوم تھی کہ جو شخص وہاں جاتا تھا وہ ان کا معتقد اور مداح ہو کر آتا تھا''۔ ❶

گرچہ تاثیر غزل بھی کہتے تھے اور اس صنعت میں انھوں نے روایتی کلاسیکی غزل کی ہیئت کے ساتھ ساتھ جدید رنگِ تغزل میں بھی بڑی خوبصورت غزلیں کہی ہیں' تاہم ان کا طبعی میلان نظم کی طرف زیادہ تھا جیسا کہ سید عابد علی عابد بیان کرتے ہیں کہ:

''تاثیر کی غزل گوئی حقیقت میں مشقِ سخن ہے۔ غزل کہہ کے وہ اپنے زورِ بازو کو آزمانا چاہتا ہے کہ اصل میں اس زور کو نظم میں صرف ہونا تھا''۔ ❷

تاثیر مختلف علوم وفنون سے آگاہ تھے اور چونکہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اس لیے اظہار و بیان پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ انگریزی شعر و ادب میں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا تھا اور پھر وہ اس دور کے شاعر تھے جب ایک دُنیا پر تذبذب کا عالم طاری تھا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی رجحانات اور تغیر پذیر اخلاقی اقدار نے جہاں سوچنے سمجھنے کی نئی راہیں کھول دی تھیں وہاں ذہنوں میں انتشار بھی پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ تاثیر کی منظومات اس بدلتے ہوئے ماحول اور ان تغیر پذیر اقدار کی آئینہ دار ہیں اور اگر ان کی منظومات میں کہیں کہیں پیچیدگیاں آتی ہیں تو اس کی وجہ کسی حد تک اس عہد کا ذہنی تناؤ' نااستواری و روہ پراگندہ نظامِ فکر ہے جو بیسویں صدی سے مخصوص ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ پرانی معاشرت نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھی' افکار متغیر تھے اور زندگی پیچیدہ ہو کر رہ گئی تھی' شعر کی کہنہ روایات اپنے قدیم انداز میں باقی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی لیے تاثیر نے اپنی نظم ''اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام'' میں شعرائے متقدمین کو خوش قسمت قرار دیا ہے:

کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام!

---

❶ چند بڑے ادیب (مقالہ) سید عابد علی عابد' نقوش لاہور نمبر' ص ۱۰۸۶

❷ آتش کدہ (دیباچہ از سید عابد علی عابد)' ص ح

دن رات نغمہ ہائے چنگ و رباب
روز و شب گردش پیالہ و جام!
ایک جانب رقیب بد کردار!
ایک پہلو میں ساقی گلفام!
پھول تھے پھول، کانٹے کانٹے تھے
دانہ دانہ تھا اور دام تھا دام!
ربط تھا زندگی کے قصے میں
ابتدا تھی الگ، الگ انجام

☆☆

آج دنیا کو وہ قرار کہاں
زندگی ہے کہ ساغر سر جوش
مغ بچے عابدانِ سبحہ بدست
مسجدوں کے امام بادہ فروش
رات سے دن کا امتیاز محال
صبحِ صادق ہے شام در آغوش
پھول اُلجھے ہوئے ہیں کانٹوں سے
بلبلیں پھر رہی ہیں دام بدوش
گا رہے ہیں طیور شاخ بہ شاخ
اور تاثیر سن رہا ہے خموش
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے ❶

---

❶ آتش کدہ، ڈاکٹر محمد دین تاثیر ص ۳۰

نظم بعنوان "یدِ بیضا" تاثیر کی جولانیِ تخیل کا شہکار اور ان کے اعلیٰ شاعر ہونے کا سب سے بڑا نشان ہے۔ تاثیر نے اس نظم کی توضیح سے متعلق نظم کا پس منظر بھی قلم بند کیا ہے جو الفاظ کے پردے میں محسوسات کا عظیم دفتر ہے اور پھر وہ نظم تخلیق کی ہے جس کی نظیر اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ بقول سید عابد علی عابد:

"......اُردو زبان میں اتنی عمیق اور جامع نظم آج تک نہیں لکھی گئی............ میری دانست میں تاثیر اگر صرف یہی ایک نظم لکھ کر ہم سے رخصت ہو جاتا تو پھر بھی اُردو زبان کے ممتاز ترین شعراء میں اس کا شمار ہوتا............" ❶

تاثیر نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جمالیات کی تحقیق و تدقیق میں صرف کیا تھا۔ چنانچہ اپنے اکتساب کے تمام افکار حسیں کو انھوں نے اس نظم میں سمو دیا ہے۔ اس نظم کی خوبصورت ترکیبیں، تشبیہیں، استعارے اور کنائے اس امر کے غماز ہیں کہ شاعر اپنے افکار کو مختلف جمالیاتی علامتوں کے سہارے ظاہر کر رہا ہے۔ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی علامتوں کو اس نظم میں جس طرح برتا گیا وہ تاثیر کا کمالِ شاعری ہے۔ نظم کے آخری چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کلیم غش میں گرا! طور جل کے خاک ہوا
نظر کی بات رہی اور نہ دل کی بات رہی
شہود و شاہد و مشہود کے حدود کہاں
نہ اس کی ذات رہی اور نہ اُس کی ذات رہی
مگر وہ ایک دہکتا ہوا نشان کہ جو ہے
متاعِ عرض تماشا بس اور کچھ بھی نہیں
وہی کہ جس سے درخشاں ہے خاکنائے حیات
وہی کہ جس سے ہے لمحات زندگی کو ثبات
وہی حیات کا مقصد وہی بنائے حیات
وہی کہ ہے یدِ بیضا بس اور کچھ بھی نہیں

---

❶ آتش کدہ (دیباچہ) از سید عابد علی عابد، ص ۴

یہی ہے' کچھ بھی نہیں اور کائنات مری

مری حیات ادب ہے ادب حیات مری

میان قلب و نظر اک مقام ہے اس کا

مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اس کا

جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں

نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں [1]

✿✿

اسد ملتانی (۱۹۰۲ء۔۱۹۵۹ء)

افغانوں کے ایک قبیلہ "شیرانی" [2] کے کچھ لوگ صدیوں سے ملتان اور اس کے نواح میں آباد ہیں۔ اسد ملتانی' جن کا پورا نام محمد اسد خان ہے' اسی قبیلے کے ایک معزز گھرانے میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء کو کڑی افغاناں ملتان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خان غلام قادر خان تھا۔ اسد کی ابتدائی تعلیم و تربیت ملتان ہی میں ہوئی۔ حمرچ مشن ہائی سکول ملتان سے میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۲۴ء میں بی اے کیا۔ دورانِ تعلیم سائنس' فلسفہ اور ادبیات سے خاص دلچسپی رہی۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ ملتان کے اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس رہے۔ وہیں سے ہفت روزہ "الشمس" اور سائنسی ماہنامہ "روشنی" جاری کیا۔ [3] مگر ۱۹۲۶ء میں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر حکومت ہند کے سیکرٹریٹ میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے۔ پہلے فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور پھر سپرنٹنڈنٹ رہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر قیام دہلی اور شملہ میں رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے اپنی ملازمت پاکستان کے سیکریٹریٹ کراچی میں منتقل کرالی اور

---

[1] آتش کدہ' محمد دین تاثیر' ص ۱۲' ۱۳

[2] عظیم محقق حافظ محمود خان شیرانی اور ان کے نامور فرزند اور دبستان لاہور کے منفرد شاعر اختر شیرانی کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔

[3] معاصرین .... اقبال کی نظر میں' محمد عبداللہ قریشی' ص ۴۷۸

تقریباً گیارہ سال کراچی میں رہے۔ پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونے پر آپ راولپنڈی چلے آئے اور نومبر ۱۹۵۹ء میں وزارت خارجہ میں شعبہ ریاست و سرحدات کے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے وہیں انتقال کیا۔

اسد کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ بقول مصنف "نظم لطیف":

"گھر میں جو کہانیاں سنی جاتیں' ان کو نظم کرنے کی کوشش رہتی۔ وقتاً فوقتاً متفرق اشعار بھی موزوں ہوتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں "آب حیات" کے مطالعے نے فطری شوق کی آگ کو اور بھڑکایا"۔ ❶

لیکن ان کا یہ ذوق کالج کے زمانے میں آکر پروان چڑھا اور پھر عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔ حکومت ہند کی ملازمت کے عرصے میں اسد "بزم اُردو شملہ" کے، جس کے زیر انتظام شاندار مشاعرے منعقد ہوتے تھے' سیکرٹری تھے۔ آپ چار سال تک اس بزم کے سیکرٹری رہے۔ مصنف تذکرہ شعرائے اُردو کے بیان کے مطابق:

"اِسی بزم کا ایک مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو نے نشر کیا تھا"۔ ❷

اسد فطری طور پر ذہین اور طبع رسا کے مالک تھے' چنانچہ طالب علمی کے زمانے ہی میں کلام میں پختگی پیدا ہو گئی تھی۔ جن دنوں آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے' اُن دنوں کالج میں ہر سال منظومات کا ایک انعامی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال نے' جو اس مقابلے کے منصف تھے۔ ان کی نظم "شبنم کا قطرہ" کو اول انعام کا مستحق قرار دیا ❸ اور حوصلہ افزائی کے لیے بعض جگہوں پر اپنے قلم سے اصلاح بھی فرمائی۔ ❹ اس کے بعد اسد نے اپنی ریاضت سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔

---

❶ نظم لطیف' مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری' ادارہ شرکت مصنفین کراچی' س ن' ص ۳۷۷

❷ تذکرہ شعرائے اُردو' صفدر حسین خان نظیر لدھیانوی' عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۳ء' ص ۳۵۶۔۳۵۷

❸ نظم لطیف' مولوی حافظ سید جلال الدین جعفری' ص ۳۷۷

❹ ایضاً۔ ص ۳۷۷

اسد نے زیادہ تر اُردو میں کہا ہے جو گاہے گاہے ملک کے معروف جریدوں میں چھپتا رہا۔ کچھ کلام فارسی میں ہے، جن میں سے بعض فارسی نظمیں افغانستان کے رسالوں میں بھی شائع ہوئیں۔ (۱) اس کے علاوہ کچھ کلام سرائیکی میں بھی ملتا ہے۔ (۲) مگر ان کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ بہرکیف اسد کی نظم ہو یا غزل ان کے ہر شعر میں کوئی بات ضرور ہوتی ہے اور ان کے یہاں بھرتی کے شعر شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ بقول محمد عبداللہ قریشی:

> ''اسد کی نظموں میں اکبر کا طنز بھی ہے، حالی کا پندِ سودمند بھی، اقبال کا تفکر اور جذبہ حب الوطنی بھی۔ بعض اوقات تو ان کی شاعری کا مقصد ہی اقبال کا نور بصیرت عام کرنا اور سوز عشق پھیلانا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی بہترین نظمیں وہی ہیں جن میں یہ رنگ نمایاں ہے'' (۳)

نمونہ کلام کے طور پر علامہ اقبال کے ہاتھ سے اصلاح شدہ نظم ''شبنم کا قطرہ'' کا پہلا اور آخری بند اور ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

قطرۂ بے رنگ ہوں یا قلزم نیرنگ ہوں
سننے والے سن کہ میں بھی اِک خوش آہنگ ہوں
وقف بے تابی ہے میری جان مضطر کے لیے
میں بنا ہوں چرخ کی مانند چکر کے لیے
گردش ہفت آسماں پنہاں ہے میرے سینے میں
زندگی کا راز پوشیدہ ہے میرے جینے میں
سن ذرا غافل مری آوارگی کی داستاں
میں کہاں تھا؟ کس لیے اور کس طرح پہنچا یہاں؟
قطرۂ ناچیز ہوں، لیکن جہاندیدہ ہوں میں
تجربہ کار، انقلاب آسماں دیدہ ہوں میں

---

(۱) نظم لطیف، مولوی حافظ سید جلال الدین جعفری، ص ۳۷۷

(۲) معاصرین..........اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، ص ۴۹۳

(۳) ایضاً

میری ہستی ہستیِ انسان سے کچھ کم نہیں
غافل انساں لیکن ان اسرار سے محرم نہیں
مجھ میں پوشیدہ ہے رازِ زندگی بے ثبات
مجھ سے پوچھو نکتۂ سربستۂ موت و حیات
محرم رازِ بلندی، واقفِ ہستی ہوں میں
بہر انساں رہنمائے منزلِ ہستی ہوں میں
ہاں مجسم تجربہ ہوں اور سراپا ہوش ہوں
ہوں ذرا سا قطرہ لیکن بحر۔۔ آغوش ہوں
(شبنم کا قطرہ) [1]

✿✿

بسکہ بے تاب ہوں، پرسوز ہے زنداں مجھ سے
مَیں نہیں حلقۂ زنجیر ہے نالاں مجھ سے
دل میں کیا ولولۂ شوق نے بجلی بھر دی
خوف لرزاں ہے، غم و یاس ہراساں مجھ سے
قصرِ ہمت کا نتیجہ ہے کہ مجبوری کا
میں ہوں دنیا سے کہ دنیا ہے گریزاں مجھ سے
عکس پڑتا ہے مرے خونِ جگر کا اس میں
شبنمِ شعر و غزل ہے شرر افشاں مجھ سے
کبھی اس شہر کی شہرت تھی بزرگوں کے سبب
اے اسد آج ہے رسوائی ملتاں مجھ سے [2]

✿✿

---

[1] معاصرینِ اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، ص ۴۸۶

[2] تذکرہ شعرائے اردو، اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، ص ۳۵۷

چراغ حسن حسرت (۱۹۰۴ء۔۱۹۵۵ء)

چراغ حسن حسرت ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ (کشمیر) کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں آپ کے نانا جناب حسن نے 'جو پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ شعر گوئی کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے' آپ کو گود لے لیا تھا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم و تربیت انھی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ پونچھ سے میٹرک کرنے کے بعد آپ لاہور آ گئے جہاں سے ۱۹۲۴ء میں بی اے کیا۔ حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں تک مختلف مدارس میں فارسی کے معلّم کی حیثیت سے کام کیا لیکن اس پیشے سے آپ کو طبعی مناسبت نہ تھی اس لیے کلکتہ جا کر اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا اور مختلف اوقات میں مختلف جرائد عصر جدید، آفتاب، نئی دنیا، جمہور اور استقلال میں کام کیا۔ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''پیغام'' میں کام کر رہے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے اور حسرت کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے۔ یہاں آ کر آپ کا تعلق زمیندار، انصاف، احسان، احرار، شہباز، شیرازہ اور کئی دیگر اخبارات سے رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی اور پھر دوسری جنگ عظیم کے دوران میں سرکاری ہفت روزہ ''پنچایت'' اور ''قومی اخبار'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کام کے بعد انھیں کوالالمپور بھیج دیا گیا۔ زمانہ جنگ میں ہزار ہا ہندوستانی جوان اور افسر مشرقی ایشیا میں موجود تھے' ان کے لیے رومن رسم الخط میں ایک اردو روزنامہ ''جوان'' کے نام سے جاری ہوا جس کی ادارت کے فرائض حسرت کے سپرد ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر روزنامہ ''امروز'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ امروز کا پہلا شمارہ آپ کی زیر ادارت شائع ہوا تھا۔[1] کئی سال تک ''امروز'' کے مدیر اعلیٰ رہنے کے بعد آپ نے ''امروز'' سے علیحدگی اختیار کر لی اور کراچی چلے گئے جہاں ریڈیو پاکستان میں ڈائریکٹر نیشنل پروگرام مقرر ہوئے۔[2] لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ لاہور کی کشش نے آپ کو پھر لاہور میں کھینچ لیا۔ اس دوران میں آپ کو دل کے عارضے کی شکایت لاحق ہو گئی اور اگرچہ آپ اس وقت سے اپنی وفات تک زیادہ عرصہ صاحب فراش ہی رہے لیکن پڑھنے لکھنے کا کام برابر جاری رہا یہاں تک

---

[1] جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) جلد سوم ص ۶۲۷

[2] دے صورتیں الٰہی' عبدالسلام خورشید' ص ۱۱۵

کہ دام واپسیں سے کچھ دن پہلے تک آپ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ ❶ آخر ۲۶ رجون ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔

مولانا چراغ حسن حسرت لاہور کے ادیبوں میں، بقول شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ❷ وہ ایک فقید المثال طنز و مزاح نگار، کالم نویس اور بلند پایہ خاکہ نگار تھے۔ بلاشبہ اُردو ادب میں آپ کی شہرت کولمبس اور سند باد جہازی کے قلمی نام سے فکاہی شذرات لکھنے کی وجہ سے ہے۔ لیکن ان کی نثری کاوشوں سے قطع نظر جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھیں شعر و شاعری سے غایت درجے کی دلچسپی تھی اور وہ ایک منجھے ہوئے شاعر تھے۔ انھیں شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا جناب حسن سے ورثے میں ملا تھا۔

حسرت نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا میلانِ طبع غزل کی طرف زیادہ ہے اگرچہ انھوں نے اپنی صحافتی مصروفیات کے پیش نظر بہت کم کہا ہے لیکن جتنا بھی کہا ہے اس میں ہماری کلاسیکی شاعری کا پورا رچاؤ موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں تصوف اور فلسفہ کے مضامین اور الفاظ کی جادوگری کے بجائے ہر جگہ حسنِ سادگی، شگفتگی اور لطافت کے ساتھ واردات قلبی کا اظہار نظر آتا ہے۔ ان کی زبان اور ان کا اسلوب بیان بڑا رواں اور شستہ ہے اور وہ روزمرہ اور محاورے کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ حسرت کی ان تمام خوبیوں کے باوصف آج تک ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ بہرکیف نمونہ کے طور پر ان کی یہ دو مختصر غزلیں ملاحظہ کیجیے جو کہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں:

یارب غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پہ ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اِک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

---

❶ ادیب اور مصنف (مقالہ) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، نقوش لاہور نمبر، ص ۹۲۶

❷ ایضاً

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے

یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی

وعدہ تو وفا کرتے وعدہ نہ کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے

کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا [1]

☆☆

آؤ حسن یار کی باتیں کریں

زلف کی رُخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں

طرّہ طرار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پہ

روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کے چلیں اس بزم میں

مصر کے بازار کی باتیں کریں

ان کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں

سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے

آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں [2]

✿✿

---

[1] جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) جلد سوم ص ۶۳۰

[2] جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) جلد سوم ص ۶۳۱

سیّد ذوالفقار علی بخاری (۱۹۰۴ء۔۱۹۷۵ء):

ذوالفقار علی بخاری، پطرس بخاری کے، جنھوں نے "پطرس کے مضامین" کی بدولت اُردو کے مزاحیہ ادب میں مستقل مقام حاصل کیا، چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے دونوں بھائی آل انڈیا ریڈیو میں اہم عہدوں پر فائز تھے اور ریڈیو پر ان کا اتنا کنٹرول تھا کہ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

"لوگ آل انڈیا ریڈیو کو بی بی سی کا نام دیتے تھے۔ یعنی بخاری برادرز کارپوریشن"۔ ❶

قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کے قیام اور استحکام میں بھی دونوں بھائیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ بعد میں پطرس بخاری تو ریڈیو سے علیحدہ ہو گئے لیکن ذوالفقار علی بخاری کی ملازمت کا تمام عرصہ ریڈیو سے ہی وابستہ رہا۔ بلکہ ۱۹۶۲ء سے ریٹائرمنٹ کے بعد وفات تک ریڈیو سے بحیثیت مشیر منسلک رہے۔ دورانِ ملازمت میں اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد زیادہ تر آپ کے دو ہی شوق تھے......... شاعری اور موسیقی۔ آخر ۱۲ر جولائی ۱۹۷۵ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

ذوالفقار علی بخاری نے آنکھ کھولی تو گھر کا ماحول شعر و ادب میں رنگا ہوا تھا۔ والد پیر اسد اللہ شاہ بخاری بڑی باغ و بہار شخصیت اور سخنور تھے۔ انھیں قدیم اساتذہ کے ہزاروں شعر، مسلسل تخمیس اور غزلیں ازبر تھیں ❷ اور مشاعروں میں ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ سب سے بڑے بھائی پیر سید محمد شاہ بھی شعر کہتے تھے اور رفعت تخلص کرتے تھے ❸ منجھلے بھائی پطرس بخاری بھی شعر و ادب کے انتہائی دلدادہ تھے۔ ایسے میں ذوالفقار علی بخاری جو فطرتاً بھی موزوں طبع لے کر آئے تھے اگر شعر نہ کہتے تو یہ اچنبھے کی بات ہوتی۔ چنانچہ تیرہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے اور یہ ذوق تادمِ زیست برقرار

---

❶ وہ صورتیں الٰہی: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۱۲۹

❷ سید ذوالفقار علی بخاری (تحقیقی مقالہ ایم اے اردو ۱۹۸۵ء) ثمینہ یاسمین نذیر، مخزونہ اورینٹل کالج لائبریری، ص ۲

❸ تذکرۂ معاصرین: مالک رام، جلد سوم، ص ۲۳۸

رہا۔ اُردو شاعروں میں آپ کو میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور حسرتؔ بہت پسند تھے۔ ⓿

لیکن ان کے کلام پر ان شعراء کے بجائے میر انیسؔ کا اثر زیادہ ہے۔ غالباً انھوں نے میر انیسؔ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور لاشعوری طور پر ان سے بے حد متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب ریڈیو یا ٹی وی پر انیسؔ کے مرثیے تحت اللفظ پڑھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے لفظ لفظ کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ یہی حال مشاعروں کا تھا۔

ذوالفقار علی بخاری کا، جو بخاری ہی تخلص کرتے تھے، مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔ کلام مختلف ادبی رسائل کی زینت بنتا رہا۔ آپ کو طبعاً غزل سے زیادہ رغبت تھی۔ آپ کی غزل میں لہجے کی نرمی اور جذبے کی شدت ہے۔ کلام قدیم و جدید روایات کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اسلوب بیان پر کامل عبور تھا۔ اکثر خیالات میں جدت و ندرت پائی جاتی ہے۔

نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

سجدۂ شوق کرے کون ادا، میرے بعد
اب پھرتے رہیں بن بن کے خدا، میرے بعد

نغمہ کاوی کے لیے ناخنِ مضراب کہاں
سینۂ ساز سے اُٹھی نہ صدا، میرے بعد

میں ہوں سرسبز خزاں میں بھی بہاروں کی طرح
کس کو راس آئے گی یہ آب و ہوا، میرے بعد

کس کو آئے گا اسیری میں رہائی کا مزہ
کس کو پہنائیں گے زنجیرِ وفا، میرے بعد

مرحمت میں نے کیا اشک کو دریا کا مقام
آہ وہ اشک کہ دریا نہ ہوا، میرے بعد

⓿ سخنور (تذکرہ شعرائے پاکستان)، سلطانہ مہر ص ۳۹

ایک میں تھا کہ میری یاد دلوں سے نہ مٹی

ورنہ مٹنے کو تو کیا کیا نہ مٹا' میرے بعد

شہر والوں میں ولی تھا نہ پیمبر لیکن

جو میں کہتا تھا وہی ہو کے رہا' میرے بعد ❶

✿✿

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء۔۱۹۴۸ء)

محمد داؤد خان اختر شیرانی' راجپوتانہ (بھارت) کی ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست ٹونک میں ۴ رمئی ۱۹۰۵ء کو پٹھانوں کے ایک معزز خاندان شیرانی ❷ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ محمود خان شیرانی فارسی اور اُردو کے ایک مستند عالم' نامور محقق اور نقاد تھے جو پہلے کچھ عرصہ تک لاہور کے اسلامیہ کالج میں پڑھاتے رہے اور پھر اورینٹل کالج میں پروفیسر ہوئے۔ اختر کی ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں ہوئی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے والد کے پاس لاہور چلے آئے۔ جہاں ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج سے منشی فاضل اور اس سے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مگر طبیعت کے لااُبالی پن کے باعث آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے البتہ انگریزی زبان وادب کا مطالعہ نجی طور پر جاری رکھا اور مضمون نگاری اور شعرو شاعری شروع کردی۔ ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ بعض رسائل میں بطور مدیر بھی کام کیا۔ آخر ۱۹۲۸ء میں خود اپنا ماہوار رسالہ "بہارستان" نکالا لیکن وہ طبعاً جم کر کام کرنے کے عادی نہ تھے' اس لیے پرچہ بے توجہی کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔ بہارستان کے بعد ۱۹۳۰ء میں "خیالستان" جاری کیا۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور خیالستان بھی بہارستان کی طرح اختر کی بے نیازی سے نیم جان ہو کر بند ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے ماہنامہ "رومان" نکالا لیکن "رومان" بھی صرف آٹھ ماہ کے بعد بند ہو گیا۔

غرض یہ ثابت ہو گیا کہ کسی رسالے کی ادارت اختر کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ اس اثنا میں اختر کی

---

❶ سید ذوالفقار علی بخاری (تحقیقی مقالہ ایم اے اُردو ۱۹۸۵ء)' ثمینہ یاسمین' ص ۸۳

❷ "شیرانی" سرحدی پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان سے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد ہے۔ اور اپنے جداعلیٰ ملک شیرانی کے نام سے منسلک ہے۔ اس قبیلے کے بعض خاندان بوجوہ راجپوتانے میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ (بحوالہ اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب' ڈاکٹر یونس حسنی' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۷۶ء' ص ۲۳

شاعری کی دھوم مچ گئی اور ملک کے چوٹی کے شعراء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی اورینٹل کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر اپنے وطن ٹونک چلے گئے۔ چنانچہ اختر کو بھی جنھیں لاہور چھوڑنا کسی طور گوارا نہ تھا' ٹونک جانا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اختر پھر لاہور آ گئے۔ مولانا تاجور نے اپنے رسالے ''شاہکار'' کی ادارت ان کے سپرد کر دی لیکن اختر پابندی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ''شاہکار'' سے الگ ہو گئے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے کلام کے مجموعے نغمۂ حرم، شعرستان، صبح بہار، اختر ستان اور طیور آوارہ کے نام سے شائع کیے۔ بعد ازاں وہ پھر ٹونک چلے گئے۔ اس اثنا میں ان کے والد فوت ہو گئے۔ [1] اختر قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے لیکن کثرت مے نوشی سے ان کے قویٰ ضعیف ہو گئے تھے اور وہ عرصہ سے صاحب فراش چلے آ رہے تھے، چنانچہ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

اُردو شاعری میں نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز آزاد اور حالی کی اصلاحی اور مناظر فطرت کی نظموں سے ہوا اور ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ علامہ اقبال نے نظم کو اخلاقی' مذہبی، سیاسی اور فکری موضوعات دیے۔ لیکن بقول احمد ندیم قاسمی:

> ''وہ جذبہ جس نے شاعری کو جنم دیا ہے' وہ حسنِ صورت اور حسنِ خیال جن کے دم سے زندگی اپنی گوناگوں کلفتوں کے باوجود زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے' عشق و محبت اور حسن و جمال کا وہ احساسِ لطیف جو شاعر کو شاعر بناتا ہے۔ ابھی تک نظم کی ہیئت میں کسی نے نہ برتا تھا''۔ [2]

اردو شعر و ادب پر اختر شیرانی کا یہ احسان ہے کہ اس نے حسن و عشق کے موضوعات پر ایسی نادر نظمیں لکھیں کہ اردو شاعری کا دامن بے حد وسیع ہو گیا۔ یقیناً بعد کے شعراء کی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ نظموں سے اُردو نظم کو مزید وسعت ملی۔ تاہم اختر شیرانی کے شعری کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اختر شیرانی نے اُردو شاعری کو ان موضوعات سے جو بظاہر اجنبی تھے' اس وقت روشناس کرایا جب

---

[1] حافظ محمود شیرانی کا انتقال ۱۵ ر فروری ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ (بحوالہ اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب' ص ۴۸

[2] چند بڑے ادیب (مقالہ) احمد ندیم قاسمی، نقوش لاہور فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۰۹۷

اُردو شاعری پند و موعظت کے حصار میں تھی۔ اپنے زمانے میں اختر کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی تھی کہ انھوں نے جذبات و احساسات پر سے رسم و رواج کی چادر اُتار دی تھی۔ یاد رہے کہ اختر اس زمانے میں مقبول تھا جب علامہ اقبال کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اتنے عظیم شاعر کی موجودگی میں اختر کا اس حد تک قبول عام کا درجہ پانا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ صرف ان کی انفرادیت ہے جس نے انھیں ممیز کیا۔

اختر کی اس رومانوی شاعری کا تذکرہ ہم گزشتہ باب میں ''اُردو شاعری میں رومانوی تحریک'' کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس جگہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ان کی شاعری کے بعض دوسرے پہلوؤں پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اختر جذبہ و تخیل کے شاعر ہیں اور وہ اسی کے سہارے حسن کے پیکر تراشتے اور محبت کے ایوان و گلزار تیار کرتے تھے۔ ان کی رومانوی شاعری میں جگہ جگہ یہی جذبہ و تخیل کارفرما ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلیات میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ خاص طور پر ان کی مذہبی و اخلاقی اقدار کی حامل اور مناظر فطرت پر مشتمل نظموں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اختر کی شاعری میں بظاہر یہ پہلو تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ ان کے دل میں عشق حقیقی اور عشق رسولؐ بھی موجزن تھا۔ اختر نے جہاں حسنِ مجازی کے حضور میں محبت کے خوبصورت گلدستے پیش کیے ہیں وہاں انھوں نے رحمتِ دو عالمؐ کے قدموں میں بھی سر نیاز جھکا کر عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ خاص طور پر ان کے آخری دور کی شاعری میں یہ عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔ اصل میں اختر نے اپنی شاعری کا آغاز ہی حمد و نعت سے کیا تھا اور بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

> ''ابتدا میں نعتوں پر مشتمل ایک مجموعہ بھی تیار ہو گیا تھا لیکن وہ بھی اختر کے بعض دوسرے کارناموں کی طرح نذر شراب ہو گیا اور اب ان نعتوں کو کوئی صاحب اپنے نام سے پڑھا کرتے ہیں'' ❶

ان کے آخری مجموعہ کلام ''شہروز'' میں ایک حصہ نعتوں پر مشتمل ہے۔ ایک نعت میں حب رسولؐ ملاحظہ فرمایئے:

اگر اے نسیم سحرؔ ترا ہو گزرؔ دیار حجاز میں

میری چشمِ تر کا سلام کہنا حضور بندہ نواز میں

تمھیں حد عقل نہ پا سکی، فقط اتنا حال بتا سکی

کہ تم ایک جلوۂ راز تھے جو عیاں ہُوا رنگِ مجاز میں

عجب اِک سرور سا چھا گیا، میری روح و دل میں سما گیا

ترا نام ناز سے آ گیا، مرے لب پہ جب بھی نماز میں

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی، نہ متاعِ امن و اماں ملی

جو دوائے دردِ نہاں ملی، تو ملی بہشتِ حجاز میں

کروں نذر نغمۂ جاں فزا میں کہاں سے اختر غم نوا

کہ سوائے نالۂ غم نہیں مرے دل کے غمزدہ ساز میں ❶

جدید اُردو شاعری میں سماجی اقدار کی استواری اور معاشرتی اصلاح کا رجحان اختر کے دور سے کچھ پہلے تک ایک موثر رجحان تھا۔ چنانچہ اختر نے بھی اس رجحان سے اثر قبول کیا ہے اور یہ رجحان ان کے یہاں ایک مستقل شکل میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اختر کی نگاہوں سے سماج اور معاشرے کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ مادیت پرستی سے متنفر تھے۔ روحانی اقدار کی پامالی ان کے لیے ہمیشہ سوہانِ رُوح رہی۔ کسان اور مزدور طبقے کی مفلوک الحالی، غریبوں کی نکبت و افلاس اور سماجی ناانصافیوں کے وہ ہمیشہ شاکی رہے اور معاشرے میں امیر و غریب کے درمیان امتیاز کی خلیج اور پھر ایسا نظامِ معاشرت جو اس خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرتا ہے انھیں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ اختر نے اس صورت حال کی گاہے گاہے خوب عکاسی کی ہے۔ ان کی ایک نظم ''عشق و آزادی و شعر'' سے یہ اشعار دیکھیے:

دور ہے دور ابھی منزلِ مقصود اپنی

اور گزرنا ہے بیابانوں سے کہساروں سے

خودکشی کی بھی اجازت نہیں اب تو ہم کو

کھیلتے تھے کبھی ہم غیر کی تلواروں سے

---

❶ شہرود، اختر شیرانی، آئینہ ادب، چوک انارکلی لاہور ۱۹۶۹ ص ۳۷

گلشن دہر میں گل چینی کا ارمان ہے اگر
دست و دامن کو بچائے نہ رکھو خاروں سے

دیو افلاس کا نعرہ ہے فضا میں لرزاں
کہ عوض بھوک کا لو دہر کے خونخواروں سے

ہم صفیروں ہی کو بلوا دے قفس تک صیاد
ایسی ہی ضد ہے اگر تجھ کو گرفتاروں سے

عشق و آزادی و شعر اپنا ہے پیشہ اختر
ہم کو سرکاروں سے مطلب ہے، نہ درباروں سے [1]

ایک دوسری نظم ''امیر و غریب'' ملاحظہ کیجیے۔ اختر نے اسی صورت حال پر طنز کیا ہے:

دُنیا کا ہر آرام امیروں کے لیے ہے
پھر کون سی شے ہے جو فقیروں کے لیے ہے

بدبخت مریدوں پہ بھی یا رب نگہِ لطف
مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لیے ہے

اِک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی
کھانے کے لیے کب ہے ذخیروں کے لیے ہے [2]

اختر کے یہاں قابل لحاظ تعداد میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو مظاہرِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔ مناظرِ فطرت میں اختر نے موسمِ بہار اور موسمِ برسات پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کی نظمیں نوائے گل' برکھا رُت' جشن بہار' آمد بہار' بادل' نغمۂ بہار' ابر سے' ترانۂ بہار' طلوعِ بہار' ماتم بہار اور فروغِ سحر اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ ویسے بھی اختر چونکہ ایک بلانوش رند میخانہ تھے اس لیے طبعاً انھیں بہار اور برسات سے زیادہ اُنس تھا اور اسی لیے اختر ان کا ذکر بڑے جوش و جذبہ اور مسرت و شادمانی

---

1. شہروداختر شیرانی' ص ۱۲۵ تا ۱۲۷
2. شہ داختر ' انی'

سے کرتے ہیں۔ ''نوائے گل'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بہار ہے خدائے گل، تو بوئے گل کو چاہیے دعائے گل
چمن میں آ کے بربطِ نسیم پر سنے کوئی نوائے گل
چمن میں روتے روتے بلبل آخر ایک گہری نیند سو گئی
دبی زبان سے مرتے مرتے اتنا کہنے پائی تھی کہ ہائے گل
مرے دل و دماغ و گوش و چشم و تن پہ کیف بن کے چھا گئی
ادائے گل، ہوائے گل، نوائے گل، فضائے گل، قبائے گل
حریم رنگ و بو میں آج ملکۂ بہار جلوہ ریز ہے
نسیم صبح نے اُٹھا دیے ہیں ہر طرف سے پردہ ہائے گل
یہ آرزو ہے اختر کہ مر کے اس کے رنگ و بو میں سو رہوں
مرا مزار ہو سرائے گل، مرا کفن بنے قبائے گل [1]

''برکھا رُت'' سے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں، اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھر تھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، کلیاں مسکرا رہی ہیں
چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظر سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں
چمن میں اختر بہار آئی، لہک کے صوت ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی، اٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں [2]

---

[1] صبح بہار، اختر شیرانی، آئینہ ادب (سن ندارد) ص ۷۹

[2] لالہ طور، اختر شیرانی، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۹۵

اختر کی شاعری کے ان پہلوؤں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اختر کی شاعری میں کم و بیش وہ تمام پہلو آ گئے ہیں جو اُردو میں جدید شاعری کا خاصہ ہیں۔ اختر نے مذہبی، اخلاقی، سماجی، تاریخی، قومی، سیاسی، حب وطن جیسے موضوعات پر قابلِ قدر نظمیں لکھی ہیں اور رومانویت سے سرشار ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے معاشرے اور سماجی مسائل پر تعمیری انداز میں شعر کہے ہیں۔

○○

جلال الدین اکبر (۱۹۰۵ء۔۱۹۸۸ء)

چودھری جلال الدین نام، اکبر تخلص، دسمبر ۱۹۰۵ء میں تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے ایک پُر فضا گاؤں علی وال نہراں والا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چودھری فتح علی ایک معمولی زمیندار تھے لیکن اپنی سیر چشمی اور فیاضی کی بدولت علاقے بھر میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم و تربیت مختلف قصباتی مدارس میں ہوئی۔ پھر ایم بی ہائی سکول گوجرہ سے اعلیٰ نمبروں میں میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۲۷ء میں بی اے (آنرز) کیا۔ آپ نے زمانہ طالب علمی کے ہر درجے میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے وظیفہ حاصل کیا تھا۔ بی اے (آنرز) میں نہ صرف گولڈ میڈل حاصل کیا بلکہ کالج رول آف آنرز پر نام بھی درج ہوا۔ اسی دوران میں آپ کو تعلیم و تعلّم سے اس قدر رغبت پیدا ہو گئی کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کیا اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی ملازمت [1] اختیار کی۔

۱۹۳۰ء میں آپ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں معلم مقرر ہوئے اور صرف پانچ سال کی قلیل مدت میں صدر معلم (ہیڈ ماسٹر) ہو گئے اور ایک طویل مدت تک یہ فرائض سرانجام دینے کے بعد

---

[1] مقالہ نگار کے اس سوال کے جواب میں کہ چودھری جلال الدین اکبر نے زمانہ طالب علمی کے ہر درجے میں اس قدر نمایاں کامیابی اور غیر معمولی ذہانت کے باوجود زمانے کے عام رجحان کے مطابق سول سروس کا رُخ کیوں اختیار نہیں کیا تھا، ان کے صاحبزادے چودھری مجاہد اکبر نے بتایا کہ اکبر سکول کے زمانہ ہی سے تحریک خلافت، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور کئی دوسرے مسلمان زعماء سے بے حد متاثر اور انگریز اور انگریزی حکومت کو انتہائی ناپسند کرتے تھے۔ انھیں مقابلے کا امتحان دیے بغیر حکومت کی جانب سے پی سی ایس نامزد کرنے کی سفارش کی پیشکش بھی ہوئی لیکن انھوں نے اپنے جذبہ حب الوطنی کی بنا پر اسے ٹھکرا دیا تھا۔

اسلامیہ ہائی سکول ملتان روڈ لاہور سے ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ❶ آپ نے اپنی تمام عملی زندگی دنیاوی نمود و نمائش اور مدح و ستائش سے بے نیاز ہو کر مکمل سادگی کے ساتھ درویشانہ طور پر بسر کی۔ چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہی مسلک رہا اور زیادہ عرصہ خانہ نشین رہ کر یاد الٰہی میں زندگی بسر کرنے کے بعد ۸/مئی ۱۹۸۸ء کو ۸۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اکبر کو شعری ذوق فطرت کی طرف سے ملا تھا اور آپ ابھی چھٹی جماعت ہی میں تھے کہ شعر کہنے لگے تھے۔ میٹرک پاس کرنے سے پہلے زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی نظمیں کہتے رہے لیکن لاہور میں آنے کے بعد نظم کی نسبت روز بروز غزل سے زیادہ رغبت پیدا ہوتی گئی۔ غزل میں آپ حسرت موہانی کے رنگ کے بڑے گرویدہ تھے، چنانچہ اسی رنگ کو اپنا لیا اور اس خوبی سے اپنایا کہ اہل زبان، شاعروں اور نقادوں نے جن میں سید سلیمان ندوی اور مولانا تاجور نجیب آبادی جیسی مقتدر ادبی شخصیتیں شامل ہیں آپ کو ''پنجاب کا حسرت موہانی'' کہا۔ ❷ آپ نے خود بھی اپنے آپ کو حسرت کا مقلد اور ہم رنگ کہا ہے:

وہ جنوں میں وامق و فرہاد کا ہم سنگ ہے
وہ سخن میں حضرت حسرت کا ہم آہنگ ہے ❸

اکبر نے ۱۹۲۵ء تک شعر گوئی میں کسی سے مشورہ نہیں کیا بلکہ ذوق سلیم ہی کو رہنما رکھا۔ مگر ۱۹۲۵ء میں ایک غزل اور ایک نظم حکیم فیروز الدین طغرائی امرتسری کو دکھائیں۔ ❹ بعد ازاں باقاعدہ طور پر سید عابد علی عابد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے، جنھوں نے نہ صرف آپ کے کلام کی اصلاح کی بلکہ آپ کا

---

❶ آپ کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے انجمن نے آپ کو ریٹائرمنٹ کی مقررہ عمر سے کئی سال بعد تک ملازمت پر برقرار رکھا تھا۔ (بحوالہ جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی (مقالہ) بشیر ساجد، نقوش لاہور (خاص نمبر) دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۸)

❷ گرانقدر رائیں (نقش ارژنگ) مطبوعہ محمد اسمٰعیل نعیم مالک رسالہ ہزار داستان لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۵، ۲۳

❸ کلیات اکبر، جلال الدین اکبر (غیر مطبوعہ) مملوکہ مجاہد اکبر خلف الرشید جلال الدین اکبر، ص ۱۳۶

❹ تعارف (نقش ارژنگ) ''قلقل'' (ہادی حسین ایڈیٹر ماہنامہ ہزار داستاں)، ص ۴

مجموعہ کلام "نقش ارژنگ" بھی انھیں کی نظرثانی کے بعد ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ (۱) بعد میں یہی تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ (۲)

"نقش ارژنگ" کی اشاعت اس وقت ہوئی جب اکبر ابھی تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے لیکن اس عمر میں بھی ان کا شعری ذوق نہ صرف پختہ ہو چکا تھا بلکہ وہ شعر کی تمام خوبیوں اور فنی باریکیوں سے بخوبی آشنا ہو چکے تھے۔ اس کے بعد بھی اسی ذوق کے ساتھ مشقِ سخن جاری رہی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور میں دو ادبی گروہ تھے۔ ایک گروہ میں تاجور نجیب آبادی، سید عابد علی عابد، تصدق حسین خالد، اختر شیرانی، احسان دانش اور بعض دوسرے حضرات شامل تھے۔ یہ گروہ "انجمن ارباب علم" کہلاتا تھا۔ اکبر کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ (۳) دوسرے گروہ میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، پطرس بخاری، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، پنڈت ہری چند اختر، حفیظ جالندھری اور کچھ اور حضرات شامل تھے۔ یہ گروہ "نیاز مندانِ لاہور" کہلاتا تھا۔ ان دونوں گروہوں کی عام طور پر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی لیکن اکبر چونکہ فطرتاً خاموش طبع، صلح کل، مرنجاں مرنج اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے اس لیے ان کے تعلقات سب سے خوشگوار تھے۔ (۴)

اس زمانے تک اکبر کی شاعری کا بیشتر رنگ عاشقانہ اور کہیں کہیں متصوفانہ ہے۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے تاثرات کو گہرائی میں جا کر اور بڑی خوبی سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ "نقش ارژنگ" کے "مقدمہ" میں سید عابد علی عابد نے اکبر کی شاعری کی چار خصوصیات گنوائی ہیں جن کا ملخص یہ ہے کہ اکبر نے ہر بات کو انداز کی رنگینی اور بیان کی شیرینی سے ادا کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حقائق کائنات کو بڑی آسان اور پُر لطف زبان میں بیان کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ تراکیب کے تنوع اور رنگینی سے کلام کو پرزور بناتے ہیں اور چوتھے یہ کہ جذبات کے بیان میں وہ ایسے دل گداز الفاظ اور نازک انداز سے کام لیتے

---

(۱) شعرائے پنجاب، ملک محمد باقر نسیم رضوانی، گجرات پرنٹنگ پریس گجرات ۱۹۳۷ء ص ۲۲۳

(۲) جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی (مقالہ) بشیر ساجد، نقوش لاہور (خاص نمبر) دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۳۰۹

(۳) جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی (مقالہ) بشیر ساجد، ص ۳۱۱

(۴) ایضاً، ص ۳۱۱

ہیں کہ بے اختیار دل میں ایک درد سا محسوس ہوتا ہے۔ ❶

اکبر کی شاعری کا یہی رنگ دلوں کو مسحور کر رہا تھا کہ ۱۹۳۸ء میں انھیں ایک مرد درویش اور صاحب دل بزرگ حضرت حاجی حافظ ابوالرضا حاکم علیؒ ❷ سے ارادت پیدا ہو گئی۔ جن کے اثر سے آپ کی زندگی اور شاعری دونوں میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا اور غزل میں رنگینی و مستی کے بجائے متانت' پاکیزگی اور معرفت کا رنگ غالب آ گیا۔ آپ خود بیان کرتے ہیں:

اکبر کہ جس کے عشق و محبت کی دھوم تھی
سنتے ہیں آج عابد شب زندہ دار ہے ❸

بہرکیف اکبر کا تمام کلام ہموار و شیریں ہے۔ اس میں نہایت رچی ہوئی شعریت اور دلآویزی ہے۔ ان کی غزل ہو یا نظم اس میں ایک دھیما پن اور مخصوص رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کے جذبات بلند ہیں اور چونکہ سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اس لیے ان میں بڑی کشش ہے۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر ان کے شاعری کے دونوں رنگ علیحدہ علیحدہ ملاحظہ کیجیے۔

پہلے ان کے راہ سلوک میں قدم رکھنے سے پہلے کا یہ رنگ دیکھیے جو حسرت موہانی کے رنگِ تغزل کی حدود سے آگے نکل کر میر کے حدود میں داخل ہوتا معلوم ہوتا ہے:

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے ان کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے
میں ان کو دیکھا رہتا ہوں' وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

---

❶ مقدمہ (نقش ارژنگ) سید عابد علی عابد ص ۹ تا ۱۳

❷ آپ کا وصال ۱۹۳۰ء میں ہوا لیکن وصال سے پہلے آپ نے اکبر کے حسن سیرت اور عقیدت مندی کے پیش نظر انھیں اپنا خرقہ مبارک دے کر خلافت عطا فرمائی۔ (بحوالہ جدید شعرائے اُردو) (فیروز سنز) ص ۹۳۱

❸ کلیات اکبرؔ جلال الدین اکبرؔ (غیر مطبوعہ) حصہ اول ص ۹۶

ان کی وہ حیا وہ خاموشی اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سننے کو سب کچھ سنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اس شوق فراواں کی یارب! آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ' ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں' ہمراز نہیں' کس سے کہیے' کیوں کر کہیے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے' جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

اکبر شاید دل کھو بیٹھیں' وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں' ہر وقت اداس سے رہتے ہیں [1]

اور یہ متصوفانہ رنگ ملاحظہ کیجیے جس میں اکبر نے سالک کے بعض انتہائی نازک احساسات' روحانی تجربات اور احوال و مقامات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

مرے سامنے ہیں وہ جلوہ گر مری بے خودی کا کمال ہے
یہ وصال ہے کہ فراق ہے یہ فراق ہے کہ وصال ہے

ترے ذکر و فکر کے فیض سے مرے دل کا اب تو یہ حال ہے
ترا ذکر مجھ کو وبال ہے ترا فکر مجھ کو محال ہے

مرا لاکھ حال خراب ہو' میں تری رضا کا غلام ہوں
مجھے اپنا حال عزیز ہے مرا حال تیرا خیال ہے

میں ہوں در پہ اس کے پڑا ہوا مجھے اور چاہیے کیا بھلا
مجھے بے پری کا ہو کیوں گلہ مری بے پری پر وبال ہے

یہ کلام اکبر خوش نوا ہے کمال فکر کا معجزہ
یہ صداقتوں کی' لطافتوں کی' بلاغتوں کی مثال ہے [2]

○○

---

[1] کلیات اکبر' جلال الدین اکبر (غیر مطبوعہ) حصہ اوّل' ص ۸۶

[2] کلیات اکبر' جلال الدین اکبر۔ حصہ دوم' ص ۵

سید عابد علی عابد (۱۹۰۶ء۔۱۹۷۱ء)

عابد علی عابد ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پہلی سے چھٹی جماعت تک ڈیرہ اسماعیل خان میں حاصل کی' جہاں ان دنوں آپ کے والد' سید غلام عباس فوج میں بطور رسالدار میجر تعینات تھے۔ پھر مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ یہاں آپ کے دادا' سید حسن شاہ' سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد سکونت پذیر تھے۔ لاہور میں آپ کو مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخل کرا دیا گیا۔ سکول کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے دادا اور چچا سید نثار علی شاہ سے بھی انگریزی پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی محمد حیات سے جنھیں آپ کے دادا نے بطور خاص آپ کا اتالیق مقرر کیا تھا فارسی پڑھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء میں میٹرک اور پھر ۱۹۱۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میں آپ کو درسی کتب کے علاوہ ادبی کتب و رسائل کے ساتھ غایت درجے کی دلچسپی رہی۔ اس زمانے میں حکیم احمد شجاع کی سرپرستی میں لاہور سے پندرہ روزہ ادبی رسالہ ''ہزار داستان'' اور بچوں کے لیے ہفتہ وار ''نونہال'' شائع ہوا کرتے تھے۔ آپ نے ان پرچوں میں مضامین اور نظمیں بھیجنا شروع کیں اور اس طرح زمانہ طالب علمی میں ہی آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ ''ہزار داستان'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس طرح آپ کی صحافتی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔ رسالے کی ادارت کے ساتھ ساتھ آپ نے قانون کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد گجرات (پنجاب) میں دو ڈھائی سال پریکٹس بھی کی لیکن اس کام میں دل نہیں لگا چنانچہ لاہور چلے آئے اور ''ادبی دنیا'' کے نائب مدیر ہو گئے۔ ساتھ ہی آپ نے یونیورسٹی اورینٹل کالج کی ایم اے (فارسی) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اورینٹل کالج میں آپ کو شاداں بلگرامی اور حافظ محمود شیرانی جیسے جید علماء سے استفادے کا موقع ملا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں آپ ایف سی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ دو سال تدریس سے وابستہ رہ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں بمبئی چلے گئے مگر وہاں بھی کوئی روزگار مزاج کے موافق نہ ملا' لہٰذا واپس لاہور آ گئے اور دیال سنگھ کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ جہاں ایک عرصہ تک فارسی پڑھاتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں آپ کو اسی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ آپ نے اس زمانے میں بڑی عمدگی اور لیاقت کے ساتھ کالج کو ترقی

دی۔ یہ آپ کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ لیکن سکون وشادابی کا یہ زمانہ زیادہ نہ گزرا تھا کہ بعض وجوہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ آپ کو ۱۹۵۴ء میں کالج سے علیحدہ ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد آپ ''مجلس ترقی ادب'' سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں ''مجلس'' نے سہ ماہی ادبی مجلّہ ''صحیفہ'' کا اجرا کیا تو اس کے پہلے مدیر عابد صاحب ہی تھے۔ اپریل ۱۹۶۷ء کا صحیفہ آپ کی ادارت میں آخری شمارہ تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد آپ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آپ کی علالت کے اس زمانے کے متعلق مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ:

> ''ان کی زندگی کا آخری دور گوناگوں علالتوں کی وجہ سے خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ مگر ان کے علمی وادبی انہماک میں کمی نہ آئی اور شدید جسمانی تکلیفات میں بھی وہ سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ علالت و رنجوری نے ان کے جسم پر کتنا ہی بُرا اثر ڈالا ہو لیکن ان کے علم، ان کے بلوغ نظر یا ان کی جدّت طرازی کو قطعاً متاثر نہیں کیا تھا''۔ ❶

آخر طویل علالت کے بعد ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی صبح کو آپ پر دل کا شدید دورہ پڑا اور علمی دُنیا، منفرد حیثیت کے ایک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز، قادر الکلام شاعر اور عظیم ماہر تعلیم سے محروم ہو گئی۔

عابد علی عابد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُردو ادب میں ان کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، ڈرامہ نویس، ناول نگار، محقق، مترجم، افسانہ نگار، فنون لطیفہ کے ماہر اور معروف ماہر تعلیم تھے۔ لیکن اس جگہ ان کے دوسرے کمالات سے قطع نظر صرف ان کی شاعرانہ حیثیت کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ ان کے دیگر کمالات کا نام محض اس لیے لیا ہے کہ ان کمالات کے اثرات بہر طور ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

عابدؔ اُردو اور فارسی زبان وادب کے فاضل تو تھے ہی لیکن دوسرے علوم وفنون پر بھی ان کی نظر تھی۔ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ انھوں نے جدید مغربی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شاعری کے ساتھ انھیں سِنِ شعور ہی سے وابستگی تھی اور وہ اس فن کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ فنِ شعر پر گہری نظر، فارسی کے

---

❶ ''سید عابد علی عابد مرحوم'' (مضمون) مولانا غلام رسول مہر، مطبوعہ ''صحیفہ'' لاہور (عابد نمبر) بابت جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱

جلیل القدر شعراء کا بھرپور مطالعہ‘ اردو کے کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی سے والہانہ وابستگی ❶ اور حروف کے صوتی نظام میں ان کے فاضلانہ ادراک ❷ نے ان کے شاعرانہ مزاج کی تشکیل کی تھی، ان کے عہدِ شعر گوئی میں بساط شاعری پر اگرچہ بہت سے شعری رجحانات کارفرما تھے لیکن وہ اپنے مخصوص نظریہ فن پر قائم رہے۔ وہ شاعری کو بنیادی طور پر اظہار حسن تصور کرتے تھے اور جمالیاتی اصولوں پر سختی سے کاربند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی نثری کارنامہ ہو یا شعری تخلیق اس میں یک گونہ عظمت و رفعت ہے اور ہر جگہ ان کا اسلوب فن کارانہ ہے۔ بقول میرزا ادیب:

> ”ہر جگہ ان کی ایک خاص خوبی مجھے بہت نمایاں محسوس ہوتی ہے اور یہ خوبی ہے مُنَبَّت کاری۔ اپنی ذہنی پیداوار کے ہر جزو کو انھوں نے اپنی محنت‘ جگر کاوی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ بنایا‘ سنوارا اور نکھارا ہے اور ہر ایک خدوخال‘ فنی مقتضیات کے اعتبار سے‘ ہر جگہ مکمل نظر آتا ہے“۔ ❸

عابد علی عابد اس عہد کے واحد شاعر ہیں جو ”صحیح الفاظ کے انتخاب اور ان کے مناسب استعمال کا ہمیشہ بہت اہتمام کرتے تھے“۔ ❹ انھوں نے فارسی اور اُردو کلاسیکی روایات اور اپنے دور کے لوازمات کے ساتھ ساتھ فنی بصیرت کو اپنی شاعری میں جذب کر کے اس طرح منتخب شعر کہے ہیں کہ ”شعر فہمی میں شبلی کے بعد انھیں دوسرا درجہ دیا گیا ہے“۔ ❺

عابد کو بالطبع غزل کی روش پسند ہے اور ”غزل میں عابد پر غالب اور مومن کا بہت اثر نظر آتا ہے“۔ ❻ لیکن ان کے اس کلاسیکی رجحان کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی شاعری عصری تقاضوں سے

---

❶ شب نگار بنداں‘ عابد علی عابد (پیش لفظ سے پہلے) مرزا ادیب‘ مطبوعہ مکتبہ اُردو لاہور ۱۹۵۵ء ص الف

❷ ایضاً۔ ص الف

❸ ایضاً‘ ص الف

❹ شب نگار بنداں (پیش لفظ) محمود نظامی‘ ص ۱۲

❺ بریشم عود عابد علی عابد (اقتباسیہ) گوہر نوشاہی‘ مطبوعہ مکتبہ ادب جدید لاہور ۱۹۶۶ء ص ۸۸

❻ شب نگار بنداں (پیش لفظ) محمود نظامی‘ ص ۸

لاتعلق ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم دمؤ ہم نفسؤ نغمہ گروؤ دیدہ ورو
سب چلیں تا در زنداں تو مزا آجائے

اس کے باوصف کہ پابندِ سلاسل ہے نسیم
مہک اُٹھے جو گلستاں تو مزا آجائے

کسی دیوانے کی تربت کا غبار گستاخ
تھام لے دامنِ سلطاں تو مزا آجائے

عاملِ شہر سمجھتا نہیں عابد کا کلام
وہ سخن داں ہو مری جاں تو مزا آجائے [1]

عابد علی عابد ایک حساس شاعر تھے اور وہ وہی کچھ رقم کرتے تھے جو ان کے دل پر گزرتی تھی۔ وہ نقادٗ جن کو اُردو کی شعری روایت کا پورا شعور نہیں ہے عابد کی شاعری کو کلاسیکی شاعری کہہ کر گویا ''فرسودہ'' قرار دے دیتے تھے۔ اگر یہ لوگ ان کے کلام کا مطالعہ بغیر کسی تعصب کے کریں تو انھیں معلوم ہو گا کہ عابد نے شاعری میں ہیئت کے تجربے کیے بغیر اپنے شعری نظریہ پر سختی سے قائم رہتے ہوئے بھی جدید موضوعات پر ان سے کہیں بہتر نظمیں کہی ہیں۔ قائد اعظم پر لکھی جانے والی نظموں میں عابد کی نظم ''قندیلِ آرزو'' سے بہتر نظم اس عظیم ہستی کے بارے میں شاید ہی لکھی گئی ہو۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

گہنا گیا وہ چاند مگر اُس کے نُور سے
دیوار و در وطن کے ہیں تاباں اسی طرح

مرجھا گیا وہ پھول مگر اس کے فروغ سے
بزمِ وطن ہے بزمِ چراغاں اسی طرح

دیکھو تو اس کے کوکبِ اقبال کا عروج
ٹھہری ہوئی ہے گردشِ دوراں اسی طرح

---

[1] شب نگار بنداں، عابد علی عابد، ص ۳۷

بالیدہ ہے زمینِ وطن کی نمو میں وہ
مضطر ہے مثلِ شعلہ ہمارے لہو میں وہ ❶

عابد کی غزل ہو یا نظم، موزوں اور مترنم الفاظ کا حسین لباسِ فکر و نظر پہنانا ان کی شاعری کی اوّلین خصوصیت ہے۔ بقول یوسف ظفر:

"ان کی غزل ہو یا نظم ہر جگہ ایک مربوط ترنم قاری کو گھیر لیتا ہے اور ہر جگہ روحِ تغزل کارفرما ہے"۔ ❷

مگر ان کی بہاریہ نظمیں، گیت اور رباعیاں بھی ایسی چیزیں نہیں ہیں جنھیں اردو ادب آسانی سے فراموش کر سکے۔ خاص طور پر ان کے ساقی نامے اور ساقی ناموں کے اسلوب کی دوسری نظمیں اُردو شعری ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ اُردو شاعری میں علامہ اقبال کا "ساقی نامہ" بڑا مقام رکھتا ہے لیکن اقبال نے فارسی روش کے ساقی نامے کو اپنے رنگِ شعر میں پیش کیا۔ ان کا ساقی نامہ ے و ناؤ نوش اور ساقی گری کے ساتھ ساتھ اپنے دور پر تبصرہ بھی ہے اور انھوں نے اس میں خودی کا درس بھی دیا ہے لیکن اس کے برعکس عابد نے اپنے ساقی ناموں کو میکدے سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ان کے ایک ساقی نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ مصرعوں کی اُٹھان، غمزہ و ناز و ادا کی ترک تازیوں، شعری تخیلی ترنم ریزیوں اور جذبے کی دلسوزیوں سے آدمی مسحور ہو جاتا ہے:

فسونِ خرد سے ہے دل تلخ کام
پلا ساقیا بادۂ لالہ فام

دل شادماں ہے نہ طبعِ جواں
مجھے کھا گئی فکرِ سود و زیاں

نہیں کم یہ شرمندگی ساقیا!
کٹی رائیگاں زندگی ساقیا

---

❶ شبِ نگار بنداں، عابد علی، ص ۱۶۴

❷ بریشم عود، عابد علی عابد (پیش لفظ) یوسف ظفر، ص ۶

نہ درد محبت نہ ذوق جنوں
نہ وہ گریۂ خوں نہ سوز دروں
سنا کوئی پنجاب کی داستاں
کہ دل پر ہے بار محبت گراں
وطن ہے میرا حسن کی سر زمین
کمی اس جگہ دلبروں کی نہیں
سنا مجھ کو افسانۂ عشق ہیر!
ذرا چھیڑ دھیمے سُروں میں ہیر! ❶

اِن گزارشات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عابد علی عابد دبستانِ لاہور کے اہم ترین شعراء میں سے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ ایک منفرد انداز کے شاعر کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

○○

سید محمد جعفری (۱۹۰۷ء۔۱۹۷۶ء)

اکبر الہ آبادی کے بعد اُردو میں ظریفانہ شاعری کی طرف شعراء کا رجحان قدرے کم نظر آتا ہے لیکن بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے دوبارہ ہمیں یہ روایت ماضی سے جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان شعراء میں سید محمد جعفری کا نام بہت نمایاں ہے۔ سید محمد جعفری ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو بھرت پور (انڈیا) کے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید محمد علی جعفری ❷ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن تعلیم و تعلم کے سلسلے سے منسلک اور علم دوست ہونے کی بنا پر شعر و شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ سید محمد جعفری نے تعلیم کے زیادہ تر مراحل لاہور میں رہ کر طے کیے۔ آپ ابتدا ہی سے نہایت ذہین

---

❶ شب نگار بنداں، عابد علی عابد، ص ۲۱۷

❷ سید محمد علی جعفری کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل تھے اس سے قبل وہ وہیں اسلامیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب سکول سے کالج بنا تو انھیں اس کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ وہ اس عہدہ سے ۱۹۱۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ وہ مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے ملنے والوں میں تھے۔ انھوں نے بہت لمبی عمر پائی' ۳۰ ۱۹۷ء میں ۱۰۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ (بحوالہ تذکرہ معاصرین' مالک رام جلد چہارم ص ۱۱)

واقع ہوئے تھے۔ دوسرے گھر کا ماحول علمی اور تعلیمی تھا۔ چنانچہ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ❶ اس کے بعد صرف انگریزی کا امتحان دے کر میٹرک کی سند لی اور پھر تو تعلیمی میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی (آنرزان کیمسٹری) اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے فارسی اور ایم او ایل کی اسناد لیں۔ پھر ۱۹۳۲ء میں تاریخ میں اور ۱۹۳۳ء میں اُردو میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کیا۔ سب سے آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ کسب معاش کا مسئلہ سامنے آیا تو اولاً چندے صحافت سے شوق پورا کیا اور یہ "زمیندار" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ جہلم لاہور اور لائل پور (فیصل آباد) کے سکولوں میں پڑھایا پھر گورنمنٹ کالج لائل پور میں پڑھانے لگے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں آپ محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر بن کر دہلی چلے گئے۔ اسی سال بھرت پور میں آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کی بیوی اُردو کے معروف مزاحیہ شاعر ظریف جبل پوری کی بھانجی ہیں۔ تقسیم کے بعد آپ پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہو گئے۔ اس عہدہ پر آپ مدتوں رہے۔ ۱۹۶۴ء میں پاکستان کے سفارت خانے میں کنٹرول اتاشی کے طور پر ایران چلے گئے جہاں تین سال تک یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد ریٹائر ہو کر کراچی میں رہائش اختیار کر لی، جہاں ۷ر جنوری ۱۹۷۶ء کو عارضہ قلب کی وجہ سے انتقال کیا۔

سید محمد جعفری میں صغیر سنی سے ہی مزاح کی حس بہت تیز تھی اور شعر کہنے کا مادہ بھی فطری طور پر موجود تھا، چنانچہ وہ بچپن سے ہی مضحک صورت حال کو شعر کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر کبھی کسی سے اصلاح نہ لی۔ البتہ اس ضمن ان کا قیام محکمہ اطلاعات میں آنے سے پہلے دو سال تک لکھنو میں رہا تو وہاں ظریف لکھنوی' عزیز لکھنوی اور دوسرے اساتذہ کی صحبتوں سے فیض ضرور حاصل کیا۔ ❷

---

❶ تذکرہ معاصرین' مالک رام جلد چہارم' ص ۱۱

❷ سخنور (تذکرہ شعرائے پاکستان)' سلطانہ مہر' ص ۹۴

علاوہ ازیں وہ اپنے سے پہلے تمام اچھے شعراء کو اپنا استاد سمجھتے تھے۔ مزاحیہ شعر کہنے والوں میں حضرت اکبرالہ آبادی کے بڑے مداح تھے اور انھیں اردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبرالہ آبادی کی طرح ان کی نظموں کا سب سے بڑا موضوع بھی تہذیبی تضاد سے دوچار معاشرہ اور ردگرد کا ماحول ہے۔ ❶

"ظریفانہ اور طنزیہ شاعری بالعموم کسی نہ کسی مقصد کے تابع ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے محرکات معاشرتی تضادات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> "اس کے محرکات میں عموماً وہ سماجی ناہمواریاں' بے اعتدالیاں' ناانصافیاں اور کج رویاں ہوتی ہیں جو افراد و طبقات میں عدم مطابقت کو جنم دے کر احساس برتری یا احساس کمتری کے تحت ایک فرد کو دوسرے فرد پر اور ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر ہنسنے ہنسانے کا موقع دیتی ہیں۔ اگر ہنسنے ہنسانے کا یہ عمل صرف وقتی خوش طبعی اور بے ضرر دل لگی تک محدود ہو تو عموماً اسے ظرافت کا نام دیا جاتا ہے لیکن جب اس ظرافت کی تہ میں شعوری یا لاشعوری طور پر کوئی دل آزارانہ یا اصلاحی مقصد پوشیدہ ہو تو اسے طنز سے موسوم کرتے ہیں...... ❷

ظریفانہ اور طنزیہ شاعری سے شاعر کا مقصد اس صورت حال کو تبدیل کرنا ہوتا ہے یا پھر ظاہر و باطن کے تضاد اور منافقانہ رویوں پر ضرب لگانا۔ ایک اور صورت خالص مزاح کی بھی ہوتی ہے۔ خالص مزاح کسی مقصد کے تابع نہیں ہوتا بلکہ اس سے زندگی کے بارے میں آگہی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ سید محمد جعفری نہایت ذہین مزاح نگار ہیں' ان کے یہاں مزاح کی دونوں صورتیں موجود ہیں۔ وہ کہیں الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر' کہیں تحریف نگاری اور تضمین کے ہنر کی مدد سے اور کہیں محض زبان و بیان کی روانی' چستی و چاشنی اور محاورات کے برجستہ استعمال سے مضحک صورت حال کو پیش کرتے اور معاشرتی تضادات کو نمایاں کرتے ہیں بلکہ خالص مزاح بھی پیدا کرتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے متعلق ان کا نظریہ

---

❶ سخن ور (تذکرۂ شعرائے پاکستان' سلطانہ مہر' ص ۹۲

❷ شوخیٔ تحریر' سید محمد جعفری' مطبوعہ مکتبۂ دانیال کراچی ۱۹۸۵ء (دیباچہ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری) ص ۱۰

یہ تھا کہ:

"اسے ایسا صاف ستھرا ہونا چاہیے کہ آپ اسے مستورات اور بچوں کے سامنے بھی پڑھ سکیں، دوسرے اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو"۔ ❶

سید محمد جعفری قیام پاکستان سے قبل جب دہلی میں ملازم تھے تو وہاں بھی اپنی "ہکلی غزل" اور قحط بنگال، بھنگیوں کی ہڑتال، گوشت کا مرثیہ، ترانۂ دلی اور اسی نوع کی دوسری نظموں کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جب وہ پاکستان آگئے تو بھی ان کا شمار پاکستان کے چوٹی کے طنزیہ و مزاحیہ شاعروں میں ہوا۔ نمونہ کلام کے لیے ان کی "ہکلی غزل" اور ۱۹۴۷ء سے قبل کہی گئی نظموں سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

م م مجھ میں اور ت ت تجھ میں جو ر ربط اور ض ض ضبط تھا
ب ب بلبل اور گ گ گل میں بھی م میانۂ چ چمن نہ ہو

ن ن نامہ بر شش و پنج میں م م مجھ سے ہے پ پ پوچھتا
ک ک کہ تو ان کے ھ ھ ہے نہیں کہ کہ کیا کروں جو دہن نہ ہو

ر رقیب روسیہ بزم سے ن نکل گیا تو ز رو پڑا
م مزا تو جب ہے پ پٹ کے بھی م م ماتھے پر شکن نہ ہو

نہ نہ جایئے ر رقیب کے گھ گھ گھر خدا کے واسطے
ر رفیق اس کو نہ جایئے جو م مجھ سا نیک چلن نہ ہو

ج ج جعفری غ غریب ہے ت ت تمغہ (*) اس کو نہ دیجیے
ق ق قدر اس کی جو بڑھ گئی د د دوسروں کو جلن نہ ہو

(ہکلی غزل) ❷

✿ ✿

---

❶ تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد چہارم، ص ۱۴۲

• شملہ میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں بہترین غزل پر انعام کے طور پر ایک تمغہ رکھا گیا تھا۔ (بحوالہ شوخیٔ تحریر، ص ۱۰۴)

❷ شوخیٔ تحریر، ص ۱۰۴

ہو گیا ہے مثلِ دشتِ نجد کلکتہ کا حال
چاول اور گندم ہیں چشمہائے لیلیٰ کی مثال
جن کی اِک جنبش سے ہے گردش میں سودستِ سوال
دیکھیے جس کی طرف مجنوں کا ہوتا ہے خیال
گردشِ مجنوں بہ چشمہائے لیلیٰ آشنا"

(قحط بنگال) ❶

✿✿

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے
کہتر و مہتر کا پتلا حال ہے
گردش دوراں نے ثابت کر دیا
رفع حاجت بھی بڑا جنجال ہے
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی
جیسے دھوتی میں بہت سا مال ہے
ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی
سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے
آ گیا رو کے سے رُک سکتا نہیں
اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے!
شہر پر پھینکا گیا ہے گیس بم
جس کو دیکھو ناک پر رومال ہے
ہر گلی کوچے کی اپنی جھیل ہے
ہر جگہ دہلی میں نینی تال ہے

(بھنگیوں کی ہڑتال) ❷

✿✿

---

❶ شوخیٔ تحریر، ص۱۳۳
❷ شوخیٔ تحریر، ص۱۰۲

عرش ملسیانی (۱۹۰۸ء-۱۹۷۹ء)

بال مکند نام' عرش تخلص' ۲۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی قصبے ملسیان (جالندھر) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد' جوش ملسیانی کا شمار اُردو کے معروف غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ جوش ملسیانی جیسے با مذاق' مہذب اور مشفق باپ کی تربیت کا فیض تھا کہ عرش ایک شستہ ادبی ذوق کے مالک ہوئے۔ عرش نے اپنے والد کی زیر نگرانی ۱۹۲۴ء میں جالندھر سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں انجنیئرنگ کالج رسول (گجرات) سے اوورسیئری کا امتحان پاس کیا اور محکمہ نہر میں ملازمت اختیار کر لی لیکن چونکہ انھیں شعروادب سے فطری لگاؤ تھا اس لیے دو سال بعد یہ ملازمت ترک کر کے ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ انڈسٹریل سکول لدھیانہ میں بطور ڈرائنگ ٹیچر ملازم ہو گئے جہاں آپ نے کم و بیش بارہ سال کام کیا۔ اس دوران میں آپ نے ذاتی مطالعہ کی بنا پر ۱۹۳۲ء میں ایف اے اور ۱۹۳۵ء میں بی اے کے امتحانات بھی پاس کر لیے۔ تقسیم ملک سے پہلے آپ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن میں' جہاں حفیظ جالندھری ڈائریکٹر سانگ پبلسٹی تھے' ملازم تھے۔ تقسیم کے بعد کچھ عرصہ آپ منسٹری آف لیبر حکومت ہند' نئی دہلی کے دفتر میں ملازم رہے۔ بعد ازاں پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبہ اُردو میں' جو تین ماہانہ جریدوں آج کل، بساط عالم اور نونہال شائع کرنے کا اہتمام کرتا تھا اور جہاں حضرت جوش ملیح آبادی مدیر اعلیٰ تھے' آپ "آج کل" کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں جوش ملیح آبادی کے پاکستان آجانے پر آپ اس ماہنامے کے مدیر اعلیٰ ہو گئے۔ جہاں سے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو سرکاری پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد تقریباً بارہ سال خانہ نشین رہ کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہنے کے بعد ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو نئی دہلی میں انتقال کیا۔ ❶

عرش نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس لیے ان کی شعروسخن کے ساتھ دلچسپی فطری بات تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں کم عمری میں ہی نہ صرف شعر کہنے پر قدرت حاصل ہو گئی بلکہ وہ اُردو شعری روایات سے بھی کامل طور پر آشنا ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف اقبال کی شاعری کی دھوم تھی اور دوسری طرف جوش ملسیانی' حفیظ جالندھری' تلوک چند محروم اور دوسرے

---

❶ "کلیات عرش ملسیانی" مرتبہ مالک رام' مطبوعہ جامعہ ملیہ نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۷

شعرا نئی غنائیت اور نئی شعری قدروں کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ عرش کا اس فضا سے متاثر ہونا لازمی امر تھا۔
چنانچہ انھوں نے خود بھی جو نغمہ چھیڑا وہ رنگِ تغزل سے بھرپور تھا۔

عرش نے موضوعاتی نظمیں بھی کہی ہیں، جن میں قدرتی مناظر سے لے کر اپنے ماحول کی ترجمانی اور زندگی کے مختلف النوع مسائل تک تمام موضوعات آ گئے ہیں، لیکن انھیں صنفِ غزل زیادہ محبوب ہے۔ جس طرح نظم میں وہ عصری جذبات و رجحانات کو پوری طرح پیش کرنے پر قادر ہیں اسی طرح ان کی غزل روایات کے ساتھ ساتھ نئے سماجی و معاشرتی رجحانات اور جدید شعری تصورات کا خوبصورت مرقع ہے۔ بقول حضرت جوش ملیح آبادی:

> ''عرش صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں، فن کی بلندی کا سختی کے ساتھ لحاظ کرتے اور معائب شعری سے دور رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روح اور بیان میں حرارت پائی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی اکثر نظموں میں مغز اور تفکر کے نمایاں آثار ملتے ہیں''۔ [1]

عرش کی زبان اور ان کے اسلوب بیان کا انداز وہی ہے جو اُن کے والد جوش ملسیانی کا ہے اور جوش زبان و بیان کے معاملے میں حضرت داغ کے شاگرد ہونے کے ناطے مستند تسلیم کیے جاتے ہیں۔ غرض عرش کی شاعری فکری اعتبار سے اپنے زمانے کے تقاضوں کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے محاسن سے آراستہ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

اگر تو دل میں ایک بار آئے
عمر بھر کے لیے قرار آئے

آشیانہ ہی گلستاں میں نہیں
اَب خزاں آئے یا بہار آئے

وہ نہ آئیں تو اے دمِ آخر
لب پہ نام ان کا بار بار آئے

---

[1] کلیاتِ عرش ملسیانی (تعارف، حضرت جوش ملیح آبادی)، ص ۹

نہ حرم میں ہیں وہ' نہ دیر میں ہیں
ہم تو چاروں طرف پکار آئے
یاس کہتی ہے کچھ' تمنا کچھ
کس کی باتوں کا اعتبار آئے
موت نے آسرا دیا بھی تو کب
جب مصیبت کے دن گزار آئے
یہ تو کچھ تلخ تھی مرے ساقی!
اب جو آئے' وہ خوشگوار آئے
اس کو تیرا پیامبر سمجھوں
موت اگر وقتِ انتظار آئے
عرشؔ وہ بے قراریاں نہ رہیں
دل کو اب کس طرح قرار آئے ⓿

⭘⭘

صنم کدہ ہو کلیسا ہو' دیر ہو کہ کنشت
یہ خوب کر نہیں سکتے اسے عمل جو ہے زشت
یہ لاف برہمن و شیخ زادگی کیسی!
کوئی غرورِ نسب سے نہیں ہے نیک سرشت
خیال حور و قصور و مے طہور نہ کر
اگر تو غور سے دیکھے تو زندگی ہے بہشت
ہیں ایک دل ہی میں تسکین و اضطراب نہاں
اسی کا نام ہے دوزخ اسی کا نام بہشت

⓿ کلیاتِ عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام' ص ۴۳

یہ مسجد اور یہ مندر، خدا کے گھر توبہ!
اور ان میں آ کے تو کرتا ہے آرزوئے بہشت
ترے فریب و ریا کے ہیں مقبرے گویا
یہ رکھ دیے ہیں جو چن چن کے تُو نے سنگ و خشت
مجھے خطر ہے کہیں مات کھا نہ جائے تو
بساطِ دہر میں ہر ہر قدم پہ تجھ کو ہے کشت
(حقیقتِ تلخ) ❶

○○

دکھا وہ میکدہ مجھ کو بھی آج' پیرِ مغاں
ہزار صومعے جس میکدے پہ ہیں قرباں
وہ میکدہ وہ شعور و خرد کی ہے کا امیں
کہ دھوئی جاتی ہے جس میں حماقتِ انساں
بجائے شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں
بجائے عود مہکتا ہے جس میں سوزِ نہاں
وہ میکدہ کہ جہاں روحِ آدمیت ہے
وہ میکدہ کہ جہاں تازہ ہوتے ہیں ایماں
وہ میکدہ کہ ہے ظلماتِ جہل سے محفوظ
وہ میکدہ کہ جہاں مہرِ عقل ہے تاباں
جہاں بگوشۂ یک جام وسعتِ عالم
جہاں بگوشۂ یک دل فضائے کون و مکاں
(میکدہ) ❷

○○

❶ کلیاتِ عرش ملسیانی، مرتبہ مالک رام، ص ۲۷۷
❷ کلیاتِ عرش ملسیانی، مرتبہ مالک رام، ص ۳۰۷

باقی صدیقی (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۲ء)

باقی صدیقی جن کا اصل نام محمد افضل ہے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ٹیکسلا کے نواحی قصبے' سہام میں پیدا ہوئے۔ بد قسمتی سے بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اس لیے فکر معاش کی وجہ سے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ تقریباً پانچ سال تک ضلع راولپنڈی کے دیہاتی مدارس میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران میں جے وی کا محکمانہ امتحان بھی پاس کر لیا مگر یہ ملازمت آپ کی طبیعت کے موافق نہ تھی، چنانچہ مدرسی سے سبکدوش ہو کر بہتر مستقبل کی تلاش میں بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں آپ کا قیام تقریباً تین سال تک رہا۔ اس اثنا میں آپ نے ایک دو فلم کمپنیوں میں کام کیا مگر اس کام میں بھی دل نہ لگا تو وطن لوٹ آئے۔ اس عرصے میں جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو چکا تھا۔ باقی صدیقی نے معاشی مجبوریوں کے پیشِ نظر موقع غنیمت جانا اور فوج میں حوالدار کلرک بھرتی ہو گئے جہاں آپ دو سال تک رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ آرڈننس ڈپو اور پھر چار سال تک ایم ای ایس میں ملازم رہے مگر ۱۹۴۹ء میں والدہ کے انتقال کی وجہ سے سرکاری ملازمت ترک کر دی۔ ۱۹۵۰ء میں ہفتہ وار ''راہ و منزل'' راولپنڈی کے ادارے میں شامل ہو گئے، ایک سال بعد یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک ہو گئے، اس سلسلے میں کچھ عرصہ راولپنڈی بھی رہے لیکن قسمت نے یہاں بھی یاوری نہ کی اور ۱۹۵۳ء میں عملے میں تخفیف کی بنا پر آپ کو اس جگہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ اپنے آبائی قصبے ''سہام'' میں قیام پذیر ہوئے۔ جہاں فکر شعر و ادب کے علاوہ اپنے کلام کے مجموعوں کو مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اسی جگہ ۸ر جنوری ۱۹۷۲ء کو انتقال کیا۔

باقی صدیقی کو شعری ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ آپ نے اسی ذوق کے زیر اثر شاعری کی ابتدا پنجابی نظمیں کہنے سے کی لیکن جلد ہی اُردو کی طرف رغبت پیدا ہو گئی تو اُردو میں نظمیں کہنے لگے۔ فن شعر میں عبدالحمید عدم سے اصلاح لیتے تھے۔ ❶

باقی صدیقی کو نظم سے زیادہ غزل کی صنف پسند ہے۔ جس میں انھوں نے فکر و فن کی جملہ خصوصیات کو بڑے سلیقے اور حسن تناسب سے برتا ہے۔ غزل میں ان کا انداز کلاسیکی رہا ہے مگر موضوع کے اعتبار سے انھیں

---

❶ پیش لفظ ''جام جم'' (مجموعہ کلام باقی صدیقی) احسان دانش' مطبوعہ دانش گاہ پنجاب مزنگ لاہور (سن ن) ص ۶

یہ امتیاز حاصل ہے کہ ”جدید متغزلین کی طرح غمِ ذات کے ساتھ غمِ کائنات کو بھی اپنے کلام میں جگہ دے کر اسے زیادہ حسین، زیادہ دلکش اور زیادہ حقیقت افروز بنا دیا ہے“۔ ❶ ان خصوصیات کے باوصف خاص طور پر ان کی چھوٹی بحر کی غزلیں، جو صفائی و سادگی، روانی و سلاست، رمز و ایما اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بڑی دل آویز ہیں، ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ایک مختصر نظم اور ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

مدھم مدھم رُخ پہ غازہ
زخم جگر کے تازہ تازہ

جی کچھ غم میں بیکل بیکل
آنسو آنکھ میں جل تھل جل تھل

سینہ درد سے بوجھل بوجھل
نیند نظر سے اوجھل اوجھل

دل جذبے سے خالی خالی
زیست کی راہیں کالی کالی

جیون ندی سوکھی سوکھی
انگڑائی کچھ روکھی روکھی

دل کی دنیا سونی سونی
غم کی موجیں خونی خونی

حسن کا دریا ٹھہرا ٹھہرا
فکر کا عالم گہرا گہرا

ہاتھ کے ناخن کورے کورے
سُونے بازو گورے گورے

---

❶ جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) ص ۱۰۹۹

روح الم میں کھوئی کھوئی
جاگتی بستی سوئی سوئی

(بیرہ) ❶

✿ ✿

جو تمہارے حضور ہوتا ہے
وہ زمانے سے دُور ہوتا ہے
اپنی اپنی وفاؤں پر سب کو
تھوڑا تھوڑا غرور ہوتا ہے
بے رُخی کا گلہ کریں نہ کریں
دل کو صدمہ ضرور ہوتا ہے
بخش دیجیے تو کوئی بات نہیں
آدمی سے قصور ہوتا ہے
مے اُلفت کی بات کیا باقی
اور ہی کچھ سُرور ہوتا ہے ❷

✿ ✿

ن م راشد (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۵ء)

نذر محمد راشد جو ن م راشد ❸ کے قلمی نام سے معروف ہوئے۔ گوجرانوالہ کے ایک

---

❶ جام جم، باقی صدیقی ص ۶۶

❷ دارو رسن، باقی صدیقی، مطبوعہ قومی کتب خانہ راولپنڈی، سن ن، ص ۶۳

❸ طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں راشد نے وحیدی اور خاطف علی پوری کے قلمی نام سے بھی کچھ غزلیں اور نظمیں کہیں جو ماہنامہ تفریح، بجنور، ماہنامہ کائنات لاہور اور ماہنامہ خیالستان لاہور سے شائع ہوئیں۔ یہ کلام راشد نے اپنے کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ راشد کی وفات کے بعد ان کے ایک مداح ڈاکٹر مغنی تبسم نے یہ کلام راشد پر مرتب کردہ اپنی کتاب "ن م راشد فن اور شخصیت" مطبوعہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۱ء کے آخر میں یکجا کر دیا ہے۔

قصبے اکال گڑھ (۱) میں پیدا ہوئے۔

اسی قصبے کے گورنمنٹ ہائی سکول سے ۱۹۲۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ شعر کہنے کا شوق ورثے میں پایا تھا اور طالب علمی کے ابتدائی زمانہ ہی سے تھا۔ آپ کے دادا راجہ غلام رسول چشتی' اگرچہ پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے لیکن عربی کے ایک جید عالم تھے' شعر بھی کہتے تھے اور ''غلامی'' تخلص کرتے تھے۔ والد' راجہ فضل الٰہی چشتی کو' جو شعر تو کم کہتے تھے' فارسی شاعری کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ راشد نے حافظ' سعدی' غالب اور اقبال کی شاعری سے انھیں کی بدولت آشنائی حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے جہاں سے ۱۹۳۰ء میں بی اے اور ۱۹۳۲ء میں ایم اے (اقتصادیات) کے امتحان پاس کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں کالج میگزین ''راوی'' کے اُردو حصے کے ایڈیٹر رہے جس میں ان کی کئی نظمیں اور مضامین شائع ہوئے۔ کالج میں وہ بزم سخن کے سیکرٹری بھی تھے اور انھیں بحث و مباحثہ اور تقریری مقابلوں میں شریک ہونے کا بھی شوق رہا۔ ۱۹۳۳ء میں چند ماہ تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے رسالے ''شہکار'' کی ادارت کی اور پھر ملتان میں کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں راشد نے اپنی پہلی آزاد نظم ''جرأت پرواز'' لکھی جو اُن کے پہلے مجموعے ''ماورا'' میں شامل ہے مگر جس نظم نے بعض نقادوں اور قاریوں کو سب سے زیادہ چونکایا وہ ''اتفاقات'' تھی جو ۱۹۳۵ء میں مجلّہ ''ادبی دنیا'' لاہور کے سالنامے میں شائع ہوئی۔ ملتان کے عرصہ قیام میں راشد' خاکسار تحریک سے بھی بطور ضلع سالار وابستہ رہے۔ اس تحریک کا نظم و ضبط انھیں بہت پسند تھا جس کے وہ ہمیشہ عادی بھی رہے لیکن بوجوہ ایک سال بعد اس تحریک سے بے تعلق ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں راشد نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں جب آپ ڈائریکٹر آف پروگرامز تھے تو فوج میں عارضی کمیشن پا کر بحیثیت پبلک ریلیشنز آفیسر مختلف ممالک میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۴۷ء میں فوج سے رخصت ہو کر دوبارہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار

---

(۱) اس تاریخی قصبے کو جو ضلع گوجرانوالہ میں دریائے چناب سے پانچ چھے کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے اب علی پور چٹھہ کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ سکھوں کا بڑا گڑھ (مرکز) تھا۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تھا جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں اس کی آبادی تین ہزار کے لگ بھگ تھی آج کل پچاس ہزار کے قریب ہے۔

کرلی۔ تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کے مختلف سٹیشنوں پر بطور ریجنل ڈائریکٹر کام کیا۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کی ملازمت میں آ گئے اور مختلف اوقات میں مختلف ممالک میں بطور ڈائریکٹر اطلاعات کام کیا۔ اس سلسلے میں زیادہ عرصہ نیویارک میں بسر ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد لندن کے ایک مضافاتی خوبصورت قصبے چیلٹینہم میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ۹ راکتوبر ۱۹۷۵ء کو لندن میں انتقال کیا۔

ن م راشد کے سوانحی خاکے سے واضح ہے کہ ان کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے بے حد دلچسپی تھی اور زمانہ طالب علمی ہی میں وہ شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل اور پابند نظم ہی سے کیا جو بھرپور رومانوی رجحانات کی حامل تھی تاہم جلد ہی انھوں نے اُردو شعری روایات سے انحراف کر کے مغرب کے شعراء بالخصوص انگلستان اور فرانس کے جدید شعراء کے زیر اثر نظم نگاری کے فن کو نئے طریقوں سے برتا اور اپنی تمام تر توجہ آزاد نظم کی طرف منعطف کردی۔ لیکن اس ذہانت اور نفاست کے ساتھ کہ نہ تو مغربی شعراء کی اندھی تقلید کی اور نہ اُردو شعری روایات کو یکسر فراموش کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی' راشد کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ن م راشد نے روایت سے انحراف کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ انحراف کو روایت سے ملایا بھی ہے۔ یہی ان کے فن کی انفرادیت ہے''۔ ❶

پابند نظم کے بجائے ایسی آزاد نظم جس میں مصرے چھوٹے بڑے ہوں اور ارکان کی تعداد بھی یکساں نہ ہو یقیناً قارئین کے لیے نامانوس تھی لیکن زیادہ انوکھی چیز اس لیے نہ تھی کہ راشد سے پہلے ایک تو اُردو شاعری میں مستزاد کی روایت موجود تھی دوسرے شرر اور اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی نظموں میں۔ جس چیز نے اُردو ادب کے قاری کو سب سے زیادہ چونکایا وہ ان کے تخیل کی جدت طرازی تھی جس میں افسانوی اور ڈرامائی عناصر کے جدید اسالیب سے کام لیا گیا تھا۔ اب نظم میں شاعر کے واحد متکلم ہونے کے بجائے ایک کردار اور بعض اوقات کئی کئی کردار تھے' کہیں خود کلامی کا انداز تھا اور کہیں ایسے مکالمے' جن میں مخاطب کا نام لیے بغیر کچھ جملے ادا کیے گئے تھے اور پھر ان کے درمیان بھی کئی محذوفات اور ایسے ابہام تھے جنھیں قاری کو اپنے خیال سے پر کرنا تھا۔ گویا روایتی نظم نگاری کے برخلاف

---

❶ ''ن م راشد.........ایک مطالعہ'' (پیش لفظ) ڈاکٹر جمیل جالبی' مطبوعہ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء ص ۹

آزاد نظم میں ایک منطقی انداز کے بجائے ایسا تصورِ زمان و مکان تھا جو ہر آن حرکت پذیر ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ راشد کے پہلے مجموعے ''ماورا'' کے دیباچے میں کرشن چندر نے ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اس کا تخیل ہمیشہ موروثی زبان کے الفاظ ان کے معانی' اسالیب بیان' بندشوں اور ترکیبوں کو توڑتا' پگھلاتا' انھیں نئے سانچوں میں ڈھالتا' نئی صورتیں دیتا اور ان میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے''۔ [1]

''ماورا'' میں راشد کی شاعری کا محور نیا زمانہ اور اس کی تلخیاں ہے۔ ان کی شاعری کا یہ زمانہ تشکیک کا زمانہ ہے' یہ وہ دور ہے جب تیسری دُنیا بالخصوص ایشیا میں مغربی تسلط اور نوآبادیاتی تشدد عام ہے اور انسانی قدریں پامال ہیں۔ چونکہ شعراء اپنے معاشرے کے حساس افراد ہوتے ہیں اس لیے اکثر شعراء کے یہاں ان کی شاعری کا معتدبہ حصہ سماجی انحطاط' صنعتی و اقتصادی سرگرمی اور سیاسی بیداری' وطنیت' عظمت کار' عزتِ نفس اور آزادیٔ مشرق کی غلامی' مغربی سامراج کے تصادم سے پیدا شدہ صورت حال اور مشرقی اقدار کے احیا پر مبنی ہے۔ ن م راشد بھی اس دھارے سے باہر نہیں بلکہ ان کی شاعری فکری اور جذباتی لحاظ سے اس صورت حال کی عکاسی زیادہ شدت کے ساتھ کرتی ہے اور اس دور کے معتز عوامل بالخصوص روایت پرستی' ملائیت اور تصوف کے منفی رجحانات کو مٹا دینے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کو احساس ہے کہ ان عوامل نے مشرقی روح کو کمزور کیا ہے۔ بقول کرشن چندر:

''یہ احساسِ شدید جو مشرق کے تنزل حیات سے ہوا ہے اس کی قوت متخیلہ پر پوری طرح

---

[1] ''ماورا'' (تعارف از کرشن چندر) ن م راشد' مطبوعہ مکتبۂ اردو لاہور ۱۹۴۱ء ص ۸

چھا گیا ہے"۔ ❶

ن م راشد اپنی فکری کاوشیں اس دور کے منفی رجحانات کو بدلنے میں صرف کرتے رہے لیکن جب اپنے تمام تر خلوص کے باوجود ان کی مساعی سرخرو نہیں ہوتیں تو وہ اس صورتِ حال سے اُکتا جاتے ہیں اور اپنی سعی رائیگاں کو خشت کوبی کا نام دیتے ہیں۔ زمان ومکان کے قہرمانی دور سے نکلنے کا انھیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا اور ان کا درد پنہاں سوال بن کر زبان شعر میں ڈھل جاتا ہے:

کوئی مجھ کو دورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتادو'
کوئی یہ سمجھادو کہ حاصل ہے کیا ہستی رائیگاں سے؟
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی!
میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے' نان شبینہ نہیں ہے'
اور اس پر بھی یہ قوم دل شاد ہے شوکت باستان سے
اور اب بھی ہے اُمید فردا کسی ساحرِ بے نشاں سے!
مری جان' شب وروز کی اس مشقت سے تنگ آگیا ہوں'
میں اس خشت کوبی سے اُکتا گیا ہوں
کہاں ہیں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنھوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا؟

(پہلی کرن) ❷

مشرق ومغرب کے جس المیے کو "ماورا" کی نظموں میں استعاروں اور مختلف پیکروں کے ذریعے اُبھارنے کی کوشش کی گئی تھی "ایران میں اجنبی" کی تمام نظموں میں اِس المیے نے ایک مربوط' منظم اور ٹھوس استعارے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اب ذہنی اور فکری اعتبار سے راشد اور بھی پختہ کار معلوم

---

❶ ماورا (تعارف از کرشن چندر) ن م راشد' ص ۱۲

❷ کلیاتِ راشد' ن م راشد' مطبوعہ ماورا پبلشرز لاہور ۱۹۸۸ء' ص ۱۳۰

ہوتے ہیں اور وہ انسانی قافلے کو اپنی ہی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں:

برے ہاتھ میں ہاتھ دے دو !

برے ہاتھ میں ہاتھ دے دو !

کہ دیکھی ہیں مَیں نے

ہمالہ دالوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

انھیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر

بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے

جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں !

(تیل کے سوداگر) ❶

''ماورا'' اور ''ایران میں اجنبی'' کی بیشتر نظموں میں وسعتِ فکر اور ایک طرح سے اتحادِ عمل کی دعوت ہے اور پھر بقول خلیل الرحمٰن عظمی :

''بعض جگہ راشد اپنے مخصوص الفاظ اور پیرایہ ہائے اظہار کی یکسانیت سے نکل کر نسبتاً متحرک اسلوب کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں''۔ ❷

راشد کے تیسرے مجموعے ''لا = انسان'' اور آخری مجموعے ''گمان کا ممکن'' میں ان کا فن مزید ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے۔ اب ان کی شاعری کا مرکز اور محور وہ آفاقی انسان ہے جو اقدار کی شکست و ریخت میں اپنے وجود کے معنی و مفہوم کھو بیٹھتا ہے۔ اب راشد انسان کو اس کے وجود کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں، گویا وہ اب زمان و مکان کے حدود سے نکل کر ایک وسیع تر اُفق کی جانب محوِ پرواز ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں دانشورانہ اندازِ فکر کی وہ سطح ملتی ہے جو جدید شاعری کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ ''گمان کا ممکن'' کی ایک

---

❶ کلیاتِ راشد' ن م راشد ص ۲۳۸

❷ راشد کا ذہنی ارتقا (مقالہ) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی' مطبوعہ ن م راشد.........ایک مطالعہ' مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی' ص ۱۳۷

نظم سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں وہ انسان کو دل کی بھٹی میں تپا کر اس کی شخصیت کو نکھارنا چاہتے ہیں:

شہر کے گوشوں میں ہیں بکھرے ہوئے
پا شکستہ سر بریدہ خواب
جن سے شہر والے بے خبر!
گھومتا ہوں شہر کے گوشوں میں روز و شب
کہ ان کو جمع کر لوں
دل کی بھٹی میں تپاؤں
جس سے چھٹ جائے پرانا میل
ان کے دست و پا پھر سے اُبھر آئیں
چمک اُٹھیں لب و رخسار و گردن
جیسے نو آراستہ دُلہوں کے دل کی حسرتیں
پھر سے ان خوابوں کو سمت رہ ملے!

(اندھا کباڑی) ❶

✿ ✿

---

❶ کلیاتِ راشدؔ، ن م راشدؔ، ص ۴۹۵

سید عبدالحمید عدم (۱۹۱۰ء۔۱۹۸۱ء)

گوجرانوالہ کے مضافات میں سات کلومیٹر کے فاصلے پر تلونڈی موسیٰ خان نام کا ایک گاؤں ہے جو عبدالحمید عدم کے اجداد کا وطن مالوف ہے۔ عدم کا تعلق سادات گھرانے سے ہے۔ یہ گھرانہ مدت سے یہاں آباد تھا۔ آپ کے آباء میں سے اکثر لوگ فوج سے منسلک رہے ہیں۔ آپ کے دادا سید مہتاب شاہ بھی فوج میں صوبیدار تھے۔ لیکن آپ کے والد نے فوجی ملازمت نہ کی اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں وہ عارضی طور پر لائل پور (فیصل آباد) میں اقامت پذیر تھے۔ جہاں ۱۰/ اپریل ۱۹۱۰ء کو عدم پیدا ہوئے۔ ❶ عدم کی پرورش اور تعلیم و تربیت ابتدا میں گوجرانوالہ اور پھر لاہور میں ہوئی جہاں آپ کے والد نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں جبکہ عدم کی عمر صرف سولہ سال تھی، ان کے والدِ ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ عدم کے کندھوں پر آپڑا اور وہ اقتصادی مشکلات میں بُری طرح گھر گئے۔ انھی حالات میں ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی ہو گئی، جس سے اخراجات مزید بڑھ گئے۔ چنانچہ گھریلو اخراجات کی کفالت کے لیے اور حالات بہتر بنانے کی کوشش میں عدم نے گاؤں میں اپنی جائیداد فروخت کر دی اور تعلیم سے فراغت کے بعد ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اسی محکمے سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اپریل ۱۹۶۶ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی ملازمت کا زیادہ وقت راولپنڈی میں بسر ہوا لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں قیام پذیر رہے جہاں بالآخر ۱۰/ مارچ ۱۹۸۱ء کو وفات پائی۔

دبستانِ لاہور اگرچہ زیادہ تر نظم گوئی میں اپنے مخصوص اظہار و ابلاغ کی بنا پر معروف ہے لیکن یہاں دوسری اصناف شاعری پر بھی مناسب توجہ دی گئی اور ان اصناف میں موضوع اور ہیئت کے کامیاب تجربات بھی ہوئے۔ یہاں نہ صرف اردو شاعری کی سب سے اہم صنف غزل کی روایت کی پیروی کی گئی بلکہ دبستان کے شعراء نے اپنی فکر و خیال کی جدت سے اس صنفِ شعر میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ انھی جدید غزل گو شعراء میں عبدالحمید عدم کا شمار ہوتا ہے۔

---

❶ عدم کے حالات زندگی زیادہ تر ان کے خود نوشت سوانح حیات مطبوعہ فنون (جدید غزل نمبر) بابت جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۳۱ سے ماخوذ ہیں۔

عدم کو شعر و شاعری سے دلچسپی طالب علمی کے زمانے سے ہی تھی لیکن ان کی شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۲۷ء سے ہوئی جب انھوں نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ عدم نے چونکہ طبع موزوں پائی تھی اس لیے شعر گوئی کے معاملے میں انھوں نے اپنے فطری وجدان اور ذوقِ سلیم کی رہنمائی کو ہی غنیمت جانا اور کبھی کسی سے اصلاح نہ لی۔ خواجہ دل محمد کی طرح، ذرا سے فرق کے ساتھ، یہ بات عدم پر بھی صادق آتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو دن رات حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا ہو وہ تغزل کا ایسا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ذوق کیسے رکھتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ایک تو عدم فطری شاعر تھے اور شعریت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی دوسرے حساب اور شاعری کے اصولوں میں گہری مشابہت ہے اور خواجہ دل محمد کے الفاظ میں:

> "ریاضی نیرنگِ مقادیر سے وہی لطف اٹھاتی ہے جو شاعری نیرنگِ خیال سے۔ ⓿

چنانچہ حساب کتاب عدم کی شاعری کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوا۔

جب عدم نے شعر و شاعری کی ابتدا کی تو پہلے پہل نظم کہتے تھے اور ان کی اس زمانے کی نظمیں خاصی جاندار بھی ہیں مگر عدم کا رجحانِ طبع فطرتاً تغزل کی طرف زیادہ تھا اس لیے ان کا خاص سرمایہ غزل ہی ہے۔ عدم ایک رند مشرب انسان تھے چنانچہ ان کی غزل میں بھی رندی و سرمستی کے دلکش مضامین کثرت سے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے سوز و گداز، شوخی و بذلہ سنجی اور کیف و سرور سے اور بھی دلآویز کر دیا ہے۔

دبستانِ لاہور میں اختر شیرانی کے بعد اگر کسی شاعر کو صحیح معنوں میں رومانویت کا علمبردار کہا جا سکتا ہے تو وہ عدم ہی ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک صحت مند رومانی کیفیت ہر وقت موجزن رہتی ہے۔ ان کے یہاں رومان میں ایک بشاشت اور شادابی ہے۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی عدم ایک شگفتہ مزاج انسان تھے اور برے حالات میں بھی انھوں نے زندگی کے مثبت پہلوؤں اور اس شگفتگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ چنانچہ ان کی شاعری پر بھی یہی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔

عدم تغزل کے اس رنگ میں کسی کے مقلد نہیں بلکہ ان کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ ہے جو منفرد بھی

⓿ دیباچہ "صد پارۂ دل" ص ب

ہے اور یکتا بھی۔ وہ اگرچہ فکر و خیال کے شاعر نہیں، جسے دبستانِ لاہور کے اکثر شعراء نے ہمیشہ مقدم رکھا ہے تاہم ان کی شاعری میں سوز اور بے ساختہ پن دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ عدم اس دبستان کے سلیس، رواں، بے تکلف اور سبک انداز بیان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل میں ان مضامین کو اولیت دی ہے، جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ دل کے ساتھ ہے۔

عدم کو زبان و بیان دونوں پر بڑی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ انھیں مترنم اور دلکش بحروں کے انتخاب میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تشبیہوں، استعاروں، کنایوں اور ترکیبوں میں حسنِ ادا کے ساتھ ساتھ اکثر اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاص و عام نے ان کے کلام کو پسند کیا۔ علامہ نیاز فتح پوری، عدم کے اولین مجموعہ کلام ''نقشِ دوام'' کی جو پہلی بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا، ابتدا میں، ان کے کلام کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عدم کے کلام کی وہ خصوصیات جس نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا، جذبات کی بلندی اور زبان کی حلاوت ہے۔ غزل ہو یا نظم وہ ہر چیز کو خاص نظر سے دیکھتے ہیں اور ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کے لیے یہ امتیاز دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر کے خیال سے لطف اٹھا رہا ہے یا اس کی زبان سے۔'' [1]

عدم بڑے زود گو تھے، انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ ان کے تقریباً تیس مجموعے بغیر کاٹ چھانٹ کے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر ان کا منتخب کلام ہی شائع ہوتا تو آج عدم کا شمار پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے غزل گو شعراء میں ہوتا۔

بہر کیف عدم کی شاعری فکر و خیال، رندی و سرمستی اور شوخی و سادگی سے عبارت ہے۔ انھوں نے نظم کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور غزل کے ساتھ بھی۔ ان کی نظمیں بالخصوص ساقی نامہ، نعرۂ مردانہ، فلسفۂ زندگی، ابرِ کرم سے خطاب، دریا اور شاعر، مجبوری، فلسفی سے خطاب، بادل اور کوہسار، خامشی، رُخصت، تاثراتِ گورستان، وقت، راوی کے کنارے ایک شام، مزدور، سیرِ محشرستان، شبِ مہتاب، گھٹا، بچے، سرودِ رُوح، حوادثِ پنہاں، بیتے ہوئے دنوں کی یاد، اسرارِ حیات، سکوتِ نیم شب، یادِ وطن،

---

[1] اعتذار و اعتراف (ابتدائیہ ''نقشِ دوام'') علامہ نیاز فتح پوری، مطبوعہ کارواں، لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۱۲

دریا، اور عقل و عشق اپنی اپنی جگہ لاجواب نظمیں ہیں۔ جن میں عدم نے ہر عنوان کی رعایت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اصل مقصود سے غیر متوازن خیالات کو کہیں بھی جگہ نہیں دی اور بقول علامہ نیاز فتح پوری:

"نظم کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہوتی ہے کہ خیال و زبان دونوں مربوط و مسلسل ہوں۔" [1]

مثال کے طور پر عدم کی ایک مختصر نظم "وقت" ملاحظہ کیجیے جس میں عدم نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے اپنے موضوع کو پیش کیا ہے:

چٹک کے وقت سے ننھی سی اک کلی نے کہا
ذرا چمن میں طلسمِ بہار رہنے دے
ابھی تو آنکھ کھلی ہے مری، ابھی کچھ دیر
فضائے باغ کو شاداب کار رہنے دے
مری رگوں میں مچلنے دے موجِ صہبا کو
مرے خیال کو غرقِ بہار رہنے دے
لباس، قوسِ قزح کا، جو میں نے پہنا ہے
مرے بدن سے اُسے مت اتار رہنے دے
صباحتیں ہیں اگرچہ بہت عجیب و غریب
صباحتیں ہیں یہ ناپائیدار رہنے دے
ہجوم رنگ و فروغ جمال و بارشِ کیف
عجیب چیز ہے دورِ بہار رہنے دے
تجھے بہار کے لیل و نہار کی سوگند
ذرا بہار کے لیل و نہار رہنے دے
کہا کلی نے، بصد منت و نیاز کہا
مرا سہاگ، مری یہ بہار رہنے دے

---

[1] اعتذار و اعتراف (ابتدائیہ "نقش دوام")، علامہ نیاز فتح پوری، ص ۱۲

مگر وہ گھائل انداز التجا نہ ہُوا
کلی کو توڑ کے ہنستا ہوا روانہ ہُوا

❶

عدم، نظم سے زیادہ غزل کا شاعر ہے۔ غزل میں ان کے کلام کا سب سے نمایاں پہلو وہ بے ساختہ پن ہے جو اُن کی شاعری کو روزمرہ کی بے تکلف گفتگو کے بہت قریب لے آتا ہے، سلیس اور رواں زبان اور شیریں لہجے کی آمیزش اس بے ساختہ پن میں انفرادیت کا وہ رنگ بھرتی ہے، جو عدم سے خاص ہے۔ رنگِ غزل ملاحظہ کیجیے:

کوئی خدمت دلِ جواں کے لیے
کوئی ارشاد میہماں کے لیے

آپ اگر اِک نگاہ بخش سکیں
روشنی چاہیے مکاں کے لیے

مشغلہ بھی تو کچھ خضر صاحب
چاہیے عُمرِ جاوداں کے لیے

بارہا دل پہ ہاتھ رکھا ہے
ہم نے تفریح مہ وشاں کے لیے

آپ ہی نے تو کی تھی فہمائش
ہم سے آغاز داستاں کے لیے

دیکھیے کیا ہوس کے ہاتھ آئے
سود اِک عذر ہے زیاں کے لیے

اِتفاقاً چلے گئے تھے جہاں
دل ترستا ہے اب وہاں کے لیے

کھول دیجیے دراز زلفوں کو
آج تسخیرِ لامکاں کے لیے

پرسشِ حال کی ضرورت کیا
اے عدم اس مزاج داں کے لیے

❷

○○

---

❶ نقشِ دوام، عدم، مکتبۂ کارواں لاہور ۱۹۷۲ء ص ۵۱

❷ رم آہو، سید عبدالحمید عدم، آئینۂ ادب لاہور ۱۹۶۶ء ص ۱۵۸

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء)

فیض کا آبائی وطن ضلع سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کا ایک قصبہ کالا قادر ہے، جہاں آپ کے والد چودھری سلطان محمد خان بار ایٹ لاء ایک درمیانے درجے کے زمیندار تھے اور علاقے بھر میں اپنی محنت، دیانت، شرافت، علم اور ادب دوستی کی بنا پر بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فیض ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان دنوں آپ کے والد، جو سیالکوٹ کے ایک سرکردہ وکیل ہی نہ تھے بلکہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین بھی تھے، مستقل سکونت رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے والد کو مذہب سے بڑا لگاؤ تھا، چنانچہ انھوں نے فیض کو عربی، فارسی اور اُردو کی روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ حفظِ قرآن اور مذہبی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے معروف مکتب میں داخل کرادیا۔ مولوی صاحب اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ فیض بھی اپنے والد کے ساتھ ان کے حلقہ درس میں روزانہ شریک ہوتے اور پھر سکاچ مشن ہائی سکول جاتے جہاں آپ نے چوتھی جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ رات کو آپ اپنے والد کو اخبار پڑھ کر سناتے اور خط و کتابت میں ان کی مدد کرتے۔ اس طرح بچپن ہی میں عام سطح کے لڑکوں کی نسبت آپ کی لیاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اپنی ابتدائی زندگی کے کوائف کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے' درسِ قرآن سنا۔ ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کے لیے گئے، پھر اسکول۔ رات کو ابا بلا لیا کرتے۔ خط لکھنے کے لیے۔ اس زمانے میں انھیں لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سیکرٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انھیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اُردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی

اضافہ ہوا۔“ ❶

سکول کے زمانے میں ہی آپ نے اپنے شوق مطالعہ کی بنیاد پر طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد اور مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے علاوہ اکثر شعراء مثلاً میر، غالب اور داغ کا کلام بھی پڑھ لیا تھا۔ اس طرح شعر و ادب سے دلچسپی بڑھی اور شعر کہنے کی طرف رجحان ہوا۔ میٹرک ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد آپ مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے جہاں کالج اساتذہ میں شمس العلماء میر حسن، جیسے فاضل لوگ موجود تھے جن سے آپ نے کسبِ فیض کیا۔ ان دنوں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، صدر شعبہ اردو، کالج میں طرحی مشاعرہ کرایا کرتے تھے۔ پہلی بزم سخن میں فیض بھی شریک تھے۔ انھوں نے مجوزہ مصرع طرح: ”غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا“ پر ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر تھا:

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

سُن کر چشتی صاحب نے کہا تھا:

”اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح مشقِ سخن کرتا رہا تو ایک دن اس کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوگا۔“ ❷

چشتی صاحب کی پیش گوئی پوری ہوئی اور فیض کا شمار نہ صرف پاک و ہند کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوا بلکہ اپریل ۱۹۶۲ء میں انھیں روس کا سب سے بڑا اعزاز ”بین الاقوامی لینن امن انعام“ بھی ملا اور ان کی شہرت دُنیا بھر میں پھیلی۔

سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں ان دنوں پطرس بخاری اور صوفی تبسم جیسے شفیق اساتذہ موجود تھے۔ ان کے علاوہ فیض کو ڈاکٹر تاثیر، مولانا

---

❶ عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک (مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو) دیباچہ شام شہرِ یاراں (نسخہ ہائے وفا) فیض احمد فیض، مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۱

❷ انجمن (ذاتی یادداشتوں اور تاثرات کا مجموعہ) فقیر سید وحید الدین، لائن آرٹ پریس کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۲۳۷

عبدالمجید سالک، پنڈت ہری چند اختر، امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی جیسے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت سے بھی فیض اٹھانے کا موقع ملا جو اپنی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ہم ذوقی کی بنا پر ان لوگوں میں سے اکثر سے آپ کے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ ان بزرگوں کی صحبت سے آپ نے بہت کچھ سیکھا جس کا اعتراف آپ نے یوں کیا ہے:

''ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے تھے۔ ان سے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا یا دوستوں نے کہا نکال دو، تو اسے کاٹ دیتے۔ ایم اے میں پہنچتے تک باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا''۔ ❶

اس طرح ایک خوشگوار ادبی ماحول میں رہ کر ایک طرف تو آپ کی شاعری کو جلا ملی دوسری طرف گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں اور بعد ازاں اورینٹل کالج سے عربی میں ایم اے کر لیا۔ اسی عرصے میں ناگہانی طور پر آپ کے والد انتقال کر گئے۔ اس سانحہ نے آپ کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا اور وہ دن جو بے فکری کے ساتھ لاہور کی شعری فضا میں ہنسی خوشی بسر ہو رہے تھے، غم روزگار کی لپیٹ میں آ گئے۔ چنانچہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء میں آپ نے ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ جہاں ڈاکٹر تاثیر پرنسپل اور صاحبزادہ محمود الظفر وائس پرنسپل تھے۔ یہاں آپ ۱۹۴۰ء تک رہے۔ اس دوران میں آپ کا میل جول کالج سٹاف کے علاوہ صاحبزادہ صاحب کی معروف رفیقہ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور دوسرے دانشوروں سے بڑھا تو فکر و نظر کو مزید وسعت ملی۔ یہ زمانہ ہندوستان میں ادبی اور سیاسی ہر دو جہتوں سے بڑی گہما گہمی کا تھا۔ ترقی پسند مصنفین انجمن کا اجرا انہی دنوں ہوا تھا۔ فیض کو یہ راستہ اچھا لگا چنانچہ وہ بھی اس کارواں میں شامل ہو گئے۔ ''اب وہ غم جاناں اور غم روزگار سے گزر کر غم وطن اور غم جہاں کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔'' ❷ اور آفرین ہے فیض پر کہ اس کٹھن راہ کو طے کرنے میں ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قید و بند کی

---

❶ عہد طفلی سے عنفوان شباب تک (مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو) نسخہ ہائے وفا، ص ۴۹۳

❷ فیض سے میری رفاقت، شیر محمد حمید نسخہ ہائے وفا، ص ۵۰۸

صعوبتیں کہیں۔ پابند سلاسل ہوئے لیکن نہ پائے استقلال میں لغزش آئی اور نہ کبھی تھکن محسوس کی۔

آپ نے ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک معروف ادبی مجلّے "ادب لطیف" کی ادارت کی اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء تک ہیلی کالج میں انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ اس اثنا میں آپ کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" شائع ہوا۔ اِس دور میں آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ایک انگریز خاتون ایلس جارج سے شادی کرنا ہے، جنھوں نے فیض کا قدم قدم پر ساتھ دیا اور بقول شیر محمد حمید:

"قید و بند کی جن جن آزمائشوں سے فیض گزرے ہیں، ایلس کی غم خواری اور حوصلہ مندی کے بغیر ان جان لیوا مراحل سے یوں اعتماد اور یقینِ محکم کے ساتھ گزرنا مشکل ہوتا۔" ❶

جنگِ عظیم دوم کے دوران میں (جون ۱۹۴۲ء) فیض نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی جہاں آپ کم و بیش پانچ سال تک رہے اور پھر استعفا دے کر لاہور چلے آئے اور روزنامہ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کے مدیر ہو گئے۔ ۹ رمارچ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے اور کچھ اُوپر چار سال تک اسیر رہے۔ رہائی کے بعد آپ اے پی پی کے صدر منتخب ہوئے لیکن پاکستان میں پہلے مارشل لا کے چند ماہ بعد دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور تقریباً پانچ ماہ محبوس رکھنے کے بعد رہا کر دیے گئے۔ تین سال تک پاکستان آرٹس کونسل کے سیکرٹری رہے۔ پھر کچھ عرصہ تک ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء امور ثقافت و وزارت تعلیم پاکستان کے مشیر بھی رہے۔ ۱۹۷۸ء میں بیروت چلے گئے۔ جہاں چند سال افرو ایشیائی سہ ماہی مجلّے "لوٹس" کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے گزارے۔ نومبر ۱۹۸۱ء میں پاکستان واپس آ گئے۔

فیض نے جس حیثیت سے بھی کام کیا اور جہاں بھی رہے، شعر و شاعری کے ساتھ دلچسپی ہمیشہ برقرار رہی۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹ رنومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنے کلام کو یکجا کر کے "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے شائع کرا دیا تھا۔

فیض، دبستانِ لاہور کے ان اُردو شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے زندگی کے

---

❶ فیض سے میری رفاقت، شیر محمد حمید، نسخہ ہائے وفا، ص ۵۱۰

حسن و جمال اور نشیب و فراز کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ فیض کی نظر مشرقی اور مغربی ادب پر بہت گہری ہے، چنانچہ مشرقی و مغربی ادب کی اعلیٰ اقدار احساس و یقین کے ساتھ ان کے یہاں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ اگرچہ سوشلزم کے فلسفہ سے انھیں بڑی گہری وابستگی ہے مگر فیض نے کورانہ تقلید کے بجائے اپنے توانا شعور، پختہ ادبی ذوق اور شعری وجدان کے ساتھ اسے اپنی فکر کا جزو بنایا ہے۔ فیض نے شاعری کی مثبت روایات اور ثقافتی ورثے کو قائم رکھا ہے مگر چونکہ انھیں اپنے عہد اور ماحول سے فکر و شعور کا وافر حصہ ملا ہے اس لیے انھوں نے پُرانے استعارے نئے مفاہیم میں استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے اور مخصوص معاشرتی ماحول اور سیاسی پس منظر کے حامل نئے استعارے بھی تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے جہاں زبان و بیان کے مانوس اسالیب اختیار کیے ہیں وہاں نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں جو معنی خیز بھی ہیں اور انفرادی شان بھی رکھتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے زمانے کی شاعری میں ہونے والے نئے تجربات سے استفادہ کیا ہے اور خود بھی نئے تجربات کیے ہیں مگر اس طرح کہ شعریت کا دامن ان کے ہاتھ سے کہیں بھی نہیں چھوٹا۔ یہاں تک کہ موضوعاتی نظموں کے علاوہ ان کی سیاسی نظمیں بھی محض وزن اور ردیف قافیے کا خوبصورت کھیل نہیں بلکہ ان میں بھی شعریت ہے۔ فیض نے ہر جگہ نہایت شستہ اور پاکیزہ زبان استعمال کی ہے اور ان کے کلام میں نغمگی کا عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ فیض کے یہاں جمالیات اور افادیت، رومان اور حقیقت اور فن اور مقصدیت میں گہرا ربط ہے اور اسی کے امتزاج سے انھوں نے شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ فیض کی ابتدائی شاعری کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

> ''مجھے فیض کے کلام کی دو باتوں نے بطور خاص متاثر کیا تھا۔ ایک تو ان کے لفظوں کا استعمال تخلیقیت کا حامل تھا اور تمثالوں میں بلا کی انفرادیت اور تازگی تھی جو مجھے بار باران کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر مجبور کرتی۔ دوسرے ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا سنجوگ اُبھرا تھا جو اردو شاعری میں بالکل نئی بات تھی۔'' [1]

---

[1] فیض اور ان کی شاعری (مقالہ) ڈاکٹر وزیر آغا، فیض احمد فیض ۔۔۔۔ عکس اور جہتیں مرتبہ شاہد ماہلی، معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۸۷، ص ۵۱

فیض نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی، مگر دراصل وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو ایک نیا شعور بخشا جس کی بنا پر اہل ادب نے ایک بار پھر غزل کی اس تازگی، شیرینی اور بانکپن کو محسوس کیا جس کے بل بوتے پر میر و غالب نے دلوں کو مسخر کیا تھا۔ نظم کہنے کی طرف عام رجحان اور اس کی مقبولیت کے عہد میں انھوں نے غزل کے خد و خال اور حسن و جمال کو اس طرح سنوارا کہ اسے مقبول و محبوب بنا کر تخت نشین کر دیا۔ تغزل کا رنگ فیض کے یہاں اتنا گہرا ہے کہ ان کی نظمیں بھی غزلیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہی غزل کی چاشنی، وہی غزل کا اختصار، حسن اور رنگینی اور لطف یہ ہے کہ وہ روایت اور کلاسیکی اقدار کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اپنے ماحول اور زمانے کی عکاسی بھی بھرپور انداز میں کرتے ہیں۔ بقول ممتاز حسین:

''فیض کی غزلوں میں وحدت تاثر کے باعث نظموں کا رنگ ہے اور ان کی نظموں میں حسن تغزل کی راہ پانے اور نامیاتی اٹھان کی وجہ سے غزلوں کا مزہ ملتا ہے۔'' ❶

فیض کی نظمیں ہوں یا غزلیں ان میں ایک امتیازی پہلو اور انفرادیت ہے کہ انھوں نے جہاں پرانی علامتوں کو نئے نئے معنی دیے وہیں اپنے فکر و خیال سے سیدھے سادے الفاظ و تراکیب اور تشبیہ و استعارے کو اپنے اشعار میں اس طرح برتا کہ ان میں نئی تاثیر اور معنویت پیدا کر دی۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اعجاز حسین کو کہنا پڑا کہ:

''فن کاری اور ندرت تخیل کا اتنا حسین امتزاج دور جدید میں کسی شاعر کے یہاں نہیں دکھائی دیتا۔ سیدھے سادے الفاظ کو بغیر تشبیہ و استعارے کے شعر کی صورت میں پیش کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے۔'' ❷

سید سجاد ظہیر نے ''زنداں نامہ'' کے آغاز میں فیض کی نظم گوئی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک

---

❶ فیض کی شاعری (مقالہ) ممتاز حسین، فیض احمد فیض ..... عکس اور جہتیں، ص ۴۶

❷ مختصر تاریخ ادب اُردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۱ء، ص ۳۶۶

ان اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا عزم، شیریں اور مترنم انداز کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔ اس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے، اس کے خیالات میں ان سچائیوں اور جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔'' ❶

بلحاظ مجموعی فیض کے کلام میں دو اوصاف بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک جمالیاتی ہے اور دوسرا افادی۔ جمالیاتی پہلو جذب و عشق کی داستانوں پر مبنی ہے۔ جس میں واردات قلبی، زندگی کی حرارت اور اثرات و کیفیات کا بیان ہے جبکہ دوسرا پہلو سیاسی و سماجی استبداد کے اذکار کا ہے جو زمانے کے مختلف عوامل کی داستانوں پر محیط ہے جس میں دُکھی انسانیت کی کراہ، امن اور آزادیٔ وطن کی تمنا اور اصلاحِ حال کی تڑپ ہے۔ فیض نے شاعری کے جمالیاتی اور افادی پہلوؤں کا ذکر اپنے ایک فاضلانہ مقالے ''شاعری کی قدریں'' میں بھی کیا ہے جس سے ان کے اس رجحانِ طبع اور اندازِ فکر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حُسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں افادی فعل بھی ہے، چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیہ نفس ہو جو ہماری رُوح کو مترنم کرے، جس کی بُو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو، صرف حسین ہی نہیں، مفید بھی ہے۔ اسی وجہ سے غنائیہ ادب (بلکہ تمام اچھا آرٹ) ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔'' ❷

شاعری کے یہ جمالیاتی اور افادی پہلو فیض کے یہاں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر چند ان دونوں پہلوؤں کی صداقت کے تقاضے پورے کرنا اتنا آسان نہیں تاہم فیض نے ایک عظیم

---

❶ سرِ آغاز (زنداں نامہ) نسخہ ہائے وفا، سید سجاد ظہیر، ص ۱۹۸

❷ شاعری کی قدریں (مقالہ)، میزان (مجموعہ مقالات فیض)، مطبوعہ اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۳۲

فنکار کی طرح اس دشوار راستے کو طے کیا ہے اور ہر حال میں فن کے تقاضوں کو نبھایا ہے:

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار ❶

کلیم الدین احمد نے فیض کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔" ❷

بجا سہی، مگر فیض کا خود شعر کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ:

"مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر ہی نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اُترے"۔ ❸

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فیض کا کلام ان دونوں کسوٹیوں پر پورا اُترتا ہے۔ ان کی نظم "دو عشق" سے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں
چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

---

❶ نسخہ ہائے وفا، ص ۶۲۱

❷ فیض احمد فیض ــــــ عکس اور جہتیں ص ۲۳

❸ شاعری کی قدریں (مقالہ) میزان، ص ۲۶

ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رُخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں
اس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا، ہر اِک غم کو سنوارا (۱)

شاعری جذبات کی حقیقی ترجمانی کا نام ہے لیکن کامیاب اظہار کے لیے دیگر عوامل کے علاوہ جذبے کی صداقت اور اسلوب اظہار پر قدرت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں فطرت نے کمال فیاضی کے ساتھ فیض کو ودیعت کر رکھی ہیں۔ ان کی نظمیں انجام، سرود شبانہ، حسن اور موت، ایک رہگذر پر، میرے ندیم، تنہائی، موضوع سخن، لوح و قلم، دو عشق، دست تہ سنگ آمدہ، شام، شہر یاراں، جرسِ گل کی صدا، خاص طور پر جذبہ و اظہار کے دلآویز مرقعے ہیں بلکہ شاعر کی فنکارانہ قوت تخلیق کا کرشمہ ہیں۔ اِن نظموں میں ہر کہیں لطیف وپُر کیف اور نرم و نازک رومانی فضا چھائی ہوئی ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اس قدر مستولی ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اسی فضا میں جھومنے لگتا ہے۔ ایک مختصر نظم ''سرود شبانہ'' ملاحظہ کیجیے:

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی ،
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے

---

(۱)۔ نسخہ ہائے وفا، ص ۱۴۴، ۱۴۵

چھن رہا ہے خمار کیف آگیں　　　آرزو، خواب، تیرا رُوئے حسیں ❶

فیض شعوری طور پر ترقی پسند نظریے کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن اس کارواں کے دوسرے شعراء کے برعکس وہ افکار و جذبات کی رو میں نہیں بہہ جاتے۔ ان کے یہاں جھنجھلاہٹ، گھن گرج، غصہ اور دہاہی کے آثار کہیں نمایاں نہیں ہوتے بلکہ وہ انتہا پسندی سے گریز کر کے اپنی بات دھیمے لہجے میں بڑے اعتدال کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں محکوم و مظلوم اقوام کی دردناک زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے، ظالم اور جابر آقاؤں کے طرزِ عمل پر شدید حملے بھی کیے ہیں لیکن تندی و تیزی کے بجائے ان کے لہجے میں ہر جگہ نرمی ہے، وہ تلخ و ترش واقعات کی شدت کو شعر کے لطیف پردوں میں اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ "شعریت اور سیاست دونوں ایک دوسرے میں بالکل شیر و شکر ہو گئے ہیں۔" ❷

یہ ایک بند ملاحظہ کیجیے۔ فیض نے محبوب کے تجدیدِ محبت کے سوال پر اپنے طرزِ عمل کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے ماحول کا کربناک منظر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے ❸

---

❶ نسخہ ہائے وفا، ص ۲۶

❷ فیض، ایک تقابلی مطالعہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، افکار کراچی ۱۹۶۵، ص ۴۷۸

❸ نسخہ ہائے وفا

اسی ماحول اور معاشرے کے المناک مناظر کی طرف جب فیض کی نظر اُٹھتی ہے اور وہ اپنی قوم کو قعرِ ذلت میں گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان سے رہا نہیں جاتا، وہ قوم کا درد محسوس کرتے ہیں اور تڑپ اٹھتے ہیں مگر انھیں بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے، چنانچہ وہ عام ترقی پسند شاعروں کی طرح جوش و خروش اور شور و غوغا کے بجائے نہایت متانت کے ساتھ جذبات کا اظہار کرتے ہیں جس سے قاری کے دل پر دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، اس نظم میں اور اسی طرح کی کئی دوسری نظموں میں فیض نے فرنگی کی سیاسی حکمتِ عملی کی شکار، اپنی قوم کی زبوں حالی کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے دل میں یہ آرزو بیدار رہتی ہے کہ یہ غلامانہ دور جلد ختم ہو اور وہ اپنی درماندہ قوم کو آزادی کی فضا میں سانس لیتے دیکھیں:

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
عرصۂ دہر کی جُھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے [1]

---

[1] نسخہ ہائے وفا، ص ۷۵

ایک دوسری نظم کے یہ دو اشعار بھی دیکھیے:

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں

گھاؤ اتنے ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

جا بجا نور نے اِک جال سا بن رکھا ہے

دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے ❶

فیض کے خلاق ذہن نے جہاں اُردو شاعری کو بہت سی خوبصورت اور نئی تراکیب دی ہیں وہیں پرانی تراکیب کو نئے معنوں میں بھی برتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف قدیم اُردو شاعری کی روایات سے فائدہ اُٹھایا ہے بلکہ جدید شعری سرمائے سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ فیض سے پہلے دبستانِ لاہور میں "اقبال نے جو جہانِ معنی جلوہ گر کیا تھا، فیض نے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔"❷ اور اس طرح فیض ہمیں "اقبال کا ہم نشین"❸ بنا نظر آتا ہے۔

✿✿

محمد عظیم قریشی (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۰ء)

محمد عظیم قریشی نام، عظیم تخلص، ۲۴ مارچ ۱۹۱۱ء کو وادیٔ کشمیر کے پُر بہار قصبے اننت ناگ میں، جہاں آپ کے والد، محمد مستقیم قریشی محکمہ ڈاک کی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے، پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا تبادلہ مختلف اضلاع میں ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے عظیم قریشی کی ابتدائی تعلیم بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوتی رہی۔ ۱۹۲۶ء میں آپ کے والد کا تبادلہ جی پی او لاہور میں ہوا لیکن اس سے اگلے ہی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت عظیم قریشی آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے مشن ہائی سکول رنگ محل سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور نا مساعد حالات کی بنا پر مزید تعلیم کے خیال کو ترک کر کے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یکم مارچ ۱۹۳۰ء کو جی پی او لاہور میں کلرک بھرتی ہوئے لیکن ملازمت کے دوران میں آپ نے مطالعہ جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں لاہور بورڈ سے

---

❶ نسخہ ہائے وفا، ص ۱۱۱

❷ حکیم فرزانہ، شیخ محمد اکرام، ص ۴۸

❸ ایضاً، ص ۴۹

پرائیوٹ طور پر ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسی بورڈ سے اگلے سال منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا اور اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے صرف انگلش کا امتحان دے کر بی اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ آپ نے اپنی ملازمت کا کم وبیش تمام عرصہ لاہور میں بسر کیا اور یہیں سے ۱۹۷۰ء میں اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ لاہور کے شعری و ادبی حلقوں میں پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزارنے کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۸۰ء کو انتقال کیا۔ ❶

عظیم قریشی کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد نہ صرف شعروسخن کے دلدادہ تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے، احسن تخلص کرتے تھے اور غزل کے ساتھ خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ والد کی دیکھا دیکھی عظیم قریشی بھی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اپنے خودنوشت سوانحی حالات میں لکھتے ہیں کہ:

> ''عین عالمِ طفولیت میں شعروشاعری کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور بارہ برس کی عمر میں غزل سے آغاز کیا۔'' ❷

ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے لیکن والد کی وفات (۱۹۲۷ء) کے بعد کسی سے اصلاح نہ لی۔ شعر کے ساتھ لگن نے انھیں اختر شیرانی اور میراجی کے قریب کردیا تھا۔ آگے چل کر ان لوگوں کے ساتھ یہ قربت گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

عظیم قریشی نے شاعری کا آغاز صنفِ غزل سے کیا تھا اور گو وہ غزل بہت اچھی کہتے تھے اور ان کی غزلیں اپنے وقت کے معروف رسائل میں شائع ہوتی تھیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں مگر جلد ہی اپنی جدت پسند طبیعت کی بنا پر تنگنائے غزل کو خیرباد کہہ کر نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ نظم کے معاملے میں وہ اختر شیرانی اور میراجی سے متاثر تھے، خاص طور پر میراجی سے انھوں نے گہرا اثر قبول کیا تھا اور ان کی پیروی میں قدیم ہندی شاعر ودیاپتی اور چنڈی داس کا مطالعہ بھی کیا تھا مگر اس کے باوجود ان کی نظموں میں تقلید کا رنگ زیادہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ جدید نظم نگاری کے رجحان اور شوقِ اختراع کے باعث ان کی نظموں میں ایک انفرادیت ملتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی نظموں میں حبِ وطن کے

---

❶ محمد عظیم قریشی ۔۔۔۔۔ حیات اور فن، طاہر مسعود چودھری، غیر مطبوعہ (مقالہ ایم۔ اے اُردو ۸۶۔۱۹۸۵ء، ص ۱۵

❷ خودنوشت سوانحی حالات، مطبوعہ فنون جدید غزل نمبر جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۳۱

تقاضے، سماجی تفاوت، سامراجی تشدد، احترام آدمیت اور انسان دوستی کے مظاہر کے طور پر ترقی پسند عناصر زیادہ ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے اگرچہ انھوں نے پابند، معریٰ اور آزاد نظمیں بھی کہی ہیں اور جن میں وہ نئی نئی علامتیں بھی استعمال کرتے ہیں مگر مختصر نظم ان کے نام کے ساتھ مخصوص ہے۔

عظیم قریشی نے بہت کچھ لکھا ہے جس میں مطبوعہ کم ہے اور زیادہ تر غیر مطبوعہ ہے۔ بہر کیف ان کی غزلوں اور نظموں میں ان کے جذبات اور احساسات پوری توانائیوں کے ساتھ اُجاگر ہوئے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

سرورِ عشق کی مستی کہاں ہے سب کے لیے
وہ مجھ میں جذب ہُوا آ کے، ایک شب کے لیے
وہ ایک کرب حسیں جو مجھے ہوا ہے عطا
نہ تیرے رُخ کے لیے ہے نہ تیرے لب کے لیے
کبھی تو اُلٹے سرِ عام وہ نقاب اپنی
ترس رہے ہیں کبھی بادۂ عنب کے لیے
ترے وصال کی کب آرزو رہی دل کو
کہ ہم نے چاہا تجھے شوقِ بے سبب کے لیے
دلِ حزیں کہ دو عالم نہیں بہا جس کی
لٹایا میں نے اسے تیری ایک چھب کے لیے
وہی کرن جو سرِ چرخ رہ گئی تنہا
وہ سوگ بن گئی تاروں کے ہر طرب کے لیے
عظیم عشقِ شہِ دوسرا بسا دل میں!
وہی عجم کے لیے ہے وہی عرب کے لیے ❶

○○

---

❶ فنون (جدید غزل نمبر) جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۸۷۹

وہ ساز کہ جس ساز کے تاروں میں نہاں ہو

اِک نغمۂ رنگیں

پھولوں سے بھی خوشتر

خوشبوئے معطر کہ دل و جاں کو جو بخشے

کیفیتِ دلکش

دل جس کا ہے عکسِ رُخِ حورانِ بہشتی

بھرپُور وفا سے

ہیں جس کی محبت کے درخشندہ ستارے

معصوم فسانے

فطرت نے ہے بھیجا جسے شہکار بنا کر

بے کیف جہاں میں

(ماں) ❶

○○

حفیظ ہوشیارپوری (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۳ء)

حفیظ کا اصل نام شیخ عبدالحفیظ ہے۔ آپ جھنگ کے قریب ایک قصبے دیوان پور میں ۵؍جنوری ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ فضل محمد، ہوشیار پور (بھارت) کے رہنے والے تھے۔ گھرانا پڑھا لکھا اور ادب و شعر کا دلدادہ تھا۔ آپ کے نانا شیخ غلام محمد ایک فاضل بزرگ تھے اور فارسی کے نامور شاعر مولانا شیخ غلام قادر گرامی کے ہم جلیس تھے۔ حفیظ کے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید بھی شاعر تھے، راجل تخلص کرتے تھے اور حفیظ کی طرح تاریخ گوئی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ حفیظ کی ابتدائی ذہنی تربیت میں ان دونوں بزرگوں کو دخل رہا۔ حفیظ خود بھی نوعمری میں مولانا گرامی کی صحبت میں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔

حفیظ کی ابتدائی تعلیم کا بیشتر زمانہ ہوشیار پور میں گزرا، جہاں اسلامیہ ہائی سکول سے ۱۹۲۸ء میں میٹرک اور گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۳۳ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں فلسفہ میں

---

❶ آج کے نغمے، کل کے شعلے (مجموعہ کلام عظیم قریشی) مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور، (سن ندارد)، ص ۳۳

ایم اے کی ڈگری لی۔ یہاں فیض احمد فیض اور ن م راشد آپ کے ہم عصر اور پطرس بخاری اور صوفی تبسم اُستاد تھے۔ ان کی علمی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور اپنے مذاقِ سخن کو نکھارا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کچھ عرصہ خالص علمی و ادبی مشاغل میں گزارا۔ ۱۹۳۶ء میں میاں بشیر احمد نے لاہور میں "انجمن اردو پنجاب" کی بنا ڈالی تو حفیظ اُن کے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ "ادبی دُنیا" کی ادارت میں مولانا صلاح الدین احمد کا ہاتھ بٹایا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ "شیرازہ" اور میاں بشیر احمد کے ماہوار رسالے "ہمایوں" میں بھی معاون رہے۔ پھر چند مہینے دہلی جا کر دیوان سنگھ مفتون کے اخبار "ریاست" میں بھی کام کیا۔ ۱۹۳۸ء میں سید امتیاز علی تاج نے بچوں کے مقبول رسالے "پھول" اور عورتوں کے پسندیدہ رسالے "تہذیبِ نسواں" کی ادارت انھیں سونپ دی۔ یہ سلسلہ ان کے ریڈیو میں پہنچنے یعنی اکتوبر ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ ریڈیو میں ان کی پہلی تقرری دہلی میں ہوئی۔ اسی سلسلے میں کچھ عرصہ بمبئی میں بھی رہے پھر لاہور آ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ پہلے کراچی میں پروگرام ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں آپ کا تبادلہ لاہور ہو گیا اور رفتہ رفتہ ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بن کر ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ریڈیو سے منسلک رہے اور جز وقتی طور پر مذہبی نشریات کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور جب تک صحت نے ساتھ دیا اس کام میں انہماک رہا جو اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ بالآخر ۱۰ر جنوری ۱۹۷۳ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

حفیظ خوش گو بھی تھے اور زود گو بھی مگر پُر گو نہیں تھے۔ بھرتی کے شعر نہیں کہتے تھے۔ یہی اُن کے مزاج کی پختگی کی دلیل ہے۔ شعر و ادب کے ساتھ ان کا تعلق اس وقت سے رہا جب ابھی وہ اپنے آبائی شہر، ہوشیار پور میں انٹر کلاس کے طالب علم تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا قومی نعرے اور باغیانہ نظمیں لکھنے سے ہوئی لیکن جلد ہی اس روش کو ترک کر دیا۔ شان الحق حقی ان کی اس زمانے کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> "حفیظ نے شاعری بڑے طمطراق سے قومی نعرہ بازیوں سے شروع کی تھی، زمانہ طالب علمی میں لڑکوں کے جلوس میں پیش پیش رہے اور باغیانہ نظمیں لکھنے پر ان کی گرفتاری قریب تھی کہ ان کے پرنسپل کی پُشت پناہی نے انھیں بچا لیا اور خان قربان علی نے جو اس وقت

ہوشیار پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے ان کو نصیحت فضیحت کر کے چھوڑ دیا۔'' ❶

اس واقعے کے بعد حفیظ کی طبیعت جذباتی شاعری کو چھوڑ کر سنجیدہ رنگِ تغزل اور نرم گفتاری کی طرف مائل ہو گئی۔ لہجے کا یہ دھیما پن عمر کے آخری حصے تک ان کا شعار رہا۔

حفیظ کی شخصیت بڑی پُرکشش، جاذبِ نظر اور پہلودار تھی۔ وہ طبعاً رکھ رکھاؤ کی طرف مائل لیکن سادگی پسند اور شگفتہ مزاج تھے۔ لہجہ نرم و ملائم و شیریں تھا۔ ''اکثر بولتے میں ہنستے اور ہنستے میں بولتے جاتے تھے۔ ❷ ادبی حیثیت سے وہ ایسے شاعر ہیں جو اردو شعر کی روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ جدید بزمِ سخن کے سجانے والوں کے دوش بدوش چلتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان کی انفرادیت ان دونوں پہلوؤں سے مشخص ہے۔

حفیظ نے نہ صرف قدیم اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا بلکہ جدید علوم وفنون پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ پھر آپ انگریزی زبان وادب سے خوب واقف تھے، فارسی پر عبور حاصل تھا اور پنجابی و سندھی ادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، چنانچہ ان چیزوں کا اثر قبول کرتے ہوئے وہ اردو شعراء کی کلاسیکی روایت کی پابندی کرتے ہیں اور شعر و شاعری کے جدید اثرات سے بھی روگردانی نہیں کرتے۔ اصنافِ سخن میں انھیں غزل عزیز ہے۔ لیکن جدید رجحانات کے زیرِ اثر نئے موضوعات کو غزل کے اشعار میں ڈھالتے ہیں اور نئے موضوعات کے لحاظ سے تازہ اسالیب ایجاد کرتے ہیں۔ پُرانی تراکیب کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اور عصری تقاضوں کے مطابق نئی تراکیب وضع کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اس طرح حفیظ کی غزل کلاسیکی غزل سے وابستہ اور اپنے زمانے کی رُوح سے ہم آہنگ ہے، یہی ان کی انفرادیت ہے۔

جدید غزل کا مطالعہ کرنے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جدید غزل گو شعراء میں جن شعراء کا رنگ منفرد ہے وہ ان کے طرزِ اظہار سے زیادہ طرزِ احساس و اندازِ فکر کی وجہ سے ہے۔ شاعر

---

❶ ''عرضِ مرتب'' شان الحق حقی (دیباچہ ''مقامِ غزل'' مجموعہ کلام حفیظ ہوشیار پوری) مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۸

❷ ایضاً، ص ۱۱

معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اس کے اثرات بھی قبول کرتا ہے لیکن یہ امر ہر شاعر کی مخصوص افتادِ طبع اور شعور کی گہرائی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک نئے معنوی پہلو دکھاتا اور تراشتا ہے۔ شاعر الفاظ کی قوت اور حقیقت سے واقف ہوتا ہے اور اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے لفظوں کو نئی علامتوں اور نئی معنویتوں سے آشنا کرتا ہے۔ فکر و اظہار کی اسی نئی بصیرت سے نئی غزل وجود میں آتی ہے جس کے اچھے نمونے ہمیں دبستانِ لاہور میں نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر فیض اور حفیظ ہوشیار پوری کے یہاں یہ نمونے بکثرت موجود ہیں۔

حفیظ کی غزلیں اردو غزل کے شائستہ رویے کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے:

سُنا رہا ہوں برنگِ غزل زمانے کو
حکایتِ غمِ دوراں، فسانۂ غمِ دل

تاہم ان کے تغزل کی اہم خصوصیت تخیل کی گہرائی ہے۔ یہ تفکر اور فلسفیانہ انداز ان کے یہاں اسی لیے پیدا ہوا ہے کہ انھیں فلسفہ کے مضمون سے گہرا شغف رہا ہے۔ چنانچہ وہ روایتی غزل کے پامال مضامین کو بھی ایسے انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو نئی باتوں کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ کئی زبانوں پر کامل دستگاہ رکھتے تھے اس لیے زبان و بیان کی خوبیاں بھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ حفیظ کی ایک غزل کے یہ چند اشعار دیکھیے۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فُرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
حفیظ ان سے مَیں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے ❶

یا ان کی ایک دوسری غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا
تلاشِ دوست کو اک عمر چاہیے اے دوست!
کہ ایک عمر ترا انتظار ہم نے کیا
ترے خیال میں دل شادماں رہا برسوں
ترے حضور اسے سوگوار ہم نے کیا
فراق و وصل کے جھگڑوں سے مل گئی فرصت
کچھ اس طرح سے ترا اعتبار ہم نے کیا
یہ تشنگی ہے کہ ان سے قریب رہ کر بھی
حفیظ یاد انھیں بار بار ہم نے کیا ❷

حفیظ کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے اور بلاشبہ غزل ہی میں ان کے فکر و فن کے جوہر آشکار ہوتے ہیں مگر حفیظ نے نظم کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے، اگرچہ غزلوں کی نسبت ان کی نظمیں بہت کم ہیں مگر ان میں بھی وہی جاذبیت ہے جو اُن کی غزلوں کا امتیاز ہے۔ آپ نے صنفِ نظم میں زیادہ تر رومانی نظمیں کہی ہیں، جن میں جذبات کی فراوانی اور فکر و خیال کی رعنائی موجود ہے۔ یہ نظمیں درحقیقت ان کے پریت کے گیت ہیں جن میں صحت مند ذہنی و جذباتی کیفیات کا اظہار ہے۔ ان نظموں کی زبان شیریں

❶ مقام غزل، ص ۱۴۰
❷ مقام غزل، ص ۱۸۰

ہے جن میں اُردو کے نرم و ملائم الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی کے رس بھرے لفظ بھی بلا تکلف استعمال کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے منظومات میں جذبات کے اظہار کے ساتھ موسیقیت کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔

ان کی ایک نظم ''آگ لگے اس من میں آگ'' سے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

لو پھر رات برہ کی آئی! جان بری تن میں گھبرائی
چاروں اور اُداسی چھائی اپنی قسمت اپنے بھاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کالی اور برستی رین اُس بن نیند کو ترسیں نین
جس کے ساتھ گیا سکھ چین اُس کی یاد کہے اب جاگ
آگ لگے اس من میں آگ

جس دن سے وہ پاس نہیں ہے کوئی خوشی بھی راس نہیں ہے
جینے تک کی آس نہیں ہے جان کو ہے اب تن سے لاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کون جیے اور کس کے سہارے میٹھے میٹھے بول سدھارے
گیت کہاں وہ پیارے پیارے اب وہ تان نہ اب وہ راگ
آگ لگے اس من میں آگ [1]

حفیظ کے بارے میں یہ بات واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ انھیں فنِ تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے اس ضمن میں علامہ اقبال کی تاریخ گوئی پر ''تاریخ گو اقبال'' (۱۳۷۱ھ) کے تاریخی عنوان کے تحت ایک مقالہ بھی لکھا جو اس موضوع پر سب سے پہلا مقالہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء کے روزنامہ ''آفاق'' لاہور میں شائع ہوا۔ [2]

حفیظ نے بہت سے ایسی تاریخیں بھی کہی ہیں جن سے اس روایت میں اضافہ ہوا۔ مثلاً علامہ اقبال کی

[1] جدید شعرائے اُردو، جلد سوم (متاخرین)، ص ۶۳۷

[2] حیات جاوداں، محمد عبداللہ قریشی، مطبوعہ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۷ء ص ۱۶

تاریخ وفات ان کی مثنوی ''مسافر'' کے ایک مصرعے ''صدق واخلاص وصفا باقی نہ ماند'' ❶ سے نکالی۔

۱۳۵۷ھ

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تاریخ وفات:

''محب صادق احباب تاثیر'' ❷

۱۳۷۰ھ

اور ''ہجراں تاثیر'' ❸

۱۳۷۰ھ

سے اور لیاقت علی خان کی تاریخ شہادت علامہ اقبال کے مصرعے:

''صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ'' ❹

سے اخذ کی۔ ۱۳۷۱ھ

بہرکیف حفیظ دبستانِ لاہور کے خوش فکر شعراء میں سے ہیں۔ ان کا کلام فکر و تخیل، پختگی وروانی اور درد واثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ جس میں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''کئی رنگ اور بھی آ ملتے ہیں۔ کہیں اقبال کا تفکر، کہیں میر کا ایما اور کہیں فیض کا استعارہ۔ ان سب صورتوں میں حفیظ کی اپنی متواضع شخصیت کی تہذیب اور فلسفیانہ تہذیب کی سنجیدگی اور طبیعت کی شیرینی گھل مل گئی ہے۔'' ❺

✿ ✿

سراج الدین ظفر (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۲ء)

سراج الدین ظفر ۲۵ رمارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میاں عبدالقادر ریلوے میں انجینئر تھے۔ آپ کی والدہ مسز عبدالقادر اپنے عہد کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے تھیں اور اُردو افسانہ نگاروں میں ہیبت ناک، پراسرار اور محیّر العقول واقعات سے متعلق افسانے لکھنے میں ممتاز

---

❶ معاصرین۔۔۔۔۔اقبال کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵۵۴

❷ جدید شعرائے اُردو، جلد سوم (متاخرین)، ص ۶۴۷

❸ ایضاً ص ۶۴۷

❹ جدید شعرائے اردو جلد سوم (متاخرین)، ص ۶۴۷

❺ دیباچہ (مقام غزل) ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۳۴

درجہ رکھتی تھیں۔ آپ کے دادا میاں فضل الدین اپنے خاندان گکھڑوں کی ایک شاخ سکندرال کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھے۔ آپ کے نانا مولوی فقیر محمد دیوبند کے فاضل اور متعدد اسلامی کتب کے مصنف تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میاں سراج الدین ظفر نے ابتدا ہی سے ایک علمی و ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور مطالعے اور شعر و ادب کا ذوق انھیں ورثے میں ملا۔

سراج الدین ظفر کو بچپن ہی سے مطالعے سے اُنس تھا اور ساتھ ہی علم نجوم، علمِ فلکیات اور ہوا بازی کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انٹر میں پڑھتے تھے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہوا بازی کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی۔ سلطانہ مہر لکھتی ہیں کہ:

"مسلمانوں میں سب سے نو عمر ہوا بازوں میں سے تھے۔ حکومت ہند سے اِس سلسلے میں انعام حاصل کیا۔" ❶

۱۹۳۶ء میں لاہور سے لاء میں گریجوایشن کرنے کے بعد کچھ عرصہ وکالت کی۔ پھر کچھ عرصہ ہوائی فوج میں بحیثیت آفیسر ملازم رہے اور ۱۹۵۰ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن بعد ازاں ترک ملازمت کر کے کتابوں کی تجارت کی طرف مائل ہوئے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ وہ مولوی فیروز الدین کے، جو برصغیر کے معروف اشاعتی ادارے فیروز سنز کے بانی ہیں، داماد اور ڈاکٹر عبدالوحید کے، جو فیروز سنز کے ڈائریکٹر ہیں، برادر نسبتی تھے۔ بہر کیف باقی عمر اسی کاروبار سے متعلق رہے۔ آخر ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو انتقال کیا۔

ظفر ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے مگر وہ بحیثیت شاعر زیادہ مشہور ہوئے۔ انھیں شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اچھی خاصی نظم کہہ لیا کرتے تھے۔ سلطانہ مہر نے تذکرۂ شعرائے پاکستان "سخنور" میں ظفر کے بچپن کے کچھ حالات لکھے ہیں اور ان کی نظم گوئی کا ایک واقعہ بھی تحریر کیا ہے، یہاں ان کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپ لکھتی ہیں:

"۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں یہ لوگ کشمیر گئے تھے۔ والدہ نے کہا یہاں کے مناظر پر نظمیں

---

❶ سخنور (تذکرۂ شعرائے پاکستان) سلطانہ مہر، ص ۲۳۰

لکھو، فی نظم ایک روپیہ ملے گا۔ یاد رہے یہ وہ زمانہ تھا جب گھریلو ملازم آٹھ آنے ماہوار پر
کام کرتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔
سراج نے دس بارہ نظمیں لکھیں۔" ❶

سراج الدین ظفر نے اپنی شاعری کی ابتدا سے ہی کبھی کسی سے اصلاح نہ لی اور جو کچھ کہا محض اپنے ذوق اور وجدان کی رہنمائی میں کہا۔ ہاں البتہ بقول سلطانہ مہر:

"طالب علمی کے زمانے میں ہی تقریباً تمام اساتذہ کے کلام کا غائر مطالعہ کر لیا تھا اور یوں اردو شاعری کے پورے ارتقا پر ان کی نظر تھی۔" ❷

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں پختگی اور خوش فکری کے پہلو نمایاں ہیں۔

ظفر نے کم و بیش تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا اصل میلان غزل اور مثنوی کی طرف ہے۔ مثنوی میں تو وہ قدیم رنگ کے رسیا معلوم ہوتے ہیں لیکن غزل کے معاملے میں قدیم رنگِ شاعری انھیں پسند نہیں جیسا کہ ان کا کہنا ہے:

مری غزل ہے ظفر عصرِ نو کا آئینہ
قدیم رنگ سے ہے بغضِ للّٰہی مجھ کو ❸

صنفِ غزل میں ان کا تعلق جدید شعراء کے اس گروہ سے ہے جنھوں نے جدید انداز اختیار کرنے کے باوجود خود کو کسی خاص مکتبِ فکر سے منسلک نہ کیا بلکہ اپنی طبیعت کے رجحان کے مطابق کلام میں جدت آفرینی اور آزاد خیالی سے کام لے کر جامعیت اور پختگی پیدا کی۔ انھوں نے غزل میں جذبات کے بعض ایسے مرقعے پیش کیے ہیں جو قادر الکلامی، وسعت مشاہدہ، فکر و خیال اور لطافتِ بیان کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ماسوا ذوق نظر کے کہیں آباد نہیں
حُسن کیا شے ہے اگر خود مری ایجاد نہیں

---

❶ سخنور (تذکرۂ شعرائے پاکستان) سلطانہ مہر، ص ۲۳۰
❷ ایضاً، ص ۲۳۰
❸ سخنور (تذکرۂ شعرائے پاکستان) سلطانہ مہر، ص ۲۳۳

شاد ہے رُوح ترے عشق میں اور شاد نہیں
کوئی میری طرح مجموعۂ اضداد نہیں
شمع بھی میں ہوں ترے عشق میں پروانہ بھی مَیں
کسی بیگانے سے خلوت مری آباد نہیں
یوں لیے پھرتا ہے اخفائے محبت کا خیال
جیسے میری طرح، دُنیا میں کوئی شاد نہیں
پردۂ عشق میں خود حسن ہے سرگرم نوا
میری فریاد بھی شاید مری فریاد نہیں
اب یہ عالم ہے کہ خود آپ ہوں اپنا معبود
اور کچھ عشق کی عظمت کے سوا یاد نہیں
تنکے اڑتے ہیں نشیمن کے مرے بعد کہاں
میری آہیں جو نہیں۔ برق نہیں باد نہیں
عشق کے فیض سے ہوں زندۂ جاوید ظفر
میں وہ برباد محبت ہوں جو برباد نہیں [1]

اصناف شاعری میں غزل کے علاوہ ظفر کو مثنوی بہت پسند ہے۔ اس صنف میں انھوں نے موضوعات کے اعتبار سے قدیم اور مابعدالطبیعیاتی روایات کو یکسر نظر انداز کر کے جدید اور فطرت کے مطابق موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں انسانی جذبات کے بعض ایسے خوبصورت مرقعے پیش کیے ہیں جو اُن کے مشاہدے کی وسعت، بلند خیالی اور لطافتِ بیان کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ خاص طور پر ان کی مثنویاں "لاجونتی" اور "مسافر" اُردو ادب میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان مثنویوں میں جو واقعات بیان کیے گئے اِن میں مبالغہ آرائی اور فوق العادت باتوں سے گریز کیا گیا ہے اور یہ زمانے کے اقتضا اور مذاق کے مطابق ہیں۔ یہ مثنویاں جس فطری سادگی اور روانی کی حامل ہیں ان

---

[1] زمزمۂ حیات، سراج الدین ظفر، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، س ن، ص ۲۲،۲۱

سے ورڈز ورتھ کی ''لوسی'' نظمیں یاد آتی ہیں جو فطرت کے بہت قریب رہ کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مثنوی ''لاجونتی'' دیکھیے جس کا لب لباب یہ ہے کہ:

لاجونتی اور اس کی چھوٹی بہن رانی نشیب کوہ میں راوی کے کنارے رہا کرتی تھیں، اسی وادی میں رادھے بھی اپنے گیتوں میں مگن رہتا تھا۔ لاجونتی کو رادھے کی لَے سے عشق تھا جس کا اظہار وہ یوں کرتی کہ پھولوں کی ایک مالا روزانہ رادھے کی نذر کرتی مگر رادھے کو معلوم بھی نہ تھا کہ لاجونتی اس کی پوجا کرتی ہے، وہ تو عشق کی لذت سے ناآشنا رانی کا عاشق تھا۔ رادھے جب رانی کو دیکھتا تو اسے اپنے سُر بھول جاتے۔ ایک دن رادھے نے رانی کو وہی مالا پہنادی جو لاجونتی اسے دے کر گئی تھی۔ چراغ جلے جب لاجونتی نے رانی کے گلے میں اپنی مالا دیکھی تو اس نے اپنے عشق کو امر کرنے کے لیے اپنے آپ کو راوی کی سرکش موجوں کے حوالے کر دیا۔ ادھر رادھے اور رانی کا بیاہ ہو گیا۔ نارائن اور شاماں ان کے دو معصوم بچے ہیں۔ اب جب کبھی راوی میں طوفان اُٹھتا ہے تو شاماں، نارائن سے کہا کرتی ہے:

''صدا باہر جو پیدا ہو رہی ہے
یہ خالہ لاجونتی رو رہی ہے'' [1]

مثنوی سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دیے جب جل اُٹھے سب بستیوں میں
اُٹھی وہ غرق ہو کر مستیوں میں

دوپٹہ ڈال کر سر پر بسنتی
کھڑی تھی راستے میں لاجونتی

پڑیں اس کی جو مالا پر نگاہیں
لبوں تک رہ گئیں آ آ کے آہیں

یہ مالا تھی بلائے ناگہانی
ہوئی سب منکشف اس پر کہانی

---

[1] زمزمہ حیات، سراج الدین ظفر، ص ۹۲

مصیبت میں کوئی کس طرح بھاگے
اندھیرا آ گیا آنکھوں کے آگے

○○

نظر آیا نہ جب کوئی ٹھکانہ
ہوئی دریائے راوی کو روانہ
اسے برسات نے جانے سے روکا
سہانے آبشاروں نے بھی ٹوکا
جوانی اس کے پیچھے بھاگی
فضا شور قیامت سُن کے جاگی
پہنچ کر دُور راوی کے کنارے
شکستہ آرزؤوں کے سہارے
نئی اِک زندگی کی ہو کے جویا
ہوئی اس طرح تنہائی میں گویا
مرے شاہد ہو تم اے دیوتاؤ
جوانی اور محبت کے خداؤ
قیامت عشق پر ڈھائی گئی ہے
جوانی میری ٹھکرائی گئی ہے
کہاں اب آرزؤوں کے ترانے
یہاں آئی ہوں بھینٹ اپنی چڑھانے
کہا یہ اور آنچل سر پہ ڈالے
ندی کے کر دیا خود کو حوالے

○○

میراجی (۱۹۱۲ء۔۱۹۴۹ء)

محمد ثناءاللہ ڈار، جو اپنے ادبی نام و تخلص میراجی سے ہی ادبی حلقوں میں معروف ہوئے، ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء کو ضلع گوجرانوالہ کے ایک موضع اتارہ میں پیدا ہوئے۔ میراجی کے والد منشی مہتاب الدین ریلوے میں برج انسپکٹر تھے اور ملازمت کی نوعیت کے اعتبار سے انھیں اکثر مختلف ریلوے سٹیشنوں پر رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ منشی صاحب کے کسی ایک جگہ قیام پذیر نہ ہونے کی وجہ سے میراجی کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوئی۔ آخر میں لاہور آ گئے تھے لیکن میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی تعلیم کا سلسلہ بوجوہ منقطع ہو گیا، البتہ کتاب بینی کا شوق، جو انھیں بچپن سے تھا، برابر جاری رہا اور انھوں نے اپنی عدیم المثال ذہانت سے کام لے کر قدیم و جدید انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا۔ انگریزی ادبیات کے توسط سے مغرب کے بہت سے شعراء بالخصوص فرانسیسی شعراء کا کلام پڑھا اور ان میں سے اکثر سے اثر بھی قبول کیا۔

میراجی کو شاعری کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا۔ اپنے ابتدائی دور شاعری میں ''ساحری'' تخلص کرتے تھے۔ شاعری کا یہ ذوق دراصل انھیں اپنے والد کی طرف سے ملا تھا جنھیں ادب و شعر سے خاصا شغف تھا اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ''ادبی دُنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد کا بیان ہے کہ عمر کے خاصے فرق کے باوجود، میراجی کے والد شعر میں ان سے مشورہ لینے میں بھی تامل نہ کیا کرتے تھے۔ ❶

میراجی قیام لاہور کے دوران میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک نائب مدیر کی حیثیت سے ''ادبی دنیا'' کی ادارت میں شامل رہے اور یہیں سے ان کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔ ''ادبی دُنیا'' کے ساتھ ساتھ میراجی ''حلقہ ارباب ذوق'' سے بھی وابستہ ہو گئے اور حلقہ کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں مقدور بھر کوشش کی۔ یہاں تک کہ حلقہ اور میراجی ایک ہی ذات کے دو نام بن گئے۔ ''میراجی حلقہ ارباب ذوق کا فکری محور تھے اور حلقہ کے ارکان ان سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان کی رہنمائی میں مختلف ادبی تجربات کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔'' ❷

---

❶ میراجی کی نثر (مقالہ) صلاح الدین احمد، مطبوعہ میراجی۔۔۔۔۔ شخصیت اور فن، مرتبہ کمار پاشی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۵۵

❷ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۵۶۲

اسی زمانے میں میراجی کی زندگی مِراسین نامی ایک بنگالی لڑکی سے ناکام عشق کی وجہ سے یکسر بدل گئی۔ ردعمل کے طور پر وہ شراب کے عادی ہو گئے، پان کھانے کی انتہا کر دی، ہیئت عجیب بنالی، مطالعے میں غرق رہنے لگے۔ ان کی زندگی کی ہر بات کچھ اس طرح بدل گئی گویا انھوں نے ایک نیا جنم لیا ہو۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں آل انڈیا ریڈیو کے سٹاف میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے لاہور کے اکثر ادبا اور شعراء کو دِلّی بلالیا۔ اسی سلسلے میں میراجی بھی دِلّی پہنچے جہاں وہ ریڈیو پر نشر ہونے والے مختلف مسودات اور گیت لکھنے پر مامور ہوئے۔ یہ مسوّدات اور گیت وہ حسبِ ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ لیکن شراب نوشی کی کثرت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا اور اسی وجہ سے ان کی دِلّی کی زندگی بڑی تلخ گزری۔

ریڈیو سے قطع تعلق کر کے کچھ عرصہ بعد میراجی بمبئی چلے گئے۔ وہاں ان کا ارادہ فلم کمپنیوں میں کام کرنے کا تھا۔ ❶ بمبئی میں انھوں نے مشہور شاعر اختر الایمان کے ساتھ مل کر ماہنامہ "خیال" بھی جاری کیا۔ ❷ لیکن شراب کی عادت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی چنانچہ اکثر بدحال رہنے لگے۔ شاہد احمد دہلوی کا ان کے آخری دنوں کے متعلق بیان ہے کہ مرنے سے چھے ماہ قبل اچانک شراب کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جس سے ان کے قلب کی حرکت میں فرق آ گیا۔ جگر اور معدے نے جواب دے دیا اور میراجی کا مرض لاعلاج ہو گیا تھا۔ ❸ آخر کس مپرسی کے عالم میں بمبئی کے ایک سرکاری ہسپتال میں میراجی، جو اپنی وضع کے ایک ہی آدمی تھے، ۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کو وفات پا گئے اور وہیں دفن ہو گئے۔

میراجی نے اُردو نظم کو اس کی مخصوص ہیئتوں اور موضوعات کی پابندیوں سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اپنی بیشتر منظومات کو موضوع اور تکنیک ہر دو لحاظ سے بالکل نئے رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آزاد نظم ہماری شاعری میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میراجی کے سامنے نظم کے میدان میں ایسی کوئی مثال نہیں تھی جس کو سامنے رکھ کر وہ نظم

---

❶ "میراجی" (مضمون) شاہد احمد دہلوی، ص ۲۸

❷ ایضاً، ص ۲۸

❸ ایضاً، ص ۲۹

کے اس خاص انداز کو ترقی دیتے یا بتدریج اس میں اضافہ کرتے، اس لیے جو کچھ آزاد نظم کی ہیئت میں میراجی نے کہا وہ ان کے اپنے مطالعے اور ذہانت کا مرہونِ منت ہے۔ میراجی نے اپنی بے مثال ذہانت اور صلاحیتوں سے اُردو نظم کو ایک نئے سانچے، ایک نئے مزاج اور نئے آہنگ سے آشنا کیا اور نظم کے دھارے کا رُخ اس طرح موڑ دیا کہ میراجی کے بعد آنے والے بہت سے شعراء نے میراجی سے بڑے واضح اثرات قبول کیے اور ان کی علامتوں، اشاروں، کنایوں، مخصوص اندازِ فکر اور اندازِ بیان کے نئے پیرایوں کو پیشِ نظر رکھا۔

میراجی کی زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو عام فہم نہیں بلکہ اُلجھی ہوئی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ:

"وہ شاعری میں اپنی بات کہنے کی اُمنگ کے باوجود اپنی بات چھپائے رکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔" ❶

شاید اس کی بڑی وجہ وہ معاشرہ ہے جو تہذیبی تصادم اور کش مکش کا شکار ہے اور جس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔ جبکہ میراجی بھی اسی معاشرے کے ایک حساس فرد ہیں۔ اس امر کا اظہار انھوں نے خود بھی برملا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مشاہدے کے لحاظ سے اگرچہ بحیثیت مجموعی، زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔ مطالعے کے لحاظ سے اس زمانے میں نہ صرف مغربی ادبیات نے میری راہنمائی کی بلکہ مغربی تفکرات اور سائنس نے بھی اپنا اپنا اثر کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشرقی روایات اور صدیوں کے اثاثے سے بیگانگی رہی۔ وشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا بلکہ

---

❶ چند بڑے ادیب (مقالہ) احمد ندیم قاسمی، "نقوش" لاہور نمبر، ص ۱۰۰

اس کی ادبی روایات بھی کچھ اس انداز سے بروئے کار آئیں کہ دل ودماغ ایک

جیتا جاگتا برندابن ☆ بن کر رہ گیا۔ [1]

اس امر کا احساس میراجی کو خود بھی تھا کہ وہ جو کچھ نظموں میں کہتے ہیں وہ عام فہم نہیں ہے اور شاید بہت ہی کم لوگ اس کو سمجھ پاتے ہوں۔ چنانچہ اس کی وضاحت انھوں نے ''میراجی کی نظمیں'' کے دیباچے میں کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی نظمیں ہر ایک کے لیے نہیں، صرف خواص کے لیے ہیں۔ میراجی کے الفاظ میں:

> ''اکثریت کی نظمیں الگ ہیں، میری نظمیں الگ ہیں اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دُنیا کی ہر بات ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی اس لیے یوں سمجھیے کہ میری نظمیں بھی صرف انھی لوگوں کے لیے ہیں جو انھیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہوں۔'' [2]

عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے میراجی کی نظموں کا نمایاں پہلوان کا جنسی ابہام ہے اور ان کی نظموں کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر اکثر نقاد یہ کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ میراجی کی ذات کی طرح ان میں بھی سوائے غلاظت کے اور کچھ نہیں۔ مگر یہ قرینِ انصاف نہیں۔ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ شاعر کی ذاتی زندگی کا اثر اس کی شاعری پر کسی حد تک ضرور پڑتا ہے۔ مگر تمام تر حیثیت کو اس کی شاعری میں گھسیٹنا کسی طرح روا نہیں۔ شاعری کے بارے میں میراجی کے اس نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں ان واقعات وحالات کو دیکھنا ہوگا جن کے زیرِ اثر انھوں نے ان نظموں کی تخلیق کی۔ میراجی اسی دھرتی کے باسی تھے، ان کا مزاج اسی دھرتی پر تشکیل ہوا تھا۔ اس لیے ان کے اجتماعی شعور میں قدیم ہندوستان

☆) برندابن جسے بندرابن بھی کہا جاتا ہے ضلع متھرا میں دریائے جمنا کی بائیں کنارے قصبہ گوکل کے نزدیک ایک گھنے جنگل کا نام ہے جس میں تلسی کے پیڑوں کی بہتات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرشن کنھیا کی جوانی کا زمانہ اس جنگل میں بسر ہوا تھا اور وہ یہاں رادھا گجیا اور اپنی دوسری گوپیوں کے ساتھ گائیں چرایا کرتے تھے۔ (بحوالہ ''اے ڈکشنری آف اُردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش، جان ٹی پلیٹس، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۹

[1] پابند نظمیں، میراجی، کتاب نما راولپنڈی ۱۹۶۸ء، ص ۲۳

[2] میراجی کی نظمیں، ساقی بک ڈپو دہلی، س ن، ص ۱۳

اور ماضی کی روایات کے ان تمام نقوش کا موجود رہنا بعید از قیاس نہیں جو صد ہا سالوں پر محیط ہیں اور جوان کی ذہنی مراجعت کا بنیادی سبب ہیں۔

میراجی کی شاعری اور تنقید نگاری کا سفر ایک ساتھ شروع ہوا۔ ابتدا میں انھوں نے مغرب و مشرق کے ممتاز شاعروں پر بڑے وقیع تنقیدی مضامین لکھے اور ان شعراء کی تخلیقات کے ترجمے بھی پیش کیے۔ غالباً میراجی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو ادب کو قدیم ہندوستان کے سنسکرت شاعر امارو، بنگالی کے پہلے شاعر چنڈی داس اور میتھالی کے عظیم ویشنو شاعر ودیاپتی اور کئی دوسرے سنسکرت اور بنگالی شعراء سے متعارف کرایا۔ میراجی نے ان شعراء میں سے ودیاپتی سے بطور خاص اثر قبول کیا۔ ودیاپتی ویشنومت میں یقین رکھتے تھے جس میں جنس مذہب سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ خود میراجی اپنی نظموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے، وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے۔ اس لیے ردعمل کے طور پر میں دُنیا کی ہر بات کو جنس کے اُس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور۔۔۔ جو میرا آدرش ہے۔'' ❶

میراجی کے اِس بیان سے واضح ہے کہ وہ جنسی عمل کو تخلیقی عمل کا درجہ دیتے تھے جو ویشنومت اور پراکرتی اعتقاد کے عین مطابق ہے۔ پراکرتی کے مظاہر کی یہ تصویریں ان کی نظموں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

> دن ختم ہوا، دن بیت چکا،
> رفتہ رفتہ ہر نجم فلک اس اُونچے، نیلے منڈل سے
> چوری چوری یوں جھانکتا ہے

---

❶ میراجی کی نظمیں، ص ۱۵

جیسے جنگل میں کنیا کے اِک سیدھے سادے دوارے سے
کوئی تنہا چپ چاپ کھڑا جھپ کر گھر سے باہر دیکھے!
جنگل کی ہر ٹہنی نے سبزی چھوڑی، شرما کے چھپی تاریکی میں
اور رنگ برنگے پھولوں کے شعلے، کالے کاجل بن کر روپوش ہوئے
اور بادل کے گھونگٹ کی اوٹ سے تکتے تکتے چنچل چندا کا روپ بڑھا! (سنجوگ) ❶

✿ ✿

آشا آئی سارے من کے دُکھ اِک پل میں مُجھ کو بھولے
من مندر میں سکھ سنگت نے ایسی اُمنگیں آن جگائیں
جیسے کوئی ساون رُت میں پھلواری میں جھولا جھولے
کومل لہریں میرے من میں اِک انوکھی شوبھا لائیں
جیسے اُونچے، نیلے ساگر میں دو کونجیں اُڑتی جائیں
جیسے بسنتی سماں سہانا من کو چنچل ناچ نچائے! (اجالا) ❷

✿ ✿

پہلے پھیلی ہوئی دھرتی پر کوئی چیز نہ تھی
صرف دو پیڑ کھڑے تھے ------ چپ چاپ
ان کی شاخوں پہ کوئی پتے نہ تھے
ان کو معلوم نہ تھا کیا ہے خزاں کیا ہے بہار
پیڑ نے پیڑ کو جب دیکھا تو پتے پھوٹے
وہی پتے ----- وہی بڑھتے ہوئے ہاتھوں کے نشاں
شرم سے بڑھتے ہوئے، گوہر تاباں کو چھپاتے ہوئے، سہلاتے ہوئے،
وقت بہتا گیا، جنت کا تصور بھی لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح
دُور ہوتا گیا، دھندلاتا گیا،

---

❶ میراجی کی نظمیں، ص ۴۳
❷ میراجی کی نظمیں، ص ۷۱

پتے بڑھتے ہی گئے، بڑھتے، بڑھتے گئے،

بَن نئے شکل بدلتے ہوئے، کروٹ لیتے

آج ملبوس کی صورت میں نظر آتے ہیں،

(برقع) ❶

میراجی کے بیان اور ان کی نظموں کے درج بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ پراکرتی کی پرستش ہی ان کا آدرش تھا جسے وہ ساری عمر اپنے سینے سے لگائے رہے۔ لیکن زمانہ حال میں اپنے داخلی کردار کو سمجھنے کے لیے انھوں نے اسے ماضی کی نظر سے دیکھا جس کی بنا پر وہ ہر چیز کو دُور سے دیکھنے کے عادی ہو گئے یہاں تک کہ اپنی محبوبہ میرا سین کو بھی انھوں نے اتنی دُور سے دیکھا کہ اس کا کوئی واضح نقش، ان کی کسی نظم سے نہیں اُبھر سکا۔ جس طرح دُور کھڑے پربت انھیں ایک نیلگوں راز دکھائی دیتے تھے اسی طرح جب انھوں نے میرا سین کو ماضی کے گہرے دھندلکوں میں دیکھا تو میرا سین، میرا سین نہ رہی بلکہ کہیں رادھا، کہیں بادل، کہیں دریا، کہیں ساگر، کہیں پربت اور کہیں پیڑ بن گئی یعنی اس نے پراکرتی کا رُوپ دھار لیا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ میراجی کا عشق سطحی نہیں تھا بلکہ میرا سین کے پس منظر میں اسے اس خالق کی تلاش تھی جس نے پراکرتی کا یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ میراجی، میرا سین کی تلاش میں اور اپنی انفرادی شخصیت کے کھوج میں بہت دُور نکل گئے۔ جہاں ہندوستان کے قدیم ترین سنسکرت شاعر امارو کے گیتوں نے ان کی رُوح کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ امارو کے گیتوں میں انھوں نے رادھا کو میرا سین کے رُوپ میں دیکھا، چنانچہ انھوں نے اپنی نظموں میں میرا سین کی جو جھلکیاں پیش کی ہیں انھیں دیکھنے کے لیے بصارت چاہیے۔ مثال کے طور پر میراجی کی نظموں کے یہ چند ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

یہ چندا کرشن ۔۔۔۔۔۔ ستارے ہیں جُھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!

اور زہرہ نیلے منڈل کی رادھا بن کر کیوں آئی ہے؟

کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی؟

جنگل کی گھنی گپھاؤں میں جگنو جگمگ جگمگ کرتے، جلتے بجھتے، چنگارے ہیں!

---

❶ میراجی کی نظمیں، ص ۱۸۳

اور جھینگر تال کنارے سے گیتوں کے تیر چلاتے ہیں،

نغموں میں بہتے جاتے ہیں! (سنجوگ) ❶

⭘ ⭘

جھومی گیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا،

نٹ کھٹ برندابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا،

رادھا مکھ کی اُجلی صورت، شیام گیسو کا سایا

سامنے جیوتی جاگ رہی ہے، پیچھے گھور اندھیرا،

دیکھ کے دو دنیاؤں کا جلوہ ڈول اُٹھا من میرا،

دونوں اڑائیں دھیان کے پنچھی کی جوگی والا پھیرا،

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی، (ایک منظر) ❷

میراجی نے اپنی دُنیا خود تخلیق کی، جس میں وہ زندہ تھے اور میرا سین کے رُوپ میں اپنی ذات کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہے۔ وہ اپنی نظموں میں اپنی ہستی کا اظہار کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے شعری رویوں کے سلسلے میں اپنے مشاہدے اور مطالعے سے جو علم حاصل کیا اس کا اظہار بلا کم و کاست اپنی شعری تخلیقات میں کر دیا۔ اپنی انفرادی ذہنیت کی بدولت انھوں نے جو شعری کردار تخلیق کیے اُس کا مکمل خاکہ دیکھنے کے لیے ان کی نظم ''جاتری'' کا مطالعہ کافی ہوگا جس میں انھوں نے ایسا زندہ کردار پیش کیا ہے جو ازل سے موجود ہے اور اب حال کے خشک، بے برگ اور بے رنگ صحرا میں کھڑا ہے اور اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ:

سفر یہ اُجالے، اندھیرے کا چلتا رہا ہے تو چلتا رہے گا یہی

رسم ہے راہ کی ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا، رات

ایسے گزر جائے گی، (جاتری) ❸

---

❶ میراجی کی نظمیں، ص ۴۳

❷ میراجی کی نظمیں، ص ۹۲

❸ ایضاً، ص ۱۳۵

ڈاکٹر وزیر آغا نے میراجی کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اُردو نظم میں میراجی وہ پہلا شاعر ہے جس نے محض رسمی طور پر ملکی رسوم، عقائد اور مظاہر سے وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ مغربی تہذیب سے ردعمل کے طور پر اپنے وطن کے گُن گائے ہیں بلکہ جس کی رُوح دھرتی کی رُوح سے ہم آہنگ اور جس کا سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملکی روایات، تاریخ اور اساطیر سے مملو ہے"۔ ❶

میراجی کے ذہنی رویے کی بہترین مثال ان کی پابند نظم "سندباد کی واپسی" ہے جس کے چند مصرعے درج ذیل ہیں:

ماتا سلامتی ہے کنارے پہ بحر کے
دلچسپ حادثوں کی خبر لب پہ لاؤں گا!
جو دل بجھے ہوئے ہیں، فسردہ ہیں ان کو آج
میں جلوہ ہائے موج و گہر سے رجھاؤں گا
چھا جائے سب کی رُوح پہ اک دام جستجو
وہ سحر زا طلسم کا نغمہ سناؤں گا
یہ زندگی بھی ایک تگ و دو ہے مستقل
ہمدم سفر کا عمر کو سب کی بناؤں گا
گوشے میں عافیت کے نہ بیٹھے کبھی کوئی
مسلک مرا یہی ہے ہراک کو بتاؤں گا
سو تجربے ہیں راہ سفر میں چھپے ہوئے
میں ان کو اپنی عمر کا حاصل بناؤں گا
طاری ہے اک جمود سا روحِ حیات پر
ہر نقشِ جمود کو یکسر مٹاؤں گا!

---

❶ میراجی ــــــ دھرتی پوجا کی ایک مثال (مقالہ) ڈاکٹر وزیر آغا، میراجی ــــــ شخصیت اور فن، ص ۱۴۲

لیکن عطا ہوں سحر کی خاصیتیں مجھے
مل جائیں لفظ لفظ میں کیفیتیں مجھے

(سندباد کی واپسی) ❶

اگرچہ میراجی کی بیشتر نظموں میں ایک ابہام اور الجھاؤ کی کیفیت ہے اور قدیم ہندو تہذیب کے مطالعے کے بغیر ان کی نظموں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر ان کی غزلوں بالخصوص گیتوں میں یہ کیفیت بالکل برعکس ہے۔ گیتوں میں بھی ان کی نظموں کی طرح اردو اور ہندی کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے مگر گیتوں میں "وہ اتنا رواں اور مترنم ہے کہ شاعری اور موسیقی کے درمیان بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔" ❷ حالانکہ ان گیتوں کی فضا بھی کم و بیش وہی ہے جو اُن کی نظموں کی ہے لیکن شاید گیتوں کی یہ فضا نظموں سے قدرے سبک ہے۔ بہرکیف میراجی کی نظمیں ہوں، ان کی غزلیں یا گیت، ان کی ایک مخصوص فضا ہے۔ وہ ہندو دیومالا اور فلسفے سے جذباتی طور پر شدت کے ساتھ ہم آہنگ اور قدیم ہندو شعراء سے متاثر ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کے پس منظر میں عموماً ہندوستان کی قدیم تہذیب ہے اور اس لحاظ سے اُردو نظم کے حوالے سے میراجی کی حیثیت منفرد اور یکتا ہے۔

✿ ✿

مجید لاہوری (۱۹۱۳ء۔۱۹۵۷ء)

خطہ پنجاب میں ایسے متعدد شعراء پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی علمی کاوشوں اور فکر کی رفعتوں کی بدولت ایسے لازوال نقوش ثبت کیے جو اَنمٹ ہیں۔ مجید لاہوری بھی ایسے ہی صاحب طرز طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنی منفرد ظریفانہ شاعری کی بنا پر نام کمایا اور جن کا شمار اردو ادب کے ممتاز مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ مجید لاہوری جن کا خاندانی نام عبدالمجید چوہان تھا، ۱۹۱۳ء میں گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابھی شیر خوار ہی تھے کہ ان کے والد داغ مفارقت دے گئے تو ان کی والدہ اپنے میکے گوجرانوالہ چلی آئیں جہاں انھوں نے عقدِ ثانی کر لیا۔ ان کے سوتیلے والد کا کاروبار کراچی میں تھا، چنانچہ یہ بھی صغر سنی میں ہی کراچی چلے گئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ اسی دوران میں

---

❶ پابند نظمیں، ص ۱۲۳

❷ چند بڑے ادیب (مقالہ) احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ نقوش لاہور نمبر، ص ۱۱۰۰

ان کے سوتیلے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے ننھیال گوجرانوالہ چلے آئے اور گوجرانوالہ میں رہ کر تعلیم مکمل کی۔ حصول تعلیم کے بعد حصول معاش کے لیے لاہور چلے آئے اور عرصہ دراز تک لاہور میں مقیم رہنے کی وجہ سے مجید لاہوری کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مجید لاہوری نے عملی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں صحافت سے کیا۔ انھوں نے لاہور سے شائع ہونے والے کئی اخباروں اور رسالوں میں کام کیا۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران میں انھوں نے کچھ عرصہ ریڈیو کے سانگ پبلسٹی کے شعبے میں بھی کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے گئے، جہاں انصاف، انجام اور خورشید میں ایک عرصہ کام کرنے کے بعد "جنگ" میں مزاحیہ کالم شروع کیا اور تادم آخر لکھتے رہے۔ کراچی کے عرصہ قیام میں انھوں نے ایک پندرہ روزہ "نمکدان" بھی شائع کیا جس میں نظم ونثر کے تقریباً تمام موضوعات طنزیہ اور مزاحیہ ہوتے تھے۔ آپ نے بہت کم عمر پائی اور حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب ۲۶ر جون ۱۹۵۷ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی روایت خاصی قدیم ہے۔ تاہم اس سلسلے میں اکبرالہ آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے باقاعدہ تعمیری کام لینے کی کوشش کی۔ اکبر کے بعد جن شعراء نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو تعمیری نقطۂ نگاہ سے اپنایا ان میں مجید لاہوری کا نام بہت نمایاں ہے۔

مجید لاہوری کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ "وہ عوامی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کرتے تھے۔" ⓿ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ذہنِ رسا سے رمضانی، سائیں سلیمان بادشاہ، چچا سورج دین، مولوی گل شیر خان، رجو بھیا، شیخ حماد اللہ اور سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی وغیرہ معاشرے کے ایسے نمائندہ کردار تخلیق کر رکھے تھے جن کے ذریعے وہ بڑے بےباکانہ انداز میں اپنے معاشرے اور ماحول کی برائیاں اور اچھائیاں نمایاں کرتے ہیں۔ ان کا یہ انداز دلکش بھی ہے اور موثر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی شاعری کی دوسری بڑی خاصیت ان کی تحریف نگاری کا جداگانہ انداز ہے جس میں انھیں بڑی دسترس حاصل تھی اور تیسری بڑی خاصیت

⓿ دے صورتیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۳۳۴

انگریزی الفاظ کا بلا جھجک استعمال ہے۔

بہر کیف مجید لاہوری کی شاعری کا ایک مخصوص انداز ہے جو انھیں کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا۔ مگر آج بھی قاری سے خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ان کی ایک مشہور نظم "منکہ ایک منسٹر ہوں" سے اقتباس اور چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

نرغیوں پر بھی میں کر سکتا ہوں اظہار خیال
اور سانڈوں پر بھی ہوں محفل میں سرگرم مقال

ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں
اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں!

بو علی سینا کی حکمت، بات افلاطون کی
ایگری کلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی

داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز
ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبطِ محمود و ایاز

کشتۂ فولاد ہو یا شربتِ دینار ہو
ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
شوق ہے دل میں مگر قرآن کی تفسیر کا

جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر مستند ہے میرا فرمایا ہوا

(منکہ ایک منسٹر ہوں) [1]

✿✿

---

[1] کاربن نمک، مجید لاہوری، مکتبہ مجید، بندر روڈ کراچی ۱۹۵۸ء، ص ۳۱

خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو　　　برا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے

○ ○

ان کے وعدے اُف توبہ　　　یو این او کی باتیں ہیں

○ ○

اگر ہوتی رہیں اقبال پر انگلش میں تقریریں
بدل جائیں گی اک دن دیکھنا ملت کی تقدیریں

○ ○

چھڑی اک ہاتھ میں ہے اور ہے اک ہاتھ میں سگریٹ
''جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں''!

○ ○

احسان دانش (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء)

احسان دانش کاندھلہ مظفر نگر (یو پی، بھارت) کے ایک نہایت مفلس اور کم تعلیم یافتہ گھرانے میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی دانش علی تھا، جو ضلع میرٹھ کے ایک قصبے باغپت کے رہنے والے تھے اور پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے محنت مزدوری کر کے بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے، تلاشِ معاش میں کاندھلہ چلے آئے تھے مگر یہاں بھی حالات جوں کے توں رہے اور انھیں مفلسی سے کسی طرح نجات نہ مل سکی۔ ایسے ہی غریبانہ ماحول میں احسان نے آنکھ کھولی۔ اصلی نام احسان الحق تھا جو بعد میں اپنے والد کے نام کی مناسبت سے احسان بن دانش اور بالآخر احسان دانش ہو گیا۔ آپ کے والد کی انتہائی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تعلیم پائے اور وہ احسان کو کسی نہ کسی طرح تین سال تک سکول بھیجتے رہے مگر جب وہ چوتھی جماعت پاس کر چکے تو ان کے والدین کے پاس تنگدستی کے باعث اگلی جماعت کی فیس اور کتابوں کے لیے پیسے نہیں تھے، اس لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس بات کا ذکر احسان دانش نے اپنی خودنوشت سوانح ''جہانِ دانش'' میں بڑے دردناک انداز سے کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ جب میں نے درجہ چہارم کی کتابیں خریدی تھیں اس وقت ہمارے گھر

میں کوئی تانبے یا پیتل کا برتن نہیں رہا تھا۔" [1]

چنانچہ چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد کمسنی ہی سے احسان زمانے کے مصائب و آلام میں پھنس گئے، آپ کے ابتدائی عمر کے واقعات بہت الم‌ناک ہیں۔ اپنی اور اپنے والدین کی گزر اوقات کے لیے انھوں نے سنِ شعور کا سارا زمانہ محنت مزدوری میں بسر کیا اور معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی کبھی کسی تکلف کو روا نہیں رکھا، چپڑاسی بنے، چوکیدار رہے، باغبانی کی، ٹوکری اُٹھائی، خشت برداری کی، قلی بنے، رنگ سازی اور قالین بافی کی اور کہیں باورچی رہے مگر کسی طرح مفلسی کا مداوا نہ ہو سکا۔ اپنے ان رُوح فرسا حالات کا بیان انھوں نے "جہانِ دانش" میں بلاکم و کاست کیا ہے جو اُن کی عظمت کی دلیل ہے مگر ان جان لیوا مشقتوں کے دوران میں بھی وقت نکال کر انھوں نے اپنے طور پر شعر شاعری اور مطالعے کا شوق جاری رکھا جس کا انھیں ابتدا سے ہی جنون تھا۔

احسان دانش قیامِ پاکستان سے کافی عرصہ پہلے بسلسلہ روزگار لاہور میں مقیم تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے ایبک روڈ پر "مکتبہ دانش" کے نام سے کتابوں کی ایک دکان کھولی اور نزدیک ہی انار کلی بازار کے ایک مکان میں نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر ایک طویل عرصہ کی علالت کے بعد ۲۲ / مارچ ۱۹۸۲ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہُوئے اور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔

احسان دانش کو شعر و شاعری کا ذوق فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، جسے وہ سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے روز افزوں نکھارنے میں مشغول رہے۔ کاندھلہ کے عرصہ قیام میں معروف شاعر قاضی محمد ذکی کی صحبت سے مستفید ہوئے اور لاہور آنے کے بعد مختلف اوقات میں مولانا تاجور نجیب آبادی، جوش ملسیانی، تلوک چند محروم، برجموہن دتاتریہ کیفی اور نوح ناروی سے اکتسابِ فن کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ جہاں اکثر اوقات بہت زیادہ داد و تحسین سے نوازے جاتے رہے اور اس طرح قبولِ عام کا درجہ حاصل کیا۔ آپ کی شہرت نے یہ رنگ اختیار کر لیا تھا کہ آپ کی شمولیت کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جانے لگی تھی۔ احسان

---

[1] جہانِ دانش، احسان دانش، مطبوعہ دانش آباد، انارکلی لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۱۷

اپنی نظمیں بڑے دلگداز ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ جوش ملیح آبادی کے بعد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے محض اپنی نظموں کی بنیاد پر مشاعروں میں اپنا سکہ جمایا۔

احسان دانش نے چونکہ دُنیا کے نشیب وفراز کا تجربہ اور مطالعہ بلاواسطہ طور پر بذاتِ خود کیا تھا اس لیے ان کی شاعری کا بڑا حصہ مزدور اور سرمایہ دار کی خونچکاں داستانوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اِس مستقل موضوع کو جس تنوع اور رنگا رنگی سے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور اس ضمن میں ان کی حیثیت عام اہلِ سخن سے بڑھی ہوئی ہے۔ احسان نے اپنے آپ کو مزدور کہلوانے میں کبھی ہتکی محسوس نہیں کہ بلکہ خود کو "شاعرِ مزدور" لکھتے تھے اور شاعرِ مزدور کہلانے پر فخر کیا کرتے تھے۔ ❶

میں شاعرِ مزدور ہوں لیڈر تو نہیں ہوں
کھانا مجھے درکار ہے باسی ہو کہ تازہ ❷

احسان چونکہ ایک مزدور کے گھر میں پیدا ہوئے اور خود بھی عرصہ دراز تک مختلف مزدوریاں کرتے رہے' اس لیے مزدوروں اور کسانوں کے تلخ لمحات زندگی کی حقیقتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایسا شخص اگر شاعری کے ملکہ سے بھی بہرہ مند ہو تو ظاہر ہے ایک مزدور کے حالات اور جذبات کی ترجمانی اس سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا اور اس کے بیان میں اثر انگیزی بھی بدرجہ اُتم ہوگی۔ احسان کی شاعری کا بھی یہی حال ہے اور ان کے زیادہ تر موضوعات نظم کسی نہ کسی طور سے ستم رسیدہ لوگوں کی زندگی ہی سے متعلق ہیں۔ احسان اس طبقے سے شدید ہمدردی رکھتے ہیں، اس کی مفلوک الحالی پر کُڑھتے ہیں اور اس کی آسودگی اور عافیت کی دلی خواہش رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں "کسان"، "خسیس سرمایہ دار"، "ایک جاگیردار سے"، "سرمایہ دار کی موت"، "مزدور کا پیغام"، "مزدور کی شام"، "مزدور طالب علم"، "مزدور کی بیوہ"، "مزدور عورت"، "طفلِ بیمار"، "مزدور کی موت"، "مزدور کی لاش"، "مزدور کی عید"، "مزدور کی برسات" وغیرہ میں محنت کش طبقہ کی زندگی اور مظلومی و بے بسی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مثلاً ایک مزدور دن بھر کی جان لیوا مشقت کے بعد جب شام کو اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے تو اس کی پُردرد

---

❶ لاہور کا جوذکر کیا، گوپال متل، ص ۴۷

❷ مقامات، احسان دانش، مکتبہ دانش لاہور (سن ندارد)، ص ۱۱۰

بیتِ کذائی اور ذہنی کیفیت کی مرقع نگاری انھوں نے کن الفاظ میں کی ہے، ان کی نظم ''مزدور کی شام'' کے اِن اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

غروب مہر، گردوں پر شفق، چپ چاپ ویرانہ
زبانِ شام پر ہے دن کی ناسازی کا افسانہ
رواں ہے اس طرح مزدور گھر کی سمت جنگل سے
کھنچا جاتا ہو جیسے شمع کے جلووں میں پروانہ
تہی آنکھیں، تہی سینہ، تہی کیسہ، تہی دامن،
شکستہ آتشِ شب رنگ سے راحت کا کاشانہ
چٹختی ہڈیوں سے اِک خشک صحرا کے سینے میں
دھڑکتے دل کے سازِ غم سے پیدا سوز عرفانہ
پھٹے کُرتے کی ہلتی دھجیاں ٹھنڈی ہواؤں میں
زبانِ حال سے کہتی ہوئیں عسرت کا افسانہ
برستی جا رہی ہے ٹوکری سے بُھربُھری مٹی،
بکھرتا جا رہا ہے خاک سے حُسنِ شریفانہ
دلِ محزوں کی ہر دھڑکن کسک، ہر سانس اِک نشتر
لبوں پر مانعِ فریاد انداز کلیمانہ
پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوانِ مجبوری
برہنہ پاؤں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ ❶

محنت کش طبقہ اور مفلوک الحال عوام کی اتنی بھرپور عکاسی اردو شاعری میں بہت کم ہے۔ یہ عکاسی نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی ہے لیکن ان کا لب و لہجہ اتنا تند و تیز نہیں جتنا احسان دانش کا ہے۔

---

❶ چراغاں، احسان دانش، مکتبہ دانش (س ن) ص ۴۱، ۴۲

جیسا کہ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"نظیر اکبرآبادی کے بعد عوام کی زندگی کی ترجمانی سب سے زیادہ احسان دانش نے ہی کی ہے لیکن نظیر میں اور احسان میں فرق یہ ہے کہ نظیر کے موضوع معین تھے اور نہ مقصد، لیکن احسان کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اسی لیے نظیر اکبرآبادی کے تنوع اور اہتزاز شعری کے مقابلے میں احسان کے پاس تخصیص اور تنگی دکھائی دیتی ہے۔" ❶

احسان دانش کا انداز بیان عام طور پر بڑا دلکش ہے۔ بیانیہ شاعری اور مرقع نگاری میں ان کا قلم بڑا سبک رو ہے۔ وہ تخیل سے زیادہ تجربے اور مشاہدے سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے جہاں بھی کسی منظر کو پیش کیا ہے اس کی ایسی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جن پر عموماً دوسروں کی نظر نہیں پڑتی۔ مثلاً اپنی ایک نظم "طفلِ بیمار" میں ایک قلاش مزدور کی، اپنے بچے کی بیماری پر بے چارگی کے تاثرات، جسے وہ گود میں اُٹھائے کسی ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہے، اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ان کا انداز بیان بعض اوقات مرثیے کی طرح رقت انگیز بن جاتا ہے اور شاعر اپنے جذبات کی رو میں پڑھنے والوں کو بھی بہا کر لے جاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

گود میں ہے زرد رُو بچہ شفا کی فکر ہے
جیب میں صرف ایک آنہ ہے دوا کی فکر ہے
اِک طرف پیسے کی تنگی سے ہے سینہ داغ داغ
اِک طرف بچے کے رونے سے کلیجہ پاش پاش
دل ہی دل میں کہہ رہا ہے اے خداوندِ انام
بڑھ نہ جائیں ایک آنے سے کہیں نسخے کے دام ❷

مفلوک الحال محنت کش طبقے کی صحیح ترجمانی اور بیانیہ شاعری میں دلکش مرقعوں کے علاوہ احسان دانش کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات اور مظاہرِ فطرت کی عکاسی بھی بہت نمایاں ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس دور کے رومانوی شعراء کے یہاں عام ملتی ہیں یعنی وطن اور اس کی تمام اشیاء سے

---

❶ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، شیخ غلام علی لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۷

❷ آتش خاموش، احسان دانش، مکتبہ دانش لاہور، سن ندارد، ص ۱۲۰

وابستگی کا اظہار اور مناظر فطرت کے نظاروں مثلاً: آمدِ بہار، کیفیاتِ چمن، موسمِ برسات، طلوعِ صبح، وقتِ غروب آفتاب، دیہات کی شام، کھیتوں، دریاؤں، پہاڑوں اور دامنِ کوہ کے نظاروں کا بیان اور میلوں ٹھیلوں کا ذکر وغیرہ۔ احسان بھی یہ سب کچھ بڑے سلیقے سے دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ سب رنگ میزیاں ان کے یہاں محض پس منظر کے طور پر ہوتی ہیں اور پڑھنے والا ان کی دلکشی میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ یہ مناظر بھی اس کے اصل مُدّعا یعنی ستم رسیدہ لوگوں کی ترجمانی کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مجموعہ کلام "نفیرِ فطرت" کی نظمیں، جہانگیر کے مقبرے کی ایک شام، برسات کی ایک چاندنی رات، شبابِ چمن، دیہات کی شام، کیفِ برشگال، کیفِ چمن، صُبحِ گلستان، صبحِ بیاباں وغیرہ اور ان کے مجموعے "چراغاں" کی اس موضوع پر نظمیں مثلاً شامِ برشگال، آفتابِ تازہ، آئینۂ سحر، کاروانِ بہار، ساون کی گھٹا، مہتاب درمہتاب، جلوہ زارِ صُبح وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذیل میں "دیہات کی شام" سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ شاعر نے دیہات میں فطرت کی رعنائیوں کا بیان، کس فنکارانہ مہارت سے کرتے کرتے اُسے چرواہوں اور کسانوں کی زندگی کے تلخ شب و روز سے جاملایا ہے کہ قاری تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا:

شام کے اندھیرے میں دن کا اُجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا
ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دُھندلا چراغ
مشورے ہونے لگے نشوونما کے باب میں
سادہ خاطر بہہ چلے تقریر کے سیلاب میں
یہ وہ ہیں جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں
جن کی گرد رہگذر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زُلفِ روزگار
بازوؤں پر جن کے نازاں فطرت گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حُسن انجمن مائل بہ ناز!

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار
دل یہ کہتا ہے فراق انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں ❶

✿✿

قیوم نظر (۱۹۱۴ء-۱۹۸۹ء)

قیوم نظر، جن کا اصل نام عبدالقیوم بٹ تھا اور نظر تخلص کرتے تھے، ۷رمارچ ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے مرحلے پنجاب کے مختلف اضلاع میں طے کیے۔ البتہ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے کیا اور زمانہ طالب علمی کے آخری چند سال دیال سنگھ کالج اور ایف سی کالج لاہور میں گزارے جہاں آپ کا شعری وادبی ذوق پروان چڑھا۔ بی اے کرنے کے بعد بعض ناگزیر حالات کے پیشِ نظر اعلیٰ تعلیم کا خیال ترک کر کے ملازمت کر لی۔ ملازمت کا آغاز ایک پرائمری سکول کی مدرسی سے کیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ اے جی آفس لاہور میں ملازم ہو گئے۔ جہاں آپ کافی دنوں تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے اورینٹل کالج لاہور سے اُردو میں ایم اے پاس کیا اور اُردو کے لیکچرار ہو گئے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں بسر کیا پھر آپ کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا جہاں ایک مدت گزاری۔ کچھ عرصہ کے لیے اورینٹل کالج لاہور میں شعبہ پنجابی کے صدر بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ مدت گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور ۲۵رجون ۱۹۸۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ زمانہ تعلیم میں قیوم نظر کو علامہ تاجور نجیب آبادی اور پروفیسر سید عابد علی عابد جیسے متبحر عالِم اور شفیق اُستاد میسر آئے جن کی راہنمائی میں نہ صرف انھوں نے علم کی پیاس بجھائی بلکہ اکتسابِ فیض بھی کیا۔ بالخصوص شعروادب کے معاملے میں یہ لوگ ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں کہنہ مشق شعراء سے جن کا غزل میں اپنا علیحدہ علیحدہ خاص مقام ہے، استفادے کے باوجود قیوم نظر اپنی غزلوں میں وہ بات پیدا نہ کر سکے جس سے ان کی آواز میں انفرادیت پیدا ہوتی۔ لیکن غزل کے ساتھ جب انھوں نے جدید نظم کو اپنایا تو بلاشبہ اس میدان

---

❶ نفیرِ فطرت، احسان دانش، مکتبہ دانش لاہور، (س ن)، ص ۹۲، ۹۳

میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔

قیوم نظر کی نظموں میں وسعتِ مشاہدہ، شدت احساس، فکر و خیال اور اسلوب بیان کی ایسی لطافتیں پائی جاتی ہیں جو انھیں اپنے ہم عصر نظم نگاروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی نظموں میں بڑا تنوع ہے۔ ان میں مناظرِ فطرت سے لے کر سامراجی تشدد، معاشرتی استحصال، انسانی عظمت اور عشق و محبت تک ہر طرح کے موضوع شامل ہیں۔ معاشرے کی معاشرتی و سیاسی ناہمواریوں اور اخلاقی مجبوریوں کے موضوعات پر بالخصوص انھوں نے بڑے دلنشیں انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ دبستانِ لاہور کے جن شعراء نے ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے ہیں ان میں قیوم نظر کا ایک خاص مقام ہے۔ ہیئت کے معاملے میں وہ روایتی سانچوں سے گریز کرتے اور نئے سانچے تلاش کرتے نظر آتے ہیں مگر اس طرح کہ اپنے قریبی پیش روؤں کے تجربات سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور بعض جگہوں پر اچھوتے پیرائے بھی اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے نامانوس بحروں اور ارکان کی کمی بیشی کے ساتھ ساتھ لفظی ترکیبوں، علامتوں، استعاروں اور تمثالوں کا استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی شاعری میں دلآویزی تو آئی مگر فن کی عظمت محض ہیئت کی دلآویزی سے پیدا نہیں ہوتی۔

قیوم نظر اپنے مسلکِ شعر کے اعتبار سے ''حلقہ اربابِ ذوق'' کے مدرسہ فکر کے شاعر ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے مقصدی اور انقلابی روّیوں کا ساتھ نہیں دیتے اور شاعری کو کسی طے شدہ مقصد کے لیے بطور ذریعہ استعمال نہیں کرتے بلکہ شاعری کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حلقہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے انھیں شاعری میں ''فن برائے فن'' کے نظریہ کی حمایت کرنی چاہیے۔

نمونہ کلام کے طور پر ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

عجیب دن ہے، ابھی گھٹائیں مچل رہی تھیں

برستے نغموں نے رُوپ دھارا تھا ندیوں کا

ابھی رواں کارواں تھا شفاف گنبدوں کا

ابھی فلک سیر بوندیوں کے طلائی ریزے

اُڑائے پھرتی تھیں نرم رو، مشک بو ہوائیں

ابھی چمک اُٹھیں ہر طرف ان گنت صدائیں

پھدکتی چڑیاں، شریر کوے، متین چیلیں
ہوا میں بجتی بلندیاں جن کے آشیانے
لٹا رہے ہیں مسرتوں کے بھرے خزانے
چہکتی شاخوں کے لاڈلے گیت گاتے بچے
خوشی سے بے حال ہر کسی سے لپٹ رہے ہیں
فضا کی جھولی میں زندگانی کے چھچے ہیں
قدم قدم پر انوکھی کیفیتوں کا عالم
ہرے بھرے وہ درخت جیسے اُڑن کھٹولے
وہ سُرخ انگارا پھول کھاتے ہیں یوں جھکولے
چمن چمن گویا جا رہے ہیں شہاب ثاقب
نشانِ پا ہے، نہ رہگزر ہے، نہ کوئی منزل
رہے گی جیسے ہمیشہ ایسے جہاں کی محفل
یہ کیسا احساس میری رگ رگ میں ناچتا ہے
عجیب دن ہے، نہ یادِ ماضی، نہ فکرِ کل کا
نہ حال کے تابناک رُخ پر کوئی دُھندلکا!
(ایک پل کے لیے)[1]

✿✿

(۱)۔ قلب ونظر کے سلسلے (کلیاتِ قیوم نظر)، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۶۵۹

مجید امجد (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۴ء)

مجید امجد ۲۹ رجون ۱۹۱۴ء کو جھنگ مگھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں علی محمد تھا جو محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ مجید امجد ابھی چھے ماہ کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ مجید امجد کی زندگی کا پہلا سانحہ تھا اور پھر اس سانحہ کی کربناکیوں میں مجید امجد کی پرورش ہوئی۔ ابھی تین برس کے تھے کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ ان کے نانا، میاں نور محمد نہایت متقی بزرگ اور اپنے عہد کے بے مثال عالم، فقیہ، محدث اور ماہر طبیب تھے، اپنی بیٹی (مجید امجد کی والدہ) کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیٹی کی نشانی (نواسے) کو گود لے لیا۔ میاں نور محمد کے یہاں روزانہ اہلِ علم کی مجلس ہوتی تھی جس میں مختلف مسائل زیر بحث آتے۔ مجید امجد بھی ان مجلسوں میں شامل ہو کر ذہنی بالیدگی حاصل کرتے۔ ذہین اتنے تھے کہ آپ صرف پانچ چھے سال کی عمر میں قرآن مجید، گلستاں بوستاں، پند نامہ عطار اور دیگر مروجہ کتب کے علاوہ ایک آدھ طب کی ابتدائی کتاب بھی پڑھ چکے تھے۔ سکول میں داخل ہوئے تو معمول یہ تھا کہ صبح سکول میں پڑھتے اور سہ پہر سے رات گئے تک اپنے نانا سے عربی، فارسی، صرف و نحو اور طب پڑھتے۔ اس طرح آپ نے اسلامیہ ہائی سکول جھنگ سے ۱۹۳۰ء میں میٹرک اور گورنمنٹ کالج جھنگ سے ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان پاس کیے۔ اس کے بعد آپ لاہور چلے آئے اور اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۴ء میں بی اے کیا، بی اے کرنے کے بعد آپ پھر جھنگ آ گئے۔ ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں کئی سال تک جھنگ سے شائع ہونے والے نیم سرکاری رسالے "عروج" کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۴۴ء میں آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی لیکن شعر و ادب سے بدستور گہرا تعلق رہا۔ بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں آپ کا قیام طویل ترین ہے جہاں آپ تقریباً ۲۹ سال مقیم رہے اور یہیں سے ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس دوران میں مقامی طور پر آپ کی شخصیت شعری و ادبی ماحول کا محور بنی رہی۔ ۱۱ رمئی ۱۹۷۴ء کو رات دو بجے ساہیوال میں انتقال ہوا۔ میت آپ کے آبائی شہر جھنگ لے جائی گئی اور ۱۲ رمئی کو تدفین ہوئی۔

مجید امجد نے کم و بیش ساری عمر تنہا زندگی گزاری تھی۔ وہ بہت کم گو تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حصے میں محرومیاں ہی محرومیاں آئی تھیں۔ باپ کے زندہ ہونے کے باوجود اُن کی شفقت سے

محرومی، اولاد سے محرومی اور خوشگوار ازدواجی زندگی سے محرومی۔ ان تمام باتوں سے مل کر ان کی زندگی تلخ کامیوں کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے بہت غم برداشت کیے لیکن دوسروں کو اپنے دُکھ کا احساس نہیں ہونے دیا اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ ان کی زندگی غم و آلام کا مرقع تھی لیکن وہ صرف شعر کہنے کے لیے زندہ تھے۔ ان کے بہت سے ارادت مند ادیب و شاعر، جو عمر بھر ان سے فیض یاب ہوتے رہے، ان پر جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن انھوں نے کسی کو اپنے غم میں شریک نہ کیا۔ وہ دوستوں پر بوجھ بننے کے قائل نہ تھے۔ کسی کا احسان اُٹھانا انھیں گوارا نہ تھا۔ گھر سے دفتر، دفتر سے سیدھے گھر یا "بزمِ فکر و ادب" کی لائبریری ان کی محدود زندگی کا محور تھے۔ وہ شعر کہتے، ایک استغراق کے عالم میں رہتے یا پھر ایک اضطراری کیفیت ان پر طاری ہو جاتی۔ اپنی اس کیفیت کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

> "بظاہر میں دنیا میں چلتا پھرتا ہوں، در اصل میں اپنے سامنے نظر آنے والے بے نام عنوانوں سے مصروفِ کلام رہتا ہوں۔ اُن کہی نظموں کے یہ پیامی قدم قدم پر میرا راستہ روک لیتے ہیں۔ کتنے پُر اسرار سندیسے ہیں جو موڑ موڑ پر مجھے ملتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان احساسات کو میں نے نوکِ قلم سے چھونے کی جرأت نہ کی۔ ہوتے ہوتے ایک خاکہ دوسرے خاکے میں گھل مل گیا۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد میرے سامنے صفحۂ قرطاس پر لفظوں اور لکیروں کا ایک ڈھیر موجود ہوتا ہے۔ لوگ انھیں میری نظمیں کہتے ہیں۔" ❶

مجید امجد دبستانِ لاہور کے وہ شاعر ہیں جن کے یہاں موضوعات، اسالیب اور ہیئتوں کا حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں رومانوی حقیقت، طبقاتی تفاوت اور جدید موضوعات پر وافر تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ پھر اُن کا اسلوبِ بیان ایسا ہے کہ انھوں نے مانوس روایتی زبان کے ساتھ ساتھ بہت سی نئی تراکیب بھی اختراع کی ہیں۔ وہ موضوع کے اعتبار سے ہیئت کا انتخاب کرتے ہیں۔ چنانچہ کم و بیش ان کی ہر نظم ایک الگ ہیئت کی حامل ہے لیکن قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ انھوں نے اظہار کے جو سانچے بھی وضع کیے ہیں ان میں ہر جگہ ایک لطیف ٹھہراؤ اور دھیما پن ہے۔ گویا ان کی شاعری نرم اور گداز لہجے کی شاعری ہے۔ ان کی زندگی چونکہ استغنا، انکسار اور درویشی و فاقہ مستی سے عبارت تھی اس

---

❶ لوحِ دل (کلیاتِ مجید امجد) مرتبہ تاج سعید، مطبوعہ مکتبہ ارژنگ پشاور ۱۹۸۷ء، ص ۲۸

لیے فطری طور پر اظہار کا یہی لب ولہجہ انھیں مرغوب بھی ہے۔ دنیاوی آلام کے ہجوم اور اپنی بے انتہا محرومیوں کے اژدحام میں صبر وقناعت اور کمال ضبط کے باوصف ان کے لبوں پر حرف شکایت بھی آتا ہے کہ خدا نے اپنی نعمتوں کے لازوال خزانوں میں سے انھیں صرف ایک ریزۂ درد بخشا ہے:

مرے خدا، میرے دل

یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے

جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو تو اِک یہ ریزۂ درد

ہیں جس کی جھولی میں کھلیان، تیرے شعلوں کے

اور اپ کہ سامنے جلتی حدوں کی سرحد ہے

ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ روحیں

جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں

(مرے خدا مرے دل) ❶

مجید امجد کی شاعری اس غم کی ترجمان ہے۔ وہ بظاہر ہمیں کہیں کہیں مسکراتے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی مسکراہٹوں کے پس منظر میں درد کی کسک صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کی نظم ''پچاسویں پت جھڑ'' ❷ سے اسی کیفیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، یہ بند دیکھیے:

اتنا بھرپور سماں تھا، مگر اب کے مجھے جس نے بھی دیکھا یہ کہا!

''جانے کیا بات ہوئی، کچھ تو بتا،

تیرے ہونٹوں سے تو اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی۔۔۔۔۔''

میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ میرے پیکر میں

اک تپش ایسی بھی ہے، جس کے سبب،

رُوح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے،

---

❶ لوحِ دل (کلیاتِ مجید امجد)، ص ۲۹۵

❷ مجید امجد نے یہ نظم ۲۵ ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو لکھی تھی یعنی جب وہ اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر چکے تھے (بحوالہ لوحِ دل، ۲۹۸)

سانس کے بل میں پہنچنے کی سکت بچی ہے،
ٹوٹتی کڑیوں میں، جینے کے جتن جڑتے ہیں

(پچاسویں پت جھڑ) ❶

مجید امجد کو مظاہر فطرت کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے۔ مظاہر فطرت میں انھوں نے ایسے حسین نظاروں کی مرقع کاری نہیں کی جو ہر اک کا دل موہ لیتے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ کھیت، کھلیان، رہٹ، فصلیں، ندی، نالے، راجباہے، نہریں اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں ان کی شاعری کا محور ہیں اور درخت تو خاص طور پر انھیں بہت عزیز ہیں' جنھیں انھوں نے تمثالاً اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا ہے بلکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"اس کے ہاں ہرے بھرے شجر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے شجر کو نہ صرف اس کے ہر رنگ و روپ میں دیکھا ہے بلکہ زاویہ نگاہ کو بدل بدل کر بھی اس کا نظارہ کیا ہے۔ مجید امجد کے لیے شجر بیک وقت ایک دوست، محبوب، دست گیر، سخی اور بھکاری ہے اور آخر میں تو محسوس ہوتا ہے جیسے خود مجید امجد بھی کسی تر و تازہ پیڑ ہی کا ایک رُوپ ہے۔۔۔۔ ایسا پیڑ جس نے زمین کو اپنے کلاوے میں جکڑ رکھا ہے مگر جس کا چھتنار سر اُٹھائے آسمان سے محوِ گفتگو ہے۔" ❷

مجید امجد کا شجر سے یہ تعلق ان کی نظموں سوکھا تنہا پتا، دُور کے پیڑ، ایک کوہستانی سفر کے دوران میں، شاخِ چنار، توسیعِ شہر، صبح کے اُجالے میں، یہ سر سبز پیڑوں کے سائے سے بخوبی ظاہر ہے۔ "توسیعِ شہر" ان کی مختصر نظم ہے، اس نظم میں یہ تعلق گہری کسک کے ساتھ اُجاگر ہوا ہے۔ یہ نظم ایک لحاظ سے درختوں کا نوحہ ہے۔ شاعر نے اپنے تاثر کے اظہار کے لیے مرثیہ کی روایتی صنف، مسدس کا انتخاب کیا ہے۔ شاعر جب گاتی نہر کے متصل جھومتے کھیتوں کی سرحد پر ہرے بھرے درختوں کی ایک پوری قطار کو قاتل تیشوں کی زد میں دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جگہ ایک مقتل بن گئی ہے، جہاں اس

---

❶ لوحِ دل (کلیات مجید امجد)، ص ۲۹۷

❷ مجید امجد کی شاعری میں شجر (مقالہ)، وزیر آغا، ماہنامہ "اوراق" لاہور، بابت نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۱

کے دوست اور ہمراز قتل ہو رہے ہیں اور وہ خیال کرتا ہے کہ اپنے سنگی ساتھیوں کے بغیر تنہا جی کر کیا کرے گا۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ ان درختوں کے ساتھ اولادِ آدم اس کو بھی کاٹ دے۔

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے، چھتنار
بیس ہزار میں بِک گئے سارے، ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

(توسیعِ شہر) ❶

مجید امجد نے شجر کو نہ صرف محسوساتی سطح پر اپنے آپ سے ہم آہنگ کر لیا ہے بلکہ شجر کی تمام تر خصوصیات کو مقدور بھر اپنی زندگی میں سمو لیا ہے۔ جس طرح درخت خود تو دھوپ میں جلتا ہے مگر تھکے ماندے مسافروں کو ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے۔ درخت کے دل پر آرے چلتے ہیں مگر وہ لوگوں کے لیے سایہ اور پھل مہیا کرتا ہے اور اپنے تن من سے خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف رہتا ہے اور اپنی فیض رسانی سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ مجید امجد نے درخت کی اسی بے مثال قربانی کے جذبے کو بڑے دلکش اور اچھوتے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے یہاں درخت کی حیثیت اس بے لوث دستگیر کی سی ہے

---

❶ لوحِ دل، (کلیاتِ مجید امجد)، ص ۲۳۶

زمانے کے گرم وسرد اور جور وظلم برداشت کرتا ہے مگر اس قدر فیاض ہے کہ ہر حال میں لوگوں کی دستگیری کرتا ہے۔ ان کی یہ مختصر نظم ملاحظہ کیجیے:

تنگ پگڈنڈی سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے دونوں سمت گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ، اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سیکڑوں گرتے ہوؤں کی دست گیری کا امیں
آہ۔۔۔ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اِک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں!!

(ایک کوہستانی سفر کے دوران میں) ❶

غرض مجید امجد اپنے گرد وپیش کے مناظر سے شاعرانہ تخیل کی ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔ موضوعاتی تنوع، نئی نئی جہتوں کی نشان دہی اور زبان واسلوب کے بندھے ٹکے اصولوں کے بجائے نئے پہلوؤں کی تلاش، دبستانِ لاہور کی یہ خصوصیات مجید امجد کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور ہم انھیں اس دبستان کا اہم شاعر سمجھتے ہیں۔

✪ ✪

یوسف ظفر (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۲ء)

شیخ محمد یوسف نام، ظفر تخلص، یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو پاکستان کے معروف صحت افزا مقام مری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، شیخ غلام رسول کا شمار علاقے کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ وہ شعر وسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یوسف ظفر کو شاعری

❶ لوحِ دل (کلیاتِ مجید امجد)، ص ۹۴

ورثے میں ملی تھی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت راولپنڈی میں ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں جبکہ آپ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے، آپ کے والد صاحب فراش ہو گئے اور ایسے ہوئے کہ دو سال کی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ آپ کی ہمشیرہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکی اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان سانحوں سے یوسف ظفر کا دل بجھ گیا اور وہ بے یار و مددگار رہ گئے۔

۱۹۳۶ء میں کسی نہ کسی طرح بی اے کرنے کے بعد آپ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں دہلی پہنچے لیکن ناکام رہے اور مجبوری میں دیواروں پر اشتہار چپکانے کی ادنیٰ مزدوری تک کی۔ حسنِ اتفاق سے انھی دنوں آپ کی ملاقات جوش ملیح آبادی سے ہوگئی جنھوں نے آپ کو اپنے رسالے "کلیم" کی ذمہ داری سونپ دی۔ لیکن چند ماہ بعد ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر آپ لاہور چلے آئے اور ۱۹۳۸ء میں محکمہ انہار میں بطور کلرک ملازم ہو گئے جہاں آپ پانچ سال تک خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۳ء میں یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور "ہمایوں" کی ادارت میں میاں بشیر احمد کے معاون ہو گئے لیکن کئی سال تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھانے کے بعد "ہمایوں" سے بھی علیحدہ ہو گئے اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے منسلک ہو گئے۔ جہاں آپ دم آخر تک رہے۔ ۷ر مارچ ۱۹۷۲ء کو انتقال کیا۔

یوسف ظفر نے اگرچہ ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی مگر زمانے کی گردش سے انھیں زندگی کی تلخیوں کا احساس بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ابتدائی عمر میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب آپ راولپنڈی کے گلی کوچوں میں رسالے اور کتابیں فروخت کر کے گھر کی کفالت میں معاونت کرتے رہے۔ اس کے بعد ریڈیو میں ملازم ہونے تک بھی بڑے نشیب و فراز سے گزرے لیکن بہر حال صابر و شاکر رہے۔ زندگی کے ناخوشگوار واقعات اور تلخ تجربات نے آپ کے احساسات میں شدت پیدا کر دی۔ یہی احساسات و جذبات آپ کی شاعری پر محیط ہیں جیسا کہ "زہر خند" کے دیباچے میں آپ خود بھی لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ اِن منتشر اجزاء کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک ہجوم ہے جس میں قہقہوں کے ساتھ ماتم کی صدائیں بھی بلند ہو رہی ہیں۔ مسکراہٹیں آنسوؤں میں

لتھڑی ہوئی ہیں، مسرتیں چیخوں سے ہمکنار ہیں۔ کسی کو کسی کا غم نہیں، ہر کوئی اپنی سی کیے جا رہا ہے۔ میں نے زندگی میں یہی کچھ پایا ہے اور زندگی کے اس آئینے میں اسی کا عکس پیش کر رہا ہوں۔" ❶

یوسف ظفر نے غزل بھی کہی ہے لیکن آپ کی فکر وفن کا اصل میدان نظم ہے۔ لاہور کے دورانِ قیام میں میراجی اور احسان دانش سے ان کے دوستانہ مراسم پیدا ہوئے اور نظم میں ان کے اثرات بھی قبول کیے۔ لیکن آپ کی نظموں میں تقلید کے بجائے انفرادیت ہے۔ ابتدا میں مناظرِ فطرت کے موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے لیکن تلخیٔ ایام نے تخیل کو تحریک دی تو جذبات کی ترجمانی اور حقیقت نگاری کا رنگ اُبھرتا چلا گیا۔ اسی بنا پر آپ کی بیشتر نظموں میں شدت احساس، خلوصِ اظہار اور تفکر کا رنگ غالب ہے۔ آپ نے پابند نظمیں بھی کہی ہیں، نظمِ معریٰ کی ہیئت کو بھی اپنایا اور جدید رجحانات کی نمائندگی میں نئی ہیئتوں کے تجربات بھی کیے ہیں لیکن لب ولہجہ کی تلخی ہر کہیں موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

دل کی دھڑکن سے عبارت ہیں امیدیں اے دوست!
ہر ستارے کو تمنائے بقا ہوتی ہے
آرزو بن کے سمندر کی اُبھرتے ہیں حباب
شب کے پہلو سے سحر جلوہ نما ہوتی ہے
کارواں چلتے ہیں منزل کا سہارا لے کر
اور منزل کی کشش راہنما ہوتی ہے
قطرے قطرے میں ہے طوفانِ تمنا بے تاب
موج قلزم کے لیے آبلہ پا ہوتی ہے
ذرے ذرے سے جھلکتی ہے بیاباں کی طلب
پھول کے لب پہ گلستان کی دعا ہوتی ہے

---

❶ دیباچہ زہر خند (مجموعہ کلام) یوسف ظفر، مکتبہ اردو لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۱۱

مضطرب ہے مرے دل میں بھی تو ارمان کوئی

جی رہا ہوں تو بھلا تم پہ ہے احسان کوئی

(سامانِ تسکین) ❶

چنے میں نے موجوں سے موتی، جواہر سے جیوتی، بہاروں کے راگ

لیے میں نے پھولوں سے خوشبو کے توشے

الٹ کر نگاہوں سے راہوں کے گوشے

جلائیں، بڑھائیں، لیے ساتھ ساون کی پُروا، چناروں کی آگ،

بہاروں کے راگ

نہ کام آئے دریا کے موتی، جواہر کے جیوتی، نہ خوشبو، نہ راگ

مقدر میں پیہم، نجوم شب غم

مسرت کا ماتم، مصیبت کا عالم

وہ سارے خزینے، خزاؤں نے چھینے کہ سینے میں ہے اب چناروں کی آگ،

نہ خوشبو، نہ راگ

(کھلونے) ❷

○○

---

❶ زہر خند، ص ۱۱۹، ۱۲۰

❷ صدا بصحرا (مجموعہ کلام) یوسف ظفر، بگلڈ پبلشنگ لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۵۹

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۔۔۔۲۰۰۶ء)

اصل نام احمد شاہ ہے، ندیم تخلص کرتے ہیں، قاسمی خاندانی نسبت ہے۔ اس اعتبار سے احمد ندیم قاسمی ادبی نام اختیار کیا۔ وادی سکیسر ضلع خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان تجر علمی اور سلسلہ پیری مریدی کی بنا پر زمانہ دراز سے معروف رہا ہے۔ آپ کے والد، پیر غلام نبی اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے۔

ندیم کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے سکول میں ہوئی لیکن ۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے حقیقی چچا پیر حیدر شاہ نے اپنے ذمے لے لی۔ چونکہ چچا سرکاری ملازمت میں تھے جس میں اکثر تبادلے ہوتے رہتے تھے، اس لیے آپ بھی ہر جگہ ساتھ ہوتے۔ پیر حیدر شاہ عربی و فارسی کے عالم تھے اور شعر و سخن کا بھی بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے ندیم کو جدید تعلیم کے علاوہ عربی و فارسی زبان و ادب اور شعر و سخن کے رموز سے بھی آگاہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ ایجرٹن کالج، بہاولپور میں داخل ہوئے جہاں آپ کے چچا مشیرِ مال تھے۔ ۱۹۳۴ء میں آپ بی۔اے میں پڑھتے تھے کہ ناگہانی طور پر شفیق چچا کا انتقال ہو گیا۔ یہ زمانہ آپ کے لیے بڑے کرب کا تھا۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود ۱۹۳۵ء میں بی۔اے پاس کیا۔ پھر کئی سال تلاشِ معاش میں سرگرداں رہنے کے بعد محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر ہو گئے، لیکن یہ ملازمت ان کے مزاج کے خلاف تھی، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر لاہور آ گئے، اور دارالاشاعت پنجاب لاہور میں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے ''ادب لطیف'' کی ادارت سنبھالی۔ اس اثنا میں ادب لطیف میں ایک مضمون کی اشاعت کے باعث آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ مقدمے کے دوران میں آپ بیمار ہو گئے۔ آخر مقدمے سے بری ہوئے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں علالت کے پیشِ نظر آپ ادب لطیف کی ادارت سے دست بردار ہو گئے۔ تقسیم کے بعد کچھ عرصہ پشاور ریڈیو میں سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم رہے۔ پھر لاہور آ گئے۔ پہلے ''سویرا'' اور پھر ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت شروع کی لیکن جب یہ رسالہ سیفٹی ایکٹ کی وجہ سے بند ہو گیا تو ۵ر مارچ ۱۹۵۳ء سے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔۔۔۔۔ اور ۱۹۵۹ء تک یہ سلسلہ چلتا

رہا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء سے "فنون" کا اجراء کیا۔ ایک عرصہ تک مجلسِ ترقی ادب کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

ندیم کی شاعری کا آغاز سکول کے زمانے سے ہوا، بچپن ہی سے وہ سنجیدہ طبیعت کے حامل تھے اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ "سخنور" کی مصنفہ لکھتی ہیں کہ:

"یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا محمد علی (جوہر) کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس موقع پر ایک نظم کہی جو لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" میں پہلے صفحہ پر شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ نظم دیکھ کر چچا نے بتایا کہ یہ عروض اور فن کے نقائص سے پاک ہے۔ اس نظم کے سلسلہ میں ان کے چچا کو متعدد تعریفی خطوط بھی موصول ہوئے"۔ [1]

ندیم کو شعر گوئی کا ملکہ فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، انھوں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ اپنی اسی فطری ذکاوت احساس کے باعث اپنے ماحول سے جو تاثرات قبول کیے انھیں بلاکم و کاست شعر کا جامہ پہنا دیا۔ ندیم ان شعراء میں سے ہیں جو اپنے سامنے ایک مستقل مقصدِ حیات رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد زندگی کے حقائق پر ہے۔ وہ انسانی عظمت، طبقاتی ناہمواری اور سامراجی تشدد کے خلاف جذبات کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ "دشتِ وفا" کے تکملہ (اختتامیہ) میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"ندیم کی شاعری کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اسے زندگی کے حقائق سے گہرا تعلق ہے۔ وہ کسی بھی دائرے میں کسی بھی مقام پر ان حقائق کو نہیں بھولتا، ان سے چشم پوشی نہیں کرتا، ان سے پہلو بچا کر نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ پورے ماحول کو مثالی تصور کے مطابق آراستہ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری میں ایسی زندہ تڑپ پائی جاتی ہے، جو دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر روحِ عمل میں ہنگامہ پیدا کر دیتی

---

[1] سخنور (تذکرہ شعرائے پاکستان) سلطانہ مہر، ص ۳۵۹

ہے۔" ❶

ندیم نے صرف انسان اور انسانیت سے محبت کا پیمان استوار کیا ہے۔

محبت میری فطرت، آدمیت میرا سرمایہ ❷

وہ کسی خاص رنگ ونسل یا ملک وملت کے انسانوں کی اقدار کا نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت کے تقاضوں کو زندگی کا اہم ترین فرض سمجھتے تھے۔"شعلۂ گل" میں ان کی اکثر نظموں کا موضوع یہی ہے جہاں وہ کبھی براہ راست اور کبھی علامتوں اور ترکیبوں کا سہارا لے کر تیز وتند بات کرتے ہیں اور "دشتِ وفا" کی نظموں کی صورت بھی یہی ہے۔فراق گورکھپوری ندیم کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ان کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بڑھ کر اہم چیز، زندگی کی شکستیں گہرے اور پُر خلوص سوچ کے عناصر سب مل کر حل ہو گئے ہیں، ۔۔۔۔۔ پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو۔ندیم کے اشعار کے پیچھے لمبے اور گہرے سوچ کا بہت بڑا پس منظر ہوتا ہے۔یہی سوچ ان کے کلام میں وہ چوٹیلا پن اور کاٹ پیدا کر دیتا ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔" ❸

فرق صرف اتنا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی آواز زیادہ گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ندیم اگرچہ سیاسی افکار و حقائق کی بات بھی کرتے ہیں، دہقانی اور انقلاب کا قصہ بھی چھیڑتے ہیں، تاریخ وتہذیب کے حقائق بھی بیان کرتے ہیں مگر ہر جگہ انسانیت کے احترام اور انسان دوستی کا جذبہ ان کے پیشِ نگاہ ہے۔پھر نظموں کی ہی نہیں ان کی غزلوں اور قطعات کی کیفیت بھی یہی ہے۔شعلۂ گل کی

---

❶ دشتِ وفا، احمد ندیم قاسمی، التحریر، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۸۰

❷ شعلۂ گل، احمد ندیم قاسمی، التحریر، اردو بازار، لاہور ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۷

❸ اجالا (دیباچہ) دشتِ وفا، احمد ندیم قاسمی، ص ۱۷

ایک نظم اور ایک غزل سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

مرے پیشِ نظر رعنائی و امن و جوانی ہے
مرے مدِ نظر انساں کا حسنِ جاودانی ہے
مشینوں کا دھواں اُجرت نہیں ہے جاں سپاری کی
مرصع گالیاں قیمت نہیں خدمت گزاری کی
مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے
مجھے ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرنا ہے
مجھے بچوں کے چہروں میں گلابی رنگ بھرنا ہے
محبت چاہیے مجھ کو، صباحت چاہیے مجھ کو
بغاوت ہے اگر یہ، تو بغاوت چاہیے مجھ کو
یہی میرا ادب ہے، اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے

(ادب وسیاست) ❶

○○

میں کب سے گوش بر آواز ہوں، پکارو بھی
زمیں پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی
مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی
سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

شعلۂ گل، احمد ندیم قاسمی، ص ۱۱۸

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی
مری تلاش کی معراج ہو تمھی لیکن
نقاب اٹھاؤ، نشانِ سفر ابھارو بھی
یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم! تم اس بوجھ کو سہارو بھی ❶

اور یہ قطعہ بھی ملاحظہ کیجیے:

اتنی نیچی وادیاں اور اتنی اونچی چوٹیاں
اس بلندی اور پستی سے ہے کیا مقصد ترا
مضحکہ انگیز ہے یہ امتیازِ خوب و زشت
کیا یہ دھوکا ہے میری نظروں کا اے میرے خدا!
(فریبِ نظر) ❷

ندیم کی ولادت اور پرورش ایک گاؤں میں ہوئی۔ فطرت کا اصول ہے کہ انسان جو تاثرات کم عمری کے زمانے میں قبول کرتا ہے ان کے نقوش انمٹ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ندیم کی شاعری میں دیہات کی زندگی کے بڑے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ وہ جہاں دیہات میں فطرت کے دلآویز نظاروں اور حسن و دلربائی کے اسباب کی فراوانیوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں اہلِ دیہہ کی حالتِ زار سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ ایک حساس دل رکھتے اور اکثر اوقات دیہی آبادی کے حالات پر حد درجہ مغموم اور دردمند رہتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے، وہ کس شدتِ غم سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس، مگر
میں نے فردوس میں اُجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

---

❶ شعلۂ گل، احمد ندیم قاسمی، ص ۱۸۹

❷ دھڑکنیں (مجموعہ قطعات)، احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۵۰

جن کو تو رستم و سہراب کہا کرتا ہے،

وہ جواں مَیں نے یہاں خاک بہ سر دیکھے ہیں

مَیں نے گھوروں پہ پڑے دیکھے ہیں رخشندہ نجوم

میں نے لتھڑے ہوئے کیچڑ میں قمر دیکھے ہیں

میں نے پھولوں کو عفونت میں گھرا دیکھا ہے

میں نے جلتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھے ہیں

سبز کھیتوں میں مجھے زہر نظر آیا ہے

زرد خوشوں کی رداؤں میں شرر دیکھے ہیں

میں نے جو دیکھا ہے، اے کاش! وہ تو بھی دیکھے

دل کی دھڑکن بھی سنے دل کا لہو بھی دیکھے

(میرے افسانے) ❶

ندیم کی شاعری فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اسلوب سیدھا سادا، رواں اور سلیس ہے۔ انھیں الفاظ کے استعمال کرنے اور بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس سلیقے نے ان کی شاعری کو اثر بخشا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"۱۹۳۵ء کے بعد کی شاعری میں نظم کو آگے بڑھانے اور غزل میں نئے زمانے کی رُوح سے آشنا کرنے کا کام کئی شاعروں نے کیا ہے مگر ندیم کی آواز اور ندیم کا فن منفرد ہے۔" ❷

مولانا عبدالمجید سالک بھی "شعلۂ گل" کے دیباچے (تعارف) میں لکھتے ہیں:

"ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں۔ وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف وغیرہ کے معاملے میں بھی صرف اسی

---

❶ جلال و جمال، احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ التحریر لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۱

❷ "احمد ندیم قاسمی ۔۔۔۔۔۔ وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے: (مقالہ) ڈاکٹر سید عبداللہ مخزن حصہ اول، ص ۲۰۱

قدر تجاوز یا انحراف کا روادار ہے، جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے۔ وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے محلِ استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ انھیں انکار و اعتراض کی جرأت نہیں ہوتی۔" ❶

○ ○

مختار صدیقی (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۲ء)

مختار الحق صدیقی نام، مختار تخلص، یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو اپنے آبائی وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سیالکوٹ سے سکونت ترک کر کے مستقل طور پر گوجرانوالہ آ گئے تھے۔ مختار نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کا سلسلہ نا مساعد حالات کی بنا پر منقطع ہو گیا۔ بی اے کرنے کے بعد ابتدائی چند سال خود اختیارانہ بے کاری کی نذر ہوئے پھر پہلے کلرکی کی اور بعد میں ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

مختار کی شاعری روایت پسندی اور جدید رویوں کا حسین امتزاج ہے۔ شاعری کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوا۔ سیماب اکبر آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ آپ نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر نظم غزل اور سی حرفی ❷ کی اصناف میں خوب جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سیماب اکبر آبادی کے علاوہ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، تصدیق حسین خالد، ن م راشد اور میراجی سے بھی متاثر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کی پابند نظموں اور غزلوں میں سیماب کی زبان دانی، حفیظ کا ترنم، اختر کی رومانویت اور معرّیٰ نظموں میں خالد، راشد

---

❶ شعلۂ گل، احمد ندیم قاسمی، ص ۱۴

❷ سی حرفی، پنجابی شاعری کی مشہور صنف ہے۔ اس صنف میں یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ ابجد کے ہر حرف سے شروع کر کے چار مصرعوں کا ایک ایک قطعہ لکھا جاتا ہے جس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ مشاہدۂ کائنات کی کوئی کیفیت، زندگی کا کوئی تجربہ یا کسی بھی جذبے کا کوئی پہلو، ان قطعات کے چار مصرعوں میں بخوبی آ سکتا ہے۔ آخری قطعے میں شاعر اس رعایت سے آتا ہے جس سے محض ملکیتِ شعری ثابت نہ ہو بلکہ شاعر خود سے مخاطب ہو کر کسی بات کو بطور خاص واضح کرتا ہے۔ مثلاً پہلا بند "الف۔ اللہ" سے شروع ہوگا تو آخری بند "یٰ۔ یثرب" پر ختم ہوگا۔ پنجابی ادب میں اس کی مشہور مثال سلطان باہو کی سی حرفیاں ہیں۔

اور میراجی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی شاعری کا اپنا رنگ اور آہنگ ہے۔

مختار کی نظموں کی ایک نمایاں خاصیت خیال و اسلوب کی جدّت ہے یعنی وہ ہر بات کو نئے انداز اور نئے تیور سے پیش کرتے ہیں جبکہ دوسری خاصیت ان کا ہندی لب ولہجہ، ہندی کے رسیلے اور مترنم الفاظ کا استعمال اور موسیقیت ہے، جس سے ان کے کلام میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''رسوائی'' کے دو بند ملاحظہ کیجیے جس میں وہ اپنی تمام شعری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہیں:

ٹیکا لگاؤں، مانگ بھی، صندل سے بھر چکوں
دلہن بنوں تو چاہیے جوڑا سہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی اور لہر
افشاں ہے بخت بھی کہ رہا ان کے پھیر میں
کہتی ہے سانجھ بھور کے اب گھاٹ اُتر چکوں
تم بیٹھو میں تو آئی پہ جی سے گزر چکوں

✿ ✿

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے خدائی کی
پائل بجے، تو ہنسی کی دھن ناچ ناچ اُٹھے
بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں
دیدے گھما گھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں
ان کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں
چنتا نہ ہوگی کل سے لگائی بجھائی کی
دیکھے شفق، تو دیکھے چِتا جگ ہنسائی کی [1]

---

[1] منزل شب، مختار صدیقی، مطبوعہ نیا ادارہ لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۴۳

غزل میں مختار کو میر کا رنگ بہت محبوب ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیشتر غزلیں نہ صرف میر کی بحروں میں کہی ہیں بلکہ لب ولہجہ، اسلوب کی سادگی اور سوز و گداز کا رنگ بھی وہی ہے۔ اس طرح ہمارے شعری سرمایے میں رنگِ میر کی کامیاب عکاسی بلکہ احیا اسی شاعر کی بدولت ہوا۔ ان کی غزلوں کے یہ اشعار دیکھیے:

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کون سی سستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

چھوڑو بے صرفہ ہیں ساون بھادوں
دیکھو ہر آنکھ برستی ہے یہاں

اب تو ہر اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ہی پستی ہے یہاں (1)

✿✿

نورِ سحر کہاں ہے، اگر شامِ غم گئی
کب التفات تھا، کہ جو خُوئے ستم گئی

کیا لوگ تھے کہ جو غمِ جاناں میں مر مٹے
اے روزگار، کیوں تری گردش نہ تھم گئی (2)

✿✿

اِک عمر سے اس لیے ہیں بے چین
کیا چیز ہو کس طرح ملے چین

---

(1) منزلِ شب، مختار صدیقی، ص ۳۲
(2) ایضاً، ص ۴۰

اس پھیر سے کون بچ سکا ہے
بے چین ہیں سب کہ مل بجھے چین

کچھ دیر کو جی بہل گیا تھا
ورنہ تیرا درد اور دے چین

کب تک دمِ واپسیں کی یہ قید
مختار ہے اب بھی دے نہ دے چین ❶

مختار کو سی حرفی کی صنف بھی بہت پسند ہے لیکن انھوں نے پنجابی شاعری کے برعکس ایک حرف کے تابع ایک موضوع پر مربوط اور مسلسل ایک سے زیادہ قطعات کہے ہیں اس کی مثال "د۔دل" کے یہ قطعات ہیں:

دل دریا، صحرائے عدم بھی، تم سا ہو جو خدائے دل
دل داتا، کشکول گدا بھی، مانگے بھیک نہ پائے دل
دل پیارا، بیگانہ دل بھی، جل کر گھر کو جلائے دل
دل پیاسا، سیراب ازل بھی، دل سے جب مل جائے دل
دل اندھیارا، طور طریقت، ایمنِ صدق و صفا ہے دل
دل بیچارا، قادر مطلق، دل زدگان کا خدا ہے دل
دل انگارا، خاک فسردہ، ایسا جل کے بجھا ہے دل
دل صد پارہ، تم بے حس، اب کون سے دکھ کی دوا ہے دل
دل ویرانہ، گردِ خرد، زندانیِ صبح و شام بھی دل
دل میخانہ، ریزۂ مینا، ایسا شکست انجام بھی دل
دل پروانہ، شعلۂ کشتہ، تیری چاہ کا نام بھی دل
دل کا ظہور، وہ برق تجلی، جس نے دل کو بنایا دل

---

❶ منزلِ شب، مختار صدیقی، ص ۶۰

دل کا حضور، وہ ربطِ باہم، جس نے دل سے ملایا دل
دل کا شعور، وہ نگہِ تغافل، جس نے یاد دلایا دل
دل کا سرور، وہ دکھتی گھڑیاں، رو روشن میں گھلایا دل ❶

غرض مختار کا شعری سرمایہ مختصر مگر اپنے معاصرین سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں اردو شاعری کی روایت کے باوصف نغمہ وخیال کی بنا پر ایک انفرادیت ہے۔ وہ ڈوب کر بات کہتے ہیں اور شعر کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔

✿✿

آغا شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۵ء)

عبدالکریم نام، شورش تخلص، آغا دوستوں کی عطا اور چونکہ ان کے اجداد، جن کا سلسلہ نسب برہمنوں کی گوت ''ڈار'' سے ملتا تھا، کسی زمانے میں کشمیر سے نقل مکانی کر کے امرتسر میں آبسے تھے، جہاں سے ان کے دادا امیر بخش لاہور چلے آئے تھے تو اس نسبت سے کاشمیری کہلاتے تھے۔ عبدالکریم ۱۴راگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ❷ میٹرک تک باقاعدہ تعلیم پائی مگر مزاج میں آزادہ روی کی بنا پر مزید تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے تاہم ابتدائی عمر ہی سے ادبی کتب ورسائل کا شوق جنون کی حد تک تھا جس نے روایتی تعلیم کی کمی پوری کردی۔ یہ جنوں انھیں دم آخر تک رہا۔

شاید یہ مولانا ظفر علی خاں کے تہلکہ خیز روزنامے ''زمیندار'' کے باقاعدہ مطالعے کا اثر تھا یا اس زمانے میں برصغیر کے طول وعرض بالخصوص پنجاب کے مرکز لاہور میں سیاسی سرگرمیوں کا، کہ شورش بہت کم عمری میں ہی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ انھوں نے اپنی سب سے پہلی تقریر جولائی ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے ہنگاموں کے دنوں میں شاہی مسجد لاہور میں کی، جس کی پاداش میں انھیں قید اور جرمانے کی سزا ہوئی۔ ❸ اور پھر تو سیاست میں اتنے بے باک ہوئے کہ ۱۹۴۳ء تک جبکہ ان کی عمر

---

❶ سی حرفی، مختار صدیقی، مکتبہ طبع زاد کراچی (س ن)، ص ۹۲ تا ۹۴

❷ تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد سوم، ص ۲۸۸

❸ تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد سوم، ص ۲۸۸

صرف ۲۷ سال کی تھی، وہ اس کا تیسرا حصہ یعنی ۹ سال جیلوں میں بسر کر چکے تھے۔ (1) فروری ۱۹۳۹ء میں آپ مجلسِ احرار میں شامل ہو گئے اور یہ تعلق تقسیم ملک تک رہا۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اس ضمن میں اپنا ہفتہ وار ''چٹان'' جاری کیا جو ایک عرصہ تک ادبی حلقوں سے داد و تحسین وصول کرتا رہا اور آج تک کسی نہ کسی طرح جاری ہے۔

مسلسل قید و بند اور نظر بندی کی زندگی نے شورش کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے، چنانچہ طویل بیماری کے بعد ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو انتقال کر گئے اور میانی صاحب میں سپرد خاک ہوئے۔

شورش کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابھی پرائمری ہی میں تھے کہ سکول کے بعد احسان دانش سے، جو کاندھلے سے ترک سکونت کر کے مستقل طور پر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، نجی طور پر پڑھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں احسان دانش کی شاعری نے انھیں بہت متاثر کیا۔ شورش نے شعر کہنے کی ابتدا غزل سے کی۔ ابتدا میں آپ ''الفت'' تخلص کرتے تھے اور احسان دانش ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ شورش کا تخلص بھی انھیں احسان دانش ہی نے دیا۔ (2) اس کے بعد کچھ عرصہ اختر شیرانی، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے بھی مشورہ سخن کرتے رہے لیکن باقاعدہ اصلاح کا سلسلہ مولانا ظفر علی خاں سے استوار رہا۔ ان کی شاعری میں مولانا ظفر علی خاں کا رنگ ہی سب سے زیادہ نمایاں بھی ہے۔

شورش نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن حقیقتاً وہ نظم کے شاعر ہیں اور سیاست و صحافت میں ہونے کی بنا پر ان کے یہاں ہنگامی موضوعات کی شاعری زیادہ ہے۔ بقول مصنف ''تذکرہ معاصرین'':

''موضوعاتی ہنگامی شاعری میں ظفر علی خاں کو جو یدِ طولی حاصل تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شورش اس میدان میں ان کے قدم بقدم چلے اور اس میں ایسی حیرت ناک کامیابی حاصل کی

---

(1) تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد سوم، ص ۲۸۸

(2) تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد سوم، ص ۲۹۲

کہ خود مولانا ظفر علی خاں کو یہ سند دینا پڑی:

شورش سے مرا رشتہ ہے، اور وہ ازلی ہے
میں وقت کا رستم ہوں، تو وہ ثانیِ سہراب" ❶

شورش نے بھی مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ اپنی ذہنی مطابقت کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اپنے پہلے مجموعہ کلام گفتنی و ناگفتنی کے ابتدا میں ناگفتنی کے زیر عنوان دیباچے میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ شعری ذوق کی پختگی اور فن کی نکتہ شناسی اصلاً انھی کا فیضانِ صحبت ہے۔ اس بات میں میرا اُن سے ذہنی تلمذ رہا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور اس کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اس مجموعہ کی زیادہ تر نظموں میں انھی کے پیرایۂ اظہار کی رُوح بولتی ہے۔ چراغ حسن حسرت مجھے ان کا تتبع کہا کرتے۔ ہو سکتا ہے ان کی رائے میں مروّت ہو بہرحال میرے لیے یہ وجہ شرف ہے کہ میں نے ان کی خوشہ چینی کو اپنے لیے سعادت سمجھا۔" ❷

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شورش ایک نظم گو شاعر ہیں لیکن ان میں ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے خوب واقف ہیں اور نظم میں بھی غزل کے شعر کہہ جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اکثر نظمیں ہنگامی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کی نظموں سے دو اقتباس ملاحظہ کیجیے:

لہو کی آب ہے جمہور کے پسینوں میں
قضا کا رنگ ہے ہستی کے آبگینوں میں
شریک ہو گئے حلقہ بگوش میرِ اُمم
نظامِ زر کی سیاست کے خوشہ چینوں میں
حذر، حذر کہ ابھی تک مفاد کے بُت ہیں
خدا فروش فقیہوں کی آستینوں میں

---

❶ تذکرہ معاصرین، مالک رام، جلد سوم، ص ۲۹۱
❷ گفتنی و ناگفتنی، شورش کاشمیری، مطبوعات چٹان، لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۳۵

خدا کے خوف سے پرہیز اک قرینہ ہے
جنانِ حاضر و موجود کے قرینوں میں
نوید دی ہے مجھ کو ہلالِ مشرق نے
"اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں"

(ہلالِ مشرق) ❶

✿✿

آج سے دو سو برس پہلے جو شالامار تھا
چشمِ شاعر کے لیے اک مطلعِ انوار تھا
تختۂ اوّل کے پیڑوں کی گھنیری چھاؤں میں
نازنینانِ شہی کا حُسن نکہت بار تھا
تختۂ ثانی کی رنگا رنگ آرائش کے ساتھ
تختۂ ثالث کا ہر ذرہ دُرِ شہوار تھا
مخملیں سبزے سے لے کر چاندنی کے فرش تک
ہر طرف پھیلا ہوا افسونِ بے زنہار تھا
لیکن اب تاریخ کا سینہ سراسر داغ ہے
بادشاہوں کا گلستاں، منچلوں کا باغ ہے

(شالامار) ❷

✿✿

سید ضمیر جعفری (۱۹۱۸ء۔۱۹۹۹ء)

ضلع جہلم میں چک عبدالخالق نامی سادات کی ایک پرانی بستی ہے۔ سید ضمیر جعفری اس بستی میں یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام سید ضمیر حسین شاہ ہے۔ لیکن آپ ضمیر جعفری کے نام سے معروف ہیں۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا اور عمر کا بیشتر حصہ فوجی ملازمت میں

---

❶ گفتنی و ناگفتنی، شورش کاشمیری، ص ۱۲۸

❷ گفتنی و ناگفتنی، شورش کاشمیری، ص ۲۱۱

گزارا۔ ایک عرصہ ''ادارہ ترقی دارالحکومت'' اسلام آباد میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے عہدے پر بھی کام کیا۔ مگر جہاں بھی رہے شعروشاعری کے ساتھ رشتہ استوار رکھا۔ ۱۲ رمئی ۱۹۹۹ء کو وفات پائی۔

سید ضمیر جعفری نے بقول خود:

''چھٹی جماعت سے ہی تک بندی شروع کردی تھی۔'' ❶

کچھ عرصہ تو گھر والوں کو ان کی شاعری کی خبر نہ ہوئی لیکن جب معلوم ہوا تو والد نے صرف اتنا کہا کہ:

''شعر کہتے ہو تو نعتِ سرورِ کونینؐ بھی کہا کرو۔'' ❷

چنانچہ آپ نے باپ کی بات گرہ میں باندھ لی اور آخر تک اس پر عمل پیرا رہے۔

سید ضمیر جعفری طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری بھی کرتے تھے۔ سنجیدہ شاعری میں انھیں پابند شاعری کی روش پسند تھی اور ان کی سنجیدہ شاعری کا بنیادی عنصر حب وطن ہے جس میں انھوں نے جگر کاوی سے کام لے کر عمدہ ذوق کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ سنجیدہ شاعری میں ان کا ایک بڑا کام جزائر شرق الہند کی معروف صنفِ شاعری ''پنٹون'' ❸ کے طبع زاد تراجم بھی ہیں۔ مگر ان کی زیادہ تر شہرت طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بدولت ہے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا چرچا اس وقت سے شروع ہوا جب ابھی وہ اسلامیہ کالج لاہور کے طالبعلم تھے اور انھوں نے کالج ہوسٹل (ریواز ہوسٹل) پر

---

❶ سخنور (تذکرہ شعرائے پاکستان)، سلطانہ مہر، ص ۲۳۴

❷ ایضاً، ص ۲۳۴

❸ ''پنٹون'' پنجاب کے ''ماہیا'' اور ''ٹپہ'' سے ملتی جلتی صنف ہے۔ ''ماہیا'' اور ''ٹپہ'' میں تو ڈیڑھ ڈیڑھ مصرعوں کے بول ہوتے ہیں مگر ''پنٹون'' کے رباعی کی مانند چار مصرعے ہوتے ہیں جن میں پہلا چوتھا اور دوسرا تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے دو مصرعوں کا باقی مصرعوں سے کبھی تعلق ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ تاہم اس بے ربطی میں بھی ایک قسم کا ربط ضرور ہوتا ہے۔ وہی ربط جو الاپ اور بول میں ہے یعنی ''پنٹون'' کے بھی پہلے دو مصرعے سامع کے ذہن کو آخری دو مصرعوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے تیار کردیتے ہیں۔ ایک ''پنٹون'' ملاحظہ کیجیے:

"ریواز کی تصویر" کے عنوان سے مزاحیہ نظم لکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے موضوعات کا دامن کشادہ ہوتا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے زیادہ تر سیاسی اور معاشرتی صورتوں کو موضوع بنایا ہے جس میں مضحک صورت حال کی بصیرت اور خالص مزاح کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تلخی نہیں ہے بلکہ تحریف، تضمین اور مختلف انداز سے شوخی اور شگفتگی ان کے مزاح کا اہم عنصر ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے کہی ہوئی نظموں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

معرکہ در پیش ہے ریواز کی تفسیر کا
طالبانِ علم و فن کی بزم خوش تقدیر کا
کھینچ کر نقشہ دکھاتا ہے پلاؤ کھیر کا
کھیر کا کھانا مگر لاتا ہے ہوئے شیر کا
شاعری میں باندھتا ہے دیکھیے کف گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

فرسٹ ائیر والوں کی گھبرائی ہوئی سی ٹولیاں
کم سن ہم جھولوں کی شرمائی ہوئی ہم جھولیاں
میٹھے میٹھے قہقہے یہ پیاری پیاری بولیاں
ان سے کھیلی جا رہی ہیں شوربے کی ہولیاں
ان کے کپڑوں پر گماں گلرگئی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

گذشتہ صفحے کا حاشیہ

پلکوں پہ جو آنسو رہتا ہے، تم سے بس اتنا کہتا
یہ اِک قطرہ اک ساگر ہے اور ساگر بھی طوفانوں کا
اس پانی میں دل پگھلا ہے کتنے جلتے ارمانوں کا
جب سب تیلہ جل چکتا ہے تب جا کر لاوا بہتا ہے

(ماخوذ از سر آغاز "جزیروں کے گیت" چراغ حسن حسرت، مکتبہ کارواں لاہور، سن ندارد، ص ۸)

روز فیشن❶ مطبخوں کا آب و دانہ دیکھیے
جھومتا، گاتا، بپھرتا، جگمگاتا دیکھیے
دانہ دانہ پچن کے، بن کے، دھن کے کھاتا دیکھیے
چل رہا ہے زندگی کا کارخانہ دیکھیے
"سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

خوبصورت اچکنیں، زرکار جوتوں کی بہار
ہر طرف پنجاب کے طرّے قطار اندر قطار
رات کی جاگی ہوئی آنکھوں میں خوابیدہ خمار
پالتو مونچھیں، گھنیری، لہلہاتی، سایہ دار
ہے گماں اک ایک نوکِ مُو پہ نوک تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

(ریواز کی تصویر) ❷

○○

برے پیشِ نظر ہے ایک سستے ریٹ کا سٹما
پرانے شہر کے سب سے پرانے گیٹ کا سٹما
وہ دیکھو اُکھڑا اُکھڑا اناڑی شہسوار آیا
کہ خود اس پر تو رحم آیا مگر گھوڑے پہ پیار آیا
اِدھر تو پردۂ تصویر پر تصویر جاری ہے
اُدھر جملہ صفوں سے نعرۂ تکبیر جاری ہے
اُدھر جب زگسوں اور کرگسوں میں سامنا ہوگا
اِدھر عشاق۔ دل بردست میں محشر بپا ہوگا

---

❶ خاص پکوان کے دن کو فیشن ڈے کہا جاتا تھا۔

❷ مافی الضمیر، سید ضمیر جعفری، فیروز سنز لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۳۰

یہاں جب قلم اکثر، اتفاقاً ٹوٹ جاتی ہے
تو اہلِ ذوق کی نبضِ تحمل چھوٹ جاتی ہے

اکیلے ہاتھ سے دس میں تلواریں چلاتا ہے
جہاں چڑھنا بھی مشکل ہے وہاں سے کود جاتا ہے

اگر مفلس ہے خود تو عشق مالا مال لڑکی سے
وگرنہ ڈھونڈ کر قلاش و خستہ حال لڑکی سے

محبت میں خیال خودکشی پیہم ضروری ہے
کہ مرنا سخت لازم اور جینا کم ضروری ہے

نہ گھبراؤ نہ گھبراؤ اگر یہ مر بھی جائے گا
تو ہیروئن کی شادی پر یقیناً لوٹ آئے گا

وہ دیکھو لب ہلے، گا کر رہے گا جانتے ہیں ہم
ہمارے گھر ہی کا تو مال ہے پہچانتے ہیں ہم

کہانی میں جوانی اس طرح چھلکائی جاتی ہے
کہ چکنائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے

بلیغ الدین در دل، اندرون جان می رقصد
محمد خاں جب رقصد علی الاعلان می رقصد

(مجھے ذوقِ تماشا لے گیا تصویر خانوں میں) ❶

○○

ظہیرؔ کاشمیری (۱۹۱۹ء۔۱۹۹۴ء)

پیرزادہ دستگیر ظہیر، جو ظہیر تخلص کرتے تھے ۲۱ راگست ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے، آپ کے اجداد کا وطن کشمیر تھا اسی نسبت سے کاشمیری کہلائے۔ آپ کے بزرگوں میں حکیم فیروز الدین ظفر ال اچھے شعر فہم اور شعر گو تھے اور حکیم ظہیر الدین بھی جو آپ کے تایا تھے، شاعر تھے اور داغ دہلوی کے

---

❶ ماں الضمیر، سید ضمیر جعفری، ص ۳۵

شاگردوں میں سے تھے۔ یہ گھرانہ فنونِ لطیفہ کا مرکز تھا۔ ظہیر کا بیان ہے کہ:

''مصوری، موسیقی اور شاعری سے شغف رکھنے والے اکثر لوگ ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری، شمس مینائی اکثر ہمارے ہاں قیام کرتے تھے۔'' ❶

اس طرح جب ظہیر نے ہوش سنبھالا تو ان کے گھرانے میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا جس کا ان کی طبع پر اثر ہونا لازمی امر تھا۔ چنانچہ اسی شعری و ادبی ماحول میں آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ظہیر نے کبھی کسی سے اصلاح نہ لی بلکہ طبعِ موزوں ہی آپ کی راہنما رہی۔ خود لکھتے ہیں:

''اسے خودستائی کہہ لیجیے یا بزرگوں کا فیض کہ کسی کے سامنے زانوے تلمذتہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی، بس خود ہی کوشش کرتے رہے۔'' ❷

سکول کی تعلیم کے بعد آپ ایم اے او کالج امرتسر میں داخل ہوئے اور حُسنِ اتفاق سے وہاں بھی آپ کو ایسے اساتذہ سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا جو شعر و ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔ ان اساتذہ میں پروفیسر شیر محمد، پروفیسر محمود الظفر، ڈاکٹر تاثیر اور فیض احمد فیض کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح خاندانی پس منظر اور کالج کے ادبی ماحول نے ظہیر کی تربیت کی۔ ظہیر نے کم سنی سے ہی شعر کہنے کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ:

''میٹرک تک آتے آتے مختلف رسائل و جرائد میں میرا کلام چھپ چکا تھا۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ جب میں فرسٹ ائیر میں تھا تو میں نے امرتسر سے لاہور آ کر پہلا مشاعرہ پڑھا تھا۔'' ❸

یہ وہ زمانہ ہے جب برصغیر میں مختلف انقلابی تحریکوں کا چرچا بڑے شد و مد کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ظہیر ذہنی طور پر برطانوی سامراج کے خلاف تھے چنانچہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی ذات کو اس تحریک کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا کہ یہ رشتہ تادمِ آخر استوار رہا۔ کالج کے

---

❶ ظہیر کاشمیری سے بات چیت، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر طارق عزیز، ماہنامہ شام و سحر، ظہیر کاشمیری نمبر، لاہور بابت مارچ اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۱

❷ تذکرہ شعرائے پاکستان، سلطانہ مہر، ادارہ تحریر کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۵

❸ عظمتِ آدم، ظہیر کاشمیری، نیا ادارہ لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۳۲

زمانے میں ظہیر بڑے فعال تھے اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ کالج یونین کے صدر بھی رہے۔ بی اے کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا تو باغیانہ رجحانات رکھنے کی پاداش میں کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن خیالات میں سر مو فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

ظہیر کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے اکثر علوم کا مطالعہ کیا ہے۔ شاعری میں ابتداً نظم گوئی کی طرف رجحان تھا جو بتدریج غزل کی طرف ہوتا گیا۔ غزل میں ان کا موضوع انسان ہے جسے وہ ارتقائی اور انقلابی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے متمنی تھے۔ اسی تاثر کی بنا پر اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام بھی ''عظمتِ آدم'' رکھا۔ اسی مجموعے سے ایک نظم ''انقلابِ روس'' سے اقتباس اور ایک غزل ملاحظہ فرمائیے جن سے آپ کے خیالات کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے:

یک بیک سُرخی' افکار کا لاوا پھُوٹا
اسقف و زار کے دامن کو جلانے کے لیے
پا بہ زنجیر غلاموں نے کیا عزمِ جہاد
اپنی لاشوں پہ نئے شہر بسانے کے لیے
وقت کی ڈوبتی نبضوں میں حرارت آئی
زرد چہروں نے لیا قوتِ شاہی سے خراج
ایک مجبور سی تدبیر بدل سکتی ہے
خوف و بیداد کا راج' آتش و آہن کا مزاج
ابنِ آدم کی حمیت نے سنایا پیغام
''اب نہ دربار میں بکنے کی اجازت ہوگی
کوئی فرعون اگر تیغ پہ اترائے گا
آشتی کا یہ تقاضا ہے، بغاوت ہوگی''❶

عظمتِ آدم، ظہیر کاشمیری، نیا ادارہ لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۳۲

اور یہ غزل بھی ملاحظہ کیجیے:

کشتۂ جور بہاراں نہیں دیکھے جاتے
ہم سے یہ چاک گریباں نہیں دیکھے جاتے

ہائے وہ لوگ کہ خود گھر کو جلا دیتے تھے
آج وہ سوختہ ساماں نہیں دیکھے جاتے

جاں سلگتی ہے کہیں دل سے دھواں اٹھتا ہے
منظرِ شام غریباں نہیں دیکھے جاتے

کون دیکھے گا یہ درپردہ سلگتے ہوئے دل
اب چراغ تہِ داماں نہیں دیکھے جاتے

کس طرح عشق کی توہین گوارا کر لیں
حُسن کے بال پریشاں نہیں دیکھے جاتے

جب سے خاموش چراغ دل برباد ہوا
شہر کے جشنِ چراغاں نہیں دیکھے جاتے

کوئی جگنو یا ستارہ تری قسمت میں نہیں
غم ترے اے شب ہجراں نہیں دیکھے جاتے

آج احساسِ بشر نرم و سبک تر ہے ظہیر!
آج یہ وحشی و زنداں نہیں دیکھے جاتے[1]

○○

قتیل شفائی (۱۹۱۹ء - ۲۰۰۱ء)

قتیل شفائی، جن کا اصل نام اورنگ زیب خان ہے، ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پہلے اسلامیہ مڈل سکول راولپنڈی اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول ہری پور میں حاصل کی لیکن ۱۹۳۵ء میں والد کی ناگہانی وفات نے ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر

---

[1] تغزل، ظہیر کاشمیری، نیا ادارہ لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۹۲

گھر کی کفالت کے لیے ایک دو تجارتی مشغلے اختیار کیے لیکن ناتجربہ کاری کے باعث کامیاب نہ ہوئے۔ ایک دو جگہوں پر ملازمتیں بھی کیں لیکن یہ بھی راس نہ آئیں تو قسمت آزمانے کے لیے لاہور چلے آئے آخر فلمی گیت لکھنا اور شعروشاعری کو ذریعہ معاش بنایا جو ان کی وفات (۱۱ جولائی ۲۰۰۱ء) تک بدستور جاری رہا۔

قتیل کے گھرانے میں دُور دُور تک کوئی شاعر نہ تھا۔ ابتدا میں گھر والوں سے چُھپ کر شاعری کیا کرتے تھے لیکن بقول مصنفہ تذکرہ شعرائے پاکستان:

''جب ایک نظم پر اسکول میں ایک کتاب انعام میں ملی تو والد نے جن کا نام فیروز خان تھا، بہت شاباش دی۔''[1]

اس کے بعد بے جھجک شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں جو کچھ لکھتے وہ حکیم یحییٰ شفا خانپوری کو (جن کی نسبت سے آپ ''شفائی'' کہلاتے تھے) دکھاتے تھے اور کچھ عرصہ احمد ندیم قاسمی سے بھی مشورہ لیتے رہے جو حُسنِ اتفاق سے آپ کے ہمسائے بھی تھے۔ مگر بعد میں اپنی طبع موزوں کو راہنما بنایا اور کسی سے اصلاح نہ لی۔

قتیل نے نظم بھی کہی ہے، غزلیں اور گیت بھی لکھے ہیں۔ شاعری کے ابتدائی زمانے میں ایک مثنوی ''مغرب زدہ'' بھی لکھی تھی جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی لیکن دراصل آپ بنیادی طور پر غنائی شاعر ہیں۔ یہ غنائیت ان کی نظموں، غزلوں اور گیتوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ خاص طور پر گیتوں میں انھوں نے عشق و محبت کے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے نقوش اس حسن و خوبی سے پیش کیے ہیں کہ کوئی بھی صاحب دل ان سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ احمد ندیم قاسمی، قتیل کے گیتوں کے پہلے مجموعے ''ہریالی'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''یہ ہلکے پھلکے، ننھے ننھے گیت ستاروں کی طرح خوبصورت اور پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں۔ گیت کہنے کے لیے جس بے پایاں مہارت اور زبان و بیان کی جس تکمیل و رفعت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قتیل میں بدرجۂ اُتم موجود ہے اور اسی لیے یہ گیت، حفیظ، تاثیر، ساغر اور اندر جیت شرما کے گیتوں کے ہمراہ اُردو ادب میں ایک معتدبہ اضافہ کا باعث ہیں۔''[2]

---

[1] سخنور (تذکرہ شعرائے پاکستان) سلطانہ مہر، ادارہ تحریر کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۳۲۲

[2] ہریالی، قتیل شفائی، ماورا پبلشرز لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۸

قتیل کو غنائیت سے اس قدر فطری مناسبت ہے کہ گیتوں کے علاوہ ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی یہ کیفیت موجود ہے۔ ان کا کلام مترنم اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ تخیل کے نئے نئے شگوفے بھی کھلاتا ہے۔ سادگی و پُرکاری اور شعری آہنگ کے اعتبار سے ان کا کلام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ فارغ بخاری، قتیل کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قتیل پُر نغمگیت کا شاعر ہے، اسے فکروفن کی نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ساتھ حرف شناسی میں جو مہارت حاصل ہے درحقیقت اسی وصف نے ان کے کلام کو انفرادیت بخشی ہے، اس کی غزلوں، نظموں کی امتیازی خصوصیت ہی گیتوں کی سی وہ غنائیت ہے جو اسے فطری طور پر ودیعت ہوئی ہے، لفظوں کے چناؤ، ان کی ترتیب اور اپنے اسلوب کے ہنر سے شعر میں آہنگ پیدا کرنے کا کمال جو قتیل کے ہاں رچا بسا نظر آتا ہے وہ شاید اس کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں۔" ❶ ایک گیت کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

ندی کنارے بگیا جھومے ساجن تجھ سے دُور ہوں میں
تاک میں بیٹھا ہے جگ سارا ملنے سے مجبور ہوں میں
تو بگیا میں رہنے والا
پھولوں کی آغوش کا پالا
میں کانٹوں پر سونے والی
تیری یاد میں رونے والی
میرا دُکھیا من کہتا ہے، زخموں سے بھرپور ہوں میں
ندی کنارے بگیا جھومے ساجن تجھ سے دُور ہوں میں ❷

⚬⚬

---

❶ جلترنگ، قتیل شفائی، ماورا پبلشرز لاہور، سن ندارد، ص ۱۳

❷ ہریالی، قتیل شفائی، ص ۱۵

نظم "معذرت" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

مجھ سے پہلے بھی تری انجمن ناز میں آیا ہے کوئی
تری باتوں میں زر و سیم کی جھنکار سنی ہے میں نے
روح میں گونج اٹھا پھر وہی قلاش ندامت کا سوال
کیوں تری راہ میں اخلاص کی دیوار چنی ہے میں نے
اس سے پہلے بھی کوئی شعلۂ جوالہ ضیا پاش رہا
اس سے پہلے بھی کسی آنچ کو محبوس کیا تھا میں نے
اس سے پہلے بھی، سسکتے ہوئے احساسِ ندامت کی قسم
اپنی آنکھوں سے امڈتا ہوا سیلاب پیا تھا میں نے [1]

✿ ✿

اور قتیل کی ایک مختصر غزل بھی دیکھیے:

بے کیف جوانی میں کیا کیا سامان خریدے جاتے ہیں
آہوں کے بگولے اشکوں کے طوفان خریدے جاتے ہیں
دل سے تو کوئی کیا چاہے گا اس اجڑے ہوئے کاشانے کو
مجبوری کا یہ عالم ہے مہمان خریدے جاتے ہیں
ہر چیز کا سودا چکتا ہے دن رات بھرے بازاروں میں
جھنکاریں بچی جاتی ہیں ایمان خریدے جاتے ہیں
اک بات بھی ہوتی ٹل جاتے ہم سونے کی میزانوں میں
افسوس یہاں دو کوڑی میں انسان خریدے جاتے ہیں [2]

✿ ✿

---

[1] جلترنگ، قتیل شفائی، ص ۳۵
[2] جلترنگ، قتیل شفائی، ص ۱۱۳

ساتواں باب

دبستانِ لاہور کے دیگر شعراء

(بلحاظ ترتیبِ زمانی)

اب تک ہم نے ان شاعروں کا ذکر کیا ہے جو خطہ پنجاب میں ۱۸۷۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں معروف تھے۔ ہماری تحقیق کے حدود بھی وہیں تک ہیں۔ تاہم ایسے شاعر بھی ہیں جو ۱۹۴۷ء کے زمانے تک بہت زیادہ معروف نہیں تھے لیکن اس کے بعد انھوں نے بلند مقام پایا۔ پھر وہ شاعر بھی ہیں جو بہت زیادہ معروف نہ سہی لیکن تھوڑی بہت شہرت کی وجہ سے تاریخی اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔ ہم ان دونوں اقسام کے شعراء کا ترتیب زمانی کے لحاظ سے یہاں مختصر ذکر کرتے ہیں:

بشیر احمد زار (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۱ء)

میاں بشیر احمد نے' جو جسٹس شاہ دین ہمایوں کے فرزند تھے، آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود، عمر عزیز کا بیشتر حصہ اردو ادب کی خدمت میں بسر کیا۔ اس ضمن میں رسالہ "ہمایوں" کا اجرا کیا جو ایک طویل مدت تک، ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کرتا رہا۔ آپ کو تاریخ اور فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔ ان موضوعات پر بہت سے مفید مضامین بھی لکھے۔ اس کے علاوہ آپ کو شاعری اور سیاست سے نہایت درجے کی دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۷ء سے سیاست میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا اور جلد ہی آپ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن بن گئے۔ قرارداد لاہور کے تاریخی اجلاس میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس اجلاس میں وہ مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے۔ [1] اسی اجلاس میں قرارداد پاکستان پیش ہونے سے پہلے انھوں نے قائداعظم پر لکھی ہوئی اپنی معرکتہ الآرا نظم سنائی جو آناً فاناً پورے برصغیر میں زبان زدِ خاص و عام ہوگئی۔ یہ نظم متانت، خلوص، مترنم بحر، موزوں الفاظ، محمد علی جناح کی ردیف، شدتِ جذبات اور شاعر کی عقیدت کا دلکش مرقع ہے۔ چند اشعار پیش

---

[1] جنگِ آزادی کے اردو شعراء، ڈاکٹر محمود الرحمان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۸۶ء ص ۳۷۱

خدمت میں:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

تصویرِ عزم، جانِ وفا، روحِ حریت
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

رکھتا ہے دل میں تاب و تواں نو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

اے قوم اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

لاہور اپنے بخت پہ نازاں ہے، کیوں نہ ہو
آج اپنا میہماں ہے محمد علی جناح [1]

تحریکِ پاکستان کے دوران میں اگرچہ میاں بشیر احمد نے دو چار ہی نظمیں کہی ہیں لیکن یہ نظمیں شاعر کے جذبۂ ملی کی ترجمان اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے ان کی ایک اور نظم کو اپنے صوتی حسن، پُر جوش لہجے، عزم و ارادہ کے اظہار اور جذبات کی فراوانی کی بنا پر ملک گیر شہرت حاصل ہوئی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ پاکستان کا ایک حصہ بن گئی۔ یہ نظم ۲۴ را پریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں سنائی گئی تھی۔ [2] نظم کا رنگ و آہنگ اور طرز و

[1] جنگ آزادی کے اردو شعراء، ڈاکٹر محمود الرحمان، ص ۳۷۱

[2] جنگ آزادی کے اردو شعراء، ڈاکٹر محمود الرحمان، ص ۳۷۶

تیور ملاحظہ کیجیے:

حق ہے ہمارا پاکستان   حق پہ ہمارا ہے ایمان
آؤ کر دیں آج اعلان   چاہے اپنی جائے جان
لے کے رہیں گے پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

ہم کو بہت کچھ کرنا ہے   کرنا ہے دکھ بھرنا ہے
طوفانوں سے گزرنا ہے   جینا ہے اور مرنا ہے
پائیں گے یوں پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

ہم کو ڈر ہے کاہے کا   لا الٰہ الا اللہ
ہم ہیں وقفِ صدق و صفا   ہم ہیں مسلم نام خدا
لے کے رہیں گے پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان ❶

✿✿

نشتر جالندھری (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۵ء)

عبد الحکیم نشتر جالندھری کا وطن تحصیل نکودر ضلع جالندھر ہے۔ لاہور کے مختلف اخبارات و رسائل مثلاً پھول، تہذیب نسواں، زمیندار، انقلاب، ادیب، دلگداز، پیام ادب اور حمایت اسلام وغیرہ میں ایک دراز عرصہ تک بڑی محنت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ بیسیوں علمی، ادبی، تاریخی اور درسی کتب مرتب کیں۔ آپ بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں نظم طباطبائی سے اصلاح لی تھی۔ ❷ مگر جلد ہی اپنے ذوق وشوق کی بدولت تمام اصناف سخن بالخصوص غزل میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ ان کی غزل کی خاصیت سادگی و سلاست اور کیف

---

❶ جنگ آزادی کے اردو شعراء، ڈاکٹر محمود الرحمان، ص ۳۷۲

❷ تذکرہ معاصرین، (جلد سوم)، مالک رام، ص ۲۶۳

دسرور ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ طرفہ بحر ہے، ساحل ہے موج موج اس کی
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں دواں ہیں مسافر تلاشِ منزل میں
اگرچہ جادۂ منزل نظر نہیں آتا

یہ اشک، اشک نہیں، تگِ اشک ہیں، نشتر
جگر کا خون، جو شامل نظر نہیں آتا

☆ ☆

جو گلشن میں بہار فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں
تو دامن دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں

نگاہ و بے رُخی، دو رُخ ہیں تصویرِ محبت کے
گلستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں [1]

✿✿

حاجی لق لق (۱۸۹۷ء۔۱۹۶۱ء)

دبستانِ لاہور میں اردو صحافتی ادب کے اس نامور مزاح نگار کا اصل نام عطا محمد تھا جو ضلع قصور کے ایک گاؤں پٹی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم تو واجبی ہی تھی مگر ابتدا ہی سے بڑے ذہین تھے اور چھوٹی عمر ہی میں کئی زبانوں میں خاصی شد بد حاصل کر لی تھی۔ عمر کا ایک طویل حصہ فوجی ملازمت میں بسر ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا عبدالمجید سالک کے رسالے "فانوس خیال" سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ زیادہ عرصہ "زمیندار" سے منسلک رہے اور فکاہات کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔

حاجی لق لق مزاحیہ رنگ کی نثر کے علاوہ مزاحیہ نظمیں لکھنے میں بھی ماہر تھے۔ اگرچہ انھوں نے ابوالعلا کے نام سے سنجیدہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن وہ اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بدولت ہی زیادہ معروف ہوئے۔ مزاحیہ شاعری میں وہ حضرت اکبر الہ آبادی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ان کے زیادہ تر موضوعات اخلاق، سیاست اور سماج سے متعلق ہیں اور وہ ایسے معاشرے کو بھی ہدف

---

[1] تذکرہ معاصرین، (جلد سوم)، مالک رام، ص ۲۶۳

تنقید بناتے ہیں جس کے افراد مشرقی اقدار کو چھوڑ کر بغیر سوچے سمجھے مغربی اقدار کو اپنانے میں کوشاں نظر آتے تھے۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو ہے مرغوب مے، زاہد کو شوق چائے ہے
اپنا اپنا مشغلہ ہے اور اپنی اپنی رائے ہے
سرد مہری سے بتوں کی، ہو گیا ہے دل بھی سرد
شکریہ اونی سویٹر کا، جو دل گرمائے ہے

✿ ✿

نہیں سنتا کوئی فغانِ غریب
مرے دل کی لگی نہیں بجھتی
ریڈیو پر بھی گا کے دیکھ لیا
برف میں دل لگا کے دیکھ لیا

ہے مہربانی ہم پہ خدائے کریم کی
حد ہو گئی ہے اپنے مذاقِ سلیم کی
دیکھی نہیں ہے شکل الف لام میم کی
پاکٹ میں فوٹو رکھتے ہیں ہم مس نسیم کی

مسلمان اک قوم ہے سیدھی سادی
اسے راس کب آئے گاندھی کی کھادی
نہیں وہ فریب اور دھوکے کی عادی
وہ کیوں کر پیے دودھ بکری کا بادی

پریشان و ششدر کھڑا ہے بے چارہ
مسلماں کو گاندھی کی بکری نے مارا

✿ ✿

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (۱۸۹۹ء-۱۹۸۴ء)

سردار موہن سنگھ، جو دیوانہ تخلص کرتے تھے، راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد "جدید اردو شاعری کے رجحانات" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور "تاریخ ادب پنجابی" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی موقر ڈگریاں حاصل کیں۔ اورینٹل کالج لاہور میں تقریباً بیس سال تک انگریزی اور پنجابی کی تدریس کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دینے کے بعد ۱۹۴۷ء میں بھارت چلے گئے تھے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ کئی زبانوں کے ادب سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ اردو اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں انھوں نے نظم اور غزل دونوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام

سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ خاص طرز فکر اور اسلوب کے مالک ہیں۔ آپ کی منظومات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں کہ:

''ڈاکٹر موہن سنگھ اس عصر کے ایک اور جدت پسند شاعر ہیں، جن کی نظمیں حفیظ کی طرح شباب کے جذبات سے پُر ہیں، لیکن ان میں حسن اور موسیقی پیدا کرنے کے لیے وہ نئے دبستان کی صنعت گری سے بہت کم کام لیتے رہے۔ ہندی بحریں انھوں نے بہت کم استعمال کی ہیں اس لیے ان کی ابتدائی دور کی شاعری قدیم عروضی پابندیوں اور جدید احساسات کا مجموعہ بن گئی ہے۔ دیوانہ کی شاعری کا عام انداز عاشقانہ ہے، گویا وہ نظم میں تغزل کا رنگ بھرتے ہیں'' ❶

ایک نظم ''دوشیزہ'' سے چند اشعار دیکھیے:

غنچہ ہے نا شگفتہ، تو لب ہے ناکشودہ
ناگفتہ راز تو ہے، تو وصف ناستودہ
خاموش نغمے ہیں کیا خاموشیوں میں تیری
مستور جلوے ہیں کیا گل پوشیوں میں تیری
شرم و حیا میں تیری ناز و ادا ہے کیا کیا
کیا کیا بلائے جاں ہے، جانِ بلا ہے کیا کیا
نیچی نگاہیں تیری ڈھاتی ہیں آفتیں کیا
چاند اور کنول نے بخشیں تجھ کو لطافتیں کیا
فطرت کے ساز سے یہ، دم سازیاں غضب ہیں
ہم چشمیاں غضب ہیں، ہم رازیاں غضب ہیں

(دوشیزہ) ❷

❁❁

---

❶ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۲۷۷

❷ جدید شعرائے اردو (فیروز سنز)، ص ۷۴۳

عبدالعزیز فطرت (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۷ء)

فطرت کا وطن، خطہ پنجاب میں جیالوں کی سرزمین راولپنڈی ہے۔ پوٹھوہار کی اس سنگلاخ سرزمین میں اردو شاعری کی ترویج میں فطرت کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے عمر کا زیادہ حصہ ڈاک خانے کی ملازمت میں بسر کیا لیکن اس دوران میں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعروادب کا فروغ ہی آپ کا واحد مشغلہ تھا۔ راولپنڈی میں مشاعرے منعقد کرنے کا ایک عرصہ تک اہتمام کرتے رہے۔ ❶ جن کی وساطت سے نہ صرف اس خطے میں شعروشاعری کا خوب چرچا ہوا بلکہ بہت سے نامور شعراء بھی ابھرے جن میں باقی صدیقی بہت نمایاں ہوئے۔

فطرت، نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ ان کی غزلیں قدیم و جدید رنگ کا خوبصورت امتزاج ہیں جبکہ نظم میں پابند اور آزاد دونوں طرح کی ہیئت میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مگر نظم ہو یا غزل، فکرو اسلوب کے اعتبار سے شاعری سادہ اور رواں ہونے کی بنا پر دلکش ہے۔ ایک غزل ملاحظہ کیجیے:

نازاں نہ ہوں چمن کی دل آویزیاں بہت
ذہنِ فلک میں اب بھی ہیں خوں ریزیاں بہت

تھپکی جو دی خزاں نے تو فوراً ہی سو گئے
پھولوں نے سیکھ لی تھیں سحر خیزیاں بہت

شامِ فراق اپنے لوازم کے ساتھ آئی
پھر آج رات ہوں گی گہر ریزیاں بہت

اہلِ زمانہ کی یہ رہ و رسمِ التفات
یاد آئیں مجھ کو تیری کم آمیزیاں بہت

طوفانِ ضو سہی مہِ کامل کی چاندنی
سایوں میں بھی مگر ہیں دل آویزیاں بہت

اذنِ سخن ملا تو بھر آئے گی آنکھ بھی
فطرت بہار آئے تو گل ریزیاں بہت ❷

✿ ✿

---

❶ دے صورتیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص ۲۹۵

❷ فنون (غزل نمبر) ص ۵۰۶

منظور احمد منظور (۱۹۰۷ء۔۱۹۷۲ء)

منظور احمد منظور کا شمار اپنے دور کے اچھے شعراء میں ہوتا تھا۔انھوں نے شاعری کا آغاز اس وقت کیا جب اردو شاعری میں رومانوی تحریک کا غلغلہ تھا۔آپ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنے جذبات واحساسات کے تحت شاعری کرتے رہے۔غزل کی عام پابندیوں کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے اس میں ایک رومانوی عنصر یہ داخل کیا کہ مرد سے خطاب کرنے کے بجائے عرب شعراء کی طرح عورت سے خطاب کیا ہے۔

انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور اگرچہ خاصی حد تک قدیم اساتذہ کی پیروی کی ہے تاہم کورانہ تقلید سے دامن بچایا ہے۔جس سے ان کے کلام میں ایک طرح کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ایک غزل اور ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جبین پہ گردِ کدورت مرا اصول نہیں — جفائے اہلِ زمانہ پہ دل ملول نہیں

یہ بکھرے تارے، یہ بے نظم پھول شاہد ہیں — نمودِ حسن میں پابندیٔ اصول نہیں

ضرور کچھ تو ہے اپنی حیات کا مقصد — سنا ہے چیز کوئی دہر میں فضول نہیں [1]

✿✿

میں نے خود پالے ہیں یہ سانپ انھیں کچھ نہ کہو

گاڑ لینے دو انھیں دانت مری شہ رگ میں

آخری بوند مرے خون کی پی لینے دو

دیکھ بس دیدۂ مشتاق تماشا یہ بھی

(یہ دوست) [2]

✿✿

---

[1] دیدۂ بینا، منظور احمد منظور، ناشرین لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۵۵

[2] ایضاً

خضر تمیمی (۱۹۰۸ء۔۱۹۷۴ء)

خضر تمیمی کا اصل نام مولا بخش تھا۔ چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ لائل پور (فیصل آباد) اور لاہور میں تعلیم پائی۔ ایم اے (فارسی) اور لاء کرنے کے بعد کچھ عرصہ چنیوٹ میں پریکٹس کی، پھر لاہور میں مستقل طور پر آ گئے تھے، جہاں پریکٹس کے ساتھ ساتھ لاء کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔

خضر کو جملہ فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ خاص طور پر طبلہ بجانے میں ان کا بڑا نام تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ شاعری میں ان کا اصل میلان طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف تھا جس میں بالخصوص وہ اپنے مناظروں کی وجہ سے بڑے مقبول تھے۔ ان کے مناظروں کا پس منظر زیادہ مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا موازنہ رہا ہے۔ ان مناظروں کی تمہید نہایت دلچسپ ہے اور ہر نظم قوت مشاہدہ کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمہید کے بعد طرفین کی جانب سے نہایت دیانت داری سے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں اور آخر میں بالعموم مشرق کے حق میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے مناظروں میں سے ''حقہ اور سگریٹ کا مناظرہ'' اور ''مناظرہ سارنگی و طبلہ'' بہت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ''شیرازہ'' اور ''نمک دان'' میں بھی ہلکی پھلکی مزاحیہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اول الذکر نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو دیکھی حضرت حقہ نے یہ بات
کہ بروے نے دکھائے اوچھی پات
بزرگانہ ادا سے مسکرایا
عجب دلکش صدا سے گڑگڑایا
لگا سگرٹ سے یوں کہنے کہ منے
ذرا دیکھو تو منہ میں دانت ہیں کے
تجھے ہے بھونکنا جس نے سکھایا
اسی کو تو نے وائے کاٹ کھایا
بھلا تجھ کو ہے مجھ سے واسطہ کیا
غبار راہ کو منزل کا پتہ کیا
خجالت کش ہوئی مینا کی قلقل
میری حق حق کے آگے صورت گل
ملی اوراک کو پرواز مجھ سے
ملا محفل کو سوز و ساز مجھ سے
تجھے ہے کرمک شب تاب رہنا
مجھے مہتاب بن کر ہے چمکنا
بھرا ہے سرخ انگاروں کا چولہا
تو میرے سامنے تنہا شرارہ ●

● شعرائے پنجاب، تسیم رضوانی، ص ۲۵۳

ظہر امرتسری (۱۹۰۸ء۔۱۹۵۰ء)

خدا بخش نام، اظہر تخلص، امرتسر میں پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم ادھوری رہ جانے کے باوجود عربی اور اردو میں زور مطالعہ کی بنا پر آپ کا شمار اہل علم میں ہوتا تھا۔ لڑکپن ہی سے شعر و سخن اور انشا پردازی کا شوق تھا۔ تحریک خلافت اور دیگر سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ راولپنڈی سے ”ترجمانِ سرحد“ کے نام سے اپنا ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا تھا۔ نثر میں مولانا محمد حسین آزاد اور نظم میں مولانا ظفر علی خاں سے زیادہ متاثر تھے۔ ایک عرصہ تک روزنامہ ”زمیندار“ کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ زمیندار کے زمانہ ادارت میں مقالہ فتاحیہ لکھتے تھے تو زبان اتنی دلنشیں اور پرلطف ہوتی تھی کہ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ اظہر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ نظم ہو یا نثر، وہ ہر بات استعارے اور رمز و کنائے میں ادا کرتے تھے۔ [1] ان کے بعد اس رنگ کو کوئی ادیب اور شاعر اختیار نہیں کر سکا۔ علاوہ ازیں زبان نہایت فصیح اور اسلوب بیان نہایت اچھوتا ہے۔ چند اشعار، جو بقول نظیر لدھیانوی وفات سے چند گھنٹے پیشتر فی البدیہہ کہے تھے، ملاحظہ ہوں:

بے کسی میں بھی کچھ تو میرا آسرا ہو گا
تو اگر نہیں ہوگا تو برا خدا ہو گا

اب بھنور میں کشتی ہے اب بھنور ہے کشتی میں
کچھ بتاؤ ملاحو! اس سے آگے کیا ہو گا

اس امید پر جیتا مدتوں رہا ہوں میں
کوئی تو زمانے میں درد آشنا ہو گا [2]

○○

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، نظیر لدھیانوی، ص ۳۷۲

[2] تذکرہ شعرائے اردو، نظیر لدھیانوی، ص ۳۷۲

شیر افضل جعفری (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۹ء)

شیر محمد نام، افضل تخلص اور فقہ جعفریہ کے پیرو ہونے کی بنا پر جعفری کہلاتے ہیں۔ وطنِ مالوف رومانی لوک داستان ''ہیر رانجھا'' کی سرزمین جھنگ ہے۔ کم و بیش ساری عمر تدریس و تعلیم سے وابستہ رہے۔ شعر کہنے کا آغاز اگرچہ ملازمت کی ابتدا کے دوران ہی میں کر دیا تھا۔ تاہم ۱۹۴۹ء سے چند قلبی و اردات سے دل میں غزل کی چاندنی نکھری، جہاں سے شیر افضل کے اندر ایک نئے شاعر نے جنم لیا۔ آپ شعر و شاعری کی دنیا میں اپنے ''جھنگ رنگ'' کی بنا پر زیادہ معروف رہے۔ اسی رنگ کی وجہ سے ان کی شاعری میں عام طور پر خالص علاقائی تہذیب سے متعلقہ الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ جو بانکے سیال ہوتے ہیں	بھولے بھالے غزال ہوتے ہیں
سادہ سادہ مزاج والوں کے	اونچے اونچے خیال ہوتے ہیں
آپ کی زلف کے اندھیرے بھی	چاندنی کی مثال ہوتے ہیں
ان بھری بستیوں کے لوگوں میں	آدمی خال خال ہوتے ہیں
جھنگ کے لاڈلے جوان اکثر	چاند تاروں کی آل ہوتے ہیں
زندگی کے کھنڈر میں البیلے	جیسے گدڑی میں لال ہوتے ہیں [1]

○○

اکبر لاہوری (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۶ء)

اکبر لاہوری نے دیال سنگھ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء سے پنجاب اسمبلی میں اردو رپورٹر اور مترجم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں اسی جگہ اسسٹنٹ سیکرٹری ہوگئے۔ اسی دوران میں آپ نے ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ ڈپٹی ڈائریکٹر ولیج ایڈ بھی رہے۔

اکبر لاہوری کو شعر و شاعری کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ آپ کے والد چودھری محمد ابراہیم خاں، جو فاضل تخلص کرتے تھے، پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ چودھری سر شہاب الدین بھی پنجابی شاعری

---

[1] شیر سدا رنگ، شیر افضل جعفری، قرطاس فیصل آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۴۰

کے بارے میں ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ❶ چنانچہ والد کی دیکھا دیکھی آپ بھی شعر کہنے لگے۔ لیکن آپ پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو شاعری میں آپ علامہ تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ ❷

اکبر لاہوری کی شاعری کا رنگ بالعموم طنزیہ و مزاحیہ ہے۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ان کی شاعری کی بنیاد ہے اور اسی بنیاد سے وہ لطیف طنز و مزاح کے ایسے تیر چلاتے ہیں جو دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
بس اور کپڑا نہ سل سکے گا جو تن پہ ہے تار تار ہوگا

تلاشِ گندم کو گھر سے نکلے گا قافلہ مور ناتواں کا
پلٹ کے آیا تو سب کے پہلو میں اک دلِ داغدار ہوگا

قصائی بکرے کا گوشت لے کر ہمالہ پہ جا چھپیں گے
جوان کا پیچھا کرے گا بس کے وہ ایک مشتِ غبار ہوگا

مٹھائی اسّی روپے کی سیر اور لاٹری میں ملا کرے گی
جو عہد حلوائیوں سے باندھا گیا تھا وہ استوار ہوگا

چڑھے گی قیمت وہ جوتیوں کی نہ کوئی ان تک پہنچ سکے گا
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

کفن کی قیمت سنیں گے مُردے تو اس کے صدمے سے جی اٹھیں گے
جنازہ اٹھے گا اب کسی کا نہ اب کسی کا مزار ہوگا

نہ پوچھ اکبر کا کچھ ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں کسی چوک میں کھڑا قیمتوں کا شکوہ گزار ہوگا ❸

✿ ✿

---

❶ پنجابی ادب دی کہانی، عبدالغفور قریشی، مطبوعہ عزیز بک ڈپو لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۴۷۹

❷ پنجابی ادب دی کہانی، عبدالغفور قریشی، مطبوعہ عزیز بک ڈپو لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۴۷۹

❸ موجِ تبسم، اکبر لاہوری، مطبوعہ ایور گرین پریس لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۳

ایک غالب تھے کہ قاتل نے کیا قتل ان کو

اور کی قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ایک اکبر ہے کہ اس پر یہی آفت بیتی

لیکن اس عہد کے قاتل کی ریا سے توبہ

کی مرے قتل کی اخبار میں تردید اس نے

اور کرا دی میرے احباب سے تائید اس نے

(اپنا اپنا قتل) ❶

○○

مخمور جالندھری (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۶ء)

ترقی پسند تحریک کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا تو مرور ایام کے ساتھ اس میں بہت سے ادیب اور شاعر شامل ہوئے، ان میں سے ایک مخمور جالندھری ہیں۔ مخمور نے موضوع کے علاوہ ہیئت کے بھی قابل قدر تجربے کیے ہیں۔ انھیں نظم معرا (BLANK VERSE) کی صنف سب سے زیادہ پسند رہی ہے۔ بقول کنہیا لال کپور:

"مخمور کی بلینک ورس میں سحر ہے۔ ترنم ہے، روانی ہے۔ جس میں شعر کے جملہ اوصاف بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ مخمور فرسودہ ترکیبوں اور پامال استعاروں سے قطعاً پرہیز کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ نئی ترکیبوں، نئی تشبیہوں سے اپنے فکر کو مزین کرتا ہے۔ مخمور کو ہمیشہ تازہ اور توانا تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش رہتی ہے۔" ❷

یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فلکِ پیر گھٹاؤں سے اٹا رہتا ہے

جس کی چھت اتنی پرانی ہو وہ برباد مکان

کم نہیں ایک قیامت سے مکینوں کے لیے

---

❶ موج تبسم، اکبر لاہوری، مطبوعہ ایور گرین پریس لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۹۳

❷ تلاطم، مخمور جالندھری، دیباچہ کنہیا لال کپور، مکتبہ جدید لاہور، (سن ن) ص ۹

وقت خونخوار شکاری ہے جو ہر لمحہ کے بعد

اپنے جھولے میں نئی لاش گرا لیتا ہے

سر کے بل آہنی تعمیر گری جاتی ہے

جسے ٹھوکر بھی نہ سجدے سے اٹھائے گی کبھی

(گرتی ہوئی دیوار) ❶

٭٭

الطاف مشہدی (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۱ء)

الطاف مشہدی، اختر شیرانی کی خالص رومانی جہت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کے بجائے ہر جگہ حسن و جمال کا بیان ہے۔ بالخصوص انھوں نے ہر جگہ عورت کے ملکوتی حسن سے حسن کائنات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"الطاف کا عشق ایک حساس دنیادار عاشق کا عشق ہے اور اس میں زُلف و رُخسار سے تمازت کشید کرنے کا تمام جذبہ موجود ہے۔" ❷

الطاف مشہدی کی رومانویت میں جا بجا چاند، ستارے، پھول، کلیاں، گلشن، شبنم، کرن، آبِ جو، چاندنی، پر خواب فضائیں اور سحر آفرین ماحول ملتا ہے جس میں نسوانی کردار خوشبوئیں بکھیر رہا ہے۔ ان کے یہاں موضوعاتی تنوع نہیں ملتا بلکہ ان کی بیشتر نظموں میں مسلسل خیال کا اظہار ہے۔ یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

مجھے فرصت ملی کچھ دنوں نغمہ سرائی کی

تو مظلومی کی گردن کس طرح فرطِ تکبر سے

اکڑ کر خواجگی پر مسکراتی ہے، بتا دوں گا

تبسم کھیلتا ہے کس طرح مغموم آنکھوں میں

یتیمی کس طرح تانیں اڑاتی ہے، بتا دوں گا

---

❶ تلاطم، مخمور جالندھری، دیباچہ کنہیالال کپور، مکتبۂ جدید لاہور، (سن ن) ص ۱۲۸

❷ اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص ۴۷۱

بڑھاپے کی رگوں میں کس طرح مخمور راتوں کو
جوانی جھوم کر جیسی بجاتی ہے، بتا دوں گا
غریبی اہلِ دولت کے کراہت خیز چہروں سے
لپک کر کس طرح پردے ہٹاتی ہے، بتا دوں گا
مسرت کس طرح بے چارگی کے خشک ہونٹوں پر
تبسم کی خنک شمعیں جلاتی ہے، بتا دوں گا
برستی انکھڑیوں والے حسینوں کی نظر دل کو
بہک کر کس طرح بے خود بناتی ہے، بتا دوں گا
مجھے فرصت ملی کچھ دنوں نغمہ سرائی کی

(فرصت) ❶

✿✿

مرے حبیب مجھے وقفِ انتظار نہ کر — جگر کو سوزشِ پیہم سے ہمکنار نہ کر
مرے شباب کی راتوں کو سوگوار نہ کر — مرے حبیب مجھے وقفِ انتظار نہ کر
ہوئی اک عمر مسرت کی بھیک پا نہ سکا — ہزار چاہا بھی میں نے تو مسکرا نہ سکا
خرابِ زیست کو اتنا تو بے وقار نہ کر — مرے حبیب مجھے وقفِ انتظار نہ کر
نظر کو حوصلۂ عرضِ غم دیا میں نے — برستی آنکھ سے کارِ زباں لیا میں نے
مگر جواب کہ "یہ ذکر بار بار نہ کر" — مرے حبیب مجھے وقفِ انتظار نہ کر

(میرے حبیب) ❷

✿✿

---

❶ داغِ دل، الطاف مشہدی، مطبوعہ عوامی کتب خانہ سرگودھا، (س ن)، ص ۳۹
❷ الطاف کے نغمے، الطاف مشہدی، راوی پبلشرز لاہور ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۱

سید جعفر طاہر (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۷ء)

سید جعفر علی طاہر کا وطن مالوف جھنگ ہے۔ان کی زندگی کا زیادہ حصہ فوجی ملازمت میں بسر ہوا۔اس سلسلے میں انھوں نے خاصی مدت بیرون ملک بھی گزاری۔شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء سے کیا۔ان کے شعری ذوق کو نکھارنے میں شیر افضل جعفری، مجید امجد اور احمد ندیم قاسمی کی صحبتوں کا بڑا حصہ ہے۔ جعفر طاہر نے اردو شاعری میں اپنے کینٹوز اور منظوم ڈراموں کی بدولت بہت شہرت پائی۔ کینٹوز اور منظوم ڈراموں کے علاوہ انھوں نے قومی گیت، غزلیں، قصائد، نوحے، سلام، مرثیے اور نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا اصل کام کینٹوز ہی میں سامنے آیا ہے۔ان کینٹوز میں ڈرامائی کیفیت بھی ہے اور داستان کا تسلسل بھی۔انھوں نے مشرق و مغرب کی افسانوی روایتوں اور تاریخی کیفیتوں کو اپنے فنی شعور سے کام لے کر شاعری کی شکل میں ڈھال دیا ہے اور بلاشبہ یہ بڑا کام ہے۔نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

چھیڑ کر تذکرۂ دورِ جوانی رویا
رات یاروں کو سنا کر میں کہانی رویا

غیرتِ عشق نے کیا کیا نہ بہائے آنسو
سن کے باتیں تری، غیروں کی زبانی رویا

کس نے دی شوخیٔ رفتار کی میری طرح داد
کون یوں دیکھ کے دریا کی روانی رویا

چشمِ اربابِ وفا ہے، جو لہو روتی ہے
غیر پھر غیر ہے، رویا بھی تو پانی رویا

تیری مہکی ہوئی سانسوں کی لویں یاد آئیں
آج تو دیکھ کے میں صبح سہانی رویا[1]

✿✿

---

[1] تذکرہ معاصرین، مالک رام، (جلد چہارم)، ص ۲۶۴

جگن ناتھ آزاد (۱۹۱۸ء ۔ ۲۰۰۴ء)

جگن ناتھ آزاد میانوالی کی سنگلاخ سرزمین میں پیدا ہوئے۔ پرورش اور تعلیم راولپنڈی میں پائی، جہاں آپ کے والد تلوک چند محروم عرصہ دراز تک بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ قیام پاکستان سے قبل آپ کا زیادہ تر قیام لاہور میں رہا۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی چلے گئے۔ ایک طویل مدت تک جموں یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ پھر جامعہ ملیہ دہلی سے منسلک ہو گئے اور برصغیر میں اپنی فکری شاعری اور ماہر اقبالیات کے حوالے سے زیادہ معروف ہوئے۔ ۲۵ر جولائی ۲۰۰۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔

جگن ناتھ آزاد کو شعری ذوق اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ والد کے فیضان کے ماسوا کلام اقبال کا بھرپور اثر لیا۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ اقبال کی پیروی کرنے والے شعراء میں جگن ناتھ آزاد سب سے قد آور شاعر ہیں۔ نمونہ کلام:

پھر حسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہوں میں

دنیا میں مجھ کو جنسِ وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاشِ گُہر کر رہا ہوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں

✿✿

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں روح کو یہ کس نے پکارا

ہر منزلِ دشوار کو آساں بنایا
کیا چیز ہے اے ذوقِ نظر تیرا سہارا

اے عقل! خدا تیرے سفینے کا محافظ
یہ عشق کا دریا ہے نہیں جس کا کنارا [1]

✿✿

ساحر لدھیانوی (۱۹۲۲ء۔۱۹۸۱ء)

عبدالحئی متخلص بہ ساحر لدھیانوی ۱۹۴۲ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے کے طالب علم تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر امتحان میں شریک نہ ہو سکے اور کالج کی زندگی کو خیر باد کہہ کر ادب لطیف، شاہکار اور پھر سویرا میں مختلف اوقات میں کام کیا۔ اسی دوران میں وہ کئی مرتبہ بمبئی گئے۔ معاشی نقطہ نگاہ سے انھیں بمبئی اتنا پسند آیا کہ تقسیم کے بعد وہ مستقل طور پر بمبئی چلے گئے۔ جہاں فلمی گانے اور مکالمے لکھنے کے سلسلے میں انھوں نے بڑا نام کمایا۔

ساحر لدھیانوی فلمی شاعری کے تو بے تاج بادشاہ تھے ہی، اس کے علاوہ ان کی مستقل شاعری بھی اس پائے کی ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ زمانہ طالب علمی ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ شعر میں باقاعدہ طور پر کسی سے اصلاح نہیں لی، البتہ فیض کی شاعری سے بہت متاثر ہیں اور غالباً یہ فیض ہی کا اثر ہے کہ انھوں نے شاعری میں ہیئت کے تجربے کرنے کے بجائے معنی و موضوع اور زبان و اسلوب میں اجتہاد کیا ہے۔ ان کے کلام میں تفکر کی گہرائی، مشاہدے کی ہمہ گیری، ماحول کی اثر آفرینی اور شدت احساس کی کارفرمائی سب کچھ موجود ہے اور اسی لیے ان کا کلام حقیقت افروز اور موثر ہے۔

ساحر نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانی نظمیں کہنے سے کی تھی لیکن جلد ہی وہ رومان سے حقائق کی طرف لوٹ آئے۔ بہر کیف ان کی رومانی نظمیں ہوں یا اخلاقی، سیاسی ہوں یا سماجی ہر جگہ ان کا اسلوب نہایت دلکش، واضح اور منفرد ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کی نظم "تاج محل" سے اقتباس ملاحظہ

---

[1] بیکراں، جگن ناتھ آزاد، مکتبہ قصر اردو دہلی، (س ن)، ص ۴۳

کیجیے جو ایک دراز عرصے سے ہر کہ ومہ سے خراج وصول کر رہی ہے:

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر وہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
(تاج محل) ❶

❁❁❁

---

❶ کلیاتِ ساحر، ساحر لدھیانوی، مکتبہ شعر و ادب لاہور، (س ن) ص ۱۳۸

کتابیات

نوٹ : کتابیات میں صرف وہی کتب اور مقالات (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) اور جرائد و رسائل شامل کیے گئے ہیں جن کے حوالے ہمارے مقالے میں موجود ہیں۔ ایسی کتب، مقالات اور جرائد و رسائل جو اس مقالے کی تیاری کے دوران میں زیر مطالعہ تو رہے مگر ان سے اقتباسات نہیں لیے گئے یا ان سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا گیا، انھیں فہرست میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

نام مصنف	نام کتاب	مقام اشاعت
آزاد، پروفیسر جگن ناتھ	آنکھیں ترستیاں ہیں	لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۲ء
"	محمد اقبال، ایک ادبی سوانح حیات	نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۳ء
"	بیکراں	دہلی، مکتبہ قصر اردو، س۔ن
آزاد، مولانا محمد حسین	آب حیات	لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء
"	نظم آزاد	لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۲۶ء
آصف خان، محمد (مرتب)	آکھیا بابا فرید نے	لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۷۸ء
ابوالفضل، علامہ	آئین اکبری	لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	لکھنؤ کا دبستان شاعری	لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۷ء
اثر صہبائی	رفعت	لاہور، اکادمی پنجاب، ۱۹۵۴ء
"	روح صہبائی	جموں، راج محل پبلشرز، ۱۹۳۶ء
احسان دانش	آتش خاموش	لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن
"	جہان دانش	لاہور، دانش آباد، ۱۹۷۳ء
"	چراغاں	لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن
"	مقامات	لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن
"	نفیر فطرت	لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن
اختر شیرانی	شہرود	لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۳۹ء

اختر شیرانی	صبح بہار	لاہور' آئینہ ادب' س-ن
"	لالۂ طور	لاہور' آئینہ ادب' ۱۹۶۹ء
اعجاز حسین' ڈاکٹر	مختصر تاریخ ادب اردو	کراچی' اردو اکیڈمی سندھ' ۱۹۷۱ء
افضل جعفری' شیر	شہر سدا رنگ	فیصل آباد' قرطاس' ۱۹۸۰ء
اقبال صلاح الدین	تاریخ پنجاب	لاہور' عزیز بک ڈپو' ۱۹۷۳ء
اقبال' علامہ محمد	پیام مشرق	لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۸۱ء
"	ضرب کلیم	لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۸۱ء
"	اسرار و رموز	ایضاً
"	ارمغان حجاز	لاہور' شیخ مبارک علی' ۱۹۳۸ء
"	بال جبریل	لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۷۵ء
"	بانگ درا	ایضاً
اقبال علی' مولوی سید	سرسید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب	لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۷۳ء
اکبر' جلال الدین	کلیات اکبر (غیر مطبوعہ)	مملوکہ مجاہد اکبر' احمد بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور
"	نقش ارژنگ	لاہور' ہزار داستان' ۱۹۳۶ء
اکبر لاہوری	موج تبسم	لاہور' ایور گرین پریس' ۱۹۷۵ء
اکبری' دیوان امرناتھ	دیوان اکبری	لاہور' نولکشور' ۱۸۷۳ء
اکبری' دیوان امرناتھ	ظفر نامۂ رنجیت سنگھ	لاہور' دانش گاہ پنجاب' ۱۹۲۸ء
اکرام' شیخ محمد	حکیم فرزانہ	لاہور' ادارہ ثقافت اسلامیہ' ۱۹۷۷ء
"	آب کوثر	لاہور' فیروز سنز' ۱۹۵۳ء
البیرونی' ابوریحان	کتاب الہند	دہلی' انجمن ترقی اردو' ۱۹۴۱ء
الطاف مشہدی	الطاف کے نغمے	لاہور' راوی پبلشرز' ۱۹۴۶ء

الطاف مشہدی	داغ بیل	سرگودھا' عوامی کتب خانہ س۔ن
امجد' مجید	لوح دل (کلیات مجید امجد)	پشاور' مکتبہ ارژنگ' ۱۹۸۷ء
انور سدید' ڈاکٹر	اردو ادب کی تحریکیں	کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۱۹۸۵ء
بابر' نصیر الدین	تزک بابری	لاہور' سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۶۹ء
باقر' ڈاکٹر محمد	لاہور' ماضی اور حال (انگریزی)	لاہور' پنجاب یونیورسٹی' س ۔ ن
قررنسوی' سجاد	مغرب کے تنقیدی اصول	لاہور' اطہر سنز' ۱۹۷۱ء
باقی صدیقی	جام جم	لاہور' دانش گاہ پنجاب' س ۔ن
"	وار ورسن	راولپنڈی' قومی کتب خانہ' س۔ن
پطرس بخاری	کلیات پطرس	لاہور' مکتبہ شعر و ادب' س ۔ن
تاثیر' محمد دین	آتش کدہ	لاہور' انشا پریس' س۔ ن
تاجور نجیب آبادی مولانا	روح انتخاب	لاہور' شمشیر سنگھ اینڈ کمپنی۔ س۔ ن
تبسم' صوفی غلام مصطفیٰ	انجمن	لاہور' فیروز سنز' س۔ن
جعفری' سید محمد	شوخیٔ تحریر	کراچی' مکتبہ دانیال' ۱۹۸۵ء
جلال الدین احمد جعفری	نظم لطیف	کراچی' ادارہ شرکت مصنفین
جمیل جالبی' ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	س۔ ن
جمیل جالبی' ڈاکٹر (مرتب)	ن م راشد۔ ایک مطالعہ	لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۸۳ء
جوش ملسیانی	بادۂ سرجوش	کراچی' مکتبہ اسلوب' ۱۹۸۶ء
"	جنون و ہوش	نکودر (جالندھر) مرکز تصنیف' ۱۹۳۰ء
چشتی' مولوی نور احمد	تحقیقات چشتی	دہلی' منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز' ۱۹۵۱ء
م' عبدالحلیم	تذکرۂ مردم دیدہ	لاہور' پنجاب ادبی اکیڈمی' ۱۹۶۳ء
		لاہور' پنجاب ادبی اکیڈمی' ۱۹۶۱ء

حالی، مولانا الطاف حسین	حیات جاوید	لاہور، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۹۸۴ء
"	مسدس حالی	لاہور، کشمیر کتاب گھر، ۱۹۸۲ء
"	کلیات نظم حالی	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء
حالی، مولانا الطاف حسین	مجموعۂ نظم حالی	لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۳۲ء
"	مقدمہ شعر و شاعری	لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء
حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	آگرہ، لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۵۷ء
حزیں سیالکوٹی امین	کھا ئیگ حیات	لاہور، گیلانی الیکٹرک پریس، ۱۹۳۰ء
حسرت، چراغ حسن	مردم دیدہ	لاہور، دارالاشاعت، س ن
حسن، ڈاکٹر محمد	اردو ادب میں رومانوی تحریک ملتان	کاروان ادب، ۱۹۸۶ء
حفیظ جالندھری	تلخابۂ شیریں	لاہور، مجلس اردو، کتاب خانہ حفیظ، ۱۹۵۸ء
"	سوز و ساز	لاہور، مجلس اردو، کتاب خانہ حفیظ، ۱۹۵۹ء
"	نغمۂ زار	ایضاً
حفیظ ہوشیارپوری	مقام غزل	کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء
خالد، ڈاکٹر تصدق حسین	لامکاں تا لامکاں	کراچی، مکتبہ نصرت، ۱۹۷۶ء
خسرو، امیر	غرۃ الکمال	دہلی، کتاب خانہ نظامیہ، س ن
خلیل الرحمان اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	علی گڑھ، ایجوکیشن بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء
"	مقدمہ کلام آتش	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۹ء
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	وے صورتیں الٰہی	لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۷۶ء
دل محمد، خواجہ	بوستان دل	لاہور، خواجہ بک ڈپو، ۱۹۶۰ء
"	پیت کی ریت	ایضاً
"	حیات نو	ایضاً
"	صد پارۂ دل	لاہور، خواجہ بک ڈپو، ۱۹۶۳ء

مصنف	کتاب	ناشر
والفقار، ڈاکٹر غلام حسین	صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب	لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۸۲ء
〃	قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
رفیعہ رسالو (مرتب)	کلام حضرت بلھے شاہؒ	لاہور، ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، س۔ن
راشد، ن م	کلیات راشد	لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء
〃	ماورا	لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۳۲ء
رفیع الدین ہاشمی (مرتب)	خطوط اقبال	لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۶ء
ساحر، حکیم احمد شجاع	خون بہا	لاہور، فیروز سنز، ۱۹۵۰ء
〃	گرد کارواں	ایضاً
ساحر لدھیانوی	کلیات ساحر	لاہور، مکتبہ شعر و ادب س۔ن
سالک، مولانا عبدالمجید	راہ و رسم منزلہا	لاہور، الجدید، ۱۹۶۰ء
[illegible]	[illegible]	[illegible]
〃	سرگذشت	لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۶۶ء
سجاد ظہیر، سید	روشنائی	لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۷۶ء
سرخوش، شیر علی خاں	تذکرہ اعجاز سخن	لاہور، مستم ظریف بک ڈپو، ۱۹۲۳ء
سرخوش، محمد افضل	کلیات الشعراء	لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۲ء
سردار جعفری	ترقی پسند ادب	لاہور، مکتبہ پاکستان، ۱۹۵۶ء
سرور، آل احمد	ادب اور نظریہ	لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۴ء
سروری، عبدالقادر	جدید اردو شاعری	لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۶۷ء
سری رام لالہ، پنڈت	خمخانۂ جاوید	لاہور، مطبع نولکشور، ۱۹۱۱ء
سکسینہ، رام بابو	تاریخ ادب اردو	کراچی، غضنفر اکیڈمی، س۔ن
سلطانہ مہر	سخنور	کراچی، ادارہ تحریر، ۱۹۷۹ء
سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر	اردو شاعری میں اشاریت	نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳ء
شاہد احمد دہلوی	بزم خوش نفساں	کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء

شاہد ماہلی (مرتب)	فیض احمد فیض عکس اور جہتیں	نئی دہلی، معیار پبلیکیشنز، ۱۹۸۷ء
شبلی نعمانی، علامہ	شعر العجم (جلد اول)	لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۳۲۵ھ
"	شعر العجم (جلد سوم)	اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۳۵ء
شمس اللہ قادری، حکیم سید	اردوئے قدیم	لکھنؤ، مطبع نولکشور، ۱۹۲۵ء
شورش کاشمیری	گفتنی و ناگفتنی	لاہور، مطبوعات چٹان، ۱۹۶۳ء
صادق، ڈاکٹر محمد	آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء
صالحہ عابد حسین	یادگار حالی	لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء
صفیہ بانو، ڈاکٹر	انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات	کراچی، کفایت اکیڈمی، ۱۹۸۷ء
ضمیر جعفری	جزیروں کے گیت	لاہور، مکتبہ کاروان، س۔ن
"	مافی الضمیر	لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۷ء
ظفر، سراج الدین	زمزمۂ حیات	لاہور، فیروز سنز، س۔ن
ظفر علی خاں، مولانا	بہارستان	لاہور، اردو اکیڈمی پنجاب، ۱۹۳۷ء
"	نگارستان	لاہور، یونائیٹڈ پبلشرز، س۔ن
ظفر، یوسف	زہر خند	لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۴۴ء
"	صدا بصحرا	لاہور، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء
ظہور الدین احمد، ڈاکٹر	پاکستان میں فارسی ادب	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء
ظہیر کاشمیری	تغزل	لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء
"	عظمت آدم	لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۵۵ء
عابد، سید عابد علی	اسلوب	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء
"	بریشم عود	لاہور، ادب جدید، ۱۹۶۶ء
"	شب نگار بنداں	لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۵۵ء
عابدی، وزیر الحسن (مرتب)	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد پنجم)	لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

عبداللہ گیانی	گرو گرنتھ اور اردو	لاہور' مرکزی اردو بورڈ' ۱۹۶۹ء
عبدالحق' مولوی	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	اورنگ آباد' انجمن ترقی اردو' ۱۹۳۳ء
"	مرحوم دہلی کالج	دہلی' انجمن ترقی اردو' ۱۹۳۵ء
عبدالحکیم' ڈاکٹر خلیفہ	فکر اقبال	لاہور' بزم اقبال اردو' ۱۹۳۳ء
عبدالرشید' خواجہ	تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی)	کراچی' اقبال اکیڈمی' ۱۹۶۷ء
عبدالسلام ندوی' مولانا	اقبال کامل	اعظم گڑھ' معارف' ۱۹۴۸ء
عبدالشکور	عہد جدید کے چند منتخب ہندو شعراء	لکھنؤ' کتاب خانہ دانش محل' ۱۹۴۳ء
عبدالغفور قریشی	پنجابی ادب دی کہانی	لاہور' عزیز بک ڈپو' ۱۹۷۲ء
عبدالقادر بدایونی	منتخب التواریخ	لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۶۳ء
عبدالمجید بھٹی (مرتب)	ابیات سلطان باہوؒ	کراچی' انجمن ترقی اردو' ۱۹۶۷ء
عبدالوحید' ڈاکٹر	جدید شعرائے اردو	لاہور' فیروز سنز' ۱۹۶۹ء
عبداللہ چغتائی' ڈاکٹر محمد	قلعہ لاہور کی مختصر تاریخ	لاہور' کتاب خانہ نورس' ۱۹۷۹ء
عبداللہ' ڈاکٹر سید	سخن ور (نئے اور پرانے)	لاہور' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' ۱۹۷۶ء
عبداللہ قریشی' محمد	حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں	لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۸۲ء
"	حیات جاوداں	لاہور' بزم اقبال' ۱۹۸۷ء
"	شاعر کشمیر	لاہور' ظفر برادرس' س ۔ ن
"	معاصرین' اقبال کی نظر میں	لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۷۷ء
"	مقالات اقبال	لاہور' آئینہ ادب' ۱۹۸۲ء
"	مکاتیب اقبال (بنام گرامی)	لاہور' اقبال اکادمی پاکستان' ۱۹۸۱ء
عدم' عبدالحمید	رم آہو	لاہور' آئینہ ادب' ۱۹۶۶ء
"	نقش دوام	لاہور' مکتبہ کارواں' ۱۹۷۲ء
عرش ملسیانی	کلیات عرش ملسیانی	نئی دہلی' جامعہ ملیہ' ۱۹۸۳ء
عظیم قریشی	آج کے نغمے' کل کے شعلے	لاہور' ملک دین محمد اینڈ سنز' س ۔ ن
عقیل' ڈاکٹر معین الدین	تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۱۹۷۶ء

علی جواد زیدی	قومی شاعری کے سو سال	لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء
علی ہجویری، داتا گنج بخش	کشف الاسرار	لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء
عوفی، سدالدین محمد	لباب الالباب	لندن، ایڈورڈ جی۔ براؤن، ۱۹۰۶ء
غالب، مرزا اسداللہ خاں	اردوئے معلی	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء
غربتی، شاہ ابوالمعالی	دیوان غربتی (غیر مطبوعہ)	لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری (مجموعہ آذر)
فاخر ہریانوی	سوج صبا	لاہور، ایوان ادب، ۱۹۶۶ء
فقیر، ڈاکٹر فقیر محمد	کلیات بلھے شاہ	لاہور، پنجابی ادبی اکادمی، ۱۹۶۳ء
فوق، محمد الدین	کلیات فوق	لاہور، ظفر برادرس، ۱۹۳۳ء
"	لاہور عہد مغلیہ میں (شباب لاہور)	لاہور، ظفر برادرس، ۱۹۲۷ء
فیاض محمود، سید (مرتب)	تنقید غالب کے سو سال	لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
فیض، فیض احمد	میزان	کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷ء
"	نسخہ ہائے وفا	لاہور، مکتبہ کاروان، ۱۹۸۵ء
قتیل شفائی	جلترنگ	لاہور، ماورا پبلشرز، س۔ن
"	ہریالی	لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۳ء
کشن پرشاد کول، پنڈت	ادبی اور قومی تذکرے	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۱ء
کمار پاشی (مرتب)	میراجی۔ شخصیت اور فن	نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء
کنہیا لال ہندی، رائے بہادر	تاریخ لاہور	لاہور، وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء
کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ	منشورات	لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء
"	کیفیات واردات کیفی	لاہور، مفید عام پریس، ۱۹۳۱ء
"	کیفیہ	لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء
گوپال متل	لاہور کا جو ذکر کیا	نئی دہلی، مکتبہ تحریک، ۱۹۷۶ء
لطیف، سید محمد	تاریخ لاہور (انگریزی)	لاہور، مرکنٹائل گارڈن پریس، ۵۷-۱۹۵۶ء
مالک رام	تذکرۂ معاصرین (جلد دوم)	نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ملیہ، ۱۹۷۶ء
"	تذکرۂ معاصرین (جلد سوم)	ایضاً ۱۹۷۸ء

[illegible]	تذکرۂ معاصرین (بمبئی [illegible])	پٹنہ ۱۹۶۲ء
مجید لاہوری	کانِ نمک	کراچی، مکتبہ مجید، ۱۹۵۸ء
محروم، تلوک چند	کاروانِ وطن	نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ملیہ، ۱۹۶۰ء
٭	گنجِ معانی	دہلی، دہلی کتاب گھر، ۱۹۵۷ء
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	جنگِ آزادی کے اردو شعراء	اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۶ء
محمود شیرانی، حافظ	پنجاب میں اردو	لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۷۲ء
مختار صدیقی	سی حرفی	کراچی، مکتبہ طبع زاد، س۔ن
٭	منزلِ شب	لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۵۵ء
محمود جالندھری	تلاطم	لاہور، مکتبہ جدید، س۔ن
مراد شاہ، پیر	نامۂ مراد	لاہور، امیر پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۱ء
مسیح الزماں	حرفِ غزل	الٰہ آباد، خیابان، ۱۹۵۷ء
مصحفی، غلام ہمدانی	تذکرۂ ہندی	اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء
معتمد خان بخشی، مرزا محمد	اقبال نامۂ جہانگیری	کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۳ء
مغنی تبسم، ڈاکٹر	ن م راشد، فن اور شخصیت	نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء
مقبول بیگ بدخشانی، مرزا	ادب نامۂ ایران	لاہور، یونیورسٹی بک ایجنسی، س۔ن
٭	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد اول تا چہارم)	لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء
ملا شاہ	رباعیات و مثنویات (غیر مطبوعہ)	لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، شمارہ نمبر ۱۵۸
ممتاز حسن، ڈاکٹر (مرتب)	اقبال اور عبدالحق	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء
منظور، منظور احمد	دیدۂ بینا	لاہور، ناشرین، ۱۹۶۱ء
مہر، منشی سورج نرائن	کلامِ مہر	لاہور، مطبع مفید عام، ۱۹۰۸ء

میراجی	پابند نظمیں	راولپنڈی، کتاب نما، ۱۹۶۸ء
"	میراجی کی نظمیں	ایضاً
ناظر، چودھری خوشی محمد	نغمۂ فردوس	لائل پور، انجمن ارباب ذوق، ۱۹۳۷ء
نامی، پیر غلام دستگیر	تاریخ جلیلہ	لاہور، گلزار عالم پریس، ۱۹۶۰ء
ندیم قاسمی، احمد	جلال و جمال	لاہور، التحریر، ۱۹۶۹ء
"	دشت وفا	ایضاً ۱۹۸۶ء
"	دھڑکنیں	لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۳۲ء
نسیم رضوانی	شعرائے اردو	گجرات، گجرات پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۷ء
نظر، قیوم	قلب و نظر کے سلسلے	لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء
نظیر لدھیانوی	تذکرۂ شعرائے اردو	لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۳ء
"	فن تنقید اور شعراء پر تنقیدیں	لاہور، مکتبہ کاروان، ۱۹۷۷ء
نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر	دلی کا دبستانِ شاعری	کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء
نیرنگ، سید غلام بھیک	آہنگ عمل	لاہور، مرغوب ایجنسی، س۔ن
"	کلامِ نیرنگ	کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۳ء
نیر واسطی	سلمٰی سے دل لگا کر	نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۰ء
"	شعر و حکمت	لاہور، ملک سراج الدین اینڈ سنز، ۱۹۶۸ء
وارث شاہ، سید	ہیر	لاہور، پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۷۳ء
وحیدالدین، فقیر سید	انجمن	کراچی، لائن آرٹ پریس، ۱۹۶۶ء
"	روزگار فقیر	لاہور، آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
وزیر آغا، ڈاکٹر	تنقید اور احتساب	لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۸۳ء
"	تنقید اور مجلسی تنقید	سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۶ء
وقار انبالوی	بیانِ حال	لاہور، مکتبہ نوائے، س۔ن

وقار عظیم، سید	اقبال شاعر اور فلسفی	لاہور، تصنیفات، ۱۹۶۸ء
ہادی حسین، محمد	مغربی شعریات	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء
ہاشمی فرید آبادی، سید	ماثر لاہور	لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۵۶ء
ہمایوں، جسٹس شاہ دین	جذبات ہمایوں	لاہور، مرکنٹائل پریس، س۔ن
یحییٰ بن احمد سرہندی	تاریخ مبارک شاہی	لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۶ء
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	روح اقبال	حیدرآباد (دکن) ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۳۳ء
یونس جاوید	حلقہ ارباب ذوق	لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء
یونس حسنی، ڈاکٹر	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۱۹۷۶ء

مقالات، جرائد و رسائل

اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد	ادیب اور مصنف	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
اکبر لاہوری	شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی۔ چند تاثرات	پیچز، لاہور (تاجور نمبر) ۱۹۶۵ء
اکرم چغتائی، محمد	پنجاب میں اردو	فنون، لاہور (سالنامہ) ۱۹۶۹ء
پیام شاہجہانپوری	شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی	پیچز، لاہور (تاجور نمبر)
ثمینہ یاسمین	سید ذوالفقار علی بخاری (مقالہ) ایم اے اردو	لاہور، اورینٹل کالج لائبریری
جمیل جالبی، ڈاکٹر	فیض: ایک تقابلی مطالعہ	افکار، کراچی ۱۹۶۵ء
حکیم احمد شجاع	تاجور نجیب آبادی	پیچز، لاہور (تاجور نمبر)
	لاہور کا چیلسی	نقوش، لاہور، جنوری مارچ ۱۹۶۶ء
رفعت نسرین	حاجی لق لق (مقالہ ایم اے اردو)	لاہور، اورینٹل کالج لائبریری

ساجد بشیر	جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی	نقوش، لاہور (خاص نمبر) دسمبر ۱۹۸۷ء
سالک، گیتی آرا	سید غلام بھیک نیرنگ (مقالہ ایم اے اردو)	لاہور، اورینٹل کالج لائبریری
سہیل احمد خاں، ڈاکٹر و ڈاکٹر طارق عزیز	ظہیر کاشمیری سے بات چیت	شام و سحر، لاہور (ظہیر کاشمیری نمبر) مارچ اپریل، ۱۹۸۸ء
سیماب اکبر آبادی	پنجاب اور اردو	شاعر، آگرہ ستمبر ۱۹۳۷ء
شجاع الدین، پروفیسر محمد	سیاسی اور ثقافتی تاریخ	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
شہرت بخاری	ادبی تحریکیں	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
"	اردو نظم اور پنجاب	راوی (گورنمنٹ کالج لاہور کا مجلہ) مئی ۱۹۵۳ء
طاہر مسعود چودھری	محمد عظیم قریشی، حیات اور فن (مقالہ ایم اے اردو)	لاہور، اورینٹل کالج لائبریری
ظفر علی سیال	جھنگ کے اردو شعراء (مقالہ ایم اے اردو)	لاہور، اورینٹل کالج لائبریری
عابد، سید عابد علی	چند بڑے ادیب	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
عاشق حسین بٹالوی	تبصرہ	چٹان، لاہور، ۲۸ جون ۱۹۷۱ء
عبدالحق، مولوی	ترقی اردو کے متعلق ایک نئی تحریک (تبصرہ)	اردو، اورنگ آباد (دکن) جولائی ۱۹۲۳ء
عبدالحمید یزدانی، خواجہ	فارسی شاعری میں لاہور کا ذکر	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
"	فارسی گو شعراء	نقوش، لاہور (لاہور نمبر)
عبداللہ قریشی، محمد	رفتار ادب (تبصرہ)	مجلہ تحقیق (پنجاب یونیورسٹی) ۱۹۸۱ء
عدم، عبدالحمید	خودنوشت حالات زندگی (سوانحی اشارے)	فنون، لاہور (جدید غزل نمبر) جنوری ۱۹۶۹ء
عظیم قریشی، محمد	خودنوشت حالات زندگی (سوانحی اشارے)	فنون، لاہور (جدید غزل نمبر) جنوری ۱۹۶۹ء

علی محمد خاں	انجمن پنجاب کا قیام، مقاصد اور اس کے اثرات	صحیفہ لاہور جنوری مارچ ۱۹۸۷ء
"	ملک سخن کا تاجور۔ تاجور	ماہ نو لاہور جون ۱۹۸۵ء
فائق، کلب علی خاں	قدوی لاہوری	صحیفہ لاہور جنوری فروری ۱۹۷۶ء
فضل حق، قاضی	پنجاب میں اردو	لاہور اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء
کامل، محمد وارث	شمس العلماء تاجور	نیچرل لاہور (تاجور نمبر)
گوہر نوشاہی	اردو شاعری میں لاہور کا حصہ (مقالہ ایم اے اردو)	لاہور پنجاب یونیورسٹی لائبریری
"	لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات (مقالہ پی ایچ ڈی اردو)	لاہور پنجاب یونیورسٹی لائبریری
محمد عظیم	اردو ادب کا دبستان لاہور	حیدرآباد (پاک) نئی قدریں شمارہ نمبر ۱۰، ۱۹۶۵ء
محمود شیرانی حافظ	آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت	لاہور اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء
مہر، مولانا غلام رسول	سید عابد علی عابد مرحوم	صحیفہ لاہور (عابد نمبر)
ندیم قاسمی احمد	چند بڑے ادیب	نقوش لاہور (لاہور نمبر)
نظیر لدھیانوی	علامہ تاجور	نیچرل لاہور (تاجور نمبر)
وزیر آغا، ڈاکٹر	مجید امجد کی شاعری میں شجر	اوراق لاہور نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء

٭٭٭

مطالعۂ ادبیات میں سبک شناسی یا دبستانوں کی ادبی اقدار و روایات سے واقفیت نقد و تحسین کے لیے ناگزیر ہے۔ ادبی سرمائے کو نظم و نثر کی متعدد اور متنوع اصناف میں پیش کیا جاتا ہے۔ ادبیاتِ عالم میں اُردو زبان کے حوالے سے جو ادبی کارنامے اور شاہکار لکھے گئے ہیں' وہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے گزشتہ چار صدیوں پر محیط ہیں۔ اس زبان نے تہذیب کی بساط پر اگرچہ اپنے رنگ و آہنگ کا ادبی جلال و جمال ماضی قریب میں دکھایا ہے مگر اپنی فنی قدرت' لسانی قوت اور اسلوبیاتی جدت کی بنا پر یہ بہت سی قدیم زبانوں پر سبقت لے گئی ہے۔ اُردو زبان کے نثری شاہکار اس کے فکری اور علمی ورثے کے امانت دار ہیں مگر اس کا سرمایۂ سخن حسنِ خیال' ندرتِ ادا' انداز بیاں اور صنائع بدائع کے لحاظ سے دل و دماغ کے لیے کیف آور اور نشاط افزا ہے۔ اُردو شاعری کے مورخوں' تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے دہلی اور لکھنو، کے شعری دبستانوں پر اعلیٰ درجے کا تحقیقی لوازمہ پیش کیا ہے۔ انصاف میں نگاہوں سے جائزہ لیا جائے تو ''لاہور کا دبستانِ شاعری'' خیال اور اسلوب کی توانائی' حسن و جمال کی رعنائی اور زبان و بیان کی زیبائی کے لحاظ سے تمام دبستان ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے لاہور کو قطب البلاد قرار دیا ہے تو مجمع دانش اور حسن و جمال کی علامت نور جہاں نے اس خطۂ ارضی کو یوں خراج پیش کیا ہے۔

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم   جاں دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

فارسی زبان کے تہذیبی اور ثقافتی کارواں نے اپنی اقلیم سے نکل کر لاہور ہی کو اپنا مرکز بنایا۔ اسی زبان کے فیضان نے اُردو لغت کو ثمر آور کیا تو اس کی لطافت' فصاحت اور بلاغت اُردو زبان کا قالب اختیار کر گئی۔ مسعود سعد سلمان کی لاہور میں آمد سے انجمن پنجاب کی تشکیل (۱۸۷۴ء) تک اس میں بیسیوں نامور شعرائے کرام نے اپنی فکر سخن کے جادو جگائے' جس کا اجمالی تذکرہ فاضل محقق ڈاکٹر علی محمد خاں نے اپنے اس تحقیقی مقالے کے تمہید و تعارف میں پیش کیا ہے۔ انجمن پنجاب کی تشکیل ۱۸۷۴ء سے قیام پاکستان ۱۹۴۷ء تک پنجاب کے سیکڑوں شعرائے کرام نے اُردو زبان میں اپنے شعری زمزمے پیش کیے ہیں مگر فاضل محقق نے ''لاہور کے دبستانِ شاعری'' میں اس دورانیے کے پچپن شعراء کے کلام کا تنقیدی اور ادبی جائزہ پیش کیا ہے۔ یوں صدی کے اس شعری سفر میں حالی' اقبال' فیض اور احمد ندیم قاسمی جیسے باکمال شعرائے کرام دکھائی دیتے ہی۔

اس تحقیقی مقالے کے خالق ڈاکٹر علی محمد خاں ۷ ستمبر ۱۹۴۱ء کو پانی پت کے تاریخی شہر میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اُردو اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۸۸ء میں پی ایچ ڈی کا یہ تحقیقی مقالہ لکھا۔ آپ گزشتہ چھیالیس سال سے اُردو ادبیات کے ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اُردو زبان کی نصابی کتابوں کی ترتیب اور انتخاب میں آپ کی خدمات کی انفرادیت مسلّم ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد' خواجہ حسن نظامی اور مولانا علم الدین سالک کی بہت سی کتب کی فنی تدوین بھی انجام دی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی تدریس اور تحقیق میں آپ کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

پروفیسر

ISBN 978-969-8983-34-8